تذکرہ
علمائے اہلسنت وجماعت لاہور

ترتیب و تالیف

پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی ایم۔ اے

مکتبہ نبویہ ۵ گنج بخش روڈ لاہور

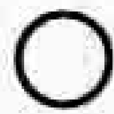
لاہور کی علمی تاریخ پر ایک بےمثال کتاب

تذکرہ

علماءِ اہلسنّت وجماعت لاہور

ترتیب و تالیف

پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی ایم۔ اے



مکتبہ نبویہ۔ گنج بخش روڈ۔ لاہور

نام کتاب ـــــــ تذکرہ علماءِ اہلِ سنت وجماعت لاہور

بار دوم ـــــــ مئی ۱۹۸۷ء

مصنف ـــــــ پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی ایم اے

کاتب ـــــــ محمد شریف گل

ناشر ـــــــ مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ، لاہور

مطبع ـــــــ سیون برادرز پریس۔ لاہور

قیمت ـــــــ ۴۵/۰۰ روپے

فہرست

نگاہِ التفات

آج ہم ان نفوسِ قدسیہ کے حالاتِ زندگی پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جنھوں نے اس برصغیر میں اسلامی معاشرت اور دینی حمیت کو زندہ رکھنے کے لیے حالات کی شدید ناہمواری کے باوجود شبانہ روز کام کیا خصوصیت سے ہم زوالی دَور کے علماءِ اہلسنت کے علمی کارناموں کو آپ کے گوشۂ چشم تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سیاہ دَور کی سنگینی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان علماءِ کرام کی حیثیت کو معاشرتی زندگی سے ہٹا کر قوم کے سامنے انھیں حقیر بنانے کی کوشش کی جاتی رہی تاریخی ادب سے ان کے حالات کو نظر انداز کیا جاتا رہا اگرچہ زمانہ اپنی مذموم کوششوں میں کسی حد تک کامیاب بھی ہُوا مگر ان علماءِ کرام نے عظمتِ اسلام کے پرچم کو ہمیشہ بلند رکھا اور روشنی کا مینار بن کر اپنا نور پھیلاتے رہے۔ ان کا یہی کردار ہمارے تذکرے کی نگارش کا محرک بنا۔

ہم نے صرف مدینۃ الاولیاء لاہور کو سامنے رکھا ہے یہاں سے علم و فضل کے چشمے پھُوٹے اور پنجاب کی سرزمین کو سیراب کرتے گئے۔ اس طرح ہم اس قافلۂ علمِ دین میں سے صرف ان علماء کے حالات ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں جو کسی صورت میں لاہور سے وابستہ رہے مگر دوسرے نظریات کے حامل علماء ہماری حدودِ تحریر سے باہر رہے ہیں اور صرف سُنّی علماء کو ہی سامنے رکھا گیا ہے۔

اس تذکرہ کی تکمیل کے لیے ہمیں کئی بار جُوئے شیر لانے کے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا۔ حالات جمع کرنے کے لیے دشت نوردی سے لے کر کُوچۂ رسوائی کی غلطتوں سے گزرنا پڑا۔ ہزاروں کتابوں کی ورق گردانی سے کچھ نہ ملا تو نقشِ کفِ پا کی لکیریں پڑھنے سے بھی گریز نہ کیا۔ بایں ہمہ اگر ہماری کوشش اہل علم کے حاشیۂ خیال میں نہ اُترے تو یہ ہمارے بخت کی نارسائی ہے — ہمیں یاد ہے آج سے کئی برس پہلے یہ کتاب کتابت کے مراحل طے کر کے نکلی مگر لیتھو مشین کی سیاہی نے قارئین کی تارِ نظر سے ہمنوائی نہ کی تو مؤلف نے ساری کتاب یہ کہہ کر تلف کر دی کہ جو روشنائی قارئین کی آنکھوں کو روشنائی نہیں بخش سکتی وہ اہلِ ذوق کے دل و دماغ پر کب دستک دے سکے گی۔ اب یہ کتاب آفسٹ کی طباعت سے مزیّن ہو کر بصد اندازِ زیبائی آپ کے سامنے آ رہی ہے۔

ہم اس کتاب کی تکمیل کے لیے ان تمام حضرات کے سپاس گزار ہیں جنھوں نے اس کی آمد تک ایک قیامت کا انتظار کیا۔ خصوصیت سے ان حضرات کی مساعی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لائیں جن میں جناب پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی (مرتب) جناب حکیم محمد موسیٰ امرتسری (محرک)، جناب مولانا محمد عبداللہ قریشی، مفتی محمود عالم ہاشمی مرحوم، جناب مرزا غلام قادر لاہوری، محترم بشیر حسین ناظم ایم اے، پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے (معاونین)، محمد عالم صاحب مختارِ حق (مصحح) اور محمد شریف صاحب گل تو سرِ فہرست ہیں۔ ان حضرات کے فکر و نظر کے نشانات تو کتاب کے صفحہ صفحہ اور سطر سطر پر بکھرے دکھائی دیں گے۔ اب یہ فیصلہ ادیبوں کے ذوق پر [illegible]

(باغ علی نسیم)



علمائے کرام

اور

اشاعتِ علومِ اسلامیہ

علمائے دین وارثِ علمِ رسول ہیں وہ ہمدِ کائناتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اشاعتِ اسلام کے لیے انبیاء کے نائب ہیں۔ وہ اپنے مقام و رتبہ کے اعتبار سے بہترین خلائق کہلائے۔ انہوں نے علومِ ربانی اور سنّتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج و اشاعت سے کائناتِ ارضی پر بسنے والوں کے سینوں کو منور کرنے میں عمریں وقف کر دیں۔ وہ وحیِ الٰہی کے مقاصد کو لے کر اُٹھے اور مشرق و مغرب پر چھا گئے۔ وہ سنّتِ رسول کو دامنِ دماغ میں سمیٹ کر بڑھے تو آسمانی وسعتوں پر حاوی ہو گئے۔ وہ اصحابِ صُفّہ تھے، معلمِ اخلاق بنے۔ وہ راویِ حدیث تھے تو استادِ جہاں کہلائے۔ وہ علمِ الٰہی کے چشمہ سے سیراب ہو کر صحرائے عرب سے نکلے تو غرناطہ و اشبیلیہ کی یونیورسٹیوں کے بانی بنے اور ایشیا و یورپ کی تاریکیوں کو علمی ضیاؤں سے چیرتے گئے۔ وہ دولتِ علم کو کائناتِ ارضی کے گوشہ گوشہ میں لیے پھرتے اور بلا امتیازِ مذہب و ملت انسانوں کی جھولیاں بھرتے گئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کبھی زادِ راہ کی جستجو کی نہ بحر و بر کی پہنائیوں سے شکستہ پا ہوئے۔ وہ جہالت کے تاریک پردوں کو ہٹاتے گئے اور ظلمات کو نور سے اڑاتے گئے۔

لیے علم و فن اُن سے نصرانیوں نے — کیا کسبِ اخلاق رُوحانیوں نے
ادب اُن سے سیکھا صفاہانیوں نے — کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے — مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے — خلافت کو زیرِ خضرا جا کے دیکھے

جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

ہم نے اسی تہذیب کے مشعل بردار علماء ربانی کی انتھک کوششوں سے متاثر ہو کر چند نفوس قدسیہ کے حالات و سوانح خاکے قلم بند کرنے کی ایک سعی ناتمام کی ہے۔ یہ علماء کرام مدینۃ الاولیاء لاہور میں اس زمانے میں علمی روشنی پھیلانے میں مصروف رہے۔ جب آفتابِ علم پر جہالت کے بادل چھا رہے تھے علم دین سے ملتِ اسلامیہ کو دُور رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

علمی حقائق کو مسخ کرنے کے لیے پورے برصغیر میں ایک منظم سازش کی جا رہی تھی۔ مغل سلطنت کے جاہ و جلال کے خاتمے کے ساتھ ہی لاہور نصف صدی تک سکھا شاہی کی تاریکیوں میں ڈوبا رہا۔ پھر انگریزی تسلط کے گڑھے میں جا گرا۔ ان علماء کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ لاہور کی تین سو سالہ علمی اور معاشرتی تہذیب کے بعض پہلو بھی نمایاں ہوں گے جو ان علماء کرام کی جد وجہد سے بنتی اور سنورتی رہی۔ ہمارے خیال میں اس موضوع کو دیدہ و دانستہ تاریخ سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے حالانکہ ملتِ اسلامیہ کو اس ورثہ سے محروم رکھنا ایک بہت بڑا سانحہ ہے چنانچہ ہم نے اس منزل کی نشان دہی کے طور پر چند علماء اہلسنت کے حالات قلم بند کر دیئے ہیں تاکہ اہل قلم اس بنیاد پر اپنی بلند و بالا عمارتیں اٹھا سکیں۔

صدیوں کے علمی شکوہ وجلال کی بارگاہوں کے بعد چند علماء کا تذکرہ گردِ کارواں نظر آئے گا مگر ہم اپنے قارئین کو اس تاریخ ساز جماعت کے مقاصد اور مراتب سے روشناس کرنے کی کوشش میں چند اوراق پڑھنے کی زحمت دیے بغیر نہیں رہیں گے جو ان کے ذوقِ علم کی تسکین کے لیے ایک مفید چیز ہو گی۔ علماءِ اسلام نے علمی شمعیں کن طوفانوں میں جلائیں، کن مقاصد کو لے کر بحرِ ظلمات کو چیرتے گئے، جہالت کے کن صحراؤں کے دامنوں کو علمی گل و گلزار سے بھر دیا علم و انصاف سے دلوں کے کن زنگ آلود گوشوں کو منور کیا۔ عدل و استحسان سے کن سینوں کو صاف کرتے گئے اور اقوامِ عالم کے سامنے کس امتیازی شان سے علم کا نور بکھیرتے گئے۔ اس سلسلہ میں ہم علامہ ابن عبدالبر کی مشہور کتاب جامع بیان العلم وفضلہ جیسے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اردو لباس پہنا کر "العلم والعلماء" کے نام سے ندوۃ المصنفین دہلی (مطبوعہ ۱۹۵۳ء)

سے شائع کیا تھا، سے استفادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ کتاب علم دین اور علماءِ دین کی جلیل القدر خدمات کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے۔ فاضل مصنّف نے علومِ اسلامیہ کے مشاہیر کے اقوال اور روایات کو جس خوبی سے پیش کیا ہے اس سے جویائے علمِ دین کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ علم دین کا طالبعلم اپنی تاریخ کو ایک روشن آئینے میں دیکھ آگے بڑھنے کے قابل ہوتا ہے اور وُہ عصرِ جدید کے علم کُش آلات وحالات کے اثرات کے باوجود اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاتا رہتا ہے۔ ہم اس عظیم اور مفید کتاب (جوان دنوں نایاب ہے) کے چیدہ چیدہ اقتباسات تذکرہ کے دیباچے کے طور پر پیش کر کے اپنی حقیر کوشش کو آبِ آتش لباس پہنا کر اہلِ دل کی مجلس میں پیش کر رہے ہیں۔

تاریخ عالم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے علم سے فیاضانہ سلوک کیا اور اسے بلا امتیاز مذہب وملت انسانی رہنمائی کا ذریعہ بنایا۔ اسلام کی آمد سے صدیوں پہلے کائناتِ ارضی کی متمدن اقوام اپنے طور پر علوم و فنون کی راہیں متعین کرتی رہی ہیں چین، ہندوستان، مصر، بابل، اشوریا، یونان، روما علم کے مراکز مانے گئے ہیں مگر امر واقعہ یہ ہے کہ یونان کے علاوہ دنیا بھر کے ممالک کے علوم کو علم کہنا علم سے ناانصافی ہے۔ بابل، اشوریا اور مصر کے علوم توہمات، سحر اور جادو کے مجموعے تھے۔ چین اور ہندوستان صدیوں طلسمات کے چکر میں رہے۔ چین نے اخلاقیات اور ہندوستان نے الٰہیات اور طب میں مختصر سی ترقی کی۔ روما صرف فتوحات کے جنون میں گرفتار رہا البتہ یونان ایک ایسا ملک ہے جس نے علم کے میدان میں بڑے بڑے فلاسفر اور مفکرین پیدا کیے۔ یونانی فلاسفروں اور علماء نے انسانی ذہن ودماغ کو نہایت قیمتی مواد مہیا کیا اور یہ ملک علم کا سرچشمہ رہا جو کئی صدیوں تک دوسری قوموں کو اپنی ضیاؤں سے منور کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک نے ایک زمانہ میں مسلمانوں کے عقلی علوم میں اضافہ کیا اور ایک عرصہ تک اسلامی دنیا کے علوم کا سرچشمہ رہا۔ بایں ہمہ یونانی علوم کی بنیاد مادیت پر تھی۔ وُہ انسان کو رُوحانیت سے یکسر محروم کر دیتا۔ یُونانی علوم نے جس تہذیب کو جنم دیا اور جس معاشرے کو فروغ دیا اس میں سقراط جیسے جلیل القدر حکیم آزادیِ فکر نہ ہونے کی وجہ سے زہر کا پیالہ پینے پر مجبور ہُوئے۔ افلاطون مخصوص شاگردوں کے ایک گروہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔

انکساغورس کو سنگسار کیا گیا اور ارسطو کو محض اس لیے وطن چھوڑنا پڑا کہ اس کے علوم اس کے ہم وطنوں کے توہمات کے طلسم کو توڑنے میں کامیاب نہ ہوئے۔

مسیحیت کے فروغ کے ساتھ یورپ اور دوسرے ممالک نے علوم و فنون کو ایک نئے انداز سے ابھرتے دیکھا لیکن کلیسائی نظام نے علم کی جو مٹی پلید کی اس کے ذکر سے تاریخ انسانی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یونانی علوم کے خزانے جسے چشم فلک نے کبھی دیکھا نہ تھا مسیحی تعصب کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اسکندریہ کی سات لاکھ کتابوں کا کتب خانہ صرف اس لیے نذرِ آتش کر دیا گیا کہ ان کے نزدیک یہ کفر و الحاد کا خزانہ تھا۔ اہل علم کو عریاں کر کے شہر سے باہر نکال دیا جاتا اور مسیحی یورپ کے عروج و کمال نے جہاں جہاں قدم جمائے وہاں کے علمی خزانے برباد کر کے چھین لیا۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے علم کو فروغ دیا اور اہل علم کی قدر کی۔ علماء و فضلاء پر ہمیشہ نوازشات کیں۔ عوام تو عوام اسلامی بادشاہوں تک نے اپنی بارگاہوں کو ہمیشہ علم کی شمعوں سے روشن رکھا اسلام نے ان عربوں کو جو صدیوں سے جہالت کے گڑھوں میں پڑے تھے۔ علم کی روشن فضا میں لا کھڑا کیا۔ مسجد نبویؐ کے فارغ التحصیل لوگ معلم اخلاق بن کر دنیا کے سامنے آئے۔ صفہ پر بیٹھ کر علوم قرآنی کو ازبر کرنے والے دنیائے علم میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور جہاں جہاں گئے انسانیت کو جہالت کی تاریکیوں سے نجات دلاتے گئے۔ اسلامی دنیا نے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ان گنت مسجدیں، مسجدوں میں مدرسے اور ان کے ساتھ لاتعداد کتب خانے قائم کیے۔ مسجدوں میں تعلیم و تدریس کے دھارے بہنے لگے۔ آزادیٔ فکر کی بدولت علمی مسائل پر بحث و مذاکرات ہوتے۔ ہر عالمِ دین ایک دارالعلوم کی حیثیت رکھتا تھا۔ سفر میں، حضر میں، مسجد میں، گھر میں، طالب علموں میں گھرا رہتا اور وہ پوری آزادی کے ساتھ علم کے انوار بکھیرتا جاتا۔ ہر قوم اور ملت کے افراد یکساں فائدہ اٹھاتے۔

اسلام کے ہاتھوں علم کی سربلندی

مسلمانوں کے علوم کا آغاز اس اُمّی آقا کی زبان معجز بیان کا مرہونِ منت ہے جسے وحیِ الٰہی "اقراء" کے لفظ کے ساتھ غارِ حرا سے اٹھتی ہوئی شعاعوں سے کائنات کے ذرہ ذرہ تک پہنچانا چاہتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا کائنات عالم پر

علوم کی ضیا باریاں کرنے والا نہ کسی کے سامنے شاگرد بن کر بیٹھا اور نہ لکھنے کے لیے قلم تراشی کی زحمت گوارا کی مگر بایں ہمہ:

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملّت بہ شست

اولین مسلمانوں میں صرف دو صحابی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ جنگِ بدر کے غیر مسلم قیدیوں کو فدیہ کی ادائیگی چند مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا بھی قرار دیا گیا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر صحابہ صفہ پر بیٹھ کر علم و کتاب کی طرف آگے بڑھے۔ یہ مکتب کی کرامت تھی یا نگاہِ رسولؐ کا کمال تھا۔ یہ مدرسہ ساری دنیا کے لیے ایک یونیورسٹی بن گیا اور ان کے علمی چرچوں سے چار دانگ عالم گونج اُٹھا۔

اسلام سے پہلے عربی علوم کا یہ عالم تھا کہ ایک کتاب بھی دنیائے عرب کے پاس نہ تھی۔ شاعری کے کمالات سینہ بسینہ محفوظ تھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کو اپنے شعر منتقل کرتا رہتا۔ لیکن اسلام نے جو علمی ذہن تیار کیے انہوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس زبان کو اوّل درجہ کی علمی زبان بنا دیا، صرف و نحو کے قواعد تیار کیے۔ فصاحت و بلاغت کے اصول بنائے لُغات مرتب کیں اور بے شمار تصانیف سے اس زبان کو مالا مال کر دیا اور عربی کو دنیا میں "اُمّ اللسان" بنا کر پیش کیا۔ یہ تاریخی حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر تک دنیا کی کوئی زبان قدیم ہو یا جدید عربی کے علمی سرمائے کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی یورپ کے علوم اور کتب خانے تو دو سو پچاس سال کی پیداوار ہیں۔ اس سے پہلے صدیوں تک یورپی زبانیں فقیر تھیں اور ان کے پاس جو کچھ تھا عربی کتابوں کے تراجم تھے۔ یہ زبانیں عربی زبان کے دروازے کے سامنے دامن پھیلائے الفاظ کی دریوزہ گری کرتی تھیں۔ عربی زبان کی جس قدر تصانیف تھیں اٹھارھویں صدی تک دنیا کی ساری زبانوں کے مجموعی لٹریچر سے زیادہ تھیں۔

مسلمان اس حقیقت سے واقف تھے کہ علم ان کی میراث ہے اور حسنہ کاینِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان تھا کہ علم تمام انسانوں کی میراث ہے جہاں سے ملے مسلمان اسے اپنی متاعِ گم گشتہ سمجھے۔ وہ عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں سے اُٹھے اور چین کی دیوار کے اس پار علوم

حاصل کرنے جا پہنچے۔ وہ بغداد سے نکلے اور یونان کے کتب خانوں کو ازبر کرنے میں مصروف ہوگئے۔ انہوں نے یونان کے علماء کو تعصب سے نہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا اور ارسطو کو "معلم اوّل" کا خطاب دیا۔ مسلمان ایک طرف علم کے حصول میں بے تاب تھا، دوسری طرف اس کی تقسیم میں فیاض تھا۔

مسلمانوں کے علمی مقام کا اعتراف غیر مسلم محققین نے بھی کیا ہے۔ امریکی علامہ ڈریپر کی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" کا ایک اقتباس اس حقیقت کے اعتراف کے لیے کافی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کو ابھی ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ یونان کی فتح کتابیں عربی زبان میں منتقل ہونے لگیں۔ بلند خیالات فطین عربی زبان میں منتقل ہونے لگے۔ المنصور نے اپنے عہدِ خلافت (۷۵۳ء - ۷۷۵ء) میں بغداد کو عروس البلاد بنا دیا۔ وہ خود علم ہیئت کا مطالعہ کرتا۔

طب و قانون کے مدارس قائم کیے گئے۔ ہارون الرشید کے حکم سے سلطنت عباسیہ کی ہر مسجد کے ساتھ ایک مکتب قائم کیا گیا۔ مامون الرشید کا دورِ خلافت تو ایشیا کے لیے علوم و فنون کا سرمایۂ صد افتخار و نازش مانا جاتا ہے۔ مامون نے بغداد کو سائنس کا مرکز قرار دیا۔ عظیم الشان کتب خانے قائم کیے اور اپنے دربار کو علماء و فضلاء سے درخشاں کیا۔ جب عربی سلطنت تین حصوں میں بٹ گئی علم و حکمت کی ترقی و ترویج میں پھر بھی فرق نہ آیا۔ بنی عباس ایشیا میں، بنو فاطمہ مصر میں اور بنی اُمیہ اندلس میں علم و حکمت کے دریا بہاتے رہے۔ شعر و ادب میں عربوں کا یہ دعوٰی بجا طور پر سچا ہے کہ ساری کائنات میں اتنے شاعر پیدا نہیں ہوئے جتنے عربی زبان میں پیدا ہوئے۔ سائنس میں وہ صرف یونانی حکماء کا تتبع نہ کرتے تھے بلکہ اسکندریہ کے علوم سے بھی مستفید ہوتے۔ وہ سائنس کی ترقی کو شاعری کی ترقی سے بالکل برعکس حقائق پہ پرکھتے تھے۔ وہ صحیفۂ فطرت کا عینی مشاہدہ کرتے۔ حکمت نظری سے بڑھ کر حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہوتے وہ اپنے علوم کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر رکھتے تھے۔ ہندسہ، ریاضیات، استدلال و استنباط کے آلات تصور کرتے تھے۔ جر ثقیل توازن مالیات پر بے پناہ کتابیں لکھیں اور ان کے تجربات سے یورپ اور امریکہ کی لیبارٹریوں کے ماہرین استفادہ کرتے:؂

وہ لقمان و سقراط کے دُرِ مکنون
وہ اسرار بقراط و درس فلاطون
ارسطو کی تعلیم سولن کے قانون
پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفون
یہیں آ کے مُہرِ سکوت ان کی ٹوٹی
اسی باغ رعنا سے بو ان کی پھوٹی

وہ فنِ کیمیا کے مُوجد تھے۔ تقطیر، تصعید، تسلیح (پگھلانے)، ترویق (چھاننے) کے سائنٹیفک آلات ایجاد کرتے گئے۔ انہوں نے ہیئت کے جو آلات ایجاد کیے وہ موجودہ ترقی پذیر ممالک کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ اصطرلاب اور لبنہ انہی مسلمان سائنس دانوں کی ایجاد ہیں۔ کیمیائی ترازو کو دنیا پہلے کب جانتی تھی۔ بغداد، اندلس اور سمرقند میں اوزان کی میزانیں اور ہیئت کے نقشے دنیا بھر کے لیے رہنما ثابت ہوتے تھے۔ علم ہندسہ، جبر و مقابلہ، اعداد نویسی میں نئے نئے اصول مرتب کیے۔

سمرقند سے اندلس تک سراسر
انہی کی رصدگاہیں تھیں جلوہ گستر
سواد مراغہ میں اور قاسیوں پر
زمیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وُہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

اسلامی کتب خانے خلیفہ ہارون الرشید نے علمی وسعت کے لیے ہزاروں کتب خانے قائم کیے۔ صدہا اونٹ قلمی کتابوں سے لدے ہُوئے بغداد میں داخل ہُوئے اور بغداد کی لائبریریوں کو مالامال کر دیا۔ قسطنطنیہ کے خزانے کی بجائے مامون الرشید نے اس کے عظیم کتب خانے کو پا کر زیادہ مسرت کا اظہار کیا۔ اس طرح جمع کی جانے والی گرانقدر کتابوں کی تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قاہرہ کے کتب خانہ فاطمیہ میں ایک لاکھ کتابیں نہایت پاکیزہ خط اور مزیّن جلدوں میں موجود تھیں اور ان کی تحریر میں شنگرف اور مرجان کی روشنائیاں استعمال میں لائی گئی تھیں۔ اس کتب خانہ میں چھ ہزار پانچ سو نسخے تو صرف علم ہیئت پر مشتمل تھے۔ کتب خانے میں دو کُرے تھے۔ پیتل کا کرہ بطلیموس نے بنایا تھا جس پر اس زمانے میں تین ہزار دینار خرچ آئے۔ چاندی کا کرہ ساری زمین کی گردش اور جغرافیائی معلومات

بہم پہنچانے میں مدد دیتا۔

اندلس کے خاص کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد چھ لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی صرف ان کی فہرست چالیس جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس شاہی کتب خانہ کے علاوہ شہر میں کتب خانے ایسے تھے جن میں ہر شخص اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر مطالعہ کر سکتا۔ ذاتی کتب خانے اس سے کہیں زیادہ تھے۔ لوگوں کی علم دوستی کا اندازہ صرف اس واقعہ سے لگا لیں کہ جب سلطان بخارا نے ایک اندلسی طبیب کو اپنے دربار میں طلب کیا تو اس نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ اس کی کتابوں کی باربرداری کے لیے چار سو اونٹ درکار ہیں۔

ان کتب خانوں کے انتظام نے مسلمانوں کی علم دوستی کو شہرت دوام بخش دی تھی۔ ہر کتب خانہ میں نقل و ترجمہ کا ایک شعبہ قائم تھا۔ ایک نسطور طبیب حنین نامی نے بغداد میں اپنے کتب خانے میں ایسا شعبہ قائم کیا جس سے چین اور ہندوستان کے اہل علم گھر بیٹھے استفادہ کرتے۔ یہ شخص ارسطو، بقراط اور جالینوس کی کتابوں کے تراجم کی اشاعت کرتا۔ جدید تصانیف اہل قلم کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہر دربار میں ایک شعبہ ہوتا جو اہل قلم سے مختلف موضوعات پر تالیفات کا اہتمام کرتا اور ان کی سرپرستی کے لیے فیاضانہ سلوک ہوتا۔ قصص و حکایات میں الف لیلیٰ عربوں کے ذوق افسانہ نویسی کا پتہ دیتی ہے۔ تاریخ، اصول، فقہ، سیاست، فلسفہ، سیر اور سوانح عمریاں نہ صرف جلیل القدر انسانوں ہی کی ترتیب دی جاتیں بلکہ اعلیٰ نسل کے گھوڑوں اور اونٹوں تک کے حالات پر لکھا جاتا تھا۔ کتابوں میں استعمال ہونے والا کاغذ خصوصیت کے ساتھ ان اجزا سے تیار کیا جاتا جو صدیوں پائیدار رہتا۔ زنگارنگ روشنائیاں تیار کی جاتیں جن کی آب و تاب صدیوں موجود رہتی۔ پھر نقش و نگار اور مطلی و مذہب جلدیں کتاب کی دیدہ زیبی اور حفاظت کی امین بن جاتیں۔

دنیائے اسلام کے اس اہتمام نے علوم و فنون کی روشنی کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ منگولیا، تاتار، ایران، عراق، شام، مصر، شمالی افریقہ، مراکش، فاس اور اندلس میں درس گاہوں نے انسانی سینوں کو علوم و فنون کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ یہ علوم نہ ہندوستان کے ہندوؤں کی جائداد رہا نہ یونانیوں کے حکمرانوں کا غلام، بلکہ اپنی ذہانت کے مطابق ایک عامی سے عامی

انسان ان مراتب کو حاصل کر سکتا جو اہلِ علم کے حصول میں آتے ہیں۔ اس عظیم اسلامی سلطنت کے ایک کنارے پر سمرقند کی رصدگاہیں اور کتب خانے اور دوسرے کنارے پر اندلس کی شہرہ آفاق آفاقی مینار آسمان سے ہمکلام تھے۔

مدارس اور مکاتب کی نگرانی خصوصیت سے ہوتی تھی اور اس نگرانی کے لیے عیسائی اور یہودی علماء کی خدمات حاصل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا جاتا۔ مامون الرشید کا یہ مقولہ تھا کہ:

"اہل علم و فضل خدا کے برگزیدہ بندے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی انسانی خدمت کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ وہ لوگوں کو علم و حکمت کے نکتے سمجھاتے ہیں۔ وہ نظام کائنات کی شیرازہ بندی کرتے ہیں اور محفل کون و فساد کی شمعیں روشن رکھتے ہیں۔ اگر یہ لوگ انتھک کوشش نہ کرتے تو دنیا جہالت و وحشت کے اتھاہ اندھیروں میں ماری ماری پھرتی۔"

اقوامِ عالم نے علوم انسانی کو ترقی دینے کے باوجود اسے محدود طبقوں اور مخصوص گروہوں اور خاندانوں کے لیے مختص کر لیا تھا مگر اسلام ہی ایک ایسا مذہب تھا جس نے علم و فضل سے فیاضانہ سلوک کیا۔ اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز مٹا دی۔ غلام امام بن گئے اور غریب والدین کے بیٹے مسلمان بادشاہوں کی مسند کے ساتھ عزت و وقار کی جگہ بیٹھنے لگے۔ اس علمی فیاضی نے صرف مسلمان قوم کو دولتِ علم سے مالا مال کیا بلکہ علماءِ اسلام نے دیگر اقوام کے بچوں کو بھی اسی محبت اور شفقت سے تعلیم دی جو انہیں اپنی قوم کے طالب علموں سے تھی۔ اندلس کے مکاتب اور مدارس یورپ کے طالب علموں کے لیے ہر وقت کھلے رہتے اور وہ علوم و فنون کی دولت سے دامنِ مراد بھر بھر کر اپنے گھروں کو لوٹتے اور یورپ کے تاریک گوشوں کو روشن کرتے۔

نوا سنجیاں ان سے دیکھیں یہ سب نے
زبان کھول دی سب کی نطق عرب نے

اسلام کا پہلا اعلان جسے ساری دنیا کی مہذب قومیں سن کر انگشت بدنداں رہ گئیں۔ وہ صرف علم کی برتری کا اعتراف کرتا ہوا مینارِ نور بن کر کائنات ارضی کے دامن پر ابھرا۔ وہ تحصیل علم کیلئے چین تک سفر کرتا گیا۔ وہ علم پھیلانے کے لیے اصحابِ صفہ سے لے کر بوعلی سینا تک فیاضانہ

سلوک کرتا گیا۔ وہ ہر مسلمان مرد اور عورت کو زیورِ علم سے آراستہ کرتا گیا۔ وہ تسخیرِ کائنات کے دعویٰ کے ساتھ آفتاب و ماہتاب کی بلندیوں کو روندتا گیا۔ وہ طلسمات، سحر، توہمات اور ٹونوں ٹوٹکوں کی دنیا کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے حقائق کی دنیا میں بڑھتا گیا اور علم کے تمام خزانے ڈنکے کی چوٹ سے لٹاتا گیا۔ وہ عرب و عجم، مشرق و مغرب، گورے کالے کے دامن کو علم کی دولت سے بھرتا گیا۔

آپ تھوڑی دیر کیلئے رفتارِ فکر کو روکیے اور غارِ حرا کے اس معلّم برحق کے سامنے سرِ تسلیم جھکا دیجئے جسے وحیِ الٰہی سب سے پہلا لفظ "اقرأ" پہنچا رہی ہے اور تخلیقِ کائنات کا مقصد پڑھنا اور قلم سے لکھنا بتاتی ہے۔ علّم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم کا اعلان کر کے حضرتِ انسان کو ان تمام علوم سے واقف کرنے کا اعلان کرتی ہے جس سے اسے آج تک محروم رکھا گیا تھا۔ وہ انسان کو ان تمام علوم کا عالم بنانے کے پروگرام مرتب کرتی ہے جسے وہ پہلے نہ جانتا تھا۔ اسلام کا یہ اعلان تاریخ انسانی کا سب سے بڑا واقعہ تھا جو صرف اہلِ ایمان کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے علم و فضل کے دروازے کھول دینے کا موجب ہوا۔

غارِ حرا سے نکل کر جب اُمّی لقب عالمِ ماکان و مایکون (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ اور مدینہ کی شہری دنیا کے سامنے آتا ہے تو سب سے اوّلین کام جہالت کے اندھیروں کو دُور کرنے اور علم کی روشنی پھیلانے کا ہوتا ہے۔ علم کی نعمتِ عظمیٰ تقسیم کرنے والا اپنے مدرسہ میں آقا و مولیٰ، عربی و حبشی کے امتیاز کو مٹا کر علم کے دریا بہا دیتا ہے۔ یہ علم انسانی اصلاح کے لیے کیمیا تھا۔ قرآن کی تعلیمات نے انسان کو "علم الانسان ما لم یعلم" کی دولت سے مالامال کر دیا۔ اور "سخر لکم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض جمیعًا منہ" کی بشارت دے کر بے کس انسان کو اوجِ ثریا کی بلندیوں تک پہنچا دیا اور "ربّ زدنی علمًا" کے نعروں کے ساتھ علمی بلندیوں تک لے گیا۔ تعمیرِ انسانیت کے لیے آیاتِ قرآنی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم ایک ایسا نسخۂ کیمیا تھا جس نے جہالت کے زنگ آلود سینے نورِ علم و عرفان سے چمکا دیئے۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

علم اور علماء کی فضیلت

تحصیل علم اور اشاعتِ علم مسلمان قوم کا مقصدِ حیات بنا دیا گیا تو اس کی فضیلت اور علماء کے مقام کو بھی متعین کیا گیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ حدیث بیان کی ہے:

"جو لوگ خدا کے کسی گھر میں جمع ہو کر قرآن کی تعلیم یا مذاکرے میں مشغول ہوتے ہیں تو رحمتِ الٰہی کے فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں۔ ان پر انوارِ خداوندی نازل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب ملائکہ میں ان کا تذکرہ کرتا ہے۔ تلاش علم کے لیے راہ چلنے والوں کے لیے جنت کی راہیں کھول دی جاتی ہیں۔"

حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"اللہ نے مجھے جو علم و ہدایت دی ہے وہ اس تیز بارش کی طرح ہے جو برس کر خشک زمین کو سیراب کر دیتی ہے اور اس مردہ زمین میں ہرا بھرا سبزہ نمودار ہوتا ہے۔ ایک اور زمین پر برسا تو اس میں مخلوقِ خدا کے لیے پانی جمع ہو گیا جس سے مویشی سیراب ہوتے رہے اور مخلوقِ خدا اپنے کھیتوں میں آب پاشی کرتی رہی۔ مگر ایک زمین ایسی بھی تھی جس پر علم و حکمت کی بارش تو ضرور ہوئی مگر نہ سبزہ اگا نہ پانی بھرا۔ پہلے دونوں مقامات ان لوگوں کو ملے جو علم و ہدایت کی روشنی میں عمل کرتے گئے اور انسانیت کو فائدہ پہنچاتے گئے مگر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو علم حاصل کرتے رہے مگر عمل سے فائدہ نہ اٹھایا اور ہدایت سے محروم رہے۔"

زر بن حبیش سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرخ چادر سے ٹیک لگائے مسجد میں تشریف فرما تھے۔ قبیلہ مراد کا ایک شخص صفوان بن عالی حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا:

"یا رسول اللہؐ! میں علم کی تلاش میں حاضر ہوا ہوں۔"

آپؐ نے فرمایا: "مرحبا اے طالب علم! فرشتے طالب علم کو اپنے پروں کے سائے میں لے لیتے ہیں۔ ان کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ نچلے آسمان پر رحمت کے فرشتے بھر جاتے ہیں۔"

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

"میری اُمت کے عالم دو قسم کے ہیں ، ایک وہ جنہیں خدا نے علم بخشا وہ لوگوں کو بے دریغ تقسیم کرتے گئے اور دنیاوی طور پر کچھ حاصل نہ کیا۔ ایسے علماءِ دین کے لیے آسمان کے فرشتے، زمین کے مویشی اور فضا کے پرندے، پانی کی مچھلیاں اور کراماً کاتبین تک خدا کے حضور میں دعا کرتے ہیں ۔ ایک وہ ہیں جو علمِ دین کی اشاعت میں بخل سے کام لیتے رہے اور دنیاوی نفع کے بغیر ایک حرف بھی نہ پڑھایا۔ ان لوگوں کو قیامت کے دن آتشیں لگامیں چڑھا کر پیش کیا جائے گا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"جس نے علم کی جستجو کی اور حاصل کر لیا ، خدا اسے دو حصے ثواب دیتا ہے ، لیکن جس نے صرف تلاشِ علم کی مگر حاصل نہ کر سکا وہ ایک حصہ ثواب کا مستحق ہوگا۔"

حضرت امام یوسفؒ کا بیان ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے والد کے ساتھ حجِ بیت اللہ کو گیا ۔ اس وقت میری عمر سولہ سال تھی ۔ میں نے ایک بوڑھے کو دیکھا جسے لوگ اپنے گھیرے میں لیے کھڑے تھے ۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ کون ہیں ؟ انہوں نے بتایا کہ یہ رسولِ خدا کے صحابی عبداللہ بن الحارث رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں نے التجا کی کہ مجھے اُن کے پاس لے چلیے تاکہ اپنے کانوں سے حضورؐ کی حدیث سُن لوں ۔ میرے والد عوام کی بھیڑ چیرتے ہوئے صحابی کے پاس لے گئے وہ اس وقت بیان کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، جو شخص دینِ الٰہی میں تفقہ کر لیتا ہے خدا اسے فکرِ معاش سے اس طرح سبکدوش کر دیتا ہے کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا۔

حسن راوی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا : "میرے جانشینوں پر خدا کی رحمت ، میرے جانشینوں پر خدا کی رحمت ، میرے جانشینوں پر خدا کی رحمت !" صحابہ نے عرض کیا : یارسول اللہؐ ! آپ کے جانشین کون ہیں ؟ آپ نے فرمایا : "جو میری سنّت سے محبت رکھتے ہیں اور بندگانِ خدا کو تعلیم دیتے ہیں ۔"

حضرت امام ابو حنیفہؒ نے حضرت حماد بن ابراہیمؒ سے "الموازین القسط لیوم القیامۃ" کی تفسیر بیان کی ہے کہ قیامت کے دن آدمی کا عمل ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا وہ اونچا ہو جائے گا۔ پھر بادل جیسی ایک چیز لائی جائے گی اور ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھ دیجائیگی وہ جھک جائے گا تب آدمی سے کہا جائے گا۔ تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ وہ خاموش رہے گا تو اسے بتایا جائے گا کہ یہ تیرے علم کی فضیلت ہے جو بندگانِ خدا کو سکھایا کرتا تھا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے وحی میں فرمایا: "میں علیم ہوں اور ہر صاحبِ علم سے محبت کرتا ہوں۔"

العلم فیہ حیاۃ للمقلوب

کما تحیا البلاد اذا مسہا المطر

دلوں کے لیے علم اس طرح زندگی بخش ہے جس طرح مینہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔

والعلم یجلوا العمی عن قلب صاحبہ

کما یجلی سواد الظلمۃ القمر

علم دل سے جہالت کی بے بصری کو اس طرح زائل کر دیتا ہے جس طرح چاند اندھیرے کو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں گئے تو صحابہ کے دو حلقے دیکھے ایک میں ذکرِ خداوندی کا زور تھا اور دوسرے میں مسائل دین کی تعلیم و تعلم کا آپ نے فرمایا: دونوں حلقے اچھے ہیں مگر یہ لوگ جو علمِ دین سیکھتے ہیں اور بے علموں کو سکھاتے ہیں زیادہ افضل ہیں۔ میں خود بھی معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ علمی حلقہ میں شریک ہو گئے۔

عبداللہ بن ابی جعفر فرمایا کرتے تھے: "علمائِ اسلام دنیا کے لیے روشنی کا مینار ہیں۔ انہی سے وہ نور پھوٹتا ہے جس سے گم راہ ہدایت پاتے ہیں۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے کہ وہ مجلس کیا ہی خوب ہے جس میں علم کی اشاعت اور رحمت کی اُمید کی جاتی ہے۔

خوشا مسجد و مدرسہ خانقاہے

کہ در وے بود قیل و قال محمدؐ

امام زہریؒ فرمایا کرتے تھے کہ "علم سے بہتر کوئی طریقہ نہیں جس سے عبادتِ الٰہی ممکن ہو۔"

حضرت معاذؓ بن جبل کا آخری وقت آیا تو کنیز سے فرمانے لگے: صبح ہوگئی؟ اس نے عرض کیا؛ ابھی نہیں۔ ایک لمحہ چپ رہے پھر فرمایا؛ اب دیکھ۔ کہنے لگی؛ ہاں صبح ہوگئی۔ آپ نے فرمایا، ایسی صبح سے پناہ مانگتا ہوں جو دوزخ کی طرف لے جانے والی ہو۔" پھر کہنے لگے: مرحبا اے موت! اے مہمان مرحبا! جو فاقہ زدہ گھر میں آتا ہے۔ جو کوئی نادم ہوا ہلاک ہوگیا۔ اے اللہ! تو خوب جانتا ہے کہ معاذ دنیا میں رہنے کا مشتاق نہ تھا، نہ باغ لگائے نہ نہریں نکالیں۔ وہ تو بس اسی لیے زندہ تھا کہ دن بھر مشقت سے خدمتِ خلق کرے۔ سارا دن گلا خشک کر دینے والی پیاس برداشت کرے اور علمی حلقوں میں علماء کے ہجوم میں رہا کرے۔ آپ حضورؐ کی ایک حدیث بیان کرتے تھے کہ "عالم زمین پر خدا کا امین ہے۔"

حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے: علم کا ایک باب سیکھنا، اس پر عمل کرنا دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ لڑکوں کو پڑھتے دیکھتے تو فرماتے: "شاباش! تم حکمت کے سرچشمے ہو، تاریکی میں روشنی ہو، تمہارے کپڑے پھٹے پرانے ہیں مگر دامنِ دل تروتازہ ہے۔ تم علم کے مکتبوں میں قید ہو، مگر تم قوم کے مہکنے والے پھولوں کی حیات بخش خوشبو ہو۔"

عبداللہ ابن مبارک روایت کیا کرتے تھے کہ حضرت سلیمان کو اختیار دیا گیا کہ علم لیں یا سلطنت۔ آپ نے دولتِ علم کو ترجیح دی۔ خدا نے ان کو علم بھی دیا اور دولتِ سلطنت بھی۔

حضرت معاذ بن جبلؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی ہے: علم حاصل کرو کیونکہ لوجہ اللہ علم کی تعلیم خشیت ہے۔ علم کی طلب عبادت ہے۔ علم کا مذاکرہ تسبیح، علم کی تلاش جہاد ہے۔ بے علموں کو علم سکھانا صدقہ ہے۔ مستحقوں میں علم پھیلانا تقرب ہے۔ علم حلال و حرام میں تمیز سکھاتا ہے۔ جنت کے راستوں کو روشن کرتا ہے۔ تنہائی کا مونس ہے۔ سفر میں رفیقِ راہ ہے۔ خلوت میں ندیم ہے، راحت و مصیبت کا ساتھی ہے۔ دشمن کے مقابلے کا ہتھیار ہے۔ دوستوں کی مجلس کی زینت ہے۔ علم کی بدولت اللہ تعالیٰ اتنا بلند رتبہ دیتا ہے کہ لوگ صدیوں اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ عالم کی سیرت کو نمونہ بنا دیا جاتا ہے۔ ملائکہ ان کی خدمت پر فخر کرتے ہیں، اپنے پر بچھاتے ہیں، ان کی مغفرت چاہتے ہیں۔ زمین کے

بکرے مکوڑے ، خشکی کے درندے پرندے دُعا کرتے ہیں ۔ جہالت کی موت میں علم دلوں کو زندگی دیتا ہے ۔ تاریکی میں آنکھوں کو روشنی پہنچاتا ہے ، علم میں غور و فکر روزے کے برابر ہے ۔ علم کی مشغولیت قیام فی الصلوٰۃ کے ہم پلّہ ہے ۔ علم سے رشتے استوار ہوتے ہیں ۔ علم عمل کا رہنما ہے عمل علم کا پیروکار ہے ۔ خوش نصیب علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور بدبخت محروم رہتے ہیں ۔

عبدالرزاق راوی ہیں کہ میں نے سفیان ثوریؒ کو ایک عرب سے کہتے سنا ، اے قوم عرب! علم حاصل کرو ورنہ مجھے ڈر ہے کہ علم تم سے نکل کر غیروں میں چلا جائے گا اور تم ذلیل ہو کر رہ جاؤ گے علم حاصل کرو کیونکہ علم دنیا میں بھی عزت اور آخرت میں بھی عزت ہے ۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا ارشاد ہے " سینے میں علم کی مثال یہ ہے جیسے اندھیرے گھر میں چراغ ۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے لڑکوں کو نصیحت کی کہ علم حاصل کرو کیونکہ مال دار ہوئے تو علم تمہارا جمال ہوگا ۔ غریب رہے تو علم تمہارے لیے دولت ثابت ہوگا "

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے : " علم مال سے بہتر ہے ۔ مال کی نگہبانی کرنا پڑتی ہے مگر علم تمہارا نگہبان ہوتا ہے ۔ مال خرچ کرنے سے ختم ہو جاتا ہے مگر علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے ۔ علم حاکم ہے مال محکوم ۔ مالدار چل بسے لیکن علم والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں ۔ علم والوں کے جسم تو مٹ سکتے ہیں مگر ان کے کارنامے تا ابد زندہ رہتے ہیں ۔

رضینا قسمت الجبار فینا　　لنا علم و للجہال مال

فان المال یفنی عنقریب　　فان العلم باق لا یزال

جعفر بن صادق کہا کرتے تھے ان کا اصل کمال تفقہ فی الدین ہے ۔ مصیبت میں ثابت قدمی ہو ، معیشت درست رہے ۔ ابلیس کسی کی موت سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا عالم کی موت سے خوش ہوتا ہے ۔ علماء باران رحمت ہیں جہاں بھی ہوں گے نفع پہنچائیں گے ۔

ابن المقفع نے کہا کہ اگر تمہیں دولت اور طاقت کی وجہ سے عزت ملے تو خوشی کا اظہار نہ کرو ۔ یہ عزت ناپائیدار ہے ۔ ہاں علم یا دین کی وجہ سے عزت ملے تو مسرت کا اظہار کرو ۔ یہ ہمیشہ رہنے والی ہے ۔

لقمان حکیم نے فرمایا : سب سے افضل انسان مومن عالم ہے ، وہ جہاں جاتا ہے ہمیشہ

بھلائی کرتا ہے۔

حجاج بن یوسف نے خالد بن صفوان سے پوچھا: بصرے کا سردار کون ہے؟

خالد نے جواب دیا: حسن!

تعجب کرتے ہوئے حجاج نے کہا: وُہ کیسے! حسن تو غلام کی اولاد ہے۔

خالد نے کہا: حسن اس لیے سردار ہے کہ لوگ اپنے دین میں ان کے محتاج ہیں اور وُہ دنیاداروں کی دولت کے محتاج نہیں۔ میں نے بصرے میں ایسا کوئی شریف آدمی نہیں دیکھا جو حسن کی مجلس میں جانے کی تمنا نہ رکھتا ہو۔ سب ان کا وعظ سنتے ہیں اور وہ علم کا نور بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔

یہ سن کر حجاج پکار اٹھا: "واللہ! یہی سرداری ہے"۔

علم اور عبادتِ الٰہی

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: تھوڑا علم بہت عبادت سے بہتر ہے۔ انسان اگر خدا کی بندگی کرے تو تھوڑا علم بھی کافی ہے۔ تھوڑی جہالت بھی بہت بُری ہے، اگر انسان کو مغرور بنا دے۔ آدمی دو قسم کے ہیں، عالم اور جاہل۔ عالم سے کج بحثی نہ کرو اور جاہل سے گفت گو نہ کرو۔

حضرت انس؄ سے روایت ہے کہ سب سے اچھا دین وُہ ہے جو سب سے آسان اور سب سے بہترین عبادت فقہ (علم) ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا ہی اچھا تحفہ ہے اور کیا ہی عمدہ سوغات ہے۔ علم و حکمت کا ایک بول جسے تم نے سُنا اور یاد کر لیا۔ مسلمان بھائی سے ملے اور سکھا دیا۔ ایسا ایک عمل سال بھر کی عبادت کے برابر ہے۔ حضرت قتادہ؄ فرماتے ہیں، علم کا ایک باب اپنی اصلاح کے لیے حفظ کرنا سال بھر کی عبادت سے افضل ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حزام بن حکیم کو بتایا: تم ایسے زمانے میں ہو جس میں علماء بہت ہیں اور لفاظ کم۔ مانگنے والے تھوڑے ہیں اور دینے والے زیادہ۔ لیکن ایسا زمانہ بھی آئے گا۔ جب علماء کم ہوں گے لفاظ زیادہ ہوں گے۔ دینے والے تھوڑے ہوں گے اور

مانگنے والے زیادہ۔ اس زمانہ میں علم عمل سے بہتر ہو گا۔

قتادہؓ فرماتے ہیں: میرے نزدیک پوری رات علمی مذاکرے میں گزار دینا عبادت میں کھڑے رہنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ فرمایا کرتے تھے: اگر میں ایک رات تھوڑا سا وقت دین میں تفقہ حاصل کروں تو مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ شام سے صبح تک عبادت میں مشغول رہوں۔

امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے، طلبِ علم نمازِ نفل سے افضل ہے۔

سفیان ثوریؒ حدیث نقل کرتے ہیں کہ اگر تم نکلو اور علم کا ایک باب بھی سیکھ لو تو یہ تمہارے لیے سَو رکعت نماز سے بہتر ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز کا ستون ہوتا ہے۔ اس دین کا ستون علم ہے۔ تفقہ فی الدین سے بہتر خدا کی عبادت کسی اور طریقے سے نہیں کی گئی۔ شیطان پر ایک اکیلا عالم ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے: قائم اللیل اور صائم النہار عابد کی موت حلال و حرام میں تمیز کرنے والے عالمِ دین کی موت کے سامنے ہیچ ہے۔

ازدی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جہاد کے بارے پوچھا تو آپ نے فرمایا: آؤ جہاد سے اہم کام بتاؤں۔ مسجد بنا کر علم دین کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو جاؤ۔

موت کے بعد علم کے فوائد

حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ موت انسان کے تمام اعمال منقطع کر دیتی ہے لیکن تین چیزیں موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں۔ صدقہ جاریہ، فیض رساں علم اور نیک اولاد جو مرنے والے کے لیے دُعا کرتی ہے۔

ابوقتادہؓ فرماتے ہیں: حضورؐ نے موت کے بعد تین چیزوں کا ہمیشہ زندہ رہنے کا بتایا اور وہ ہیں: ایسا صدقہ جس کا ثواب جاری و ساری رہتا ہے۔ ایسی نیک اولاد جو اپنے نیک کردار سے والدین کے لیے نیک دعائیں کرتی ہے اور ایسا علم جس کی اشاعت بندگانِ خدا کو نیک اعمال پر آمادہ کرتی ہے۔

کتابی علم اسلام عرب کی سرزمین میں آیا۔ اس وقت عربوں کے ہاں لکھنے کا بہت کم رواج تھا وُہ جو کچھ سُنتے ازبر کر لیتے یا سینہ بسینہ دوسروں تک پہنچاتے۔ زمانۂ جاہلیت کی شاعری کسی کتابی تحریر میں مدوّن نہ تھی بلکہ ہزاروں اشعار نوکِ زبان پر تھے۔ خدا کا کلام نازل ہوا تو ابتداء میں اسے صحابہ یاد کرتے اور قرآن پاک کے کچھ حصّے کسی کو یاد ہوتے اور دوسرے حصے کسی کو۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات (احادیث) بھی نوکِ زبان پر ہوتے۔ مگر علمی دنیا میں ان احکامات کی بڑھتی ہوئی اہمیت اس امر کی متقاضی تھی کہ ان جواہر پاروں کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کو کتابی شکل میں مدوّن کرنے کا اہتمام کرایا کاتبِ وحی مقرر ہوئے اور بڑے اہتمام سے کلام ربّانی کو ضبطِ تحریر میں لایا جانے لگا۔ دربارِ رسالت کے فرامین اور پھر مختلف قبائل و اقوام سے معاہدے تحریری طور پر سامنے آئے۔ کتاب و تحریر اشاعت علوم اسلامیہ کے لیے بڑی ضروری تھی اور اس کے دُوررس نتائج برآمد ہوئے۔

ابتدائی دور میں بعض روایات ایسی ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے علاوہ دُوسری تحریروں کی ممانعت کر دی گئی تھی مگر اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہیں کہ کہیں کلامِ ربانی کو کلام انسانی میں خلط ملط نہ کر دیا جائے لیکن جب اس بات کا اہتمام کر لیا گیا کہ ایسا نہیں ہوگا تو احادیث کو ضبطِ تحریر میں لایا جانے لگا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ قرآن کے بغیر کچھ نہ لکھو۔ جس کسی نے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہو وُہ مٹا ڈالے اسی اہتمام کا نتیجہ تھا۔

ایک دفعہ حضرت زیدؓ حضرت معاویہؓ کے پاس گئے۔ حضرت معاویہؓ نے آپ سے حضورؐ کی ایک حدیث سُنی تو اپنے منشی کو لکھنے کا حکم دیا۔ حضرت زیدؓ نے کہا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث لکھنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ اس حدیث کو مٹا دیا گیا۔

ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے خطبے میں فرمایا کہ قرآن کے علاوہ جو بھی کسی کے پاس ہے مٹا دیا جائے۔

ابونضرہ کہتے ہیں میں نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے عرض کیا: کیا ہم آپ سے جو کچھ سنتے ہیں تحریر لیا کریں، تو آپ نے فرمایا: کیا تم میری گفتگو کو کلامِ ربانی بنانا چاہتے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے یہ باتیں یاد کرنے کا حکم دیا تھا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حدیث کی تدوین کا حکم دیا تھا مگر بعد میں اس خدشہ سے کہ قرآن پاک سے خلط ملط نہ ہو جائے یہ حکم واپس لے لیا۔ غرضیکہ ایسی روایات ہمیں جابجا احادیث میں ملتی ہیں جن میں تحریر و کتابت سے منع فرمایا گیا۔ ان احکامات سے مراد یہ تھی کہ قرآن پاک کو احادیث یا دوسرے اقوال سے خلط ملط ہونے سے روک دیا جائے دوسرے حفظ کی عادت ختم نہ ہو جائے اور لوگ صرف تحریر پر انحصار کر کے نہ بیٹھ جائیں۔ بایں ہمہ ایک زمانہ آیا جب تحریر و کتابت کی اجازت ملی اور تدوین حدیث کا کام ہونے لگا۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ خطبہ کے بعد یمن کا ایک شخص ابوشاہ کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا، یا رسول اللہ! یہ خطبہ مجھے لکھ دیجیے۔ آپ نے صحابہؓ کو حکم دیا: ابوشاہ کو لکھ دو۔ حضرت ابوہریرہؓ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے عبداللہ بن عمرو سے زیادہ کسی کے پاس احادیث نہ تھیں، کیونکہ وُہ لکھا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میری عادت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرمایا کرتے میں لکھ لیا کرتا۔ قریش نے مجھے ایسا کرنے سے روکا اور کہا، بعض اوقات حضورؐ خفا ہوتے ہیں تو میں نے لکھنا موقوف کر دیا۔ کچھ دن بعد میں نے اس بات کا تذکرہ حضورؐ سے کیا تو آپ نے اپنی انگلی منہ کی طرف اٹھاتے ہوئے فرمایا: لکھا کرو۔ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلا۔

حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، علم کو کتاب میں لکھا کرو۔ ضحاک فرمایا کرتے تھے: جب کچھ سنو لکھ لیا کرو۔ اگر کاغذ نہ ملے تو دیوار پر ہی سہی۔

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ سفر میں ہوتا تو وُہ کوئی حدیث بیان کرتے تو میں کجاوے کی لکڑی پر لکھ لیتا، بعد میں گھر پہنچ کر کتاب میں نقل کر لیتا۔ ابوقلابہ فرمایا کرتے: بھول جانے سے لکھ لینا بہتر ہے۔ ابوملیح فرمایا کرتے تھے کہ ہماری تحریر پر اعتراض کرنے والے "علمها عند ربی فی کتاب" پر غور کیوں نہیں کرتے؛

یہ تھے وہ حالات جو اسلام کی ابتدائی زندگی میں درپیش تھے اور یہ تھا آغاز جو آگے چل کر کتابی علوم کی بنیاد بنا اور اس تحریر نے اسلامی احکامات کی اشاعت ساری کائنات تک پہنچا دی۔

معاویہ بن قرہ کا مقولہ ہے: جو شخص لکھتا نہیں اسے عالم ہی نہ سمجھو۔ حضرت حسن بصری رض کا درس تفسیر لوگ لکھ لیا کرتے تھے اور یہ کتابیں صدیوں لوگوں کے لیے مشعلِ راہ رہیں۔ ہشام رض کہتے تھے کہ میرے والد مروہ کی کتابیں یوم حرہ (یزید کے دورِ حکومت کا مشہور واقعہ) میں جل گئی تھیں۔ بعد میں آپ فرمایا کرتے تھے، کاش! اہل وعیال مال ودولت کی بجائے یہ کتابیں محفوظ رہتیں۔ سعید بن ابراہیم نے بیان کیا کہ عمر بن عبدالعزیز نے ہمیں سنن (احادیثِ رسول ﷺ) لکھنے کا حکم دیا۔ اس طرح ہم نے کئی کتابیں تیار کرائیں جو مملکت کے ایک ایک شہر میں بھیج دی گئیں۔

یہ مسلمانوں کا ابتدائی دور تھا۔ اشاعتِ دین کے لیے یہ ان کی محدود کوشش تھی مگر ایک دور آیا کہ دینِ اسلام کی اشاعت مسلمان بادشاہوں نے سرکاری حیثیت سے اپنے ذمہ لے لی اور دفتروں کے دفتر تیار ہوئے، کتب خانے قائم ہوئے اور ان کتابوں کو اکنافِ عالم تک پھیلایا گیا۔ آج جب ہم اسلام کے علمی ورثہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ کتنے باعزم تھے جو لکھنے پر آتے تو دفتروں کے دفتر بھر دیتے۔ امام فخرالدین رازی کی تفسیر کبیر کا مسودہ ایک سو چالیس اونٹوں پر لادا گیا تو آپ رک گئے اور فرمانے لگے: اتنی مبسوط کتاب کون پڑھے گا۔ اختصار کیا تو پھر بھی تفسیر کبیر ہی کہلائی۔ علامہ سرخسی نے مبسوط شریف قید کے کنوئیں میں املا کرائی۔ مگر آج اس کتاب کی تیس ضخیم جلدیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ کیا تھے۔ علامہ سیوطی کی کتابیں، امام غزالی کی نگارشات اور پھر علماءِ عرب وعجم کے وہ ذخائرِ علم جس سے کتاب خانے معمور ہیں مسلمانوں کی تحریری قوت اور کتابی اشاعت دین کے ذوق کا پتہ دیتے ہیں۔ متقدمین میں سے اکثر ایسے علماء گزرے ہیں جن کی کتابیں حدوشمار سے باہر ہیں۔ علامہ ابن جوزی نے وصیت کی تھی کہ لکھتے وقت قلم تراشی کے وہ چھلکے جو ایک گوشے میں محفوظ کر دیا کرتے تھے میرے غسل کا پانی گرم کرنے کے لیے کام میں لائے جائیں۔ ان بزرگوں کی نگارشات کو بعض دفعہ دیکھ کر نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں اتنا بڑا کام کس طرح

سرانجام دیا۔ ہم اسی لیے اسے قلمی کرامت۔ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہمارے اپنے زمانے میں اعلیحضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور ذوقِ تحریر کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بات کتنی حوصلہ افزا ہے کہ آپ نے ایک ہزار علمی کتابیں ترتیب دیں جو علماء اہلسنت کی تربیت علمی کے لیے گرانقدر سرمایہ ہیں۔

علماء سلف اس میدان میں دوسری اقوام کے لیے بھی مقامِ رشک رہے۔ شیخ ابن جوزی نے برسرِ منبر اعلان کیا تھا کہ انہوں نے دو ہزار جلدیں سپردِ قلم کی ہیں۔ حضرت یحیٰی بن معین نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ میں نے اپنے ہاتھ سے چھ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔ امام ابو اسامہ کوفیؒ نے اپنی عمر میں اشعار عرب کا اتنا بڑا ذخیرہ ترتیب دیا کہ اسّی قبائل کے شعراء کا سارا کلام جمع کر دیا۔ پھر ایک ایک قبیلے کا مجموعہ اشعار جمع کرنے کے بعد ایک ایک قرآن پاک کا نسخہ لکھ کر مسجد میں رکھواتے۔ امام طبری نے اپنی عمر میں اوسطاً چالیس ورق روزانہ کے حساب سے احادیث لکھیں۔ قرآن پاک کے کاتبوں کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو ان کے خط کی نفاست آج بھی نظر کو خیرہ کر دیتی ہے۔

تحصیل علم کی اہمیت

تحصیلِ علم کے لیے اسلام نے بڑا زور دیا ہے۔ جنگِ بدر کے وہ قیدی جو فدیہ دینے سے عاجز تھے، مسلمان بچوں کو پڑھانے لکھانے کے صلہ میں آزادی کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔ پھر سرکارِ دو عالمؐ نے تحصیل علم کے مواقع اُمت کے لیے مہیا کیے۔ ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اصحابِ صفہ کے لیے باقاعدہ مکتب ترتیب دیا گیا۔ طالب علموں کو شوق دلایا جاتا۔ پڑھنے پڑھانے والے کو بہترین اُمت قرار دیا جاتا۔ ابو امامہ باہلیؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو لڑکا طلب علم اور عبادات میں نشوونما پاتا ہے اور جوان ہوتا ہے اور اس طرح زندگی بسر کرنے کا عزم کرتا ہے اسے ستر صدیقوں کا ثواب ملتا ہے۔ حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے، بچپن کا تحصیلِ علم پتھر پہ لکیر کی طرح ہوتا ہے۔ حضرت علقمہؓ کہتے ہیں، میں نے کم عمری میں جو کچھ یاد کر لیا وہ میرے ذہن پر اس طرح منقش ہے جیسے ایک کتاب سامنے کھلی ہو۔ حضرت حسنؓ اپنے بچوں اور بھتیجوں کو فرمایا کرتے تھے: آج علم سمیٹ لو، کل تم جوان ہو گے قوم کو اس علم کی ضرورت ہو گی۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ بچوں کو فرمایا کرتے، آؤ آج علم سیکھ لو۔ عنقریب تم قوم کے بڑے لوگوں میں شمار ہونے والے ہو۔ میں جب چھوٹا تھا تو مجھے کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا لیکن بچپن کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ بڑا ہوا تو

ایک ہجوم میرا احترام کرنے کو دوڑتا ہے اور فتویٰ حاصل کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر شرمناک بات کیا ہو سکتی ہے کہ کسی آدمی سے دین کی بات پوچھی جائے تو وہ بغلیں جھانکنے لگے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت میں کم سن تھا۔ میں نے اپنے ایک انصاری دوست کو کہا، چلو ان لاتعداد صحابہ سے جواب موجود ہیں، علم سیکھ لیں جو کام آئے گا۔ انصاری لڑکا کہنے لگا: اتنے جلیل القدر صحابہ کے ہوتے ہوئے ہم کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ چلا گیا لیکن میں تحصیلِ علم کے لیے نکل پڑا۔ بعض اوقات مجھے معلوم ہوتا کہ فلاں صحابی کے پاس ایک حدیث ہے۔ میں دوپہر کو اس کے گھر جاتا وہ قیلولہ (دوپہر کو سونا) فرمارہے ہوتے میں دروازے کے سامنے گرم پتھر پہ سر رکھے گرم ہوا میں پڑا انتظار کرتا رہتا۔ جب وہ صحابی باہر آتا مجھے سراپا انتظار پاکر بڑا متاثر ہوتا اور کہتا، "رسول اللہ کے ابن عم! آپ کیا چاہتے ہیں؟" میں کہتا: سنا ہے آپ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے۔ وہ فرماتے: یہ تکلیف کیوں کی؟ کسی کو بھیج دیتے یا میں خود حاضر ہو جاتا۔ میں عرض کرتا: اس کام کے لیے مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ ایک زمانہ آیا جب صحابۂ رسولؐ رحلت فرما گئے لوگ میرے علم سے فائدہ اٹھانے کے لیے جمع ہو جاتے تو میرا دوست انصاری نہایت حسرت سے کہتا: ابن عباس! تمہارا اندازہ واقعی درست تھا۔ مکحولؒ نے فرمایا کہ بوڑھے آدمی کو نوجوان سے علم حاصل کرتے شرمانا نہیں چاہیے۔

علماءِ اسلام نے اس جذبۂ تحصیلِ علم کی اہمیت کو تاریخ کے نقوش میں نمایاں کیا ہے۔ وہ زمانہ کی بدبختی سے گزرتے گئے مگر تحصیلِ علم کے شوق کی تسکین نہ ہو سکی۔ حوصلہ فرسا حوادث ان کے بلند عزائم کو پست نہ کر سکے۔ علماءِ اسلام کے حالات پر سلک الدرر بڑی جامع کتاب ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے علماء طلبِ علم میں ربع مسکون کو سر کرتے رہے۔ یہ جذبہ انہیں ابتدائی دورِ اسلام کے ان عاشقانِ رسولؐ سے ورثے میں ملا تھا جو مدینہ کی گلیوں میں قرآن و حدیث کے معارف جمع کرنے میں ساری ساری راتیں جاگ کر گزارتے تھے علی ابن الحسن فرماتے ہیں کہ ایک شب نماز کے بعد مسجد سے نکلا تو دروازے پر حضرت عبداللہ بن المبارک نے ایک حدیث کا ذکر چھیڑا تو اس طرح مسجد کے دروازے پر کھڑے کھڑے صبح کی

اذان ہوگئی ۔ ابو عبید بن سلام نے ایک بار اپنے تلامذہ کو بتایا کہ میں نے چالیس برس اپنی کتاب غریب الحدیث کی تصنیف میں صرف کیے ۔ اسی دوران علمائے محدثین سے جو چیزیں ملتیں جمع کرتا جاتا۔ بعض اوقات ایک حدیث کی دریافت سے مجھے اتنی مسرت ہوتی کہ ساری ساری رات فرطِ محبت سے جاگتا رہتا ۔ امام شافعی کے شاگرد مزنی نے پچاس برس تک کتاب الرسالہ کا مطالعہ کیا ۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ ہر بار پڑھا اور نئے نئے فوائد حاصل ہوئے ۔ حکیم ارسطو کی کتاب النفس کا ایک نسخہ حکیم ابو نصر فارابی نے سو مرتبہ پڑھا ۔ ایام طالب علمی میں جب میں نے شیخ الرئیس کی کتاب ما بعد الطبیعیات کا مطالعہ شروع کیا تو مطلقاً میری سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ عبارت از بر ہوگئی لیکن مطالب نہ کھلے ، ذوق فرو نہ ہوا ۔ اتفاقاً عصر کے وقت ایک قدیم کتب فروش کے پاس گیا تو وہاں ایک شخص کتاب مابعد الطبیعیہ کی ایک شرح فروخت کر رہا تھا ، مجھے ترغیب دی کہ میں خرید لوں ۔ چونکہ میں ایک عرصہ اس کتاب پر سر مار چکا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا ۔ اس نے منت کی میں نے تین درہم میں نہایت ارزاں خرید لی ، کھولی ، یہ ابو نصر فارابی کے حواشی تھے ۔ گھر پہنچا ، مطالعہ کیا تو سارے مطالب ذہن نشین ہوگئے اور مشکلیں آسان ہوگئیں ۔

طلب صادق اور تحصیل علم کی ہزاروں مثالیں ہماری کتابوں کے صفحات میں محفوظ ہیں ۔ یہ طلباء علم کس انہماک اور جاں سوزی سے تحصیل علم کے لیے صحرا الصحرا اور در بدر کی ٹھوکریں کھاتے تھے اور دانہ دانہ جمع کر کے خرمنِ علم و فضل کے مالک بنتے تھے ۔ امام رازیؒ فرمایا کرتے تھے : کاش ! میری زندگی میں کھانا کھانے کے اوقات بھی تحصیلِ علم کے لیے وقف ہوتے ۔ وہ فرمایا کرتے تھے :

واللہ انی اتاسف فی الفوات عن اشتغال بالعلم فی وقت الاکل فان الوقت والزمان عزیز۔

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا

نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

حضرت یحییٰ ناقل مؤطا مدینہ منورہ میں ایک روز امام مالکؒ کے درس میں حاضر تھے کہ شور برپا ہوا کہ ہاتھی آیا (غالباً اسلامی فاتحین نے پہلی بار مدینہ کی گلیوں میں ہاتھی کو شرف باریابی بخشا تھا، عربوں کے لیے یہ عجوبہ روزگار تھا۔ سارے طالب علم درس چھوڑ کر بازار میں چلے گئے

صرف یحییٰ بیٹھے رہے ۔امام مالک ؒ نے فرمایا: تمہارے اندلس میں ہاتھی نہیں ہوتا تم بھی دیکھ آؤ۔
آپ نے عرض کیا: میں ہاتھی دیکھنے نہیں آیا علم سیکھنے آیا ہوں۔

بہ بست دیدۂ مجنوں ز خویش و بیگانہ
چہ آشنا نگہے بود چشمِ لیلیٰ را

یہ تھا وہ ذوقِ علم جس نے ہمارے اسلاف کو اوجِ ثریا تک پہنچا دیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے تجسس علمی اور ذوقِ مطالعہ کا اندازہ ان کے خود گفتہ حالات سے لگائیے:
"بچپن ہی سے مجھے معلوم نہیں کہ کھیل کود کیا ہوتا ہے اور خواب و راحت کس چیز کا نام ہے۔

شبِ خواب چہ و سکون کدام است
خود خواب بعاشقاں حرام است

شوقِ علم و عمل میں کبھی وقت پر کھانا نہ کھایا اور کبھی سیر ہو کر نہ سویا۔ موسم سرما کی یخ بستہ ہوائیں اور گرما کی تیز دھوپ تحصیلِ علم میں حائل نہ ہوئیں۔ بعض اوقات پڑھتے پڑھتے رات آدھی سے زیادہ ڈھل جاتی تو والد کی آواز آتی: بیٹا! کیا کر رہے ہو؟ میں لیٹ کر جواب دیتا: سونے لگا ہوں۔ پھر اٹھ کر پڑھنے لگتا۔ بسا اوقات چراغ کی لَو سے میری پگڑی اور پیشانی کے بال جل جاتے مجھے اس وقت پتہ چلتا جب گرمی میرے دماغ کو محسوس ہوتی۔

چہ دودہائے چراغ کز دماغ نہ رفت ‎ ‎ کدام بادۂ محنت کہ در ایاغ نہ رفت
کدام خواب، چہ آسایش و کجا آرام ‎ ‎ چہ خار خار کہ در بستر فراغ نہ رفت
بحیرتم ز دلِ خود کہ عمر رفت و لے ‎ ‎ زکنج غمکدہ ہرگز بصحن باغ نہ رفت

ان بزرگوں نے تحصیلِ علم کو زمانۂ طالب علمی تک ہی محدود نہیں رکھا، اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور مہد سے لحد تک ذوقِ علم کی تکمیل میں رہے۔ حضرت جابرؓ نے حضورؐ کی ایک حدیث روایت کی کہ تحصیلِ علم میں جو شخص مر جاتا ہے انبیاء کا صرف ایک درجہ نبوت اس سے بلند ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ "دو حریص ایسے ہیں جن کا پیمانۂ تحصیل کبھی پُر نہیں ہوتا۔ ایک دنیا دار اور دوسرا علم کا طالب"۔ حضورؐ نے فرمایا: طالب علم طالبِ علم میں

جان دیتا ہے تو شہید ہوگا۔"

عبداللہ بن مبارک سے لوگوں نے پوچھا: آپ کب تک پڑھتے رہیں گے؟ فرمایا: موت تک۔ سفیان بن عیینہ سے پوچھا گیا کہ علم کی سب سے زیادہ کسے ضرورت ہے؟ فرمایا: جو سب سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ ابن ابی غسان فرمایا کرتے تھے انسان اس وقت تک عالم ہے جب تک طالب علم ہے۔ طالب علمی کو خیرباد کہنے والا جہالت کو دعوت دیتا ہے۔ حضرت ابن عباس رض فرمایا کرتے تھے کہ میں تحصیل علم کے لیے کئی کئی گرم دوپہریں انصاری صحابہ کے دروازے کے سامنے پڑا رہتا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ کو اس بات کا احساس تھا کہ وُہ بہت روایتیں کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے مہاجر بھائی خرید و فروخت میں مشغول رہتے۔ انصار کھیتی باڑی سے فرصت نہ پاتے۔ میں اپنا پیٹ پالنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتا۔ وہ ارشادات میری جھولی میں آتے جس سے دُوسرے محروم تھے۔ سحنونؒ کا قول کتنا گرانقدر ہے" علم اسے راس نہیں آتا جو پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہے۔"

امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے: "طلبِ علم کے لیے تنگ دستی، خاکساری اور احترام بڑا ضروری ہے۔"

حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے: "علم حاصل کرو اور علم سے گفتگو کرو تاکہ لوگوں میں اپنا مقام متعین کر سکو۔"

اشاعت علم

مسلمانوں نے جہاں تحصیلِ علم کے لیے دشت و صحرا چھان مارے تھے۔ وُہ اشاعتِ علم میں بخیل نہ تھے۔ اپنے بیگانے، گورے کالے، مقیم و مسافر یکساں ان کے خزانے سے علم کے موتی اٹھاتے اور مختلف ممالک کو لے جاتے، حتّٰی کہ اسلامی ممالک کی وسعت کے ساتھ علماء اسلام نے خود دور دراز کے سفر اختیار کیے اور لوگوں میں علم کا نور برسایا۔

حضور علیہ السلام کی حدیث حضرت زید بن حارث کی زبانی سُنیے "خدا اسے سُرخرو کرے جس نے ہم سے کوئی بات سُنی، یاد رکھی، دوسروں کو پہنچائی۔"

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ منٰی کا خطبہ دیتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: دیکھو! جو حاضر ہیں غیر حاضروں کو سب پہنچا دیں۔ کیا عجب جنہیں پہنچاؤ گے وہ زیادہ سمجھدار ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا: خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جو ایک دو فرض سیکھتا ہے، عمل کرتا ہے، ایسے لوگوں کو سکھاتا ہے جو اس پر عمل کریں۔

حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے: میرے نزدیک اس سے زیادہ کوئی عبادت نہیں کہ علم کی اشاعت کی جائے۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص علم حاصل کرتا ہے مگر اشاعت نہیں کرتا وہ ایسا ہی ہے جو خزانہ حاصل کر کے خرچ نہیں کرتا۔

حضرت امام مالکؒ شاگردوں کو الوداعی پیغام دیا کرتے تھے کہ خدا سے ڈرو۔ علم سکھاؤ، اس کی اشاعت کرو اور کسی سے کوئی مسئلہ نہ چھپاؤ۔ حسن بصریؒ علم کی اشاعت کو بہترین صدقہ قرار دیتے ہیں۔ حدیث پاک میں ہے کہ قیامت کے دن علماؑ سے علم کی اشاعت کے بارے میں ایسا ہی سوال ہوگا جس طرح انبیاؑ سے تبلیغِ رسالت کے متعلق ہوگا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا: لوگو! آؤ تمہیں مَیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ سخی کون ہے۔ سب سے زیادہ سخی اللہ تعالیٰ ہے۔ انسانوں میں مجھے سخی بنایا گیا ہے مگر میرے بعد سب سے زیادہ سخی وُہ ہے جو علم دین سیکھ کر لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمان جاری کیا تھا کہ فقہاء اور علماء کو حکم دیا جائے کہ وُہ اپنی مجالس، مساجد میں علم کی اشاعت کریں۔

یہ تھا وُہ پروگرام جو مدینہ پاک کی درگاہ نے اپنے شاگردوں کے سامنے رکھا۔ اسی پروگرام پر چل کر علماء ربانی نے کائناتِ ارضی کے گوشہ گوشہ میں اشاعتِ علم کی۔ ایشیا، افریقہ، عرب وعجم کے شہروں کو علمی درسگاہوں سے معمور کر دیا اور لوگوں کے سینوں کو علم سے منوّر کرتے رہتے، اندلس کی اسلامی یونیورسٹیاں افریقہ اور یورپ میں علم پھیلاتی گئیں۔ مصر کی درسگاہیں مشرقِ وسطیٰ میں اشاعتِ علم کرتی رہیں۔ بغداد اور بخارا کے مدارس سارے ایشیا اور روس کو علمی دولتوں سے مالا مال کرتے رہتے۔

مشہور مورخ گبن نے مسلمانوں کی اشاعت علم و فضل کا بڑے عمدہ الفاظ میں اعترافِ کمال کیا ہے۔ وُہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے علم کی اشاعت کا اتنا مربُوط اور جامع انتظام کر رکھا تھا

کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ صوبوں کے خود مختار امراء بھی علم و ہنر کی سرپرستی سے دست کش نہ ہوتے۔ ان کی رقیبانہ مسابقت بسا اوقات اشاعتِ علم کے لیے بڑی مفید ثابت ہوتی۔ اگر ایک شہنشاہ اہلِ علم کو نوازتا تو دوسرا علمی درسگاہوں کی سرپرستی کر کے بازی لے جاتا۔ اس طرح ان لوگوں نے علم کے نور کو سمرقند و بخارا سے لے کر قرطبہ تک پھیلا دیا۔ ایک بادشاہ کے وزیر نے ایک لاکھ اشرفیاں اس لیے وقف کر دی تھیں کہ بغداد میں ایک دار العلوم قائم کیا جائے جو سارے ایشیا کے لیے قابلِ رشک ہو۔ تعلیم کے فیضان سے عوام و خواص کو یکساں بہرہ اندوز ہونے کا موقعہ ملتا۔ ایک وزیر کا بیٹا ایک غریب کفش دوز (موچی) کے بیٹے کے پہلو میں بیٹھا علوم و فنون سے جھولی بھرتا۔ ایک ایک دار العلوم میں چھ چھ ہزار طلباء بیک وقت پڑھتے۔ اساتذہ کو تنخواہیں اور نادار طلباء کو وظائف ملتے۔

فرانسیسی مورخ لیبان "تمدنِ عرب" میں لکھتے ہیں کہ یورپ کی یونیورسٹیاں چھ سو برس تک عربی کتابوں کے تراجم پر زندہ رہیں اور عربوں کے قائم کردہ مدارس سے علم و فضل سے بہرہ ور ہوتی رہیں۔ اس وقت کے اسلامی ممالک کے مدارس کا شمار حدِ حساب سے باہر ہے اور علم کی اشاعت کے ادارے ہر شہر اور قصبہ میں کام کر رہے تھے۔ یہ اسلام کی علمی اشاعت کے زندہ نشان تھے۔

نظامیہ نوریہ مستنصریہ نفیسیہ ستیہ اور صاحبیہ
رواحیہ عزیہ اور قاہریہ عزیزیہ زینفیہ اور ناصریہ
یہ کالج تھے مرکز سب آفاقیوں کے
حجازی و کردی و قبچاقیوں کے

علمی مذاکرات

بحث و تکرار اور علمی مذاکرات تحصیلِ علم کے لیے ضروری سمجھے گئے ہیں۔ ان مذاکرات کی اہمیت ہر دور اور ہر زمانے میں محسوس کی گئی ہے اور اسلامی ماہرینِ تعلیم نے اس پر عمل کر کے اس فن کو وسعت دی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ جہالت کا علاج سوال ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان انصار عورتوں کی تعریف کیا کرتی تھیں جو مسائل پوچھنے میں کسی شرم و حجاب کو حائل نہیں ہونے دیا کرتی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے : " علم تلاش سے بڑھتا ہے اور سوال سے حاصل ہوتا ہے۔"

ابن شہاب کا منقولہ ہے : " علم خزانہ ہے اور سوال اس کی کنجی ہے۔"

خلیل بن احمد کہا کرتے تھے کہ ثواب کے لیے نہیں تو اسی خیال سے لوگوں کو تعلیم دو کہ خود تمہارا علم تازہ رہے۔ کثرتِ سوال سے اکتاؤ نہیں کیونکہ اس طرح تم پر علم کے نئے نئے دروازے کھل جائیں گے۔"

اصمعی سے پوچھا گیا کہ آپ نے علم کس طرح سیکھا تو اس نے بتایا : " مسلسل سوال اور ایک ایک لفظ پر غور و فکر کرنے سے۔"

عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ " میں جن باتوں کے سوال سے شرماتا رہا ، بڑھاپے میں اپنے آپ کو ان باتوں میں جاہل پایا۔"

حضرت حسن بصری فرمایا کرتے تھے : " جو علم میں شرماتا ہے اس کا علم حقیر رہ جاتا ہے۔"

ابراہیم بن مہدی کا منقولہ ہے : " بے وقوفوں کی طرح سوال کرو اور عقلمندوں کی طرح یاد رکھو۔"

بزرگانِ دین کے یہ اقوال آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ طالب علموں کے لیے خصوصی طور پر یہ اقوال مشعل راہ کا کام دیں گے۔ ان ماہرینِ تعلیم نے اپنے تجربات کی روشنی میں ان نصائح کو ہماری راہنمائی کے لیے بیان کیا تھا۔ یہی وہ رائیں تھیں جن پر چل کر ہمارے اسلاف علم و فضل کے روشن مینار کہلائے۔ ذوقِ طلب علم اور تجسس نے انہیں اونٹ کی ساربانی اور بکریوں کی گلہ بانی سے اٹھا کر دنیا کا معلم بنا دیا تھا۔

طلبِ علم میں سفر

تحصیلِ علم کے لیے سفر کو جو اہمیت حاصل ہے شاید ہی کسی دوسری چیز کو ہو۔ اسلام نے علم کی تحصیل کے لیے نہ صرف نصیحت کی بلکہ سفر کو لازم بنا دیا۔ وہ مشرق و مغرب کے سفر کی ہدایت کرتا ہے اور علم کی طلب کے لیے دیوارِ چین تک کا سفر کرنا پڑے تو ضروری ہے۔ ایک شخص مدینہ سے چل کر حضرت ابوالدرداؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دمشق پہنچا۔ ایک حدیث کی تعلیم لی۔ ابوالدرداؓ نے سوال کیا : کیا آپ تجارت یا

کسی دُوسرے کام کے لیے دمشق آئے تھے۔ اس نے کہا، میں نے صرف طلبِ حدیث کے لیے سفر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: تمہیں مبارک ہو میں نے نبی علیہ السلام سے سُنا ہے کہ جو شخص تلاش علم کے لیے سفر کرتا ہے فرشتے اس کے راستے میں پَر بچھا دیتے ہیں۔ جنت کی راہیں کھول دی جاتی ہیں اس کے لیے آسمان و زمین کی ساری مخلوق مغفرت مانگتی ہے۔ عالم عابد پر وہی فوقیت رکھتا ہے جو بدرِ منیر تمام ستاروں پر۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں کیونکہ انبیاؑ نے درہم و دینار نہیں چھوڑے بلکہ صرف علم چھوڑا ہے جس کی تلاش میں ایک عالم سفر کرتا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ سے صرف اس لیے شام کا سفر کیا کہ مجھے معلوم ہوا کہ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی عبداللہ بن انیس انصاری نے ایک حدیث خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی تھی۔ میں ایک ماہ کی مسافت طے کر کے ان کے ہاں پہنچا۔ دروازے پر اونٹ بٹھایا، گھر میں خبر دی اور خادم کو کہا کہ جابر آپ کی چوکھٹ پر کھڑا ہے۔ خادم نے لوٹ کر دریافت کیا کہ میرے آقا پُوچھتے ہیں آپ جابر بن عبداللہ ہیں؟ میں نے کہا: ہاں۔ یہ سنتے ہی حضرت عبداللہ بن انیس گھر سے باہر آئے، معانقہ کیا اور طلبِ حدیث کے لیے سفر کرنے پر خوشخبری دی۔ پھر وُہ طویل حدیث بیان کی جو انہوں نے اپنے کانوں سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی تھی۔

حضرت ایوب انصاریؓ نے مدینہ سے مصر کا سفر صرف اس لیے کیا کہ حضرت عقبہ بن عامر سے ایک حدیث سُنیں۔ وہاں پہنچے تو کہنے لگے: میں مدینہ سے مصر اس حدیث کو سُننے کے لیے آیا ہوں جو آپ کے بغیر کسی نے نہ سُنی تھی۔ حدیث سنتے ہی حضرت ایوب انصاریؓ اُونٹ پر سوار ہُوئے اور مدینہ کو روانہ ہو گئے۔

سعید بن مسیّب ایک ایک حدیث کے لیے کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں سفر کرتے۔

شعبی کہتے ہیں کہ طلبِ حدیث میں مسروق سے بڑھ کر میں نے کسی کو سفر کرتے نہیں دیکھا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جو کوئی طلبِ علم کے لیے اپنے گھر سے نکلتا ہے فرشتے اس کے لیے دُعا کرتے ہیں۔ اس کی معیشت میں برکت ہوتی ہے، اس کا رزق گھٹتا نہیں بلکہ برکت سے معمور ہو جاتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث بیان کی ہے کہ طلبِ علم میں نکلنے والا جہاد فی سبیل اللہ میں شمار ہوتا ہے۔

شعبی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شام کے آخر سے چل کر یمن کی آخری سرحد تک محض اس لیے سفر کرے کہ وہ حکمت کا ایک قول حاصل کر لے تو میرے نزدیک اس کا سفر مبارک ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں: جو کوئی علم کے سفر کو جہاد نہیں سمجھتا اس کی عقل میں نقص ہے۔

ان احادیث و اقوال نے مسلمانوں کو تحصیلِ علم کے لیے سفر اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ وُہ علم کو اپنا کھویا ہُوا مال سمجھ کر دُور دراز ممالک میں پہنچتے اور علم و دانش سے دامنِ مراد بھر کر لوٹتے۔ مسلمان سیّاحوں کے کارنامے تاریخ کے صفحات میں درخشاں نظر آتے ہیں۔

طلبِ علم میں مشکلات

طلبِ علم میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتیں مگر علم کی لگن والے ان مشکلات اور ریاضت کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں مگر گوہرِ مراد سے دامن بھرنے سے باز نہیں آتے۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ جس کے پاس علم ہے اور وہ مزید طلبِ علم سے بے پروا ہو گیا ہے وُہ ایک جاندار پتھر بن گیا ہے۔

حضرت جابرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی ہے، تقویٰ کی ایک کان یہ بھی ہے کہ جو علم تمہارے پاس ہے اس کی روشنی میں مزید علم حاصل کرنے کی جدّ و جہد کرو۔ جو شخص علم میں اضافہ نہیں کرتا اس کے علم میں نقص ہے۔ مزید علم کی خواہش نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔

حضرت جابرؓ نے ایک اور جگہ بیان کیا کہ تحصیلِ علم میں مر جانے والا انبیاء کے مراتب سے صرف ایک رُتبہ کم رکھتا ہے۔

حضرت عیسٰی علیہ السّلام سے دریافت کیا گیا کہ علم کب تک حاصل کرنا ضروری ہے؟ آپ نے فرمایا: موت کے دروازے تک۔

حضرت امام شافعیؒ نے تحصیلِ علم کے سلسلے میں اپنی مشکلات بیان کرتے ہُوئے

فرمایا تھا: میں یتیم بچہ تھا، ماں نے مکتب میں بھیجا۔ گھر میں کھانے کے لیے بقدرِ ضرورت ہی تھا۔ ختمِ قرآن کے بعد مسجد میں علماء کے حلقہ میں بیٹھتا۔ کوئی حدیث یا مسئلہ سُنتا تو یاد کر لیتا۔ غربت کی وجہ سے میں کاغذ خریدنے سے قاصر تھا۔ مجبوراً چکنی ہڈیاں تلاش کر لیتا، صاف کر کے ان پر کچھ لکھ لیتا۔ جب یہ ہڈیاں تحریر سے بھر جائیں تو دُوسری ہڈیوں کی تلاش میں نکل پڑتا۔ اس طرح لکھی ہُوئی ہڈیوں کو اپنے گھر کے ایک کونہ میں نہایت احتیاط سے محفوظ کر لیتا۔ ایک عرصہ تک میری ابتدائی تعلیم ہوتی رہی۔ اتفاقاً ایک بار یمن کا گورنر مکّہ میں آیا بعض رُوسا نے میری ملازمت کی سفارش کی۔ وہ راضی تو ہو گیا مگر میرے پاس ایسا لباس نہ تھا کہ میں چند روز کے لیے بھی ملازمت پر ٹھہر سکتا تاہم گورنر کے قافلے کے ساتھ چل پڑا۔ والدہ کے پاس ایک چادر تھی جو گِروی رکھ کر مجھے معمولی سے کپڑے بنا دیئے۔ یمن میں گورنر نے مجھے ایک کام سونپا جو میں نے بڑی احتیاط سے سرانجام دیا۔ لوگوں نے بڑی تعریف کی اور مجھے ترقی ملی۔ اس طرح میری محنت اور تگ و دو مجھے ترقی کے زینہ پر لے گئی۔ دُوسرے سال گورنر مکّے گئے تو وہاں میری بڑی تعریف کی گئی اس طرح میری شہرت سارے عرب میں پھیل گئی۔ دوسرے سال میں مکّہ آیا تو ابن ابی یحیٰی سے ملا، وُہ مجھ پر برسے کہ تم لوگ ہمارے حلقہ میں بیٹھتے ہو مگر موقعہ پا کر نکل بھاگتے ہو"۔ سفیان بن عتبہ ملے تو انہوں نے بڑی مسرّت کا اظہار کیا اور نئے منصب پر مبارکباد دی اور ساتھ ہی فرمایا: "اگرچہ تم حقوق العباد ادا کر کے آئے ہو مگر اب واپس نہ جانا۔" اس نصیحت نے ابن ابی یحیٰی کی سرزنش سے زیادہ اثر کیا۔

امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے محمد بن حسن سے ایک اُونٹ کا بوجھ علم حاصل کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ انسان علم سے اپنا رتبہ قائم کرتا ہے لہذا علمی گفتگو کرو تاکہ تمہارا رتبہ منفرد ہو۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "علم سے مومن کو کبھی سیری نہیں ہوتی۔ وُہ تمام زندگی علم حاصل کرتے رہتا ہے حتّٰی کہ جنّت میں جا پہنچتا ہے"۔

یہ تھے وُہ اشارے جن سے علمی فضیلت اور تحصیلِ علم کی ترغیب ملتی ہے۔ ان اشاروں سے

اسلاف نے علم کی بے بہا دولت کو سمیٹا اور پھر دنیا میں بانٹا۔

ابوالاحوص نے ایک روایت بیان کی ہے کہ انسان عالم بن کر پیدا نہیں ہوتا بلکہ علم سیکھ کر عالم بنتا ہے۔

ابن شبیب کا مقولہ ہے کہ تربیت سے مزاج میں تبدیلی تو آسکتی ہے مگر تلاش کے بغیر علم نہیں مل سکتا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرمایا کرتے تھے: علم ایک گمشدہ مال ہے جہاں سے ملے اٹھالو اگر کسی مشرک کے پاس علم ہو تو حاصل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرو۔ آپس میں جب بھی ملو علمی مذاکرات کرو ورنہ علم ناپید ہو جائے گا۔

حضرت علقمہؓ مذاکرات علمی کو بڑی اہمیت دیا کرتے تھے وُہ فرمایا کرتے تھے، حدیث میں متواتر مذاکرات کرو اس سے علم کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

اسمٰعیل بن رجاء مکتب کے بچّوں کو حدیث سنایا کرتے تھے تاکہ بھُول نہ جائیں۔

اصمعی سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کا علم کیونکر محفوظ رہا حالانکہ آپ کے سارے ساتھی علم بھُول گئے۔ آپ نے فرمایا: اشاعتِ علم سے علم ہمیشہ رہتا ہے۔

عون بن عبداللہ حضرت ام الدرداءؓ کی خدمت میں دیر تک احادیث سُننے رہے۔ دیر ہوگئی تو کہنے لگے شاید آپ اکتا گئی ہیں۔ ام الدرداءؓ نے فرمایا: مجھے عبادت بڑی پسند ہے مگر جب علمی مذاکرہ ہو تو میں اسے عبادت پر ترجیح دیتی ہُوں۔

قرّاءؓ کا قول ہے کہ مجھے دو آدمیوں پر بڑا ترس آتا ہے: ایک وُہ جو علم حاصل کرنا چاہے تو حاصل نہیں کرسکتا اور ایک وُہ جو سمجھ تو سکتا ہے مگر علم حاصل نہیں کرتا۔

جالینوس سے لوگوں نے ان کے عالم ہونے کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا: میرے ساتھی شراب پر خرچ کرتے رہے اور میں چراغ میں تیل جلا کر کتب بینی میں لگا رہا۔

بزرجمہر سے پُوچھا گیا، آپ کے عالم ہونے کی وجہ کیا ہے؟ بتایا: کوّے کی طرح علی الصبح اٹھنا، گدھے کی طرح ریاضت و محنت کرنا اور چیونٹی کی طرح حریص بن کر تحصیلِ علم کرتے رہنا۔

نااہل افراد کو تعلیم کے نقصانات

علم نے جہاں عالی دماغ انسانوں کو ذرہ سے آفتاب بنایا ہے وہ نااہل اور ناقص دماغ لوگوں کے لیے وبالِ جان بن گیا۔ اسی لیے علمائے دین نے ناقدرشناسی علم پر بڑا تاسف کیا ہے۔

شعبہ کہتے ہیں کہ میں ایک دن ناقدرشناس لوگوں کے مجمع میں کھڑا احادیث سنا رہا تھا تو اعمش قریب سے گزرے اور فرمانے لگے: "شعبہ! خنزیروں کے گلے میں موتی لٹکا رہے ہو۔"

حضرت عیسٰی علیہ السلام کا ارشاد ہے: حکمت کو اہل سے روک نہ رکھو مگر نااہل کے سامنے پیش نہ کرو۔ ایک مہربان طبیب کی طرح علم کا استعمال کرو جو وہاں ہی استعمال کرتا ہے جہاں مفید ہو۔

امام شافعیؒ کا کتنا عمدہ شعر ہے ؎

انثر درًا بین سائمۃ النعم
ام انظمہ نظما لمھلمۃ الغنم

کیا میں چوپاؤں میں موتی بکھیروں اور جانوروں کے لیے ہار گوندھنے لگوں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے ہیں: علم کی بھی قیمت ہوتی ہے۔ لوگوں نے پوچھا: علم کی قیمت کیا ہے؟ جواب دیا: قیمت یہ ہے کہ علم ایسے آدمی کے سپرد کیا جائے جو اس کی حفاظت کر سکے اور اسے ضائع نہ کرے۔

حضرت عیسٰی فرمایا کرتے تھے: سُوروں کے آگے موتی نہ ڈالو۔ جسے طلب نہیں اسے حکمت نہ دو۔ حکمت موتی سے زیادہ قیمتی ہے جسے حکمت کی قدر نہیں وُہ سُور سے بدتر ہے۔

امام زہری نے علم پر بربادیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ سب سے بڑی بربادی یہ ہے کہ عالم کو ناقدری سے نظرانداز کر دیا جائے اور عالم اپنا علم سینے میں لے کر مر جائے۔ علم میں جھوٹ کی آمیزش بھی علم کی تباہی کا باعث ہُوا کرتی ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں: "مذاکرہ نہ کرنے سے علم ختم ہو جاتا ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بھائی عیسٰی نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ لوگو! نااہل کو حکمت نہ دو۔ یہ علم و حکمت پر ظلم ہوگا۔ اور اہل افراد سے حکمت کو روک نہ رکھو یہ

علم پر ظلم ہوگا۔

بعض اوقات طالب علم اپنے استاد یا بڑے عالمِ دین سے رعب اور شرم کی وجہ سے سوال کرنے سے رُک جاتے ہیں۔ یہ بات بھی علم کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ دو سال تک ارادہ کرتے رہے کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث دریافت کریں مگر ان کے رُعب و جلال سے دریافت نہ کر سکے۔ ایک دن ہمت کر کے حج کے موقعہ پر حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش ہو کر عرض کیا: امیر المومنینؓ! دو سال سے ایک حدیث کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں مگر آپ کا رُعب آڑے آیا۔ آپؓ نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو، جو کچھ پوچھنا ہو بلا جھجک پوچھ لیا کرو اس طرح علم رُک جاتا ہے۔ مجھے اگر معلوم ہوا تو بتا دوں گا ورنہ معذرت کر دوں گا تاکہ تم کسی اور سے دریافت کر سکو۔

اسی طرح حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ میں نے سعید بن مالک سے کہا: آپ سے کچھ دریافت کرنا ہے مگر آپ کا رعب و جلال سامنے آتا ہے۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا: "بھائی جلال سے نہ ڈرو۔ جو کچھ پوچھنا ہو بلا جھجک دریافت کر لیا کرو۔" چنانچہ حضرت سعید نے حدیث دریافت کر لی۔

علم کی عام بخشش مسلمانوں نے علم کو عام کرنے کے لیے باقاعدہ نظام قائم کیا۔ انہوں نے علم کو عوام الناس میں عام کرنے کے لیے بڑے اہتمام کیے اور اسے کسی خاص طبقے یا ملک کے لیے محدود نہیں رہنے دیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ علم سیکھو اور علم سکھاؤ۔ اس میں کسی قسم کا امتیاز برقرار نہ رکھو۔

حضرت جابر راوی ہیں کہ حضور اکرمؐ نے یوم النحر میں فرمایا: "مجھ سے اپنے مناسک سیکھ لو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس حج کے بعد دوسرے حج پر نہ آ سکوں۔"

خالد بن عرعرہ کہا کرتے تھے کہ حضرت علیؓ کو میں نے فرماتے سُنا: کوئی ہے جو مجھ سے کچھ دریافت کرے، خود نفع اٹھائے اور دوسروں تک پہنچائے۔"

سعید بن جبیر فرمایا کرتے تھے، "مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ لوگ میرا علم حاصل کرتے ہیں۔"

حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے : "واللہ! اگر یہ طالب علم میرے پاس آنا چھوڑ دیں تو میں خود ان کے پاس جا کر علم کے نور کو پہنچاؤں گا۔"

حضرت امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر میں لوگوں کو علم گھول کر پلا سکتا تو ضرور پلاتا۔"

ایک شخص نے حضرت سفیان ثوری کو یہ کہتے سنا کہ جو لوگ بغیر نیت اور کسی مقصد کے علم حاصل کرتے ہیں انہیں علم نہیں سکھانا چاہیے۔ آپ نے فرمایا : "علم حاصل کرنا ہی نیت اور مقصد ہے۔"

حضرت فضیل نے خاموشی کو علم کا پہلا زینہ قرار دیا۔ تو پوری توجہ، پھر عمل اور پھر اشاعت عام کا حکم دیا ہے۔ عبداللہ بن مبارک نے تحصیلِ علم کے لیے نیت، توجہ، فہم و فراست، حفظ عمل اور پھر اشاعتِ علم کو ضروری قرار دیا ہے۔

حضرت موسیٰ بن عبیدہ خاقانی کے یہ شعر کتنے عمدہ ہیں :

علم العلم من اتاك العلم
واغتنم ماجيت منه الدعأ

جو کوئی آئے اسے اپنے علم سے حصہ دو اور زندگی بھر کے لیے اس سے دعا لو۔

وليكن عندك الفقير اذا ما
طلب العلم و الغني سواء

امیر طالب علم اور غریب طالب علم دونوں تمہاری نگاہ میں برابر ہوں۔

میمون بن مہران کا قول ہے کہ علم حاصل کرتے وقت عالم سے حجت نہ کرو کیونکہ یہ چشمہ رُک جائے گا۔ علم پھیلاتے وقت جاہل سے حجت نہ کرو۔ اس طرح تمہارے سینے پر بوجھ بن جائیگا۔

حضرت مسلم فرمایا کرتے تھے : "عالم سے اتنے سوال نہ کرو کہ وہ تنگ آجائے۔ اور اسے اتنے جواب دینے پر مجبور نہ کرو کہ اپنی لاعلمی کے اعتراف سے شرماتا پھرے۔ اس کی عیب جوئی نہ کرو۔ جب تک وہ امرِ الٰہی پہنچاتا ہے، اس کی عزت کرو، اس کے آگے نہ بیٹھو اور جہاں تک ہو سکے اس کا احترام کرو۔"

حضرت حسین نے اپنے صاحبزادے کو نصیحت کی کہ علماء کی مجلس میں خود بولنے کی بجائے سیکھنے کی کوشش کرو۔ حسنِ سکوت کے ساتھ ساتھ حسن سماعت کا مظاہرہ کرو۔ کسی کی بات کو

کاٹنے کی عادت نہ ڈالو۔

شعبی کا قول ہے کہ اہل علم کی ہم نشینی کرو۔ وُہ تمہاری اچھائیوں کا اعتراف کریں گے برائیوں سے درگزر کریں گے۔ غلطی کو معاف کریں گے۔ بے عقلی کی بات پر علم کی بات سکھائیں گے اور شہادت کا موقعہ آئے گا تو فائدہ پہنچائیں گے۔

خلیل بن احمد کا قول ہے کہ تعلیم دینے کو اپنے لیے درس سمجھو۔ شاگردوں سے علمی مذاکرات کرو۔ معلومات بڑھانے کے لیے علم سیکھتے جاؤ اور حفظ کے معاملہ میں اعتدال سے کام لو۔ مشہور عربی مقولہ ہے: "عالم بننا ہو تو ایک فن میں کمال حاصل کرو، ادیب بننا ہو تو ہر فن سے موتی چن کر اکٹھے کر لو۔"

ابو عبید قاسم بن سلام نے کہا کہ زیادہ علوم جاننے والوں کو میں نے مناظرہ میں ہمیشہ شکست دی مگر ایک فن والا مجھ سے جیت گیا۔

یحیٰی بن خالد برمکی نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی: ہر علم سے ایک اچھا علم حاصل کر لو کیونکہ آدمی جس علم سے جاہل ہوتا ہے اس سے بغض رکھتا ہے۔ اور مجھے پسند نہیں کہ تم علم سے بغض رکھو۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ تین آدمی قابلِ رحم ہیں: "عزت دار جب خوار ہو جائے، امیر جب غریب ہو جائے اور عالم جب جاہلوں میں پھنس جائے۔" عالم میں تین باتیں ضروری ہیں اپنے سے کم خواندہ کی تحقیر نہ کرے، اپنے سے زیادہ عالم سے حسد نہ کرے اور اپنے علم کی قیمت وصول نہ کرے۔ خلیل بن احمد کا یہ شعر کتنا عمدہ ہے: ؎

اعمل بعلمی و ان قصرت فی عملی ۔۔۔ ینفعک علمی و لا یضررک تقصیری

(میرے علم پر عمل کرو چاہے میں خود اپنے عمل میں کوتاہ ہوں میرا علم فائدہ پہنچائے گا اور میری کوتاہی سے تمہیں نقصان نہ پہنچے گا)

علم کے فوائد جلیلہ

مالک بن دینار کہا کرتے تھے: جو شخص اپنی ذات کے لیے علم سیکھتا ہے اس کا علم کم رہے گا اور جو لوگوں کے لیے حاصل کرتا ہے اس کا علم زیادہ ہو جائے گا کیونکہ آدمی کی اپنی ضرورتیں کم ہوتی ہیں اور لوگوں کی بہت۔

امام شعبی نے فرمایا: عالم وُہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے: خود

علم سیکھو، اوروں کو سکھاؤ۔ لوگوں سے تواضع سے پیش آؤ، متکبر نہ ہو، بدمزاجی تمہارے علم کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ مشہور مقولہ ہے: "چار باتیں ایسی ہیں جن سے کسی شریف آدمی کو باک نہیں۔ باپ کی تعظیم، مہمان کی خدمت، گھوڑے کی نگہداشت اور استاد کی خدمت۔"

امام مالکؒ نے فرمایا: طالب علم وہی ہے جس میں سنجیدگی، بردباری، خوفِ خدا اور اسلاف کی پیروی ہو۔

حضرت ابوالدرداءؓ فرمایا کرتے تھے: "علم سیکھنے سے آتا ہے عقل کوشش سے۔"

حسن بصریؒ فرماتے ہیں: علم کے بغیر عمل گمراہی ہے۔ علم کے بغیر عمل نقصان دہ ہے۔ علم اس طرح حاصل کرو کہ عبادت میں خلل نہ پڑے۔ عبادت میں اس طرح مشغول رہو کہ علم سے مُنہ نہ موڑ لو۔

عالم اور طالب علم کے مدارج

ابو ہارون عبدی فرماتے تھے کہ ہم طالب علمی کے زمانے میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو فرماتے: خوش آمدید وصیت رسول اللہ، خوش آمدید، سنو! رسول اللہؐ نے فرمایا ہے عنقریب تمہارے لیے زمین مسخر کر دی جائے گی اور تمہارے پاس کم عمر لڑکے آئیں گے جو علم کے پیاسے ہوں گے تفقہ فی الدین کے خواہشمند ہوں گے اور وہ تم سے علم حاصل کرنا چاہیں گے جب وہ آئیں انہیں تعلیم دینا، مہربانی سے پیش آنا، آؤ بھگت کرنا اور حدیث بتانا۔

حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے: جب تم کسی عالم کے پاس پہنچو تو پہلے عالم کو اور پھر دوسروں کو سلام کہو۔ عالم کے رُوبرو مؤدب بیٹھو۔ ہاتھوں سے اشارے نہ کرو، آنکھیں نہ پھراؤ۔ توجیہات پیش کرنے سے گریز کرو۔ تکرار سے احتراز کرو۔ سوالوں سے پریشان نہ ہو کیونکہ عالم اس نخل کی طرح ہے جو خوشوں سے لدا پڑا ہے اور اپنے شیریں پھل کو برابر ٹپکاتا رہتا ہے۔ عالم کے لیے ضروری ہے کہ باوقار اور سنجیدہ ہو، ادھر ادھر نہ دیکھے، شور و غل نہ کرے، کھیل کود نہ کرے، خشک رو نہ ہو اور یاوہ گوئی نہ کرے۔ یحییٰ بن خالد برمکی نے اپنے بیٹے کو فرمایا: بے سمجھے جواب نہ دو خوب سمجھ کر بولا کرو کیونکہ بے سمجھے جواب دینا حماقت ہے۔

علم اور علماء کا خاتمہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر بڑا اظہارِ ملال فرمایا ہے کہ کائنات ارضی سے علم اور علماء کا خاتمہ ہو جائے۔ آپ کی اکثر احادیث میں ان خدشات کا اظہار کیا گیا ہے جس میں علماء کے اُٹھ جانے پر اظہارِ افسوس ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا "فتنے اٹھیں گے اور بہت زیادہ ہرج ہوگا" ہرج کا مطلب پُوچھا گیا تو آپ نے فرمایا "قتل قتل اور پھر علم کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ علم اس طرح ختم نہیں ہوگا کہ سینوں سے نکل جائے گا بلکہ علماء ختم ہو جائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک حدیث بیان کی ہے کہ علم آدمیوں سے چھینا نہیں جائیگا لیکن علماء کے مٹنے سے مٹ جاتا ہے۔ عالموں کے خاتمے پر لوگ جاہلوں کو اپنا سردار اور پیشوا ماننا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ علم کے بغیر فتویٰ دیتے ہیں۔ اپنی رائے سے خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے حدیث بیان فرمائی کہ قیامت سے پہلے میری اُمت میں تیس دجال پیدا ہوں گے۔ ہر ایک کا دعویٰ ہوگا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ مال اٹھ جائے گا۔ علم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ فتنے پھیلتے جائیں گے اور بڑا "حرج" ہوگا۔ حرج کا مطلب دریافت کیا گیا تو فرمایا: قتل و غارت۔

حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا: میں آج تمہیں ایسی حدیث سناتا ہوں کہ میرے سوا کوئی بھی بیان نہ کرے گا۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قیامت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ علم کم ہو جائے گا، جہالت پھیل جائے گی زنا عام ہوگا۔ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ ہوں گی۔ مردوں کی کمی ہو جائے گی۔ پچاس پچاس عورتیں ایک مرد کو جائیں گی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: علم کو اس کے ختم ہونے سے پہلے پہلے حاصل کر لو۔ علم کا ختم ہونا علماء کی موت ہے۔ ابن شہاب زہری کہا کرتے تھے کہ سنّت نبویؐ پر استواری میں ہی نجات ہے۔ علم بڑی تیزی سے سلب ہو جاتا ہے۔ علماءِ حق کے وجود سے دین و دنیا کا استحکام ہے اور علم کی تباہی دین و دنیا کی تباہی ہے۔

حضرت شداد بن اوسؓ نے فرمایا: تم جانتے ہو علم کیسے اٹھ جائے گا۔ علم کا اٹھ جانا (ختم ہو جانا) اہل علم کی موت ہے۔ میں تم کو بتا دوں کہ سب سے پہلے "خشوع" ختم ہو گا۔ لوگ خشوع سے خالی ہو جائیں گے۔

حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے: عالم کی موت سے اسلام میں ایسا شگاف پڑ جاتا ہے کہ گردشِ لیل و نہار بھی اُسے پُر نہیں کر سکتی۔

محمد بن سیرینؒ افسوس کیا کرتے تھے کہ علم تو جا چکا ہے اب تھوڑی سی کھرچن میلے برتنوں میں باقی رہ گئی ہے۔

سعید بن جبیرؒ سے پُوچھا گیا کہ قیامت کے برپا ہونے اور مخلوق کے برباد ہونے کی کیا علامت ہے؟ آپ نے فرمایا: "علماء کا اُٹھ جانا"

حضرت ابو امامہؓ کی یہ حدیث موجودہ دورِ جہالت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا نے مجھے تمام مخلوقات کے لیے رحمت و ہدایت بنا کر بھیجا ہے۔ پروردگار کا حکم ہے کہ بانسریاں، باجے، شراب اور بتوں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ میرے پروردگار نے اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر فرمایا کہ میں شراب خوروں کو بخشوں یا نہ بخشوں مگر انہیں کھولتا ہوا پانی ضرور پلاؤں گا۔ میرا بندہ حرام سمجھ کر شراب سے احتراز کرتا ہے تو میں اسے حظیرۃ القدس میں شراب طہور سے نوازوں گا۔ ہر چیز کی طرح دینِ اسلام کے لیے بھی اقبال ادبار کے مقامات ہیں۔ اقبال یہ ہے کہ قوم کی قوم علمِ معرفت سے آراستہ ہو اور اس میں اِکّا دُکّا فاسق و فاجر نظر آئیں اور معاشرے میں وہ ذلیل و خوار نظر آئیں۔ اگر وہ زبان کھولیں تو دھتکار دیے جائیں، سر اٹھائیں تو سرنگوں کر دیئے جائیں لیکن دین کا ادبار یہ ہے کہ قوم میں جہالت کی سیاہیاں چھا جائیں اور شاذ و نادر عالم دین نظر آئیں۔ وہ بھی معاشرے میں مغلوب اور معتوب دکھائی دیں۔ بولنے کی جرأت کریں تو انھیں شور مچا کر خاموش کر دیا جائے، حق گوئی پر انہیں شدید سزائیں دی جائیں اور انھیں مار مار کر چُور کر دیا جائے۔ اور انہیں کہا جائے کہ ہم سے سرکشی کرتے ہو، تمہاری یہی سزا ہے۔ پھر ایسا معاشرہ جنم پائے کہ عام مجالس اور بازاروں میں سرِ عام شراب کا دور چلے، اس کے نئے نئے نام تجویز کیے جائیں اور وہ اپنے

اسلاف پر لعنت بھیجنے لگیں حالانکہ ایسے معاشرے پر اللہ کی لعنت نازل ہوتی ہے"۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی وفات پر فرمایا: جس نے علم کا اٹھنا نہ دیکھا ہو وہ آج دیکھ لے۔

آپ نے مزید فرمایا: عالم مرتے جائیں گے اور ان کے ساتھ ہی حق کے نشان مٹتے جائیں گے یہاں تک کہ جب عالم اٹھ جائیں گے اور جاہل چھا جائیں گے تو لوگ جہالت کو ہی علم سمجھ کر اس پر یقین و عمل کرنا شروع کر دیں گے، اس طرح گمراہی کا نزدل مکمل ہو جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ جب پڑھنے والے بہت ہوں گے مگر سمجھنے والے کم ہوں گے۔ علم سلب کر لیا جائے گا اور ہرج زیادہ ہو گا۔ عرض کیا گیا: ہرج کیا ہے؛ فرمایا: آپس میں خوں ریزی اور قتل و غارت۔ پھر ایک اور وقت آئے گا کہ میری اُمت کے بعض لوگ قرآن تو پڑھیں گے مگر ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا پھر ایک ایسا وقت آئے گا جب منافق کافروں اور مشرکوں سے کفر پر بحث کرنے لگیں گے۔

حضرت ابوالدرداؓ حسرت سے فرمایا کرتے تھے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ علماء دین اُٹھتے جا رہے ہیں، جہلاء علم کی مسندوں پر قابض ہو رہے ہیں۔ لوگو! علم حاصل کرو اس سے پہلے کہ اسے اٹھا لیا جائے۔ علم کا اٹھ جانا اہل علم کا مٹ جانا ہے۔ تم اس چیز کے پیچھے پڑے ہوئے ہو جو تمہیں بہر حال ملنا ہی ہے (یعنی رزق) مگر تم اس چیز کی تحصیل سے غافل ہو جس کا حاصل کرنا تمہارے لیے واجب ہے (یعنی علم) میں تمہارے شریروں کو اس طرح پہچانتا ہوں جس طرح ایک سلوتری اپنے گھوڑوں کو پہچانتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ قرآن کریم کان بند کر کے سنتے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگلے چلے جائیں گے اور باقی ماندہ علم نہ سیکھیں گے۔ اگر عالم علم سیکھیں گے تو علم پھیلے گا۔ اگر جاہل علم استعمال کریں گے تو علم کو اپنے لیے ہموار پائیں گے۔ یہ کتنی تعجب کی بات ہے کہ تمہارے وجود کھانوں سے لبریز اور علم سے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔

داؤد بن جراح کا بیان ہے: سفیان ثوری عسقلان تشریف لائے اور تین دن مقیم رہے مگر کسی نے ان سے کوئی مسئلہ دریافت نہ کیا۔ یہ دیکھ کر فرمانے لگے، میرے لیے سواری کا

انتظام کرو۔" میں اس بستی سے نکل جانا چاہتا ہوں جہاں علم کی طلب کی بجائے جہالت کا پہرہ ہے۔"

ان احادیث اور روایات کے اجالوں میں جب ہم اپنے موجودہ معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں تو دل بیٹھ جاتا ہے۔ علماء، متعلم اور طلباءُ نے اپنے لیے کون سا مقام متعین کیا ہے ہمارا علمی کاروان کس شان و شکوہ سے روانہ ہوا، کس جاہ و جلال سے کائنات کا سفر کیا اور کن اندھیروں میں آکر رُک گیا۔ علم سے تہی دامنی کا یہ عالم ہے کہ چراغِ رُخِ زیبا لے کر بھی ڈھونڈنے سے علم اور علماء نظر نہیں آتے۔

علماء اور حکام

علماءِ کرام نے جس لگن سے اشاعتِ علم و فضل کی، اس کے بعض پہلو ایسے ہیں جن پر ہم گزشتہ صفحات میں تفصیلی طور پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس لگن میں للٰہیت اور محض رضاءِ خداوندی اور خدمتِ دین کا جذبہ کار فرما ہو تو وہ علماء وراثتِ انبیاء کے تقسیم کار ہوتے ہیں مگر یہی اشاعت اگر جلبِ منفعت، حصولِ زر اور رضاءِ حکام کا ذریعہ بنا یا جائے تو نہ صرف علم کی روح مرجاتی ہے بلکہ اشاعتِ دینِ صحیح طور پر رُک جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی علوم کے ناشرین نے علماءِ دین کو حکام اور حکومتوں کی سرپرستیوں سے دُور رہنے کی ہدایت کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی ہے کہ صحرا میں رہنے والا، شکار کے پیچھے دوڑنے والا غافل ہوجاتا ہے مگر حکام کی خوشامد کرنے والا فتنوں کا شکار ہوجاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ تم پر بادشاہوں کی حکومت ہوگی اور اچھے بُرے کام کریں گے۔ ان کی برائیوں پر جو علماء تنقید کریں گے وہ خدا کے حضور بری الذمہ ہوں گے جو دل میں بُرا جانیں گے اور خاموش رہیں گے، وہ بھی عذابِ الٰہی سے بچ جائیں گے مگر جو ان پر راضی ہوکر ان کی ہاں میں ہاں ملاتا جائے گا خدا اسے تباہ کر دے گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! ہم ایسے حکام کو قتل نہ کر ڈالیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں، جب تک نماز پڑھتے ہیں قتل نہیں کرنا چاہیے۔

ایوب سختیانی نے بتایا کہ انہیں ابو قلابہ نے نصیحت کی تھی کہ بادشاہوں کے دروازے

پر نہ جانا۔ خود غرضوں کی محبت میں نہ بیٹھنا کیونکہ تونگری خوشامد کا نام نہیں بلکہ بے فکری کا نام ہے۔

حضرت سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے: جہنم میں ایک غار ہے جس میں صرف بادشاہوں کے مصاحب ہی ڈالے جائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: حکام کی ڈیوڑھی پر فتنے اس طرح جمے رہتے ہیں جس طرح اونٹ اپنے تھانوں پر جم کر بیٹھتے ہیں۔ قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم حکام سے جتنا انعام پاؤ گے وہ تمہارے دین کو اس سے کئی چند زیادہ خراب کریں گے۔

حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے: مال جمع کرنے کا لالچ اور بادشاہوں کی دربارداری تمہاری نیکیوں سے وہی سلوک کرتی ہے جو دو بھوکے خونخوار بھیڑیے رات بھر بھیڑوں کے باڑے میں رہ کر کر سکتے ہیں۔

انہی وہب بن منبہؒ کے شاگردوں نے آپ سے پوچھا: آپ ہمیشہ سچے خواب بیان کیا کرتے تھے مگر اب کیوں نہیں سناتے۔ آپ نے فرمایا: جب سے قاضی بنا ہوں سچے خواب بھی باقی نہیں رہے۔

سفیان ثوریؒ نے فرمایا: ایک زمانہ تھا ابرار و اخیار علماءِ دین اٹھتے تھے اور حکامِ وقت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرتے تھے اور معمولی لوگ گھر میں دبکے رہتے مگر جب سے رذیل اور کمترین لوگوں نے علم کے لبادے اوڑھ لیے ہیں۔ وہ حکامِ وقت کے پاس آتے جاتے ہیں اور ابرار و اخیار گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اُمت کے دو آدمی ٹھیک رہے تو اُمت بھی ٹھیک رہے گی، وہ دو ہیں حکام اور علماء۔

حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علماء انبیاء کے امین ہیں۔ انہیں ہدایت خلق کی امانت سپرد ہوئی ہے لیکن یہ اسی وقت تک ہے جب تک بادشاہوں کی دہلیز سے دُور رہیں۔

حضرت قتادہؓ کا قول ہے کہ معاشرہ میں علماء نمک ہیں، نمک سے ہر چیز خوش ذائقہ ہوتی ہے لیکن جب نمک ہی بدمزہ ہو جائے تو کون سی چیز درست رہ سکتی ہے۔

حضرت قتادہؒ کہا کرتے تھے کہ بدترین حاکم وہ ہیں جو علمائے دُور رہتے ہیں، اور بدترین علمائ وہ ہیں جو حکام کی نزدیکی پسند کرتے ہیں۔

محمد بن سحنونؒ ایک عالمِ دین تھے، اُن کا ایک بھائی رات کے اندھیرے میں قاضیِ شہر کے گھر سلام کو جاتا۔ عالم بھائی کو خبر ہوئی تو اس نے اسے آخری خط لکھا کہ "جو تجھے دن کے وقت دیکھتا ہے وہ رات کے اندھیرے میں بھی دیکھتا ہے"۔

مندرجہ بالا روایات ان حکام اور بادشاہوں کے متعلق ہیں جو خدا اور رسولؐ کے احکام کی توہین کرتے ہیں، فاسق و فاجر ہیں۔ عادل اور نیک سیرت حکام کے لیے مختلف روایات میں بعض فضائل آئے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بنوامیہ کے خلیفہ تھے مگر انہوں نے اشاعتِ دین کے فریضہ کو ایک عالمِ دین کی حیثیت سے پُورا کیا۔ آپ کے دربار میں جن علماء کا اجتماع تھا وہ باعث فخر تھے ان علمائ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی علمی رہنمائی کی۔ یہ علماء کا ہی کام تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے طلباء کے وظائف مقرر کیے تاکہ وہ فارغ البال ہو کر تعلیم حاصل کریں۔

حضرت مالک کو حکام کے پاس جاتے ہوئے دیکھ کر کسی نے پُوچھا کہ آپ وہاں کیوں جاتے ہیں تو آپ نے فرمایا: اگر میں بھی وہاں نہ جاؤں تو انہیں کلمۂ حق کون سنائے گا۔

حسین بن علیؓ کی روایت میں ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے حج کے موقعہ پر حضرت امام مالکؒ کو ایک تھیلی بھیجی، جب واپس آنے لگا تو پیغام بھیجا کہ آپ اگر مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ بغداد چلیں۔ امام نے کہلا بھیجا آپ کی تھیلی ابھی تک سربمہر پڑی ہے۔ اور یاد رکھیں حضورؐ نے فرمایا: "مدینہ اپنے باشندوں کے لیے بہترین مقام ہے"۔

اسلامی تاریخ کے اوراق پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات نظر آئے گی کہ علماء کا ایک طبقہ حکامِ وقت اور بادشاہوں کے درباروں میں رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اصلاحِ احوال کی بجائے دین کی اشاعت کو نقصان پہنچایا ہے۔ ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ ان درباری علمائ نے فاسق اور فاجر بادشاہوں کی خوشامد میں آکر راستی کے راستے چھوڑے، حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اسلامی تاریخ پر بڑے سیاہ باب کا

اضافہ کیا۔ تاریخ کے میدان سے ہٹ کر ہم موجودہ زمانے میں بھی ان علماءِ دین کی ایک خاصی تعداد پاتے ہیں جو ہر دور کے بدلتے ہوئے اقتدار کے ایوانوں پر نگاہیں جمائے رہتے ہیں انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ حکام کون ہیں، کیسے ہیں۔ بس دربار داری، خوشامد ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ وہ دربار سجا دیکھ کر مختلف ذرائع سے حکام کے کاسہ لیسوں میں شامل ہوجاتے ہیں اور ملت کے اجتماعی مفاد پر کاری ضربیں لگاتے رہتے ہیں۔ ان علماءِ دربار میں جب تک یہ رجحان اجتماعی طور پر ختم نہیں ہوگا معاشرے کی اصلاح ناممکن ہے۔

بایں ہمہ تاریخ اسلام ان راست باز اور علماءِ ربانی کے کارناموں سے خالی نہیں جنہوں نے دربار اور بادشاہوں کی اصلاح کے لیے بڑے حُسنِ تدبر سے کام لیا۔ وُہ شاہی درباروں میں تکمیلِ خواہشات کے لیے نہیں بلکہ معاشرے کی بہبودی کے لیے کام کرتے رہے۔

امام رجاؒ نے عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کے قیام اور اس دور کی علمی اصطلاحات کے نفاذ میں بھرپور حصہ لیا اور ان کی اس کوشش سے بنو امیّہ کی تاریخ بدل گئی۔ عبدالرحمٰن العادل کے دربار میں وُہ علماء جنہوں نے اندلس کو عرب وعجم کے لیے گہوارۂ علم وفضل بنا دیا تھا۔ ان علماءِ حق کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

امام ابو یُوسف کا جو اقتدار خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں رہا اس سے ایک عالم واقف ہے۔ ابن خلکان آپ کی علمی اور بے لوث خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہُوئے لکھتے ہیں کہ ابو یوسف علم و حکمت اور ریاست و اقتدار میں انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے مذہب حنفی کی اشاعت اور فقہ حنفی کے نفاذ میں آپ نے بڑی کامیابی سے حصّہ لیا۔

امام یحیٰی ابن یحیٰی مصمودی (حضرت امام مالکؒ کے شاگردِ رشید اور موطا امام مالکؒ کے ناقل تھے) نے اندلس کے دربار میں بیٹھ کر مالکی فقہ کی تدوین و ترویج سے سارے اندلس کو مالا مال کر دیا تھا۔

حضرت یحیٰیؒ ابن اکثم مامون الرشید کے دربار میں رہ کر اشاعتِ اسلام کا کام کرتے رہے مامون ان کے علمی مقام کی بڑی قدر کرتا تھا اور تدبیرِ مملکت میں ان سے مشورہ لیتا تھا اور ملکی احکام ان کی منظوری کے بعد نافذ ہوتے۔ سلطان شہاب الدین غوری (ہندوستان کی تاریخ کا

درخشندہ ستارہ، امام فخر الدین رازی کی علمی رہنمائی سے آگے بڑھا۔ امام ممدوح دربارِ خوارزم میں اشاعتِ دین میں مصروف رہے۔ خطیب بغدادی نے عز الدولہ کے دربار میں بڑا کام کیا۔ مولانا قونویؒ سلطان روم کے دربار میں نو برس تک اسلامی قوانین کا نفاذ کرتے رہے۔ امام غزالیؒ نے جب امیر المسلمین یوسف ابن تاشفین کو علم دوست پایا تو افریقہ کا سفر کیا تاکہ دربار میں رہ کر خدمتِ دین کی جا سکے۔ ابن رافع قشیری حافظِ حدیث خراسان کے دربار سے وابستہ رہ کر اشاعتِ علوم کرتے رہے۔ ان علماءِ دین نے دربار سے وابستہ رہ کر اپنے مقام احترام اور عظمت کو منوایا۔ اور دین کی خدمت کے لیے بادشاہوں کو آمادہ کیا۔ امیر تیمور جیسا جابر بادشاہ علامہ تفتازانی کا بے حد احترام کرتا تھا۔ عمر صفار والیِ خراسان امام خفاف کو اپنا پیشوا مانا کرتا اور سلطنت کے دینی معاملات ان کی رائے سے طے پاتے۔ سلاطین عثمانیہ میں سے سلطان سلیم کا جاہ و جلال تاریخ کا بہت بڑا باب ہے۔ ایک دفعہ خزانہ میں کسی بدعنوانی کے جرم میں وہاں کے ڈیڑھ سو ملازمین کو قتل کرنے کا حکم دیا مگر مولانا علاء الدین جمالیؒ مفتی قسطنطنیہ ان ملازمین کی حالتِ زار کی ترجمانی کرنے کے لیے خود دربار میں جا پہنچے۔ اور ثابت کیا کہ شرعاً یہ قتل ناجائز ہے۔ سلطان کو اپنے خشمناک فیصلے کے سامنے ایک عالمِ دین اور دربار سے وابستہ مفتی کی مداخلت بڑی ناگوار گزری اور قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں کو معاملاتِ سلطنت میں دخل نہیں دینا چاہیے مگر مولانا جمالیؒ کی تقریر کے سامنے سلطان کو معافی کا اعلان کرنا پڑا۔

ان علماءِ ربانی کے کارناموں سے تاریخ بھری پڑی ہے انہوں نے انسانیت کی خدمت کر کے بڑا نام حاصل کیا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے صدیوں تک اسلامی مزاج کو عوام میں قائم رکھا اور آج ہم ان نفوسِ قدسیہ کی بے لوث خدمات سے اس دین اسلام کی عظمت کے مدحت سرا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان علماء ربانی نے اسلام کی تابناکیوں میں اضافہ کیا اور اپنی بے غرضانہ خدمات سے معاشرے کو خدا و رسول سے وابستہ رکھا۔

دنیاوی خواہشات کے لیے تحصیلِ علم علم نے جہاں انسانی اذہان و قلوب کو جہالت کی تاریکیوں سے نجات بخشی ہے، اور علماءِ دین نے جہاں ان انوار کو بکھیر کر خدا اور رسول کے منشاء و رضاء کو پورا کیا ہے وہاں

بعض حضرات نے محض دنیوی خواہشات کی تکمیل کی خاطر طلبِ علم کے لیے دامن پھیلائے اور اس علم سے دنیا کی نعمتوں سے مالا مال ہوئے ایسے علم اور ایسے علماء کو خدا اور رسولِ خدا نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ ان کی اس ذہنیت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ روایت بیان کی ہے کہ علم اس لئے حاصل نہ کرو کہ دُوسرے علماء پر فخر کر سکو۔ جہلاء سے حجت کرو اور مجالس میں بلند مقام پر بٹھائے جاؤ۔ جو شخص اس نیت سے علم حاصل کرتا ہے اس کے لیے دوزخ ہے، دوزخ!

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ اگر علماء اپنے علم کا احترام کرتے اور علم کو اپنے مقام پر رہنے دیتے تو زمانے کے امام ہوتے مگر انہوں نے علم کے مقام کو گرا دیا۔ دنیا داروں کے قدموں پر گرا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ذلیل و خوار ہوتے گئے۔

مکحولؒ فرمایا کرتے تھے: جو شخص حدیث اس لیے حاصل کرتا ہے کہ علماء پر فخر کرے اور مخلوق کو اپنی طرف کھینچے وہ دوزخ میں گرے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کا مقولہ ہے کہ اگر علماء اپنی عزت کرتے اور علم کو صحیح راہوں پر رکھتے تو خدا، خدا کے فرشتے اور صالحین ان سے محبت کرتے اور تمام مخلوق بھی ان کا رعب مانتی۔ مگر انہوں نے علم کو محض دنیا وی خواہشات کی تکمیل کے لیے پڑھا تو خدا بھی ان سے ناراض ہو گیا اور وہ دنیا کے سامنے بے وقار ہوتے گئے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ علم کو اپنے اخلاق سے سنوارو نہ کہ علم سے خود کو آراستہ کرو۔

فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ قیامت میں فاسق عالم بت پرستوں سے پہلے پکڑا جائے گا کیونکہ جاننے والا اور نہ جاننے والا برابر نہیں ہو سکتا۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ عالم کی سزا اس کے دل کی موت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے دریافت کیا کہ سب سے بڑا آدمی کون ہے؟ فرمایا: بگڑا ہوا عالم! عبداللہ بن عروہؓ فرمایا کرتے تھے کہ دین دین چلا کر لوگ دنیا کے مفاد کو روتے رہتے ہیں۔

علماءِ اسلام کا مقام

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جو ... ہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی ہے کیا تم جانتے ہو کہ سب سے افضل انسان کون ہے؟

سب سے افضل وہ ہے جس کا عمل سب سے افضل ہے۔ آپ نے پھر فرمایا: تمہیں معلوم ہے سب سے بڑا عالم کون ہے؟ سب سے بڑا عالم وہ ہے کہ جو اس وقت حق کی بات بیان کرے جب دنیا شک میں پڑ جائے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا: افضل ترین عالم دین وہ ہے جو معرفتِ الٰہی کا عالم ہو اور عرفانِ الٰہی کی روشنی سے معمور ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: میں تمہیں اس فقیہ کی کیوں نہ پہچان کرادوں جو پورا پورا فقیہ ہو۔ یہ فقیہ لوگوں کو نہ تو رحمتِ الٰہی سے مایوس کرتا ہے نہ قہرِ خدا سے ڈراتا ہے، نہ قرآن کے احکام کو پسِ پشت ڈالتا ہے۔ یاد رکھو وہ بے مغز عبادت ہے جس میں فہم و تدبّر نہیں۔ اس علم سے کوئی فائدہ نہیں جو فہم سے خالی ہے۔ اس تلاوت سے کچھ فائدہ نہیں جو فہم و تدبّر سے خالی ہو۔

حضرت لقمانؒ کا مقولہ ہے کہ سب سے مالدار وہ ہے جو سب سے زیادہ عالم ہو، جو دوسروں کو اپنے علم سے حصّہ بخشتا رہے۔

حارث بن یعقوبؒ فرمایا کرتے تھے: کامل فقیہ وہ ہے جو قرآن کا فہم رکھتا ہو، اور شیطان کے مکر میں نہ آئے۔

امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ مفتی کون ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ عالم دین جو علماء کے اختلافاتِ علمی سے پوری طرح واقف ہو۔ پوچھا گیا کہ اصحاب رائے کے اختلاف سے؟ فرمایا نہیں، صحابہؓ کے اختلاف سے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں، چار آدمیوں سے علم نہ لو، کھلے ہوئے بدکار سے، بندۂ غرض سے، عام گفتگو میں جھوٹے سے، اور ایسے سادہ لوح عالم دین سے جو اپنی سادگی کی وجہ سے سچ اور جھوٹ میں تمیز نہ کر سکتا ہو۔

حضرت ابو قلابہؒ کہا کرتے تھے کہ علماء تین قسم کے ہوتے ہیں: "ایک وہ جنہوں نے علم سے زندگی حاصل کی، مگر دنیا کو ان سے زندگی نہ ملی۔ ایک وہ جن کے علم سے دوسروں نے زندگی پائی مگر خود وہ ایک بے جان کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہے۔ تیسرے وہ جو علم سے خود زندہ رہے اور دوسروں کو زندگی بخشتے رہے۔"

علماء کرام میں مناظرانہ مباحث

حضرات علماء کرام کا ایک طبقہ مناظرانہ انداز سے گفتگو کرتا اور بحث و تکرار کو بڑا محبوب مشغلہ تصور کرتا ہے۔ یہ انداز اپنے مخالف فریق کو زیر کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ بسا اوقات مناظرین نے دین اسلام کے مخالف حضرات کو اپنے مناظرانہ انداز تخاطب سے بری طرح شکست دی اور اسلام کی عظمت کا لوہا منوا لیا۔ مگر بایں ہمہ اگر اسلامی طرزِ تعلیم اور اشاعتِ دین کو سامنے رکھا جائے تو مناظرانہ اندازِ فکر کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ قرآن میں جا بجا مناظرہ اور جدال سے ممانعت کی گئی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن میں حجت کرنا کفر قرار دیا ہے۔ قرآن پاک کی آیات بینات کو اپنی نزاعی اور تاویلی بحث کا نشانہ بنا لینا بڑا معیوب ہے۔

یحییٰ بن سعیدؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص اپنے دین کو بحثوں کا نشانہ بنا لیتا ہے اس کا اپنا اعتقاد بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔

مغیرہ بن ابراہیمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اسلاف دین کے معاملے میں تلوّن کو ناپسند کیا کرتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے: جب لوگ علماءؒ سے ہٹ کر دین کے معاملے میں سرگوشیاں کرنے لگیں تو جان لو کہ وہ گمراہی کی طرف جا رہے ہیں۔

اوزاعیؒ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس قوم کے افراد بحث و جدال میں سرگرم ہو جاتے ہیں اور عملی جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ سے لوگوں نے جنگِ صفین پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا تو آپ نے فرمایا: "صفین کے خون سے اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ رنگین نہیں ہونے دیے اب میں اس کے ذکر سے اپنی زبان کیوں رنگین کروں"۔

معاویہ بن عمرؒ کہتے ہیں کہ بحث و مناظرہ سے احتراز کرو۔ اس سے عملی قوت ضائع ہو جاتی ہے۔

امام مالک سے پوچھا گیا کیا حدیث کو حدیث کے معاملے میں لوگوں سے مناظرہ کرنا چاہئے؟

آپ نے فرمایا: نہیں۔ محدث کو چاہیے حدیث بیان کر دے لوگ اسے قبول کریں یا نہ کریں بحث کی ضرورت نہیں۔

امام شافعیؒ اور حفص الفرد کے درمیان مناظرہ ہوا تو امام شافعیؒ نے لوگوں کو بتلایا شرک کے علاوہ انسان جس گناہ سے بھی آلودہ ہو کر خدا کے حضور جائے مگر کلام (مناظرہ) کے گناہ سے آلودہ ہو کر نہ جائے۔ میں نے حفص کے منہ سے ایسی گفتگو سُنی ہے جس کو بیان بھی نہیں کر سکتا۔ اور یہ سب مناظرے کے اثرات ہیں۔

امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ مدینہ کے علماء کرام وہی گفتگو کیا کرتے تھے جس کے نتیجہ میں عمل کی تلقین ہو۔ وہ لفظی نزاع اور قیل و قال سے اجتناب کیا کرتے تھے۔ ہر زمانے کے صحیح الخیال فقہاء اور علماء کا یہی مسلک رہا ہے۔ وہ مناظرانہ انداز کی بجائے مصالحانہ گفتگو سے تبلیغِ دین فرمایا کرتے تھے۔ معتزلہ کی وبا نے مناظرہ کو فروغ دیا۔ علماء ربانی تو مناظرین سے اس قدر ڈرتے تھے کہ ایک دفعہ سفیان بن عُیَینہ نے جابر جعفیؒ کی زبان سے ایسی گفتگو سُنی کہ انہیں ڈر ہوا کہ کہیں چھت سر پر نہ آگرے۔

امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر لوگوں کو علم کلام کی مناظرانہ گمراہیوں کا اندازہ ہو جائے تو اس سے ایسے بھاگیں جیسے شیر سے ڈر کر بھاگا جاتا ہے۔ آپ نے مزید فرمایا: جس جگہ تم یہ بحث سُنو کہ اسم مسمّٰی ہے یا غیر مسمّٰی۔ تو یقین کر لو یہ شخص اہل کلام میں سے ہے اور بے دین ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ علم کلام کے زور سے مناظرہ کرنے والا کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔ جسے علم کلام میں تھوڑا سا بھی دخل ہے اس کے دل میں ضرور کھوٹ ہے۔

حضرت ابو امامہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی ہے، ہدایت پا جانے کے بعد جو لوگ گمراہ ہوتے ہیں وہ بحث و مناظرہ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

علامہ ابن عبدالبر فرمایا کرتے تھے کہ اسلاف علم فقہ میں تو تبادلۂ خیال کر کے اپنے نقطۂ نظر کو بیان کر دیا کرتے تھے مگر عقاید کے معاملہ میں بحث و تکرار سے منع کرتے تھے کیا آپ لوگوں نے یہ نہیں سنا کہ جب بشر نے مایکون من نجوٰی ثلاثۃ الا ھو رابعھم میں کہا کہ "خدا بذاتِ خود ہر جگہ موجود ہے" تو اس کے حریف نے یہ کہنا شروع کر دیا تو پھر تمہارا خدا

تمہاری ٹوپی کے نیچے، تمہارے باغ کی چار دیواری کے اندر، تمہارے کندھے کی کھال کے پیچھے بھی چھپا ہوا ہے۔ وکیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: واللہ میں تو ایسے لوگوں کے اقوال نقل کرنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔

ربیعہ سے ایک شخص نے سوال کیا سورۂ بقر اور سورہ آل عمران کو قرآن پاک میں اوّل کیوں جگہ دی گئی حالانکہ یہ مدینہ میں اُتری تھیں، اور کچھ اُوپر اسّی سورتیں اس سے پہلے نازل ہوئی تھیں۔ ربیعہ نے جواب دیا: قرآن کے مترتّب ان سورتوں کی ترتیب کے متعلق خاص علم رکھتے تھے اس لئے انہوں نے انہیں اوّل میں رکھا اور بلا اختلاف یہ ترتیب ہی پسند کی گئی۔ اس میں بحث کرنے سے کیا فائدہ ہے؟

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار زور دے کر کہا کہ کرید کرنے والے ہلاک ہو گئے۔

عبداللہ بن حسن فرمایا کرتے تھے: مناظرے سے پُرانی دوستیاں ختم ہو جاتی ہیں، محبت کی گرہیں کُھل جاتی ہیں، بغض و عداوت پیدا ہو جاتی ہے، مباحثے میں ہر فریق دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے اور فریق مخالف کو شکست دینے کے لیے ہر طرح زور دیتا ہے۔

قضا و قدر پر مناظروں کو صحیح علماء کرام کبھی بھی پسند نہیں کرتے۔ معتزلہ کی تحریک عقلی استدلال اور علم الکلام کے عروج کی آئینہ دار تھی۔ انہوں نے قضا و قدر، حیات بعد ممات، خلق قرآن اور دُوسرے مباحث کو اُمت میں رواج دے کر کوئی مفید کام نہیں کیا۔ ان مباحث اور مناظروں سے ہزار دینی فتنوں کو قوت ملی اور انہوں نے اسلام کی یکجہتی اور ہم آہنگی کو پارہ پارہ کر دیا۔

قرآن پاک کی بعض آیات سے بعض حضرات نے مناظرانہ اندازِ فکر کی تاویلیں نکالی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مقامات پر جتنے مباحث اٹھائے گئے ہیں وہ کفر و شرک کی بیماریوں کو دُور کرنے کے لیے ایک حکیم مطلق نے استدلال کیا تاکہ ذہن اس بیماری اور اس کے علاج کی اہمیت کو محسوس کر سکے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود اور قومِ نمرود سے بعض استدلال کرتے ہیں۔ حضرت

موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دعویٰ کو باطل قرار دیتے ہوئے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام عزیزِ مصر اور شاہِ مصر کے سامنے اپنے دلائل پیش کرتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے بحث کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ قرآن پاک اہلِ کتاب سے مباحثہ کرتا ہے۔ حجت قائم کر چکنے کے بعد مباہلے کی دعوت دیتا ہے۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکینِ مکہ، کفارِ عرب اور نصرانی اور یہودی علماء سے بحث کرتے ہیں مگر ان تمام مقامات پر مناظرانہ انداز سے نہیں ہمیشہ مصالحانہ انداز سے گفتگو ہوئی۔ دلائل و حجت کے باوجود بھی اگر معاندین نے بات نہیں مانی تو انہیں برملا کہہ دیا گیا: "لکم دینکم ولی دین" بحث کو ختم کیا اور اپنا تبلیغی کام جاری رکھا۔

صحابہ کرامؓ بعض مسائل پر مباحثہ کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف رائے کا اظہار بھی کرتے تھے اور دوسرے کے خیالات کی تردید بھی کرتے تھے۔ یوم سقیفہ، جنگِ احد، میدانِ بدر اور صلح حدیبیہ غرضیکہ اسلامی تاریخ کے اہم واقعات ان مباحث سے بھرے پڑے ہیں مگر ان مباحث کو مناظرانہ رنگ کبھی نہیں دیا گیا تھا۔ ایسے تمام مباحث کو اہلِ نظر نے پسند کیا ہے اور اسے افہام و تفہیم کا ذریعہ خیال کیا گیا۔

بایں ہمہ اسلام میں ان مباحث کی ہمت افزائی کی گئی ہے جو تفہیم قرآن اور تبلیغ اسلام کے لیے کی جاتی رہی ہیں۔ ان مباحث میں مناظرانہ اور مجادلانہ طرزِ بحث کو کبھی پسند نہیں کیا گیا۔ ابتدائے اسلام میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے یہودیوں کا مناظرہ ہوا جس میں حضرت جبرئیلؑ کے احترام و مقام کو واضح کیا گیا۔ یہودی حضرت جبریل علیہ السلام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے مقامِ جبریلؑ کو ثابت کیا اور جس کی تائید میں قرآن پاک کی آیت آئی۔ عبداللہ ابن عباسؓ کی خوارج کے ساتھ بحث ایک بڑی کامیاب کوشش ہے جس سے اکثر معاندین تائب ہو گئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے موصل میں خارجیوں سے ایک تاریخی مناظرہ کیا جس کے نتیجہ میں ہزاروں خارجی تائب ہوئے۔

علماء کے نزدیک ہر مناظر عالم ہوتا ہے مگر ہر عالم مناظر نہیں ہو سکتا۔ مناظر کے لیے ضروری ہے کہ وہ بروقت حوالے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور پھر مناظر موقع محل پر اپنے مخالف کے لفظی حملوں کی مدافعت بھی کرنا جانتا ہو۔ صحابہ کرامؓ میں بعض شرعی مسائل میں اختلاف رہا۔

اور پھر اس اختلاف کو دُور کرنے کے لیے اکثر بحث و تکرار بھی ہُوئی اور ان کے تصفیے کے لیے بڑے بڑے دلائل سامنے آئے۔ ایسے مباحث سے ہماری علمی تاریخ میں بڑا مواد ملتا ہے۔

علماء اپنے معاصرین کے سامنے

علماء کرام نے جہاں اپنے ہمعصر علماء کرام کا احترام کیا ہے اور ان کے کمالات کا اعتراف کر کے دادِ تحسین پیش کی ہے وہاں اپنے بعض ہمعصر علماء سے سخت چوٹیں بھی کی ہیں۔ یہ چوٹیں بعض اوقات تو تفنن طبع کے لیے ہوتی تھیں لیکن بعض اوقات باہمی رقابت، حسد اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے بھی روا رکھی جاتی تھیں۔ علماء کرام کے "تذکرہ نگاروں نے ان کے کمالات کے ساتھ ساتھ اس پہلو کو بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی حالانکہ اخلاقی طور پر اس عادت کو اسلامی معاشرت میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔

حضرت زبیر بن العوام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے تم میں سابقہ قوموں کی بیماری آگئی ہے۔ وہ تھی حسد، بغض، بغض مونڈنے والی صفت ہے۔ میں نہیں کہتا کہ بال مونڈتی ہے لیکن یہ دین کو ضرور مونڈ دیتی ہے۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے تم جنت میں نہیں جانے کے جب تک ایمان نہ لاؤ، اور تم ایمان نہیں لانے کے جب تک آپس میں محبت نہ رکھو۔ کیا میں تمہیں بتاؤں محبت کس طرح تمہارے دلوں میں گھر کرے گی آپس میں صاحب سلامت عام کرو۔"

حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے: "علماء کا علم قبول کرو، مگر ایک دوسرے کے خلاف رائے کبھی نہ لو۔ بخدا ابکروں میں ایسی جلن نہیں ہوتی جیسی علماء میں ہوتی ہے۔"

ابو حازمؒ کہتے ہیں، اگلے زمانہ میں علماء کی یہ حالت تھی کہ ایک عالمِ دین اپنے سے بڑے عالم کو دیکھ پاتا تو نہایت خوش ہوتا۔ برابر والے کو ملتا تو علمی مذاکرہ شروع کر دیتا۔ ادنیٰ کا سامنا ہوتا تو غرور و تکبر نہیں شفقت سے پیش آتا لیکن ہمارے زمانے میں یہ حالت ہوگئی ہے کہ عالم اپنے سے بڑے عالم کے کیڑے نکالتا ہے تاکہ لوگ اس سے متنفر ہو جائیں۔ برابر والے کو خاطر میں نہیں لاتا اور ادنیٰ کو ملتے ہی اکڑنے لگتا ہے۔

حماد عراق والوں سے کہا کرتے تھے: میں نے اہلِ حجاز کی جانچ کی تو علم سے کورا پایا۔

بخدا تمہارے لڑکے بلکہ لڑکوں کے لڑکے ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ ابن شہاب سے کہا گیا کہ آپ نے کیا کیا کہ مدینہ کو چھوڑ کر گاؤں کے ہو رہے۔ آپ کے چلے جانے سے مدینہ کے علماء یتیم ہو گئے جواب دیا : دو غلاموں نے مدینہ ہمارے لیے خراب کر دیا، ربیعہ اور ابوالزناد نے۔ حماد نے علماء کوفہ سے کہا : شکر کرو کہ میں عطاء و طاؤس سے مل آیا ہوں تمہارے بچے بھی ان سے زیادہ عالم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حماد کی زیادتی تھی۔ حماد کو امام ابوحنیفہ سے زیادہ کون جانتا ہے، حالانکہ حضرت امام ابوحنیفہ نے عطاء کو حماد پر علمی فوقیت دی ہے۔

ابو یحییٰ حمانی کی روایت ہے کہ امام ابوحنیفہ نے فرمایا : میں نے عطاء بن ابی رباح سے افضل اور جابر الجعفی سے بڑھ کر کذاب کوئی نہیں دیکھا۔

زہری کہا کرتے تھے : اسلام کو تباہ کرنے والا اہل مکہ سے زیادہ اور کوئی نہیں۔

اعمش کا بیان ہے کہ شعبی کی مجلس میں ابراہیم نخعی کا تذکرہ ہوا تو بگڑ کر فرمانے لگے، وہی کانا جو رات کو مجھ سے فتویٰ پوچھتا ہے اور دن کو عالم بن کر لوگوں کو فتویٰ دیتا پھرتا ہے۔ نخعی نے یہ بات سُنی تو کہنے لگے : یہ شعبی مسروق سے حدیث کی روایت کرتا ہے حالانکہ اس کذاب نے مسروق سے ایک حدیث بھی نہیں سنی۔ معاذ اللہ ! یہ ساری بات محض باہمی رقابت تھی ورنہ شعبی کذاب نہ تھے، وہ جلیل القدر امام تھے اور دوسری طرف ابراہیم نخعی کی دیانت اور امامت مسلّم ہے۔

غرضیکہ جلیل القدر علماء اور مشاہیر نے اپنے معاصرین کو بعض حالات میں بڑے سخت الفاظ سے یاد کیا ہے، مگر بایں ہمہ ان لوگوں نے ایک دوسرے کے احترام کمالات اور مراتب کا بھی خیال رکھا ہے لیکن حسد و رقابت کی وجہ سے جو کلمات ایک دوسرے کے خلاف کہے گئے وہ ہر ایک کے لیے قابلِ افسوس ہیں۔ ابوالعتاہیہ نے کتنے درد سے اس صورتِ حال کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے ؎

بکی شجوہ الاسلام من علمائہ ۔۔۔ فما اکترثوا لما راوا من بکاءہ

فاکثرھم مستقبح بصواب من ۔۔۔ یخالفہ مستحسن لخطاءہ

فایھم المرجو فینا الدینہ ۔۔۔ وایھم الوثوق فینا برائیہ

اسلام اپنے علماء کے ہاتھوں رو رہا ہے مگر علماء کو اس کے آنسوؤں کی پروا نہیں۔ اکثر علماء اپنے معاندین کی بُرائیاں بیان کرتے رہتے ہیں مگر اپنی غلطیوں کو سراہتے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم کس کی دینداری کی امید رکھیں اور کس کی رائے پر اعتماد کریں۔

ہم علماء کرام کی اس باہمی چپقلش کا تذکرہ زیادہ تفصیل سے کرنا مناسب نہیں سمجھتے مگر اس رقابت اور علمی نمائش کی ساری کوششوں کے باوجود ان واقعات کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جہاں معاصرین نے ایک دُوسرے سے کشیدگی کے باوجود ان کے کمالات علمی کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔

منصور بن عمار نے ایک بہت بڑے مجمع میں تقریر کی، لوگوں پر بڑا اثر ہوا۔ ان کے ایک ہمعصر شاعر ابوالعتاہیہ بھی مجلسِ وعظ میں موجود تھے اس کامیابی پر جل اُٹھے، لوگوں کو کہنے لگے: منصور نے کوفہ کے ایک عالمِ دین کی تقریر چوری کر کے آپ لوگوں کو سنا دی ہے۔ منصور کو خبر پہنچی تو فرمانے لگے، یہ شاعر زندیق اور ملحد ہے۔ یہ اپنے اشعار میں ہمیشہ موت کا تذکرہ کرتا ہے۔ جنت و دوزخ کا نام تک نہیں لیتا۔ ابوالعتاہیہ نے سُنا تو ہجو میں بہت سے اشعار کہہ ڈالے۔ بایں ہمہ جب منصور کا انتقال ہوا تو ابوالعتاہیہ ان کی قبر پر گئے اور کہا: اللہ! وہ تمام باتیں معاف کر دے جو آپ نے میرے بارے میں کہی تھیں۔

شیخ سعدیؒ کے زمانے میں ایک اور فارسی کا شاعر امامی ہروی تھا۔ اُس زمانے کے لوگ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہے کہ دونوں میں کون زیادہ باکمال ہے چنانچہ ہمگر شیرازی ایک تیسرا شاعر اس بارے میں حکم قرار دیا گیا اور اُس نے امامی کو سعدی سے افضل بتایا۔ یہ ایسا غلط فیصلہ تھا جس کے غلط ہونے میں گزشتہ سات سو برس کے عرصے میں شاید کسی کو کلام ہوا ہو، مگر معاصرت کے اثر نے ہمگر کو اس غلطی کا ادراک نہیں ہونے دیا۔ ہم جن علماء کے حالات آپ کو سنا رہے ہیں ان کے جوشِ حق پرستی نے کبھی ان کو معاصرین کے فضل و کمال سے چشم پوشی نہیں کرنے دی۔ معاصرین شہادت دے رہے ہیں کہ وہ بزرگ جوہر اور کمال کے پرکھنے والے تھے اور جن میں یہ جوہر ہوتا تھا ان کا معاصر، عمر میں چھوٹا، طبقے میں نیچا یا مذہباً مخالف ہونا ان کی قدرشناسی کو کم نہیں کر سکتا تھا امام اعظمؒ امام مالکؒ سے عمر میں تیرہ برس بڑے تھے اور طبقے میں عالی لیکن

جب اُن سے ملے تو اس ادب سے ملے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ شاعر مشہور ابواسحٰق عقیدے کا صابئی تھا[1] مگر جب وُہ مرا تو محض قدردانیٔ کمال کے لیے ہاشمی نسب شریف رضی نے اس کا مرثیہ لکھا اور لوگوں کے طعن کی کچھ پروا نہیں کی۔ معاصرین کے فضل و کمال کا اعتراف اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ علی الاعلان ان کو اپنے آپ سے زیادہ عالم و کامل بتائیں ان کی جلالت کے سامنے اپنی بے مائگی کا اقرار کریں اور جب کوئی مشکل پیش آئے تو اُن سے اُس کے حل کر دینے کا سوال کریں یا آئمہ وہ ان کی تصانیف پر اعتراض کریں تو ان کا شکریہ ادا کیا جائے اور ان کو دعائے خیر سے یاد کیا جائے ایک دفعہ پر امام شعبیؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے جنگی معرکوں کا بیان کر رہے تھے۔ اتفاقاً حضرت ابن عمرؓ کا گزر اسی راستے سے ہوا، امام ممدوح کا بیان سن کر فرمایا کہ جس قوم کا یہ ذکر کر رہے ہیں میں اس کے دیکھنے والوں میں ہوں۔ لیکن مغازی یہ مجھ سے زیادہ اور بہتر جانتے ہیں[2]۔ حضرت امام باقرؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ روئے زمین پر کوئی شخص حج کے مسئلے عطا سے بہتر نہیں جانتا[3]۔ حضرت امام زین العابدین اپنے ایک شاگرد زید ابن اسلم کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے لوگوں نے اس پر تعجب ظاہر کیا تو پاک نفس امام نے فرمایا کہ جس کی صحبت میں دین کا نفع ہوتا ہے اس کے پاس انسان بیٹھتا ہی ہے[4]۔ ایک دفعہ کا ذکر سُنیئے کہ مدینہ طیبہ میں امام زُہری امام ربیعہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک مکان میں لے گئے اور وہاں دونوں نے ایک دوسرے کے علم کو جانچا۔ جب عصر کے وقت وُہ دونوں امام زمانہ باہر تشریف لائے تو زہری تو یہ کہتے نکلے کہ ربیعہ کا مثل مدینے میں نہیں اور ربیعہ فرماتے آئے کہ زہری کے رُتبے کو کوئی نہیں پہنچا[5]۔ ابن اسحٰق اصفہانی جب بصرے گئے اور وہاں کے محدثین سے حدیث پڑھنا چاہی تو سب نے پوچھا کہ تمہارے شہر میں عباس ابن یزید نہیں ہیں؟ انہوں نے کہا: ہیں تو۔ انہوں نے فرمایا کہ ان کے ہوتے ہوئے تم ہمارے پاس کیوں آئے![6] اس واقعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد مبارک میں افراد نہیں

---

[1] ستارہ پرست ۱۲

[2] تذکرہ ۱ ص ۸۶

[3] تذکرہ ۱ ص ۹۸

[4] تذکرہ ۱ ص ۱۰۱

[5] تذکرہ ۱ ص ۱۱۹

[6] تذکرہ ۲ ص ۸۶

بلکہ گروہ کے گروہ حق کے گرویدہ تھے اور حسنِ تعلیم نے سب کے مذاق یکساں پاک صاف کر دیئے تھے۔

امام عمرو ابن دینار امام زہری کے کمالات کا شہرہ سُن کر فرمایا کرتے تھے کہ زہری کے پاس دھرا کیا ہے۔ میں نے ابن عمرؓ کو دیکھا ہے انہوں نے نہیں دیکھا۔ میں نے ابن عباسؓ کو دیکھا ہے انہوں نے نہیں دیکھا۔ اندازِ کلام صاف کہہ رہا ہے کہ ابن دینار کو کمال کا غرّا زہری سے بیزار کر رہا تھا۔ حُسنِ اتفاق کہ اُسی عرصے میں امام زُہری کا مکّہ مکرمہ میں گزر ہُوا۔ جب انہوں نے ان کی آمد کی خبر سُنی تو باوجود پاؤں سے معذور ہونے کے فوراً ملاقات کو تیار ہُوئے اور خدام سے فرمایا کہ مجھ کو امام زہری کے یہاں لے چلو۔ ملازموں نے ارشاد کی تعمیل کی اور ان کو امام ممدوح کی خدمت میں لے آئے۔ جب یہ اُن سے ملے تو زیادہ گرویدہ ہُوئے اور شب کو وہیں رہے۔ صبح کو واپس آتے تو شاگردوں نے سوال کیا کہ کیسے امام زہری کو کیسا پایا؟ ابن دینار کی اگلی رائے کو انصاف مغلوب کر چکا تھا فرمایا کہ واللہ ما رأیت مثل ھذا القرشی ابداً۔ یعنی میں نے اس قرشی کا مثل کبھی نہیں دیکھا۔[1]

مولانا ابن مؤید رومی جب محقق دوانی کے پاس گئے تو محقق نے ان سے سوال کیا کہ روم سے ہمارے لیے کیا ہدیہ لائے۔ مولانا نے یہ سُن کر علامہ خواجہ زادے کی تازہ تصنیف کتاب تہافہ پیش کی۔ محقق نے اس کو لے کر اوقاتِ فرصت میں اس کا مطالعہ کیا۔ جب تمام و کمال دیکھ چکے تو مولانا ابن مؤید سے فرمایا کہ خدائے تعالیٰ تم کو اور اس رسالے کے مصنف کو جزائے خیر دے میں بھی اس مبحث پر ایک کتاب لکھنے کے خیال میں تھا مگر اللہ نے شرم رکھ لی اگر میں اس کتاب کے دیکھنے سے پہلے لکھ چکا ہوتا تو میری بڑی ہنسی ہوتی۔[2] جب تک حضرت سالم ابن عبداللہ زندہ رہے۔ امام نافع نے فتویٰ نہیں دیا۔[3] حضرت سعید ابن المسیب کے پاس جب کوئی حاجت مند فتویٰ پُوچھنے آتا تو امام ممدوح فرماتے کہ سلیمان ابن یسار کے پاس جا کر پُوچھو اس لیے کہ وہ آج سب سے زیادہ عالم ہیں[4] یا سالم (ابن عبداللہ ابن عمرؓ) تو انہوں نے فرمایا کہ یہ مرتبہ سالم کو ہی حاصل ہے۔[5]

---

[1] ابن ج۱ ص ۴۵۱

[2] تذ ج۱ ص ۸۸

[3] شق ج۱ ص ۱۵۰

[4] ابن ج۱ ص ۲۱۳

[5] ابن ج۱ ص ۲۱۸

فراء نحوی اپنے ہمعصر اخفش اوسط سے ملنے گئے تو اخفش نے کہا: اے لوگو! تمہارے پاس لغت اور عربیت کا سردار آیا، فراء نے کہا کہ جب تک اخفش زندہ ہیں اس وقت تک نہیں[1] حضرت عبداللہ ابن مسعود کو جب ضرورت پیش آتی تو وہ زر ابن حبیش سے عربیت کے متعلق باتیں دریافت فرمایا کرتے[2] قابوس نے جب اپنے والد سے یہ سوال کیا کہ آپ صحابہ کرام کی موجودگی میں علقمہ (تابعی) کے پاس کیوں جایا کرتے تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اس لیے جایا کرتا تھا کہ میں نے بعض صحابہ کو دیکھا تھا کہ وہ علقمہ کے پاس تشریف لے جاکر مسائل دریافت فرمایا کرتے تھے[3] خواجہ حسن بصری کو جب کوئی مشکل پیش آجاتی تو بذریعہ تحریر حضرت سعید ابن المسیب سے دریافت فرما لیتے[4] امام ابواحمد کو فنِ حدیث میں ایک بار اشکال پیش آیا تو انہوں نے اپنے معاصر ابن مندہ سے نیشاپور خط بھیج کر حل کر لیا[5] حضرت ابن عمرؓ اکثر امام مجاہد (تابعی) کے گھوڑے کی رکاب تھام لیا کرتے تھے[6]۔ اشہب بن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ کو امام مالکؒ کے حضور میں ایسا مؤدب بیٹھا دیکھا جیسے چھوٹے بڑوں کے سامنے بیٹھتے ہیں[7]۔ امام اعظمؒ امام مالکؒ سے عمر میں تیرہ برس بڑے تھے اور علم میں بھی ان سے عالی ہیں۔ اسی واسطے امام ذہبیؒ واقعۂ بالا کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ "اس سے امام ابوحنیفہؒ کے حسنِ ادب اور تواضع کی کیفیت معلوم ہوتی ہے"۔ اور حق یہ ہے کہ ان بزرگوں کی عظمت کے اصلی اسباب یہی صفات تھے۔ حسنؒ ابن علیؒ کہتے ہیں کہ جب دحیم بغداد میں آئے تو میں نے اپنے والد امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور ابن سالم کو ان کے سامنے ایسا بیٹھے دیکھا جیسے بچے بیٹھے ہوں[8]۔ امام احمد ابن حنبلؒ کے پاس ایک بار امام ذہلیؒ آئے تو امام ابنِ حنبلؒ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ دونوں اماموں کے رتبے میں اس قدر فرق تھا کہ لوگوں کو اس تعظیم سے حیرت ہوئی امام ممدوح نے صرف تعظیم پر کفایت نہیں کی بلکہ اپنے صاحبزادوں اور تلامذہ کو حکم دیا کہ اُن سے جاکر حدیث نقل کریں[9]۔ سفیان ابن عیینہ سے کسی نے

---

[1] ابن ج۱ ص ۲۰۸ [2] تذ ج ص ۴۹ [3] تذ ج۱ ص ۴۲

[4] تذ ج۱ ص ۷۴ [5] تذ ج ص ۲۳۷ [6] تذ ج۱ ص ۸۰

[7] تذ ج۱ ص ۱۰۹ [8] تذ ج۲ ص ۶۴ [9] تذ ج۲ ص ۱۱۲

کہا کہ شہر میں حسین ابن جعفی آئے ہیں ابن عیینہ یہ سُن کر بے اختیار کھڑے ہو گئے اور فوراً ابن جعفی سے جا کر ملے ان کے ہاتھ چُومے اور فرمایا کہ آج یہاں ایسا شخص وارد ہوا ہے جس کی فضیلت سب سے بڑھی ہُوئی ہے سننے کے قابل یہ بات ہے کہ ابن عیینہ ابن جعفی سے بیس برس تو عمر میں بڑے تھے اور طبقۃً عالی۔ امام محمدؒ اور امام شافعیؒ میں جس قدر جزئیات میں اختلاف ہے ظاہر ہے بایں ہمہ امام محمد حنفیؒ امام شافعیؒ کی تکریم کرتے تھے اتنی کسی عالم کی نہیں کرتے تھے[1] امام بوشنجی کسی جنازے کی نماز پڑھانے تشریف لے گئے تھے جب واپس ہونے لگے تو امام ابوعمرو نے ان کے گھوڑے کی باگ تھامی۔ امام ابن خزیمہ نے رکاب اور امام جارودی نے چارجامہ درست کیا۔[2] شیخ ابواسحٰق شیرازی اپنے معاصر امام الحرمین سے ایک موقع پر یُوں خطاب کر رہے تھے:

یامفید اھل المشرق والمغرب انت الیوم امام الائمۃ۔

یعنی اے مشرق و مغرب کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے والے! آج تم سارے اماموں کے امام ہو۔[3] حق پسندی کی انتہا، یہ ہوتی ہے کہ حاکم نیشاپوری محدث مشہور نے فنِ حدیث میں ایک کتاب المدخل فی الصحیح لکھی تھی۔ امام عبدالغنی مصری نے اس کا رد لکھا۔ حاکم نے جب یہ رد دیکھا تو امام مصر کی خدمت میں شکریے کا خط بھیجا اور ان کے حق میں دُعائے خیر کی[4] ذیل کے متفرق واقعات بھی ہمارے مدعا کو کسی نہ کسی پہلو سے ثابت کرتے ہیں۔ ابواسحٰق شاعر مشہور نے جب وفات پائی تو شریف رضی نے اس کا مرثیہ لکھا، لوگ یہ سُن کر بگڑے اور کہا افسوس ہے کہ خاندانِ نبوت سے ہو کر انہوں نے ایک صابی کا مرثیہ لکھنا روا سمجھا۔ شریف ممدوح نے یہ اعتراض سُنا تو فرمایا اور کیا خوب فرمایا: انما رثیت فضلہ (میں نے تو اس کے کمال کا مرثیہ لکھا ہے)[5] الحق ؎

انما یعرف ذاالفضل من الناس ذووہٗ!

حضرت سہل ابن عبداللہ تستریؒ امام ابوداؤدؒ کے پاس (جن کی سنن داخل صحاح ستہ ہیں)

---

[1] تذ ج۱ ص ۳۲۰
[2] ابن ج۱ ص ۴۴۷
[3] تذ ج۱ ص ۲۳۰
[4] ابن ج۱ ص ۲۸۶
[5] تذ ج۳ ص ۲۵۰
[6] ابن ج۱ ص ۱۳

تشریف لے گئے۔ امام نے ان کو اہلاً وسہلاً کہہ کر لیا اور تعظیم سے بٹھایا۔ جب حضرت ممدوح بیٹھ گئے تو امام موصوف سے فرمایا کہ میں ایک کام کے واسطے حاضر ہوا ہوں۔ ابو داؤدؒ نے ارشاد کیا کہ فرمائیے۔ حضرت سہلؒ نے کہا کہ جب تک یہ وعدہ نہ ہو جائے کہ حتی الامکان میری درخواست مقبول ہو گی میں نہ کہوں گا۔ امامِ حدیث نے جب یہ منظور فرما لیا تو انہوں نے کہا کہ اپنی زبان جس سے احادیثِ نبویہ آپ نے روایت کی ہیں نکالیے تاکہ میں اس کو چوم لوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زبان نکالی اور انہوں نے چوم لی[1]۔ مبرّد اور ثعلب ادب کے دو مشہور اماموں میں بوجہ معاصرت چشمک تھی۔ جب مبرّد کے انتقال کی خبر سُنی تو ثعلب نے بہت تاسف کیا اور ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کے بعض اشعار یہ ہیں: ؎

ذهب المبرد وانقضت ایامه — ولیذهبن مع المبرد ثعلب

بیت من الآداب اضحیٰ نصفه — خربًا وباقی النصف منه سیخرب

فتزودوا من ثعلب فبکأس ما — شرب المبرد عن قریب لیشرب

اس زمانے کی حق پسندی کی ایک مثال خطیب بغدادی کے دفن سے متعلق ہے۔ خطیب کا وقت وفات جب قریب ہُوا تو انہوں نے وصیت کی کہ میری قبر بشر حافیؒ کے مزار کے قرب میں بنائی جائے۔ بعد وفات محدثین نے ہر چند تلاش کی مگر کوئی جگہ اس بابرکت قبر کے قریب نہ ملی، صرف ایک لحد تھی جو ایک صوفی ابن زہراء نے حالتِ حیات میں اپنے واسطے تیار کرائی تھی۔ ہر ہفتہ ایک بار وہ اس میں جا کر لیٹتے اور قرآن مجید ختم کرتے۔ جس کنج مزار کو اس محنت سے انہوں نے پاک بنانا چاہا تھا خطیب کے وصیوں نے آخر اُسی کو تاکا اور اُن سے اس کے دینے کی استدعا کی۔ ظاہر ہے کہ یہ کب قبول کرتے۔ وُہ بزرگ گروہ ان سے مایوس ہو کر

---

[1] ابن ج ص ۲۱۴

[2] مبرّد گیا اور اس کی زندگی کے دن گزر گئے۔ مبرّد کی رفاقت میں ثعلب بھی ضرور جائے گا، آداب کا گھر آدھا تو ویران ہو گیا۔ جو آدھا باقی ہے وہ بھی خراب ہوا چاہتا ہے۔ ثعلب کا دم غنیمت سمجھ کر جو تلخ گھونٹ مبرّد نے پیا ہے وہی ثعلب بھی عنقریب پینے والا ہے۔ ۱۲

اُن کے والد کے پاس گیا اور حال بیان کیا۔ باپ نے بیٹے کو بلا بھیجا۔ جب یہ آئے تو ان سے کہا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ قبر تم دے دو، مگر ایک بات پوچھتا ہوں فرض کرو کہ تم کسی موقع پر بشر حافی کے پاس بیٹھے ہوتے اور خطیب وہاں آتے تو تم کیا پسند کرتے کہ خطیب تم سے پائیں میں بیٹھ جائیں۔ ابن زہرا نے کہا، نہیں، میں اپنی جگہ ان کے واسطے خالی کر دیتا۔ نکتہ شناس باپ نے کہا: بس یہی معاملہ بعد رحلت ہونا چاہیے۔ صاف دل صوفی کے دل میں یہ بات اثر کر گئی اور انہوں نے وہ قبر بطیب خاطر دے دی[1]۔ عفان ابن مسلم محدث انصاری کو ایک دفعہ دس[2] ہزار اشرفیاں اس غرض سے دی گئیں کہ فلاں شخص کی نسبت وہ قاضی کی عدالت میں جرح و تعدیل نہ کریں مگر انہوں نے فرمایا کہ میں کسی کے حق کو باطل نہیں کر سکتا، اور یہ کہہ کر اشرفیاں واپس کر دیں[3]۔

اعترافِ کمالِ علم وفضل

علماءِ کرام کے بعض واقعات ہم نے اوپر ہدیۂ قارئین کیے ہیں جن سے ہمارے اسلاف کا اپنے معاصرین علماء سے سلوک ظاہر ہوتا ہے۔ یہ علماءِ کرام اتنے عالی ظرف تھے کہ انہوں نے معاصرین کی چشمک بازی کے باوجود کبھی کمالِ علم وفضل کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیا وہ اپنے ہم عصر علماء سے خواہ عمر میں چھوٹے ہوں یا بڑے، تولیت میں ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ، مالی اعتبار سے امیر ہوں یا غریب، ہمیشہ مستفید ہوتے رہے اور اپنے احباب کو ان کے علم وفضل سے سیراب ہونے کا مشورہ دیتے۔ وہ حق پسندی کے جوہر سے مزین تھے اور برہنہ شمشیر کے سامنے بھی حق پسندی کو ترک نہ کرتے۔ وہ اپنے نفس کو عجز وانکسار کی سزا دیتے تھے مگر اعترافِ کمال سے نہ رکتے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے۔ اور اگر ہمعصر علماء کی رائے ان سے بہتر ہوتی تو ان کے ممنون ہوتے اور اپنی رائے سے رجوع کرتے۔ فقہ کی کتابیں ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں کہ اُمت کے پیشوا اماموں نے کئی مسئلوں میں اپنی ایک رائے ظاہر کی اور عقیدت کی رو سے وہ مشرق و مغرب میں پھیل گئی اور ایک عالم میں اس پر عمل ہونے لگا۔ پھر جب ان کو اپنی رائے کی

---

[1] ابن ج ا ص ۱۳ [2] تذ ج ص ۳۲۰

[3] ایک اشرفی اگر دس روپے کی رکھی جائے تو ایک لاکھ روپے ہوتے ہیں۔

غلطی کی حس ہوئی تو انہوں نے علی الاعلان اپنی پہلی رائے کو چھوڑ دیا، اس کی نظیریں ابھی عرض کی جائیں گی کہ بڑے بڑے جلیل القدر اماموں نے اپنے شاگردوں کی شاگردی کی ہے۔ ایسے بھی پاک نفس بندے تھے جو کسی فن یا علم میں مشہور روزگار ہوتے تھے اور جب ان کے سامنے اسی علم کا کوئی ایسا سوال پیش کیا جاتا جس کا جواب انہیں معلوم نہ ہوتا تو وہ بہ دل کسی پس و پیش کے سائل سے فرما دیتے تھے لا ادری یعنی میں نہیں جانتا۔ امام شافعیؒ جن کی رائے پر لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں نے اپنے دین اور دنیا کو چھوڑ دیا ہے اپنی عقل اور رائے کی نسبت یہ فرماتے ہیں: ؎

کلما ادبنی الدھر اراٰنی نقص عقلی
واذا ما ازددت علماً زادنی علمی بجھلی

یہ باتیں کہنے کو تھوڑی اور چھوٹی ہیں مگر کرنے کو بڑی ہیں اور بہت بڑی۔ سلیمان ابن یسار فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ حضرت ابن عمرؓ اکثر سوالوں کے جواب میں لاَ ادری فرما دیتے تھے مگر حضرت ابن عباسؓ کسی سائل کو مایوس نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو تعجب ہوتا تھا کہ عبد اللہ ابن عمرؓ کیوں لا ادری کہہ کر لوگوں کو ناکام واپس کر دیتے ہیں اور فرماتے تھے کہ جو مسئلہ مشتبہ پیش آئے اس میں اول تو سنت کو تلاش کرنا چاہیے اور اس کے مطابق حکم دینا اور اگر صریح سنت نہ ہو تو اپنے اجتہاد سے مدد لیں اتفاق زمانہ کہ ایک روز کوئی مسئلہ ان کے سامنے ایسا پیش ہوا جس کے جواب میں حضرت ممدوح متحیر رہ گئے۔ اُس وقت ان کو اپنا وہ مقولہ یاد آیا جو حضرت ابن عمرؓ کے مقابلے میں فرمایا کرتے تھے اور ازراہِ انصاف ارشاد کیا کہ البلاء موکل بالقول[1]۔ حدیث کے عالی مرتبہ امام شعبیؒ بھی اکثر سوال کے وقت لاَ ادری کہہ دیتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ ہم فقیہ نہیں ہیں ہم نے تو بس یہ کیا ہے کہ جو حدیث سُنی اس کو روایت کر دیا۔ فقہاء وہ ہیں جو علم پر عمل بھی کرتے ہیں[2] جلیل القدر تابعی

---

[1] بولنا بلاء میں ڈالتا ہے۔ تدریج ص ۳۳

[2] تدریج ص ۳۴

حضرت عطاؒ کے پاس ایک روز ابن ابی لیلیٰ گئے تو حضرت عطاؒ نے ان سے بعض مسئلے ازرو استفادہ دریافت کیے۔ جو لوگ ان کی شانِ امامت سے واقف تھے ان کو تعجب ہوا کہ ابن ابی لیلیٰ سے عطا استفادہ کریں۔ حضرت عطاؒ نے سُنا تو فرمایا کہ حیرت کیا ہے ابن ابی لیلیٰ مجھ سے زیادہ عالم ہیں[1]۔ ان بزرگوں کی پاک نفسی اس سے معلوم ہوتی ہے کہ اپنے شاگردوں کے مقابلے میں اپنے علم و کمال کو کمتر سمجھتے تھے۔ ابن عیینہ نے اپنے شاگرد علی ابن مدینی کی نسبت ایک مرتبہ فرمایا کہ لوگو! تم مجھ کو ابن مدینی کے ارتباط پر ملامت کرتے ہو۔ واللہ وُہ جتنا علم مجھ سے حاصل کرتے ہیں اس سے زیادہ میں ان سے سیکھ لیتا ہوں[2]۔ یحییٰ ابن معین اپنے شاگرد امام ابن حنبلؒ کی نسبت فرماتے ہیں کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں مثل احمد ابن حنبلؒ کے ہو جاؤں۔ قسم ہے اپنے رب کی میں ان کے مرتبے کو نہیں پا سکتا[3]۔ حماد ابن زید کا اپنے معاصر شعبہ کے بارے میں یہ قول تھا کہ جب حدیث میں میری اور شعبہ کی رائے میں مخالفت آپڑتی ہے تو میں اپنی رائے چھوڑ کر شعبہ کا قول اختیار کر لیتا ہوں اس لیے کہ شعبہ شیخ سے ایک حدیث بیس دفعہ سُن کر بھی سیر نہیں ہوتے تھے اور میں ایک بار کے سُن لینے پر قانع ہوں[4]۔ امام شعبہ فرماتے تھے کہ سفیان احفظ منی یعنی سفیان کو مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں۔ اُن کے عہد میں اس فنِ پاک کا کمال حفظ پر موقوف تھا، لہٰذا امام شعبہ کا حضرت سفیان کو اپنے آپ سے زیادہ حافظ حدیث بتانا گویا یہ کہنا ہے کہ وُہ زیادہ عالم ہیں[5]۔ امام اوزاعی شام کے مقتدا ایک روز امام فزاری کو خط لکھوانے لگے تو کاتب سے فرمایا کہ اوّل ان کا نام لکھنا اس لیے کہ واللہ! وہ مجھ سے بہتر ہیں[6]۔ خواجہ حسن بصریؒ نے کسی موقع پر بیان فرمایا تھا کہ منافق کو تین علامتوں سے پہچان لیا کرو۔ جب وُہ بات کرے تو جھوٹ بولے، کسی کی امانت رکھے تو خیانت کرے۔ وعدہ کرے تو خلاف وعدگی کرے۔ حضرت عطاؒ نے ان کا یہ قول سُنا تو اعتراض کیا کہ حضرت یعقوبؑ کے فرزندوں میں یہ تینوں صفتیں تھیں۔ انہوں نے جھوٹ بولا،

---

[1] تذ ج ۱ ص ۹۸
[2] تذ ج ۲ ص ۱۶
[3] تذ ج ۲ ص ۱۹
[4] تذ ج ۱ ص ۱۶۵
[5] تذ ج ۱ ص ۱۸۴
[6] تذ ج ۱ ص ۲۴۹

امانت میں خیانت کی اور وعدہ خلافی بھی کی۔ بایں ہمہ خدا تعالیٰ نے ان کو نبوت کا درجہ بخشا۔ لگانیوالے تو بُرے ہوتے ہیں کسی نے حضرت عطاء کا یہ اعتراض خواجہ صاحب کے کان میں ڈال دیا۔ پاک نفس خواجہ نے یہ سن کر ازراہِ انصاف فرمایا کہ وفوق کل ذی علم علیم[1] لوگوں کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ ہمارے امام ابوحنیفہ کی (جن کو دربارِ فضل سے امام اعظم کا خطاب ملا ہے) ایک ادنیٰ پیشہ ور حجام نے پانچ غلطیاں پکڑی تھیں امام اعظم نے اس حجام کی یہ قدر کی کہ اس واقعے کو خود سُنا کر قیامت تک اس کا نام زندہ کر دیا۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ ایامِ حج میں میں نے ایک حجام سے حجامت بنوانے کا قصد کیا۔ جب میں اس سے اُجرت ٹھہرانے لگا تو اس نے کہا کہ مناسک[2] کی اجرت نہیں ٹھہرائی جاتی اس نے جب حجامت بنانی شروع کی تو میرا منہ قبلے کی جانب نہ تھا۔ اس پر حجام نے کہا کہ قبلہ رُخ ہو بیٹھو میں نے بائیں طرف سے حجامت بنوانے کا ارادہ کیا تو وہ بولا کہ حجامت سیدھی جانب سے اول بنوائی جاتی ہے۔ وہ اپنے کام میں مشغول تھا اور میں خاموش۔ اس پر اس نے ہدایت کی کہ تکبیر پڑھتے جاؤ۔ حجامت سے فارغ ہو کر میں اُٹھ کر چلا تو میرے مہربان نے پُوچھا کہ کہاں چلے؛ میں نے کہا کہ اپنی فرودگاہ پر جاتا ہوں۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ اوّل دو رکعتیں پڑھ لو پھر قیام گاہ کا قصد کرنا۔ اب تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پُوچھا کہ یہ باتیں تم کو کس نے بتلائی ہیں؛ حجام نے جواب دیا کہ میں نے حضرت عطاء کا طریقِ عمل ایسا ہی دیکھا تھا[3]۔ ائمہ حدیث کے حالات میں اس کی مثالیں کثرت سے ہیں کہ جب ان کے شاگرد بنے تو انہوں نے ان سے حدیثیں حاصل کیں بلکہ محدثین کا یہ قول ہے کہ انسان اس وقت تک محدث نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اعلیٰ، ہمسر اور کمتر تینوں طبقوں سے روایت نہ کرے[4]

احمد ابن سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے اسحٰق بن راہویہ کو یہ کہتے سُنا کہ خدا تعالیٰ حق کو پسند فرماتا ہے لہٰذا میں کہتا ہوں کہ ابو عبید (بغدادی) مجھ سے علم میں بڑھ کر اور فقہ میں زیادہ ہیں ہم

---

[1] ہر ذی علم سے بڑھ کر ایک عالم ہے ۱۲ — [3] ابن ج ۱ ص ۳۱۹

[2] وہ اعمال جو حج سے تعلق رکھتے ہیں ۱۲ — [4] ابن ج ۱ ص ۳۱۹

[5] معقدمہ ص ۵۶۵

ابوعبید کے محتاج ہیں مگر ان کو ہماری احتیاج نہیں[1]۔ جب سلیمان حافظِ حدیث بغداد میں وارد ہوئے اور امام احمد بن حنبلؒ نے ان کی آمد کی خبر سنی تو حاضرین سے فرمایا کہ چلو سلیمان سے راویانِ حدیث کا پرکھنا سیکھیں[2]۔ امام ممدوح اور سلیمان کی جلالت شان میں جو فرق بیّن تھا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ایک عالم محمد کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ ابن معین کا یہ مقولہ سنا تھا کہ ہم راویانِ حدیث پر جرح کر رہے ہیں حالانکہ ممکن ہے کہ وہی لوگ دو سو برس سے بہشت میں آسودہ ہوں۔ ایک روز میں جو ابن ابی حاتم کی خدمت میں گیا تو وہ فنِ رجال کا درس دے رہے تھے۔ میں نے امام ممدوح کا قولِ مذکور ان کو سنایا۔ ان پر اس مقولے کا یہ اثر ہوا کہ رونے لگے۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا اور کتاب ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔ زار زار روتے تھے اور بار بار مجھ سے اس روایت کو کہلواتے تھے[3]۔

ایامِ طالب علمی میں ایک روز امام دارقطنی ابن انباری کی مجلسِ درس میں شریک ہوئے۔ دورانِ املا میں ابن انباری نے ایک نام میں غلطی کی۔ دارقطنی کو اتنی جسارت تو نہ ہوئی کہ ابن انباری کو متنبہ کرتے مگر ان کے مستملی کو وہ غلطی جتادی۔ جب دوسرے جمعے کو دارقطنی پھر مجلس مذکور میں گئے تو ابن انباری نے باعلان فرمایا کہ ہم نے اس روز فلاں نام میں غلطی کی تھی۔ اس نوجوان نے ہم کو اس غلطی پر آگاہ کر دیا۔ جوشِ حق پسندی اس کو کہتے ہیں۔ اگر ابن انباری اس راز کو فاش نہ کرتے تو شاید دنیا کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی، مگر انہوں نے یہ خیال فرمایا کہ اپنی ایک خطا ظاہر ہو جائے تو مضائقہ نہیں لیکن جو نوجوان طالب علم دل بڑھائے جانے کا مستحق ہے اس کی حق تلفی نہ ہونی چاہیے۔ حافظ ابن خیرون کو کسی نے حافظ لکھا تو وہ بگڑ گئے اور فرمایا کہ میری کیا ہستی ہے جو مجھ کو حافظ لکھا جائے[5]۔ آج کل کے محمد فاضل اپنے نام کے اوّل میں مولوی لکھا دیتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ حق بحقدار رسید۔ آلِ سلجوق کے بلند پایہ وزیر نظام الملک طوسی نے جو نظامیہ مدرسہ بغداد میں قائم کیا تھا اس میں شیخ ابو اسحٰق شیرازی اور امام حجۃ الاسلام غزالی جیسے

---

۱ تذ ج۲ ص ۶
۲ تذ ج۲ ص ۶۲
۳ تذ ج۱ ص ۵۰
۴ تذ ج۴ ص ۶۱
۵ تذ ج۴ ص ۸

اکابر مدرس رہے تھے۔ فخر الاسلام شافعیؒ جب اس کے مدرس مقرر ہوئے تو پہلے روز مسندِ تدریس پر متمکن ہونے کے بعد ان اکابر کا تصور ان کو ہوا جو اس مسند کی عزت بڑھا چکے تھے۔ اس تصور نے ان کے پاکیزہ قلب پر ایک کیفیت طاری کر دی، اپنا عمامہ آنکھوں پر رکھ کر بے اختیار روئے اور یہ شعر پڑھا، ؎

خلت الدیار فسدت غیر مسود

ومن العنا تفردی بالسود د

یعنی ملک اہل کمال سے خالی ہو گیا اور میں جو شایانِ سرگروہی نہ تھا سرگروہ بنا۔ میرا سرگروہِ یگانہ بننا کیسا اندوہ فزا ہے[1]۔ ادب عربی میں جو مرتبہ اصمعی کا ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔ باوجود کلام عرب کے دقائق سے واقف ہونے کے یہ امامِ ادب کلام اللہ اور حدیث کے معنے بیان کرنے سے بہت بچتا تھا جب اس سے اس قسم کا سوال کیا جاتا تو اصمعی یہ جواب دیتا کہ عرب اس لفظ کے یہ معنے لیتے ہیں مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتاب وسنت میں اس لفظ کے کون سے معنے مراد ہیں[2]۔ امام ادب ابو العباس ثعلب کے پاس ایک شخص آیا اور ان سے کسی علمی مسئلے کا جواب چاہا۔ ثعلب کو چونکہ وہ مسئلہ معلوم نہ تھا اس لیے جواب میں لا ادری کہہ دیا۔ وہ بیچارا اس امید پر آیا تھا کہ ان کے پاس اس کی مشکل حل ہو جائے گی۔ یہاں جو یہ صاف جواب سُنا تو بہت جھنجلایا اور کہا کہ حضور کی یہ تو شہرت ہے کہ لوگ سفر کر کے حاضر ہوتے ہیں اور علم کا یہ حال کہ ایک ذرا سے سوال کے جواب میں لا ادری ارشاد ہوتا ہے۔ ثعلب نے از راہِ ظرافت کہا کہ میرے پاس جتنی لا ادریاں ہیں اگر تمہارے پاس اتنے اونٹ ہوتے تو تم بڑے مالدار ہو جاتے[3]۔ متنبی زبان عربی کے مشہور شاعر کا واقعۂ قتل اس بات کی کہ ان دنوں سچی بات دلوں پر کیا اثر کرتی تھی ایک بے نظیر مثال ہے۔ ایک مرتبہ شاعر مذکور اپنے وطن کوفہ کو واپس آرہا تھا جب بغداد کے سواد میں پہنچا تو خونخوار قزاقوں نے حملہ کیا۔ اوّل تو متنبی مع رفقاء کے خوب لڑا،

---

[1] ابن ج ۱ ص ۴۶۵　[2] ابن ج ۱ ص ۳۰

[3] ابن ج ۱ ص ۳۰

مگر پھر جان بچا کر بھاگا۔ اس کے دلیر غلام نے آقا کو بھاگتا دیکھ کر کہا کہ جس شخص کا یہ شعر ہو حیف ہے کہ لوگ اس کی طرف بھاگنے کا تذکرہ زبان پر لائیں۔ ؎

فالخیل[1] واللیل والبیداء تعرفنی
والحرب والضرب القرطاس والقلم

متنبی یہ سن کر میدان کی طرف لوٹ پڑا اور آتنا لڑا کہ اسی جگہ کام آگیا[2]۔ ابوالعلاء اور ابن ابی اسحٰق دونوں فن ادب کے مشہور امام تھے۔ ایک بار نحو کے علم میں ان میں باہم مناظرہ ہوا تھا۔ کسی موقع پر ابوالعلا نے یونس نحوی سے اس مناظرے کا تذکرہ کیا تو صاف دلی سے اعتراف کیا کہ اس مناظرے میں ابن ابی اسحاق قاعدۂ ہمزہ میں مجھ پر غالب آگئے تھے۔ اس فصل پر میں نے بعد کو غور کی ہے[3]۔ ابوزید انصاری سے کسی نے پوچھا کہ فلاں موقع پر تم مخرزق بولتے ہو اور ابوعمرو مُحرِزق صحیح کون سا لفظ ہے۔ ابوزید نے کہا کہ چونکہ ابوعمرو کے والد نبطی ہیں اور یہ لغت بھی نبطی ہے اس لیے ابوعمرو کا قول زیادہ مستند ہے[4]۔ شعراء اپنی بددماغی اور بے نیازی میں ضرب المثل ہیں۔ ان کی نازک مزاجی دوسروں کے کمال کے سامنے سر جھکانے کو گوارا نہیں کرتی۔ جس قرن کا ذکر ہم کر رہے ہیں اس کے اثر نے شاعروں کو بھی اچھوتا نہیں چھوڑا تھا۔ ابوالعتاہیہ ایک دفعہ اپنے معاصر بشار سے ملنے گئے اور اثنائے کلام میں بشار سے کہا کہ تمہارے یہ اشعار مجھ کو نہایت پسند ہیں ؎

کم من صدیق لی اسا رقه البکاء من الحیاء
واذا تفطن لامنی فاقول ما لی من بکاء
لکن ذھبت لارتدی فطرفت عینی بالرداء

بشار نے کہا کہ اس مضمون میں تقدم کا شرف آپ کو حاصل ہے اور میں آپ کا کاسہ لیس

---

[1] گھوڑا رات جنگل حرب وضرب اور کاغذ و قلم یہ سب مجھ کو خوب پہچانتے ہیں ۱۲
[2] ابن خ ص ۳۰ [3] نزہت ص ۲۳
[4] نزہت ص ۱۲۴

ہُوں اور میرا یہ شعر تمہارے ہی دریا کا قطرہ ہے چنانچہ آپ نے کہا ہے : سہ

فقالوا قد بکیت فقلت کلا — وھل تبکی من الجزع الجلید

ولکن قد اصاب سواد عینی — عوید قذی لہ طرف حدید

فقالوا مالد معھما سواء — اکلتا مقلتیک اصاب عود[1]

ایک روز مولانا شمس الدین رومیؒ سے کسی نے کہا کہ شیخ ابن الوفاؒ مولانا خسروؒ کے پاس تو جاتے ہیں مگر آپ کے پاس نہیں آتے مولانا نے جواب دیا کہ حق بجانب شیخ کے ہے۔ مولانا خسروؒ عالم با عمل ہیں اس لیے قابلِ زیارت ہیں۔ میں نے اگرچہ علم پڑھا ہے مگر سلاطین کی صحبت میں بیٹھتا ہُوں، اس واسطے قابلِ زیارت نہیں رہا۔[2]

علماءِ کرام کی راست گوئی جس پاک گروہ کو ہم نے مدارس دینیہ میں سرگرم طلب علم دیکھا اور مساجد کی پُرانی چٹائیوں پر علم وفضل حاصل کرتے پایا۔ وُہ جب مکتب و مدرسہ سے باہر آئے تو انھوں نے اپنے عزم و استقلال سے اسلامی معاشرت پر بڑے گہرے اثرات مرتسم کیے۔ اسلامی مکتب کی یہ کرامت تھی کہ یہ بوریا نشین جب دنیا کے جابر اور سفاک آمروں کے دربار میں لائے گئے تو حق گوئی کے فریضہ کو پُورا کرنے کیلئے انھوں نے کبھی کوتاہی نہ کی اور ہر بلا و مصیبت کا سامنا کیا۔ قید و بند تو عام چیز ہے۔ انھوں نے دار و رسن کے مقام پر کھڑے ہو کر حق گوئی کا فریضہ سرانجام دیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حجاج جیسے جابر کو خطبہ پڑھتے سنا تو غضب آلود ہو کر فرمانے لگے، خدا کا دشمن خدا کی حرام کی ہُوئی چیزوں کو حلال کرتے جاتا ہے۔ اللہ کے گھر کو اجاڑ رہا ہے، خدا کے بندوں کو قتل کرتا ہے۔ یہ سن کر حجاج نے حکم دیا کہ ابن عمرؓ کو زہر آلود خنجر سے ہلاک کیا جائے۔ اسی سفاک حاکم حجاج کے سامنے حضرت سعید ابن جبیرؓ نے جس راست گوئی کا مظاہرہ کیا، وہ علماءِ حق کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔

اگر تاریخ اسلام کے مختلف دوروں اور سلسلۂ دعوت و تجدید امت مرحومہ کی پچھلی کڑیوں پر

---

[1] ابن ج ۱ ص ۳،

[2] شق ج ۱ ص ۹۴

[3] تذکرہ مطبوعہ عرایڈیشن ۱۹۱۹ء (کلکتہ) ص ۱۱

نظر ڈالو تو یہ جو کچھ کہا گیا، اس کی تصدیق ہر دور کے واقعات پیش کریں گے۔ افسوس کہ یہ موقع تفصیل کا نہیں، ہر دور میں تم پاؤ گے کہ اگرچہ عامۂ علماء و صلحاء اُمت کی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی اور ان کا فضل و کمال اور ورع و تقویٰ بھی ہر طرح مسلّم و ثابت ہے، بلکہ بعض ان میں ایسے تھے کہ علم و عمل کی متعدد شاخوں میں اپنا عدیل و نظیر نہیں رکھتے تھے۔ بااین ہمہ اس عہد کی عزیمتِ دعوت اور تجدیدِ ملّت کے مرتبۂ مخصوص میں ان کا کوئی حصّہ نہ ہوا، اور صرف چند خاص افرادِ عزائم ہی کی قسمت میں آیا یا تو ان کے قدمِ ہمّت نے علم و عمل کی دوسری شاخوں پر قناعت کر لی، یا اس راہ میں قدم بڑھانے کی جُرأت ہی نہ کر سکے۔ عہدِ اوائل بنو امیّہ میں کہ ابھی ہجرت کی پہلی صدی بھی ختم نہیں ہوئی تھی، کتنی بڑی جماعت اجلّۂ صحابہ کرام اور ارکانِ بیتِ نبوّت و بقیہ صالحہ خیرالقرون کی موجود تھی؛ اور کون ہے جو ان کی عظمت و شرف میں ایک لمحہ کے لیے بھی شک کر سکے؛ لیکن بدعات و محدثاتِ بنو اُمیّہ کے مقابلے میں سرفروشانہ اقدامِ عزیمت و فتحِ بابِ مقاومت و ثبات فی الحق و العدل کا جو ایک مخصوص مقام تھا، وہ تو بجز حضرت امام حسین (علیہ و علیٰ اٰبائہٖ و اجدادہ الصّلوٰۃ و السلام) کے اور کسی کے حصّے میں نہ آیا، عبدالملک بن مروان کا زمانہ اجلّۂ تابعین و حفّاظِ سنّت و حملۂ علومِ نبویہ سے مملو تھا، لیکن اتباعِ سنّت و قیامِ حق کی راہ میں سو دُرّوں کی ضرب مردانہ وار برداشت کر لینے اور مبغوضِ مبتدعینِ آلِ مروان اور محبوبِ قلوبِ مومنین ہونے کا جو شرفِ مخصوص سیدالتابعین و اعلم بقضاءِ رسول اللّٰہ و خلفائہ یعنی حضرت سعید بن المسیّبؓ کے حصّہ میں آیا، اس میں تو ان کا کوئی سہیم و شریک نہ تھا؛ منصور عباسی کے زمانے میں کون کہہ سکتا ہے کہ اصحابِ علم و عمل کا کال تھا؛ لیکن معلوم ہے کہ شاہانِ جور کے مقابلے میں ثباتِ حق و اعتقاد کا جو مقامِ عزیمت امام دارالہجرت حضرت مالک بن انس رحمۃ اللّٰہ علیہما کو بہ ضمن مسئلہ یمین و طلاق مکرہ ملا وہ تو صرف انہی کے لیے تھا؛ یہ کیا چیز تھی کہ عین اس وقت جبکہ مشکیں اس زور سے کس دی گئی تھیں کہ ہاتھ بازو سے اُکھڑ گیا تھا اور ستر کوڑوں کی ضربیں ان کے جسمِ اقدس پر پڑ رہی تھیں، تو اسی اونٹ کی پیٹھ پر کھڑے ہو گئے جس پر تذلیل و تشہیر کے لیے سوار کرا دیا گیا تھا اور پکار کر کہا:

"من عرفنی فقد عرفنی و من لم یعرفنی فانا مالک بن انس اقول

ان الطلاق المکرہ لیس بشیٔ۔"

یعنی جو مجھ کو جانتا ہے سو جانتا ہے ، اور جو نہیں جانتا تو جان لے کہ میں ہوں مالک انسؓ کا بیٹا، اور اسی مسئلہ کا اعلان کرتا ہوں جس کے اعلان سے مجھ کو جبراً روکا جا رہا ہے کہ طلاق مکرہ کوئی چیز نہیں ! سبحان اللہ ! یہ وہی مقامِ عزیمتِ کبریٰ کی شاہی و فرمانروائی تھی جس کے آگے دنیا کی بادشاہتیں بالِ مگس کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں، اور یہی وُہ ہیبت ربانی اور جلالتِ روحانی تھی جس کو دیکھ کر حضرت سفیان ثوری بے اختیار پکار اُٹھے تھے :

فھوالمہاب و لیس ذا سلطان!

کیا خوب فرمایا حافظ ابن جوزی نے امام موصوف کے حالات میں کہ "فکانّما کانت تلک السیاط حلیا حلی بہ" ! یعنی ان کو کوڑوں سے پیٹا گیا اور مشکیں کسی گئیں ، لیکن ان باتوں سے ان کی عزت و عظمت گھٹنے کی جگہ اور بڑھ گئی۔ گویا یہ ضربِ تازیانہ ان کے جمالِ عظمت و اجلال کا زیور تھا کہ جب پہنا دیا گیا تو اس کی رعنائی و خوبروئی دوچند ہوگئی ! ؎

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود!

تیسری صدی کے اوائل میں جب فتنۂ اعتزال و تعمق فی الدین اور بدعت مضلۂ تکلم بالفلسفہ وانحراف از اعتصام بالسنۃ نے سر اٹھایا اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ لگاتار تین عظیم الشان فرمانرواؤں یعنی مامون، معتصم اور واثق باللہ کی شمشیرِ استبداد و قہرِ حکومت نے اس فتنہ کا ساتھ دیا حتیٰ کہ بقول علی بن المدینی کے فتنۂ ارتداد و منع زکوٰۃ (بعہد حضرت ابوبکرؓ) کے بعد یہ دوسرا فتنۂ عظیم تھا جو اسلام کو پیش آیا ، تو کیا اس وقت علماءِ امت اور ائمۂ شریعت سے عالم اسلامی خالی ہو گیا تھا ؟ غور تو کرو ، کیسے کیسے اساطین علم و فن اور اکابرِ فضل و کمال اس عہد میں موجود تھے؟ خود بغداد علماء اہل سنت وحدیث کا مرکز تھا مگر سب دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے اور عزیمتِ دعوت وکمال مرتبۂ وراثت نبوت و قیامِ حق وہدایت فی الارض والامت کا وہ جو ایک مخصوص مقام تھا ، صرف ایک ہی قائم لامر اللہ کے حصہ میں آیا یعنی سید المجددین و امام المصلحین حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ ۔ اپنے اپنے رنگ میں سب صاحب مراتب و مقامات تھے لیکن اس مرتبہ میں تو اور کسی کا ساجھا

نہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قیامِ سنّت و دینِ خالص کا قیامت تک کے لیے فیصلہ ہونے والا تھا، اور مامون و معتصم کے جبر و قہر، اور بشر مریسی اور قاضی ابن ابی داؤد جیسے جابرہ معتزلہ کے تسلط و حکومت نے علمائے حق کے لیے صرف دو ہی راستے باز رکھے تھے یا اصحابِ بدعت کے آگے سر جھکا دیں اور مسئلہ خلقِ قرآن پر ایمان لاکر ہمیشہ کے لیے اس کی نظیر قائم کر دیں کہ شریعت میں صرف اتنا ہی نہیں ہے جو رسول نے بتلایا گیا بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا اور کیا جا سکتا ہے، اور ہر ظن کو اس میں دخل ہے۔ ہر رائے اس پر قاضی و آمر ہے، ہر فلسفہ اس کا مالک و حاکم ہے۔ یفعل ما یشاء و یختار۔ اور یا پھر قید خانے میں رہنا، ہر روز کوڑوں سے پٹیا جانا، اور ایسے تہ خانوں میں بند ہو جانا کہ "لا یرون فیہ الشمس ابدا" کو قبول کریں۔ بہتوں کے قدم تو ابتدا ہی میں لڑکھڑا گئے بعضوں نے ابتدا میں استقامت دکھلائی لیکن پھر ضعف و رخصت کے گوشے میں پناہ گیر ہو گئے۔ عبد اللہ بن عمر القواریری اور حسن بن حماد امام موصوف کے ساتھ ہی قید کیے گئے تھے مگر شدائد و محن کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے چھوٹ گئے۔ بعضوں نے روپوشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی کہ کم سے کم اپنا دامن تو بچا لے جائیں۔ کوئی اس وقت کہتا تھا:

"لیس ھذا زمان حدیث، انما ھذا زمان بکاء و تضرع و دعاء کدعاء الغریق۔"

یعنی یہ زمانہ درس و اشاعتِ علوم و سنّت کا نہیں ہے۔ یہ تو وہ زمانہ ہے کہ بس اللہ کے آگے تضرع و زاری کرو اور ایسی دعائیں مانگو جیسے سمندر میں ڈوبتا ہوا شخص دعا مانگے۔ کوئی کہتا تھا:

"احفظوا السنتکم، عاجلوا قلوبکم، وخذوا ما تعرفوا ودعوا ما تنکروا۔"

اپنی زبانوں کی نگہبانی کرو، اپنے دل کے علاج میں لگ جاؤ، جو کچھ جانتے ہو، اس پر عمل کیے جاؤ، اور جو برا ہو اس کو چھوڑ دو۔ کوئی کہتا: "ھذا زمان السکوت و ملازمۃ البیوت" یہ زمانہ خاموشی کا زمانہ ہے اور اپنے اپنے دروازوں کو بند کر کے بیٹھ رہنے کا۔ جبکہ تمام اصحابِ کار و طریق کا یہ حال ہو رہا تھا اور دینِ خالص کا بقا و قیام ایک عظیم الشان قربانی کا طلب گار تھا، تو غور کرو کہ صرف امامِ موصوف ہی تھے جن کو فاتح و سلطانِ عہد ہونے کا

شرف حاصل ہُوا۔ انھوں نے نہ تو دعاتِ فتن و بدعت کے آگے سر جھکایا، نہ رُوپوشی و خاموشی و کنارہ کشی اختیار کی، اور نہ صرف بند حجروں کے اندر کی دعاؤں اور مناجاتوں پر قناعت کر لی، بلکہ دینِ خالص کے قیام کی راہ میں اپنے نفس و وجود کو قربان کر دینے اور تمام خلفِ اُمت کے لیے ثبات و استقامت علی السنتہ کی راہ کھول دینے کے لیے بحکم فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل اٹھ کھڑے ہوئے، ان کو قید کیا گیا، قید خانے میں چلے گئے۔ چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں ڈالی گئیں، پہن لیں، اسی عالم میں بغداد سے طرطوس لے چلے اور حکم دیا گیا کہ بلا کسی مدد کے خود ہی اُونٹ پر سوار ہوں اور خود ہی اونٹ سے اتریں۔ اس کو بھی قبول کر لیا۔ بوجھل بیڑیوں کی وجہ سے ہل نہیں سکتے تھے۔ اٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ عین رمضان المبارک کے عشرۂ اخیر میں جس کی طاعت اللہ کو تمام دنوں کی طاعات سے زیادہ محبوب ہے، بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھائے گئے، اور اس پیٹھ پر جو علوم و معارفِ نبوت کی حامل تھی، لگاتار کوڑے اس طرح مارے گئے کہ ہر جلاد دو ضربیں پُوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر نیا تازہ دم جلاد اس کی جگہ لیتا۔ اس کو بھی خوشی خوشی برداشت کر لیا، مگر اللہ کے عشق سے مُنہ نہ موڑا اور راہِ سنّت سے منحرف نہ ہوئے۔ تازیانے کی ہر ضرب پر بھی جو صدا زبان سے نکلتی تھی وُہ نہ تو جزع و فزع کی تھی اور نہ شور و فغاں کی، بلکہ وہی تھی جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ یعنی "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق"! اللہ اللہ! یہ کیسی مقام دعوتِ کبریٰ کی خسروی و سلطانی تھی، اور وراثت و نیابتِ نبوت کی ہیبت و سطوت کہ خود معتصم باللہ جس کی ہیبت و رعب سے قیصرِ روم لرزاں و ترساں رہتا تھا، سر پر کھڑا تھا، جلادوں کا مجمع چاروں طرف سے گھیرے ہُوئے تھا اور وُہ بار بار کہہ رہا تھا:

"یا احمد! واللہ انّی علیک لشفیق وانّی لاشفق علیک کشفقتی علی ھارون ابنی وواللہ لئن اجابنی لا طلقن عنک بیدی۔ ما تقول؟

یعنی واللہ میں تم پر اس سے بھی زیادہ شفقت رکھتا ہوں جس قدر اپنے بیٹے کے لیے شفیق ہوں۔ اگر تم خلقِ قرآن کا اقرار کر لو تو قسم خدا کی ابھی اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں۔ لیکن اس پیکرِ حق، اس محبتہ سنّت، اس مرید بالروح القدس، اس

صابرِ اعظم کما صبر اولوا العزم من الرسل کی زبانِ صدق سے صرف یہی جواب نکلتا تھا: اعطونی شیئاً من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہٖ" اللہ کی کتاب میں سے کچھ دکھلا دو یا اس کے رسول کا کوئی قول پیش کر دو تو میں اقرار کر لوں، اس کے سوا میں اور کچھ نہیں جانتا! ؎

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

اگر اس چراغِ تجدید و مصباح عزیمت و عوت کی روشنی مشکوٰۃِ نبوت سے مستنیر نہ تھی تو پھر یہ کیا تھا کہ جب معتصم ہر طرح عاجز آ کر قاضی ابن ابی داؤد وغیرہ علماء بدعت و اعتزال سے کہتا: "ناظروہ وکلموہ" اور وہ کتاب و سنت کے میدان میں عاجز آ کر اپنے اوہام و ظنونِ باطلہ کو باسمِ عقل و رائے پیش کرتے کہ سرتاسر یونانیات ملعونہ سے ماخوذ تھے، تو وہ اس کے جواب میں بے ساختہ بول اٹھتے: "ما ادری ما ھذا۔" میں نہیں جانتا یہ کیا بلا ہے۔" اعطونی شیئاً من کتاب اللہ او من سنۃ رسولہ حتی اقول" اس تمام کائناتِ ہستی میں میرے سر کو جھکانے والی صرف دو ہی چیزیں ہیں: اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔ اس کے سوا نہ میرے لیے کوئی دلیل ہے نہ علم: ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

امام موصوف کو جب قید کر کے طرطوس روانہ کیا گیا تو ابوبکر الاحول نے پوچھا: "ان عرضت علیک السیف تجیب؟" اگر تلوار کے نیچے ٹکڑے کر دیئے گئے تو کیا اس وقت مان لو گے؟ کہا نہیں۔ ابراہیم بن مصعب کوتوال کہتا ہے کہ میں نے کسی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمد بن حنبل سے بڑھ کر بارعب نہ پایا۔ "یومئذ ما نحن فی عینیہ الا کامثال الذباب" ہم عمّالِ حکومت ان کی نظروں میں مکھیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے اور یہ بالکل حق ہے جن لوگوں کی نظروں میں جلالِ الٰہی سمایا ہو، وہ مٹی کی ان پتلیوں کو جنھوں نے لوہا تیز کر کے کاندھے پر ڈال رکھا ہے، بہت سا چاندی سونا اپنے جسم پر لیپ لیا ہے، کیا

چیز سمجھتے ہیں؛ ان کو تو اقلیمِ عشقِ الٰہی کی سروری و شاہی اور شہرستان صدق و صفا کا تاج و تخت حاصل ہے!

میں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

ابوالعباس الرقی سے حافظ ابن جوزی روایت کرتے ہیں کہ جب رقہ میں امامِ موصوف قید تھے تو علماء کی ایک جماعت گئی اور اس قسم کی روایات و نقول سنانے لگی جن سے بخوفِ جان تقیہ کر لینے کی رخصت نکلتی ہے۔ امام موصوف نے سب سن کر جواب دیا:

کیف تصنعون بحدیث خبّاب؟ ان من کان قبلکم کان ینشر احدھم بالمنشار ثم لا یصدہ ذٰلک عن دینہ۔ فقالوا فیسنا منہ۔

یعنی یہ تو سب کچھ ہوا اگر بھلا اس حدیث کی نسبت کیا کہتے ہو کہ جب صحابہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مظالم و شدائد کی شکایت کی تو فرمایا: تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن کے سروں پر آرہ چلایا جاتا تھا اور جسم لکڑی کی طرح چیر ڈالے جاتے تھے مگر یہ آزمائشیں بھی ان کو حق سے نہیں پھرا سکتی تھیں! ابوالعباس کہتے ہیں کہ جب ہم نے یہ بات سنی تو مایوس ہو کر چلے آئے کہ ان کو سمجھانا بیکار ہے۔ یہ اپنی بات سے پھرنے والے نہیں۔ یہ جو میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ عزیمتِ دعوتِ عزیمتِ دعوت، تو یہ ہے عزیمتِ دعوت اور یہ ہے وراثت و نیابت مقام، فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل کی، اور یہ ہے خاصہ مرتبۂ عظیمۂ من یجد لہا دینہا" کا اور یہ ہے ان ایامِ فتن کا صبرِ اعظم و اکبر جس کی نسبت ترمذی کی روایت میں فرمایا:

الصبر فیہن کالقبض علی الجمر۔

تو یہی وہ لوگ ہیں جو اگر چاہیں تو گوشۂ رخصت و بیچارگی میں امن و عافیت کے پھول چن سکتے ہیں، لیکن وہ پھولوں کو چھوڑ کر دہکتے ہوئے انگارے پکڑ لیتے ہیں، اور اسی لیے ان کا اجر و ثواب بھی "مثل اجر خمسین رجلاً یعملون مثل عملکم" کا حکم رکھتا ہے۔ مانا کہ

ضعیفوں اور درماندوں کے لیے رخصت وگلوخلاصی کی راہیں بھی باز رکھی گئی ہوں لیکن اصحابِ عزائم کا عالم دوسرا ہے، ان کی ہمت عالی بھلا میدان عزیمت واسبقیت بالخیرات کو چھوڑ کر ننگنائے رخصت وضعف میں پناہ لینا کب گوارا کر سکتی ہے؛ جوانانِ ہمت اور مردانِ کارزار اس ننگ کو کیوں قبول کرنے لگے کہ کمزوروں اور درماندوں کی لکڑی کا سہارا پکڑیں، جن کے لیے اس میں سلامتی ہے، ہوا کرے، مگر ان کے لیے تو ایسا کرنا ہمت کی موت ہے، ایمان کی پامالی ہے، اور عشق کی جبینِ عزت کے لیے داغِ ننگ وعار سے کم نہیں۔ حسنات الابرار سیئات المقربین! رخصت وعزیمت کی تفریق اور اعلیٰ وادنیٰ امتیاز اصحابِ عمل کے لیے ہے نہ کہ اصحابِ عشق کے لیے۔ عشق کی راہ ایک ہی ہے اور اس میں جو کچھ ہے عزیمت ہی عزیمت ہے ضعف وبیچارگی کا تو ذکر ہی کیا؛ وہاں رخصت کا نام لینا بھی کم از معصیت نہیں کما قال بعض المحبین العارفین ؎

ملتِ عشق از ہمہ دیں ہا جدا است
عاشقاں را مذہب وملت جدا است

حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ جب معتصم باللہ نے جلادوں کو ضربِ تازیانہ کے لیے حکم دیا تو وہ علماء اہل سنت بھی دربار میں موجود تھے جو شدتِ محن ومصائب کی تاب نہ لا سکے اور اقرار کر کے چھوٹ گئے۔ ان میں سے بعض نے کہا:

"من صنع من اصحابك فى هذا الامر ما تصنع؟"

خود تمہارے ساتھیوں میں سے کس نے ایسی ہٹ کی جیسی تم کر رہے ہو؟ امام احمد نے کہا: یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی "اعطونى شيئا من كتاب الله او سنة رسوله حتى اقول به"

عین حالتِ صوم میں کہ صرف پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھ لیا تھا، تو تازہ دم جلادوں نے پوری قوت سے کوڑے مارے، یہاں تک کہ تمام پیٹھ زخموں سے چُور ہو گئی اور تمام جسم خون سے رنگین ہو گیا۔ خود کہتے ہیں کہ جب ہوش آیا تو چند آدمی پانی لائے اور کہا پی لو مگر میں نے انکار کر دیا کہ روزہ نہیں توڑ سکتا۔ وہاں سے مجھ کو اسحاق بن ابراہیم کے مکان میں لے گئے۔ ظہر کی نماز کا وقت آ گیا تھا۔ ابن سماعہ نے امامت کی اور میں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد

ابن سماعہ نے کہا: تم نے نماز پڑھی حالانکہ خون تمہارے کپڑوں میں بہہ رہا ہے؛ یعنی دم جاری و کثیر کے بعد طہارت کہاں رہی؛ میں نے جواب دیا: "قد صلی عمرؓ جرحہ یثعب دماً" ہاں مگر میں نے وہی کیا جو حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے اور قاتل نے زخمی کیا مگر اسی حالت میں انھوں نے نماز پوری کی۔

ابن سماعہ کے جواب میں حضرت امام نے حضرت عمرؓ کی جو نظیر پیش کی تو یہ ان کی تشفی کے لیے بس کرتی تھی، مگر میں کہتا ہوں کہ جو خون اس وقت امام احمد بن حنبلؒ کے زخموں سے بہہ رہا تھا، اگر وہ خون ناپاک تھا اور اس کے ساتھ نماز نہیں ہو سکتی تھی پھر دنیا میں اور کونسی چیز ایسی ہے جو انسان کو پاک کر سکتی ہے، اور کون سا پانی ہے جو طاہر و مطہر ہو سکتا ہے، اگر یہ ناپاک ہے تو دنیا کی تمام پاکیاں اس ناپاکی پر قربان اور دنیا کی ساری طہارتیں اس کے سر سے نچھاور۔ یہ کیا بات ہے کہ پاک سے پاک اور مقدس سے مقدس انسان کی میت کے لیے بھی غسل ضروری ٹھہرا کہ "اغسلوہ بماء و سدر و کفنوہ فی ثوبین" مگر شہیدانِ حق کے لیے یہ بات ہوئی کہ ان کی پاکی شرمندۂ آبِ غسل نہیں "لم یصل علیہم و لم یغسلہم" بلکہ ان کے خون میں رنگے ہوئے کپڑوں کو بھی ان سے الگ نہ کیجئے "زملوھم فی ثیابہم و دمائہم" اور اسی لباسِ گلگوں و خلعتِ رنگیں میں وہاں جانے دیجئے، جہاں ان کا انتظار کیا جا رہا ہے، اور جہاں خونِ عشق کے سرخ دھبوں سے بڑھ کر شاید اور کوئی نقش و نگارِ عمل مقبول و محبوب نہیں عند ربھم یرزقون فرحین بما آتاھم اللہ! ؎

خونِ شہیداں را ز آبِ اولیٰ تر ست
ایں گناہ از صد ثواب اولیٰ تر ست

اللہ اللہ! یہاں طہارت جسم و لباس کا کیا سوال ہے؛ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی تمام عمر میں اگر کوئی پاک سے پاک اور سچی سے سچی نماز پڑھی تھی، تو یقیناً وہ وہی ظہر کی نماز تھی۔ ان کی تمام عمر کی وہ نمازیں ایک طرف جو دجلہ کے پانی سے پاک کی گئی تھیں، اور وہ چند گھڑیوں کی عبادت ایک طرف جس کو راہِ ثباتِ حق میں بہنے والے خون نے مقدس و مطہر کر دیا تھا!

سبحان اللہ! جس کے عشق میں چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں پہن لی تھیں، جس کی خاطر

سارا جسم زخموں سے چور، اور خون سے رنگین ہو رہا تھا، اسی کے آگے جبینِ نیاز جھکی ہوئی! اسی کے ذکر میں قلب و لسان لذت یاب تسبیح و تحمید! اسی کے جلوۂ جمال میں چشم شوق وقفِ نظارہ و دید! اور اسی کی یاد میں رُوح مضطر محو و سرشارِ عشق و خود فراموشی!

یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

اور یہ جو امامِ موصوف نے افطار سے انکار کر دیا، اور نماز کا وقت آیا تو بہ اوّل وقت و بہ جماعت ادا کرنے سے باز نہ آئے حالانکہ جسم زخموں سے چُور اور پیٹھ کا خون پاؤں تک بہہ رہا تھا، تو اب بتلاؤ کہ وہ تمہارا رخصت والا معاملہ کیا ہُوا؛ کیا ایسی حالت میں رخصت نہ تھی کہ روزہ کھول دیتے اور نماز کے لیے اس قدر توقف کر جاتے کہ زخموں پر مرہم تو لگا دیا جاتا اور اگر تم اس عالم میں ہو کر امن و فراغت اور طاقت و فرصت کی حالت میں بھی مصائب و خطرات سے بچنے کے لیے دعوت الی الحق کو ترک و ملتوی اور عزم و ثباتِ حق سے انحراف کیا جا سکتا ہے اور تمہارے نزدیک مصلحت و رخصت اسی میں ہے کہ بطلان و ضلالت کے آگے سر جھکا دیا جائے تو خدا را بتلاؤ کہ یہ عالم کون سا تھا؛ کبھی اس عالم کی بھی کوئی خبر تم تک پہنچی ہے؟

یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست؟

افسوس، حیلہ جوئی و بہانہ سازی کا نام تمہاری بولی میں رخصت ہے، اور ہمت کی موت اور ایمان کی جانکنی کو تمہاری بستی میں مصلحت بینی اور دانشمندی کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ تم کو اس عالم کی کیا خبر؛ اقلیمِ عزائم اور ہمت آبادِ عشق کے معاملات تمہارے وہم و گمان سے بھی بالاتر ہیں۔ تمہارے لیے یہی بہت ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ایمان کی بچی بچائی اور بچی کھچی پونجی بچا لے جاؤ، اگرچہ اس کی بھی امید نہیں۔ ؎

تو اے گردِ تو تتم! شوکت دریا چہ مے دانی؟
اسیرِ عذر لنگی، وسعتِ صحرا چہ مے دانی!

تم کہتے ہو کہ دیدہ دانستہ اپنی جان ہلاکت میں ڈال دینا کون سی عقلمندی اور کہاں کی حق پرستی ہے؟ بلکہ ایک طرح کی ضلالت و جنون: حتی تکون حرضاً او تکون من الھالکین تو تمہاری مثال ٹھیک ٹھیک لائماتِ مصر کی سی ہے، جو جمالِ عصمت یوسفی سے بے خبر

امرأۃ العزیز کو ملامت کیا کرتی تھیں، تراود فتاھا عن نفسہ قد شغفھا حبا - انا لنراھا فی ضلال مبین - لیکن کاش ایسا ہوتا کہ پردہ اٹھایا جا سکتا اور یہ کہا جا سکتا کہ اخرج علیھن! تو اس وقت ملامت گران بے درد پر اپنی ملامتوں کی حقیقت کھلتی - لائمات مصر نے تو صرف ہاتھ ہی کاٹ لیے تھے: اکبرنہ وقطعن ایدیھن وقلن حاش للہ! ماھذا بشرا، ان ھذا الا ملك كريم - لیکن عجب نہیں کہ تمہارے ہاتھوں کی چھریاں خود تمہاری ہی گردنوں پر چل جائیں اور اس وقت دل باختگان عشق یوسفی کہتے: فذالکن الذی لمتننی فیہ! ولقد احسن القائل - ؎

لو یسمعون کما سمعت کلامھا

خروا لعزۃ سجدا و رکوعا

امام موصوف کے لڑکے عبداللہ کہتے ہیں کہ میرے والد ہمیشہ کہا کرتے:

"رحم اللہ ابا الھیثم، غفر اللہ لابی الھیثم"۔

خدا ابو الہیثم پر رحم کرے، خدا ابو الہیثم کو بخش دے۔ میں نے ایک دن پوچھا، ابو الہیثم کون ہے؟ کہا: جس دن مجھ کو سپاہی دربار میں لے گئے اور کوڑے مارے گئے تو جب ہم راہ سے گزر رہے تھے، ایک آدمی مجھ سے ملا اور کہا مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں مشہور چور اور عیار ابو الہیثم حداد ہوں۔ میرا نام شاہی دفتر میں ثبت ہے، بار ہا چوری کرتے پکڑا گیا اور بڑی بڑی سزائیں جھیلیں۔ صرف کوڑوں ہی کی مار اگر گنوں تو سب ملا کر اٹھارہ ہزار ضربیں تو میری پیٹھ پر ضرور پڑی ہوں گی۔ بایں ہمہ میری استقامت کا یہ حال ہے کہ اب تک چوری سے باز نہ آیا جب کوڑے کھا کر جیل خانے سے نکلا سیدھا چوری کی تاک میں چلا گیا۔ میری استقامت کا یہ حال شیطان کی طاعت میں رہا ہے، دنیا کی خاطر، افسوس تم پر، اگر اللہ کی محبت کی راہ میں اتنی استقامت بھی نہ دکھلا سکو، اور دین حق کی خاطر چند کوڑوں کی ضرب برداشت نہ کرو۔ میں نے جب یہ سنا تو اپنے جی میں کہا اگر حق کی خاطر اتنا بھی نہ کر سکے جتنا دنیا کی خاطر ایک چور اور ڈاکو کر رہا ہے تو ہماری بندگی پہ ہزار حیف، اور ہماری خداپرستی سے بت پرستی لاکھ درجہ بہتر! ؎

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

حافظ ابنِ جوزی نے محمد بن اسماعیل کا قول نقل کیا ہے:

"ضربت احمد بن حنبل ثمانین سوطاً لو ضربتها فیلاً لہدیتہ"!

احمد بن حنبل کو اسی کوڑے ایسے سخت مارے گئے کہ اگر ہاتھی کے بھی مارے جاتے تو چیخ اٹھتا، مگر اس کوہِ عزم و ہمت نے اُف تک نہ کی۔ جب تک ہوش رہا ہر ضرب پر یا تو وہی جملہ زبان سے نکلتا رہا جس کیلئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" اور یا یہ آیت کریمہ: لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا۔ ؎

روئے کشادہ باید و پیشانیِ فراخ
آنجا کہ سطوہائے ید اللہ مے زنند

یہ ہے مقام ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا کا، اور یہ ہے وراثت و نیابتِ حقیقی و کامل فاستقم کما امرت اور انک باعیننا اور فانہ یسلک من بین یدیہ و من خلفہ رصدا کی، اور یہ ہیں مجسم و مثل معنی کریمہ اولئک کتب فی قلوبہم الایمان و ایدہم بروح منہ اور رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ، اولئک حزب اللہ، الا ان حزب اللہ ہم المفلحون! کے اور یہ ہے وہ معاملہ کہ ان عبادی لیس لک علیہم سلطان! جب بندگانِ حق کو شیاطین و ابالیس کا دہ مکر و خدع بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا کہ لتزول عنہ الجبال تو ظاہر ہے کہ چمڑے کے کوڑے اور لوہے کی دھار ان کی استقامت پر کب غالب آنے والی ہے؟ یہ تو اس کے مقابلے میں محض ایک ابتدائی اور آزمائشی منزل ہے:

؎ کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ابھی اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

فی الحقیقت حضرت امام موصوف کی نسبت محمدی اور کمال مرتبۂ تاسی باسوۂ نبوت کی یہی وہ شان و جلالت ہے جس نے ان کو تمام ائمہ و مجددینِ اُمت کی صفوفِ مراتب و کمال سے

بلند کر کے ایک دوسرے ہی مقام پر پہنچا دیا ہے حتیٰ کہ تمام ائمۂ اسلام میں یہ فضل مخصوص صرف انہی کے حصے میں آیا کہ ان کی محبت و پیروی اہلِ حق و سنت ہونے کی دلیل ٹھہری اور ان سے انحراف بدعتی ہونے کی سب سے بڑی پہچان! اللہ تعالیٰ نے ان کو فنا فی السنۃ ہونے کا وہ مرتبہ عطا فرمایا کہ کمالِ استغراق و تفانی کی وجہ سے خود ان کی ذاتِ گرامی ہی یکسر سنت و اتباع کا پیکر و مجسمہ بن گئی۔ بجدیکہ:

نتواں تراو جاں را بہم امتیاز کردن

جو اس امام کے قدم بقدم چلا اس نے سنت کو پایا اور جس نے اس کی راہ چھوڑی اس نے سنتِ رسول و منہج اصحابِ رسولؐ سے انحراف کیا۔ یہ کیا تھا کہ بڑے بڑے ائمۂ عصر کو اعتراف کرنا پڑا "اذا رأیت الرجل یحب احمد بن حنبل، فاعلم انہ صاحب سنۃ" اگر کسی کو دیکھو کہ امام احمد سے محبت رکھتا ہے تو بس جان لو کہ صاحبِ سنت ہے! خطیب نے تاریخ میں ہمدانی کا قول نقل کیا ہے:

"یعرف بہ المسلم من الزندیق۔"

اسی کسوٹی پر مسلم کو زندیق سے پرکھا جائے گا۔ دورقی نے کہا:

"من سمعتموہ یذکر احمد بن حنبل بسوء فاتہموہ علی الاسلام" ؎

انا من اہوی، ومن اہوی، انا
نحن روحنا حللنا بدنا
فاذا ابصرتنی، ابصرتہ
واذا، ابصرتہ، ابصرتنا

ویقرب من ھذا ما قیل بالفارسیۃ!

جذبۂ وصل بحدلیست میانِ من و تو
کہ رقیب آمد و پرسید نشانِ من و تو

امام موصوف کے متعلق اسی حقیقت کو مزاحم الخاقانی نے ایک قطعہ میں نظم کیا تھا: ؎

لقد صار فی الافاق احمد محنۃ

وامر الوری فیھا فلیس بمشکل

تری ذا الھوی جھلا لاحمد مبغضا

وتعرف ذا التقوی یحب ابن حنبل

اور یہ بالکل حق ہے۔ آج بھی دیکھ لو۔ اربابِ بدعت کو کبھی امام موصوف کا مسلک خوش نہ آئے گا۔ ان کی محبت سے ان کا دل بالکل کورا ہوگا، بلکہ کہیں گے کہ ان کا طریقہ تو تاویل ورائے کی عقلمندی سے خالی اور محض ظاہر پرستی اور بے دانشی وبے علمی کا مجموعہ ہے۔ حتیٰ کہ الرحمٰن علی العرش استوٰی اور ید وعلو ونزول کے دقیق فلسفیانہ معانی بھی ان کو معلوم نہ تھے اور تجسیم وجہت کے اعتقاد میں مبتلا! برخلاف اس کے عصابۂ صالحہ کتاب و سنت وطائفۂ حقہ ما انا علیہ واصحابی کہ جمیع طرق ومذاہب بدعیہ سے یکسو دامن کشاں ہیں اگرچہ "ان تعض باصل شجرۃ" کی نوبت آجائے اور مبتدعین وارباب ہوا کے تمام شیوہ ہائے تیرہ وروش ہائے نافرجام سے بکلی پناہ ڈھونڈتے ہیں اگرچہ اس کی وجہ سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے نزدیک مبغوض ومردود ہو جائیں تو ان کا حال یہ ہے کہ اس امام اہل السنت کی محبت وپیروی کو اپنے ایمان کی زینت اور اپنے عقائد کی خوبروئی وزیبائی سمجھتے ہیں اور ان کے مسلک سنت وحکمت اور طریقِ محمدیہ خالص بے مزج بدعت قیاس ورائے کے عشق وشغف سے اپنے قلب وروح کو ہمیشہ معمور وآباد رکھتے ہیں۔ ورحمۃ اللہ علی القائل وھو ابن اعین (کما نقل الخطیب فی التاریخ) اذ یقول: ؎

اضحیٰ ابن حنبل محنۃ مامونۃ

وبحب احمد یعرف المتنسک

واذا رأیت لاحمد متنقصاً

فاعلم بان ستورہ ستھتک

امام موصوف کا یہی وہ مقام ہے جس کی طرف "بشر حافی" نے اشارہ کیا تھا "قام احمد مقام الانبیاء" اور کہا کہ امام احمد کی استقامت وثبات کی آزمائشیں لگاتار چار بادشاہوں نے کیں "بعضھم بالضراء وبعضھم بالسراء" مامون، معتصم اور واثق نے ضرب وحبس سے

آزمائش کی، اور متوکل نے تعظیم وتکریم اور عطاء وبخشش دنیا سے، لیکن "فکان فیھا معتصماً باللہ عزوجل" ان کی استقامت وعشقِ حق پر نہ توخوفِ دنیا غالب آیا اور نہ طمعِ دنیا، دونوں کسوٹیوں پر ان کا سونا یکساں طور پر کھرا نکلا! والبلاء للولاء کالناس للذھب: ؎

بندگانِ توکہ درعشق خداوندانند

دو جہاں را بہ تمنائے تو بفروختہ اند

مامون ومعتصم اور الواثق نے جو کچھ کیا وہ معلوم ہے۔ جعفر المتوکل کا یہ حال ہے کہ اس کی خلافت بدعت وارباب بدعت کے زوال وخسران اور سنّت واصحاب حدیث کے امن وعروج کا اعلانِ عام تھی۔ حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ متوکل باللہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا کہ کسی طرح پچھلے مظالم کی تلافی کرے۔ ایک بار اس نے بیس ہزار سکّے بھیجے اور دربار میں بلایا۔ ایک بار ایک لاکھ درہم بھیجا اور سخت اصرار کیا کہ اس کو قبول کر لیجئے۔ لیکن ہر مرتبہ امام موصوف نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا میں اپنے مکان میں اپنے ہاتھ سے اس قدر کشتکاری کر لیتا ہوں جو میری ضروریات کے لیے کافی ہے[1]۔ اس بوجھ کو اٹھا کر کیا کروں گا؛ کہا گیا کہ اپنے لڑکے کو حکم دیجئے وُہ قبول کر لیں۔ فرمایا: وُہ اپنی مرضی کا مختار ہے۔ لیکن جب عبداللہ سے کہا گیا تو انہوں نے بھی واپس کر دیا۔ آخر مجبور ہو کر لانے والوں نے کہا کہ خود نہیں رکھنا چاہتے تو امیر المومنین کا حکم ہے قبول کر لیجیے اور فقراء ومساکین کو بانٹ دیجیے۔ فرمایا میرے دروازے سے زیادہ امیر المومنین کے محل کے نیچے فقیروں کا مجمع رہتا ہے۔ فقیروں ہی کو دینا ہے تو وہیں دے دیا جائے اس ہنگامہ کی یہاں کیا ضرورت ہے؛ ایک مرتبہ اسحٰق بن ابراہیم کے سخت اصرار سے دس ہزار

---

[1] حافظ ابن جوزی اور خطیب نے لکھا ہے کہ امام موصوف کا ذریعۂ معاش یہ تھا کہ اپنے مکان کی زمین میں تھوڑی سی کشتکاری کر لیتے اور اسی کے حاصل پر قانع رہتے۔ زراعت کی زکوٰۃ سال بسال ادا کرتے اور اس بارے میں ان کا عمل حضرت عمرؓ کے فرمانِ خلافت پر تھا، جو انھوں نے ارضِ سوادِ عراق کی نسبت نافذ فرمایا تھا علی کل جریب درھماً وقفیزاً۔ غور کرو یہ حال علماء سلف کا تھا اور جو حال آج علماء دنیا کی دنیا پرستیوں کا ہو رہا ہے وہ معلوم ہے یاکلون اموال الناس بالباطل۔ الخ

درہم لے لیے تو اسی وقت مہاجرین و انصار کی اولاد میں تقسیم کر دیئے ؎

عدیلِ ہمتِ ساقی ست فطرتِ عرفی
کہ حاتمِ دگران و گدائے خویشتن ست

ان کے لڑکے راوی ہیں کہ جب خلیفۂ متوکل ان کی تعظیم و تکریم میں حد درجہ غلو کرنے لگا، تو انھوں نے کہا؛

"ھذا امر اشد علی من ذاك۔ ذاك فتنۃ الدین وھذا فتنۃ الدنیا۔"

یہ معاملہ تو گزشتہ معاملہ سے بھی کہیں زیادہ میرے لیے سخت ہے۔ وہ دین کے بارے میں فتنہ تھا اور یہ فتنۂ دنیا ہے! یعنی مصائب و محن کی آزمائش کہیں زیادہ پُر امن ہے، بمقابلۂ آزمائش نعیم دنیا و دعوت طمع و ترغیب کے، اور یہ بالکل حق ہے۔ کتنے ہی شہسواران ثبات و استقامت ہیں جو پہلے میدانِ آزمائش سے تو صحیح و سلامت نکل گئے، مگر دُوسری راہ سامنے آئی تو اوّل قدم ہی میں ٹھوکر لگی، حالانکہ مردِ کامل وُہ ہے جس پر یدعون ربھم خوفاً وطمعاً کا مقام ایسا طاری ہو جائے کہ دنیا کا خوف اور دنیا کی طمع، دونوں قسم کے حربے اس کے لیے بالکل بیکار ہو جائیں۔ فھم القوم الذین لا یشقی جلیسھم، ولا یستوحش انیسھم، قد نالوا مطالبھم برفع اکفھم الی خالقھم، لا یحتاجون فی حوائجھم الا الیہ، ولا یعولون فی مقاصدھم الا علیہ اوللہ درما قال: ؎

ونبئت لیلی ارسلت بشفاعۃ
الی، فھلا نفس لیلی شفیعھا
ااکرم من لیلی علی، فتزتجی
بہ الوصل، ام کنت امرلا اطیعھا

کتب بینی اور علماء کرام

اسلام نے جہاں اشاعتِ علم کے لیے مختلف راہیں کھولیں وہاں اہلِ علم میں کتب بینی اور مطالعہ کا ذوق بھی بھر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کرام نے کتب بینی اور مطالعہ کو ہمیشہ ہر چیز پر مقدم جانا۔ اسلاف میں سے ہم چند واقعات بیان کر [illegible] اندازہ لگا سکیں گے کہ کتب بینی

علماء کرام کے لیے کتنا محبوب مشغلہ رہا ہے۔

احمد بن عمران لکھتے ہیں کہ میں احمد بن محمد بن شجاع کی مجلس میں موجود تھا۔ انہوں نے اپنے خادم کو بھیجا کہ ابن الاعرابی کو بلا لائے۔ خادم نے لوٹ کر کہا: ابن الاعرابی کہتے ہیں میرے پاس کچھ عرب آئے ہُوئے ہیں میں ان سے رخصت حاصل کر کے آتا ہُوں۔ غلام نے ساتھ ہی کہا کہ وُہ اکیلے بیٹھے تھے اور کتابوں کا ایک انبار تھا جسے دیکھ رہے تھے۔ جب ابن الاعرابی آئے تو ابن شجاع نے کہا: سُبحان اللہ! اکیلے بیٹھ کر ہمیں اپنی صحبت سے محروم رکھتے ہیں اور کہلا بھیجا کہ عرب مہمان آئے ہُوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میرے مہمان میری کتابیں ہیں۔

حضرت ابو العباس احمد بن یحیٰی بن ثعلب نے کیا خوب اشعار کہے جن کا ترجمہ یُوں ہے:

"ہم بادشاہوں کی صحبت اختیار کریں تو غرور اور تکبر سے پیش آئیں گے۔ تاجروں کے پاس بیٹھیں تو وُہ دولت کی باتوں سے دل کو غریب کر دیں گے، اور روپے کے انبار گننے کی باتیں کریں گے کیوں نہ ہم کتب بینی سے حقائق علم سے دل و دماغ کو بھرپُور کر لیں۔"

محمد بن بشیر کے اشعار کا ترجمہ یُوں ہے:

"کتابیں کتنی ہم نشین ہیں جن سے بُرائی کا خدشہ نہیں ہے۔ بد کلامی کا خطرہ نہیں۔ اسلاف ہمارے لیے علم و حکمت کے خزانے چھوڑ گئے ہیں جن سے ہم دل و دماغ کے دامن کو بھرتے رہتے ہیں۔ تم آثار محکم کی طلب کرتے ہو تو احادیث کی کتابیں بھری پاؤ گے۔ عرب کے جاہل شاعروں کے تخیلات حاصل کرنا چاہو تو ادب کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ عجم کے حالات و آداب کی ضرورت ہو تو صفحات پر بکھرے پڑے ہُوئے ہیں۔ وُہ لوگ جنہوں نے کتابیں لکھی ہیں وہ ہمارے لیے علم و ادب کا خزانہ چھوڑ گئے ہیں۔"

خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے پوتے عبداللہ بن عبد العزیز نے لوگوں سے ملنا جلنا بند کر دیا اور قبرستان میں بیٹھے کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ فرمانے لگے: "میں نے قبر سے واعظ، کتاب سے دلچسپ دوست اور تنہائی سے زیادہ بے ضرر ساتھی کوئی نہیں دیکھا۔"

خواجہ حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ میری زندگی کے چالیس سال اس حالت میں گزرے

کہ سوتے جاگتے کتاب میرے سینے پر رہتی تھی۔

امام بخاری سے پوچھا گیا کہ حفظ کی دوا کیا ہے؟ فرمایا: کتب بینی۔

یہ تھے وُہ اسلاف جنہوں نے کتب بینی کو اختیار کیا اور آنے والی نسلوں میں کتاب بینی کی اہمیت کے نقوش مرتسم کیے۔ علماء اسلام نے کتب بینی سے چار دانگ عالم میں اپنی علمی وجاہت اور تحقیقی سنفاہت کو منوایا۔ موضوع کی طوالت کے خوف سے ہم ان تفصیلات سے معذرت کرتے ہیں جو علماء کرام کے ذوق کتب بینی کی ترجمان تھیں۔

علماء کا حُسنِ معاش

موجودہ دور نے ہر طبقہ کی معاشرت اور معاشی حالات کا بغور جائزہ لینا شروع کیا ہے۔ اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس ضمن میں چند سطور حوالۂ قلم کی جائیں اور ہم اپنے اسلاف اہلِ علم کی معاشرتی اور معاشی زندگی کو سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ آج کا تہذیب یافتہ پڑھا لکھا طبقہ علماء کرام کو اپنے لیے معاشی طور پر بوجھ خیال کرتا ہے، اور وُہ اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ علماء کا طبقہ صرف عبادات و نماز و روزہ پر ہی اپنی زندگی وقف کر دیتا ہے اسے معاشرتی جدوجہد میں کوئی حصّہ نہیں ملتا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جیّد علماء کرام نے نہ صرف تجارت، صنعت اور سائنس کو فروغ دے کر معاشی زندگی کو آسان بنایا تھا بلکہ وُہ پورے معاشرے میں اقتصادی ترقی کے مسائل حل کرنے میں لگے رہے۔ تجارت مسلمانوں کا مقدس پیشہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیشے کو پسند فرمایا، قبول فرمایا اور اس پر عمل کر کے دنیا کے سامنے تجارتی دیانت کے اصول رکھے۔ صحابہ میں مہاجرین کو فضیلت تھی وُہ تاجر تھے۔ قرآن پاک نے ان کی تجارتی زندگی کو بار بار سراہا ہے۔ ہم ان علماء کرام کے مختصر نام درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنہوں نے علم دین کی اشاعت اور تبلیغِ اسلام کی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ کسبِ معاش کے لیے کام کیا۔

امام یونس ابن عبید، داؤد ابن ابی ہند امہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہم ریشمی پارچہ کے بڑے ممتاز تاجر تھے۔ حسن بن ربیع کوفی (امام بخاری کے استاد) بوریئے کے بڑے تاجر تھے اسی وجہ سے انہیں بواری کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ ہشام

وستوائی عراق عرب سے کپڑا لاکر فروخت کرتے۔

حافظ الحدیث ابن رومیہ جڑی بوٹیوں کی تجارت کرتے اور آپ کا لقب عشاب تھا۔ محمد ابن سلیمان گھوڑے کے تاجر تھے۔ امام ابن جوزیؒ تانبے کی تجارت کرتے۔ آپ فخریہ طور پر صفار لقب اختیار کرتے۔

ابو الفضل مہندس دمشقی گھڑی سازی کا کام کرتے۔ ابن طاہر کتابت کرتے، ابوسعید نحوی کتابت سے بسر اوقات کرتے۔ ابن الہیثم نامور طبیب خطاطی کے فن میں کامل و یگانہ تھے۔

لاہور میں اشاعت علم

سابقہ صفحات میں ہم اسلاف کے وہ مقاصد بیان کر چکے جن سے متصف علماء اسلام کائنات ارضی پر پیغام مصطفیٰؐ لے کر بڑھتے گئے۔ یہ اہل علم کا وہ کاروان تھا جو زندگی کی دشوار راہوں پر چلتا رہا اور اپنے گرد وپیش کو علمی ضیاؤں سے منور کرتا رہا۔ ہم جن علماء ربانی کے حالات آپ کی خدمت میں لانے کی ایک حقیر کوشش کر رہے ہیں وہ اسی نورانی کاروان کے آخرین قطاروں کے مسافر تھے۔ وہ برصغیر کے مختلف مقامات میں پیدا ہوئے، مدینۃ الاولیاء لاہور پہنچے، پڑھے اور علم وفضل کی ضیا باریوں کے منابع ومصادر بنے۔ ان بزرگوں نے نہایت ناخوشگوار ماحول میں رہ کر دین کی خدمت کی اور اس راہ میں انہیں حالات کی ناہمواریوں سے گزرتے ہوئے نہ صرف شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا بلکہ وہ ہر ابتلاء کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے گئے۔ ہم نے چند علماء اہل سنت کی زندگی کے حالات قلمبند کیے جو مغل سلطنت کے زوال سے لے کر تا حال لاہور کی علمی دنیا کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ہم نے اس تذکرہ میں متقدمین کے حالات کو اس لیے نظر انداز کر دیا ہے کہ ان کے حالات بعض تذکروں میں مل جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر قارئین ان علماء کرام کے مفصل حالات دیکھنا چاہتے ہوں تو وہ تذکرہ علماءِ ہند از مولانا رحمان علی ترجمہ جناب پروفیسر محمد ایوب قادری، نزہتہ الخواطر، حدائق حنفیہ، تذکرہ حفاظ پشاور، تذکرہ علماء و مشائخ سرحد، تذکرہ ابو الکلام آزاد کو سامنے رکھیں۔

اس سے پہلے کہ ہم ان علماء اہلسنت لاہور کا آغاز کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے

کرِ قارئین کرام لاہور میں علمائے کرام اور دینی مدارس کی مختصر سی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے لیے راہوار مطالعہ کو چند لمحے رُکنے کی اجازت دیں۔ اگرچہ برصغیر[1] میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی علماء اہلسنت کی آمد شروع ہوگئی اور وہ مفتوحہ علاقوں میں علم دین کی اشاعت میں مصروف ہوگئے تھے مگر لاہور کو جو سکون تیموری دور میں نصیب ہوا وہ پہلے نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں علماء کرام نے بڑے اہتمام و انصرام کے ساتھ اشاعتِ علم میں مشغول ہوگئے۔ تیموری دور سے پہلے لاہور غزنوی دورِ حکومت میں اسلامی علوم و تہذیب سے روشناس ہو چکا تھا۔ اس زمانہ میں لاہور کی تاریخ میں جس عالمِ دین کا نام نامی درخشاں ہے وہ حضرت محدث شاہ اسمٰعیل[2] رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کے جمعہ کے خطبوں نے یہاں کے کفرزار کو اسلام کی روشنیوں سے بھرپور کر دیا۔ وہ اسلامی

---

[1] استفادہ از لاہور کے علماء مدارس از مولانا علم الدین سالک مرحوم

[2] محدث شاہ اسمٰعیل غزنوی عہد کے ابتدائی ایام میں لاہور پہنچے۔ تحقیقات چشتی کا مصنف لکھتا ہے کہ آپ محمود غزنوی سے پہلے ہی لاہور میں آگئے تھے۔ رائے بہادر کنھیا لال نے آپ کے ورود لاہور کا سن ۴۱۲ھ لکھا ہے۔ مگر مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیاء ۵ ۳۹ھ سنِ ورودِ لاہور رکھتے ہیں۔ محمود غزنوی نے ۴۱۲ھ میں کشمیر پر حملہ کیا تو وہ لاہور بھی آیا۔ خیال غالب ہے کہ آپ محمود غزنوی کے ساتھ لاہور آئے اور یہاں تبلیغِ دین کا کام کرنے لگے۔ آپ کے وعظ کی تاثیر ایسی تھی کہ لوگ پروانوں کی طرح آپ کے حلقہ میں جمع ہو جاتے۔ آپ لاہور میں پورے ۳۶ سال تبلیغ میں مصروف رہے۔ ۴۴۸ھ میں فوت ہوئے۔ حضرت داتا گنج بخش ۴۳۱ھ میں واردِ لاہور ہوئے تو لاہور میں اسلام کی روحانی تعلیمات کے لیے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ تحفۃ الواصلین کے مصنف لکھتے ہیں: "اول کسے کہ از داعیان اسلام در لاہور تشریف آورد و خلق را بہ نور اسلام روشن کرد او بود۔ از کتب معتبرہ و اقوال صحیحہ ثابت گشتہ کہ شخصے کہ اول در لاہور درس کلام مجید خواند شیخ اسمٰعیل بود۔" پنجاب میں اسلام کے اس مبلغ، درس قرآنیہ کے نامور مدرس، کلام الٰہی اور توحید و سنت سے روشناس کرنے والے عالمِ دین کا مزار ہال روڈ کے دائیں جانب ہے۔ کسی زمانے میں اس مزار کے ساتھ باغات، کنویں، تالاب اور مدرسہ کی عمارت تھی مگر اب یہ ساری چیزیں دکانوں، سڑکوں، گرجوں کی عمارات میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ (مآثر لاہور از محمد دین فوق۔ ترجمہ محمد عبداللہ قریشی)

علوم کے زبردست ماہر تھے۔ خطابت کے فن میں کمال رکھتے تھے۔ لاہور میں نمازِ جمعہ پر خطاب فرماتے تو ہر جمعہ پر پانچ صد سے زیادہ غیر مسلم دامنِ اسلام میں جگہ پاتے۔[۱] انہوں نے غزنوی دور میں اشاعت علوم دینیہ کا بڑا کام کیا۔ غزنویوں کے آخری دور میں حضرت مخدوم الہجویری ابوالحسن داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور کو علم و فضل کا گہوارہ بنا دیا۔ آپ نے اپنی مسجد کو علوم اسلامیہ کی ایک ممتاز درس گاہ میں تبدیل کر دیا۔ وُہ نہ صرف وقت کے علماء کرام کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوئے بلکہ انھوں نے عوام الناس میں قرآن و حدیث کی ضیاؤں پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ سرزمینِ پنجاب آپ کے وجودِ مسعود سے زندہ ہوگئی۔ جہالت کی سیاہیاں چھٹ گئیں اور لاہور علم کے نور سے معمور ہوگیا۔ رُوحانی تعلیمات کا چرچا ہُوا۔ بقول شہزادہ دارا شکوہ حضرت علی الہجویری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے لاہور کے ہر محلہ میں حافظانِ قرآن موجود تھے۔ حضرت مخدوم ہجویری ؒ کے معاصرین کے اسماء گرامی اگرچہ تاریخ کے اوراق محفوظ نہیں کر سکے تاہم اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت لاہور علمی طور پر بیدار ہو چکا تھا اور داتا گنج بخش ؒ کے بعد غوریوں کے زمانہ میں حضرت سید عزیز الدین المعروف پیر مکّی رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور میں علم کی مشعلوں کو روشن رکھا۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں جانے والے علماء مشائخ لاہور کی علمی رونقوں میں اضافہ کرتے اور پھر اس سرچشمۂ علم و فن سے جھولیاں بھی بھرتے اور کچھ یہاں کے طالبانِ علم کو بخشتے۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری، حضرت میراں حسین زنجانی ؒ، سید احمد توختہ ترمذی ؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر ؒ، حضرت محمد اسحاق گازرانی ؒ، سید یعقوب زنجانی اور ان کے جلیل القدر معاصرین نے لاہور کی علمی اور روحانی دولت میں اضافہ کیا۔ تیموریوں کا زمانہ دراصل لاہور میں علوم و فنون کی اشاعت کا زریں دور تھا۔ اس زمانہ کے لاہور کو بغداد، قرطبہ اور شیراز کا ہم پایہ کہا جاسکتا ہے اس کے علماء کرام کے ممتاز پر دلی و آگرہ رشک کرتے تھے اور بابر سے لے کر اورنگ زیب تک یہاں اتنے جلیل القدر علماء اہلسنت نے علم و عرفان کے جو چشمے جاری کئے ان سے سارا برصغیر سیراب ہوتا گیا۔

---

[۱] تاریخ لاہور مصنفہ رائے بہادر کنہیا لال صفحہ ۳۰

مسلمانوں کی علمی سرگرمیاں قرآن پاک، اس کی تفسیر اور حدیث کی تشریح پر مرکوز تھیں۔ دوسرے علوم قرآن وحدیث کو سمجھنے سمجھانے کے لیے پڑھائے جاتے۔ فقہ، منطق، معانی، صرف و نحو اور پھر عقائد، صحبتِ شیخ اور بیعتِ مرشد سب قرآنی علوم کو قلب و ذہن تک پہنچانے کے اسلوب و معاون تھے۔ ان تمام علوم سے قرآن فہمی، سیرت کی پختگی اور کردار کی بلندی پیدا ہوتی اور انسان اسلامی اخلاق کا نمونہ بن کر زندگی بسر کرتے۔ اسی عظیم مقصد کے لیے امام الحرمینؒ، امام غزالیؒ، امام فخر الدین رازیؒ، علامہ جلال الدین دوانیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ کی تصانیف نے لاہور کی علمی دنیا کو اسلامی علوم کا بڑا عمدہ رنگ دیا۔ پاک و ہند کے حضرت شیخ عبدالحق محدثؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ اور علامہ بحر العلومؒ اور پھر متاخرین میں اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ کی مساعی جمیلہ نے ان علوم کو برصغیر کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا۔ ہندو پاک کے دوسرے شہروں کی طرح لاہور کے دینی مدارس، مساجد اور خانقاہیں اسلامی علوم کے مراکز تھے۔

ظہیر الدین بابر (۸۹۹ھ تا ۹۳۷ھ) مغلیہ سلطنت کا بانی تھا۔ وہ خود بڑا عالم تھا۔ علم کا مربی تھا۔ اپنے جدِ امجد تیمور کی طرح اہل علم کا قدردان تھا اور ان کی ہر طرح خاطر و مدارات کرتا۔ اگر قدرت اسے ہندوستان میں زیادہ دیر رہنے کا موقع دیتی تو وہ آگرہ اور لاہور کو وسطِ ایشیا اور ایران کا مدمقابل بنا دیتی۔ اس نے وسط ایشیا کے علماء کو انعام و اکرام سے نوازا اور برصغیر میں ان کے لیے بڑی سہولتیں فراہم کیں۔ اس کے زمانہ میں ملا زین الدین خوانی وسط ایشیا سے چل کر آئے اور لاہور میں چند روز قیام کر کے آگرہ میں ایک بہت بڑے دار العلوم کے بانی بنے۔ بابر نے اس دار العلوم کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ قدیم مدارس جو سیاسی ابتری کی وجہ سے بدحالی کا شکار تھے، از سرِ نو اشاعتِ علم کرنے لگے۔ لاہور میں بابر نے جب دولت خاں لودھی کا عظیم الشان کتب خانہ دیکھا تو اس علمی ذخیرہ کی نگہداشت کا خاص اہتمام کیا۔ بابر کی موت کے بعد نصیر الدین ہمایوں (۹۳۷ھ تا ۹۶۳ھ) اپنی سیاسی پریشانیوں کے باوجود علم کی سرپرستی سے کبھی غافل نہیں رہا۔ اس نے علم کی مشعل کو روشن رکھا۔ وہ علماء کو دربار میں بلاتا۔ ان کا بیحد احترام کرتا۔ ان کی علمی کوششوں کو سراہتا۔ ملا نظام الدین ہروی کی روایت کے مطابق

اس مجلس میں عالم، فاضل اور فقیہہ ہر وقت موجود رہتے۔ اس کے دربار کی علمی محفلیں رات گئے تک قائم رہتیں۔ ان محافل میں علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی اور ذہین اور طباع علماء کو خلعت و انعامات سے نوازا جاتا[1] ہمایوں کی علم دوستی کا ہی اثر تھا کہ بیرم خان جیسے وزیر بھی علم پروری اور علما نوازی میں پیش پیش تھے۔ وہ علماء کے قدر دان، خود اسلامی علوم سے واقف اور اہل علم کے مربی تھے ہمایوں کے دور میں اگرچہ لاہور بغداد العلم تھا مگر تاریخ ان علماء کرام کے حالات اپنے دامن میں سمیٹنے سے قاصر رہی، جن کی بدولت یہ شہر رشکِ غرناطہ بن گیا تھا۔ سید عبد اللہ لاہوری ہمایوں عہد کے ان علماء میں سے نظر آتے ہیں جنہوں نے سیاسی ابتری کے باوجود درس و تدریس جاری رکھا۔

آپ سید عبد الخالق بھاکری کے فرزند ارجمند اور سلسلہ قادریہ کے عرفان یافتہ تھے معقولات اور منقولات کے امام مانے جاتے تھے۔ مولوی رحمان علی نے تذکرہ علماء ہند میں لکھا ہے:

"تمام عمر شریف خود در تعلیم و تدریس فقہ و حدیث و تفسیر بسیر بردہ"[2]

آپ بڑے متوکل تھے، بے نیاز طبیعت کے مالک تھے۔ کسی امیر یا وزیر کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا مگر طلباء علم کی خدمت میں زندگی وقف کر دی۔ آپ ۹۴۳ھ / ۱۵۳۶ء میں فوت ہوئے مزار شیخ جان محمد حضوری کے گڑھی شاہو کے مزار کے متصل ہے۔

اسی زمانہ میں شیخ حمید سنبھلی نے بڑا نام پیدا کیا۔ آپ سنبھل میں پیدا ہوئے۔ قرآن پاک کی تفسیر کرنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ ہمایوں آپ کا بڑا احترام کرتا۔ آپ ہمایوں کی شکست کے بعد کابل گئے اور اس لشکر کے ساتھ واپس آئے جو دوبارہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ دربارِ اکبری میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ کابل سے واپسی پر آپ کچھ عرصہ لاہور میں قیام پذیر ہوئے لاہور میں قرآن کی تفسیر بیان فرمانے میں مصروف رہے۔ اہل ذوق آپ کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے۔ ایک دن بادشاہ سے بڑے آشفتہ ہو کر کہنے لگے:

"بادشاہم! تمام لشکر شمارا رافضی دیدیم"

---

[1] طبقاتِ اکبری جلد دوم صفحہ ۸۴، ۸۵

[2] تذکرہ علماء ہند فارسی از مولوی رحمان علی مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۵۳۔

بادشاہ نے پوچھا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

آپ نے فرمایا: ہر جا نام لشکریاں شما یار علی، کفش علی، حیدر علی یافتم ہیچ کس را ندیدم کہ بنام یاراں دیگر بودہ باشد۔

بادشاہ کے پاس اس بات کا تو جواب نہ تھا مگر غصہ میں آکر جھنجھلا کر کہنے لگا: میرے دادے کا نام عمر شیخ ہے اوروں کے ناموں کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت کے علماء عقائد اہلسنت کی نگرانی اور راسخ الاعتقادی کی دولت کو محفوظ رکھنے میں پیش پیش تھے۔

برصغیر میں سیاسی استحکام اکبری دور کا ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ اکبر اپنی جہالت اور کم علمی کے باوجود علم دوستی میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس نے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ مدارس کو فروغ دیا، علماء کی قدر دانی کی۔ اس کی تخت نشینی کے ساتھ برصغیر کی تاریخ علم و فن کے وہ نمونے پیش کرتی ہے جن کی مثال نہیں ملتی۔ تحصیلِ تعلیم کے لیے ہر مذہب و ملت کے لیے دروازے کھلے تھے۔ وہ علم کی قدر و منزلت کو جانتا تھا چنانچہ اس دور میں جتنے علماء لاہور میں پیدا ہوئے، وہ شاید ماموں کا بغداد بھی پیدا نہ کر سکا ہو۔ اس نے اپنے دربار میں علماء و فضلاء کا ایک بہت بڑا طبقہ پیدا کیا۔ ان علماء کو دربار میں اتنا اقتدار دیا کہ انہیں سلطنت کا ایک رکن تصور کیا جاتا تھا۔ عیسائی، پارسی، غرضیکہ کسی مذہب و ملت کا عالم علوم و فنون لیے دربار میں حاضر ہوتا تو اس کی قدر افزائی ہوتی۔ وہ علماء، فضلاء اور ادباء کو دربار میں ممتاز مقام دیتا اور ان سے علوم و فنون کی سماعت کرتا۔ مصنف آئین اکبری کا بیان ہے: مثنوی مولانا روم، جام جم، قابوس نامہ، حدیقہ حکیم سنائی، کیمیائے سعادت، گلستان بوستان، شاہنامہ فردوسی، خمسہ نظامی، خمسہ امیر خسرو، کلیات جامی، کلیات خاقانی، دیوان انوری، مکتوبات شرف الدین منیری جیسی کتابیں تو اس نے صفوصفو علماء سے سنیں، جگہ جگہ اسلامی علوم کے مدارس اور مراکز قائم کیے۔ لاہور خصوصیت کے ساتھ ان علوم کا گہوارہ بنا دیا گیا۔ علماء کی سرپرستی ہوتی اور مدارس کے اخراجات حکومت برداشت کرتی۔ اکبر کے دین الٰہی کے اعلان کے باوجود علمائے اسلام کا ایک زبردست طبقہ پیدا

ہو چکا تھا جو خالص علوم اسلامیہ کی اشاعت میں سرگرم عمل تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح، حضرت مجدد الف ثانی رح، ابوالفضل، فیضی، ملّا مبارک، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولینا عبدالنبی اور سلطان الملک جیسے نامورانِ زمانہ خواہ اعتقاد و نظریات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کتنے ہی اختلاف رکھتے ہوں مگر اس دور کی علم پروری کی نعمت سے یہ تمام فضلاء بہرہ ور ہوئے۔

اکبر چونکہ خود دینی اقدار سے دُور ہو چکا تھا اس لیے اس نے خالص دینی علوم کی اشاعت و ترویج کو رعایا کے لیے ضروری نہ سمجھا بلکہ تمام علوم خواہ وُہ عقاید باطلہ پر مبنی کیوں نہ ہوں ملک میں رائج کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر بے دین دنیا کے مختلف ممالک سے برصغیر آپہنچا اور اپنی درس گاہ جاری کر کے سرکاری سرپرستی حاصل کرتا گیا۔ یونان کا فلسفہ، ایران کی شیعیت، ہندوستان کی ہندوانہ روایات اور پرتگال کی عیسائی مشنریاں برصغیر میں اپنے قدم مضبوط کرنے لگی۔ اس صورتِ حال نے اشاعتِ دین کی راہ میں بڑی مشکلات پیدا کر دیں۔ اسلام کی تضحیک و تمسخر کی کھلی چھٹی تھی۔ علماء کی بے عزتی، مشائخ پر بدزبانی، اذان پر مذاق، حتیٰ کہ ہادیِ اسلام پر ناروا حملوں کو بھی اکبر حکومت کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ یہ دور علماء اسلام کے لیے بڑا ابتلاء کا دور تھا۔ درباری علماء تو ہوا کا رُخ دیکھ کر فوراً سرِ تسلیم خم کر دیتے مگر علماء اہل سنّت نے ان فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی رح، شیخ محدث دہلوی رح، ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی رح، جمال تلوی[1]، ملّا عبدالقادر بدایونی، سلطان الملک رحمۃ اللہ علیہم ملک کے گوشے گوشے میں علمِ مصطفیٰ کو بلند کرنے میں ساعی رہے۔ ان پر سختیاں ہوئیں، سزائیں دی گئیں، حوصلہ شکن حالات پیدا کیے مگر یہ علماء اہل سنّت اپنے عزم و استقلال سے کام کرتے گئے۔ انہوں نے

---

[1] ملّا جمال تلوی رح: آپ لاہور کے محلہ تلہ (میو ہسپتال سرائے رتن چند بھارت بلڈنگ کے موجودہ مقام پر) میں قیام پذیر تھے۔ آپ کی ایک درس گاہ تھی جس میں طالبانِ علمِ دین کی خاصی تعداد تفسیر و حدیث اور دیگر اسلامی علوم حاصل کرتی تھی۔ آپ کو حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ سے بے حد عقیدت تھی۔ پورے بارہ سال حضرت مخدوم علی الہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر روزانہ حاضر ہوتے رہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اپنی شبانہ روز کوششوں سے ہوا کا رُخ بدل دیا اور اسلامی علوم کی عظمت کو از سرِ نو بحال کیا۔ انہوں نے اپنے مدارس میں قرآن، حدیث، فقہ کو رائج کیا اور برملا ثابت کیا ؎

علم دین فقہ است قرآن و حدیث
ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث

اکبر اپنے عہدِ حکومت میں کشمیر جاتے ہوئے لاہور میں دربار لگاتا جس سے اس شہر کی معاشرتی تہذیب پر بڑے گہرے اثرات وارد ہوتے۔ اس کی حکومت کے آخرین

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ایک دفعہ آپ کئی روز تک کھانے کے لیے کچھ حاصل نہ کر سکے۔ صبر و تحمل کا یہ عالم کہ اپنی اس فاقہ کشی کا کسی کے سامنے ذکر تک نہ کیا۔ قریب ہی خانِ خاناں کا باغ تھا، اس میں چلے گئے۔ ایک شہتوت کا درخت تھا جس کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ دل میں خیال پیدا ہوا کاش اس درخت پر پھل ہوتا، حالانکہ شہتوت کا موسم دو ماہ ہوئے ختم ہو چکا تھا۔ ٹہنیوں کی اوٹ سے ایک نورانی شکل نے کہا، جمال! توت کھاؤ گے؟ آپ نے کہا، ہاں۔ ٹہنیاں ہلیں اور توت زمین پر گرنے لگے۔ آپ نے جی بھر کر کھائے۔ کہتے ہیں وہ علی الہجویری تھے۔ آپ نے فرمایا، جمال! تم ہمارے عقیدت مند ہو، آج سے پانچ روپے روزانہ خزانۂ غیب سے آیا کریں گے۔

مولانا جمال کہتے ہیں: ازاں روز مرحوم از امرا و شاگرداں وغیرہم ہدایہ می فرستند حساب می کنم روزے پنج روپیہ شود۔ (مرآۃ العالم ص ۴۹۰)

مولانا نے اوچ شریف کے فاضل یگانہ ملا اسماعیل سے علومِ دین میں مہارت حاصل کی۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں، اس وقت کے وہ اعلم العلمائیں سے ہیں۔ ان کا درس بے مثال ہے۔ بڑے خوش بیان اور رز در دارِ خطابت کے مالک تھے۔ معقولات اور منقولات کی باریکیاں شاگردوں کے ذہن نشین کراتے۔ فیضی اپنی بے نقاط تفسیر سواطع الالہام کی اصلاح آپ سے لیتا تھا۔ (بدایونی ج ۳ ص ۷۰)

ملا بدایونی نے آپ کی تعریف میں کیا خوب کہا تھا ؎

چیست بحث علم اگر تا فرق فرقد می رود
ذکر مولینا جمال الدین محمد می رود

پندرہ سال وسط ایشیا اور افغانستان و ایران کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے مغلیہ سلطنت کے شمالی علاقوں کے حالات کو ابتر بنا دیا تھا۔ چنانچہ اکبر آگرہ و دہلی چھوڑ کر لاہور دربار میں زیادہ قیام کرنے لگا۔ اس کے اس قیام سے لاہور کے سماجی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں نمایاں ترقی ہوئی۔ مدارس مکمل گئے، دار العلوم قائم ہوئے، کتب خانے ترتیب دیئے گئے؛ مختلف نظریات کے علماء کی آمد و رفت جاری ہوئی۔ علمی مباحثے، مناظرے اور مجادلے رونما ہونے لگے۔ بقول ملا عبدالنبی برصغیر میں کوئی عالم، شاعر وارد ہوتا تو اس کی پہلی منزل لاہور میں ہوتی۔ لاہور کی علمی مجالس دیکھتا تو اسے زندگی بھر لاہور کی یاد تازہ رکھتی۔ ملا عبدالنبی خود لاہور کے متعلق لکھتے ہیں:

"عجب شہرے بہ نظر ایں حقیر آمد از زانی و فراوانی"

صاحب ہفت اقلیم امین الدین رازی نے لکھا:

"لاہور میں علماء و فضلاء کی تعداد گنتی اور شمار میں نہیں آسکتی۔"

ملا عبدالباقی نہاوندی خانخاناں کے دربار کی علمی، ادبی اور شعری دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: "دراں وقت دار السلطنت لاہور دار الشعراء گردید"۔ ان علماء میں سے شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی،

لہ شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی: آپ نے لاہور میں بڑی شہرت حاصل کی۔ آپ لاہور کے علاقہ نخاس (آج کے دہلی دروازے سے لے کر ریلوے اسٹیشن، نولکھا، محلہ دارا شکوہ، سرائے سلطان، شہید گنج) میں درس دیتے۔ لوگ آپ کے درس سے نہ صرف علمی اعتبار سے متاثر تھے بلکہ وہ ایک پیر طریقت کی حیثیت سے بھی مانے جاتے تھے۔ آپ نے اکثر علوم اپنے والد مولانا فتح محمد دانشمند سے حاصل کیے۔ والد کی وفات کے بعد آپ دیپال پور میں شیخ بایزید کے تلامذہ میں شریک ہوئے۔ وہاں سے سندِ فضیلت حاصل کر کے لاہور میں ایک عظیم الشان دار العلوم قائم کیا اور شیخ اسحاق کاکو کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ بختاور خان مراۃ العالم میں لکھتے ہیں:

"بسا اوقات ایسا ہوتا کہ مولانا سعد اللہ کتب سلوک کا درس دے رہے ہوتے تو آپ پر حالت طاری ہو جاتی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر دو دو تین تین دن عالم سکر میں گزر جاتے۔ جب حالتِ صحو میں آتے تو شاگردوں سے قضا شدہ نمازوں کی تعداد پوچھتے، نمازیں ادا کرتے اور درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے۔" (باقی بر صفحہ آئندہ)

شیخ اسحاق کاکو، شیخ منصور لاہوری، مُلّا جمال تلوی، مولانا علاءالدین لاہوری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آپ علوم دینیہ کی تدریس و اشاعت میں دن رات ایک کر دیتے۔ امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم ان کا دستور حیات تھی۔ امام غزالی کی مشہور کتاب جواہر القرآن کی شرح لکھی۔ اکبر اکثر مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتا اور آپ کی گفتگو سے مطمئن ہو کر کہتا:

"اس مردِ حق سے سلف صالحین کی بُو آتی ہے"

آپ ۸۰ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ مصنف مرآۃ العالم نے سنِ پیدائش لفظ ذاکر (۹۲۱ھ) اور سن وفات لفظ حکیم (۹۹۹ھ) سے لیا ہے۔

۱؎ شیخ اسحاق کاکو: شیخ کاکو لاہور کے ان علماء کرام میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اشاعت علوم اسلامیہ میں زبردست حصہ لیا۔ وہ یگانۂ روزگار، متوکل اور متورع عالمِ دین تھے۔ تمام عمر درس تدریس میں گزار دی۔ حق گو اور حق شناس تھے۔ درویشانہ زندگی بسر کی۔ امراء و وزراء کے دربار سے اجتناب کیا۔ ۹۹۶ھ میں وفات پائی۔ مزار نخاس میں تھا مگر سکھ دور میں مزار کو مسمار کر دیا گیا۔

۲؎ شیخ منصور لاہوری: آپ اکبری سلطنت کے اہم امراء میں سے تھے۔ ایک مدت تک مالوہ کے قاضی رہے۔ پھر لاہور آ کر درس تدریس میں مشغول ہو گئے۔ مُلّا بدایونی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

"از جملہ ملایان ہند بعد از پیر محمد خان شیروانی و ملا نور محمد ہیچ کس دیگر بہ بذل و کرم و نثار و ایثار ضرب المثل نہ شدہ"

انہوں نے اپنی زندگی کی ساری کمائی طلباء علم دین پر صرف کر دی۔ وہ درویشوں کی ضروریات کو ہر چیز پر مقدم جانتے اور درس و تدریس کو اپنی زندگی کا سرمایہ خیال کرتے۔ اکبر نے بارہا مختلف عہدوں کی پیشکش کی۔ مگر آپ نے علوم دینیہ کی تدریس کو ہی اپنی زندگی بنا لیا۔

۳؎ مولانا علاءالدین: آپ شیخ منصور لاہوری کے صاحبزادے تھے۔ وہ اپنے والد کے برعکس دربار شاہی سے نفرت کرتے تھے۔ اکبر نے انہیں بارہا ملازمت میں لینے کی کوشش کی مگر وہ ہر بار عذر کر کے بچ جاتے تھے۔ درس و افادہ میں مشغول رہتے۔ علماء کی مجالس میں وقت گزارتے۔ جو کچھ جاگیر سے حاصل ہوتا شاگردوں پر خرچ کر دیتے۔

شیخ منور لاہوری[1] اور شیخ معین[2] لاہوری جیسے حضرات نے لاہور کی سرزمین کو درس و تدریس سے بغدادِ ثانی بنا دیا تھا۔ حالات کی ناہمواری کے باوجود شبانہ روز کام کرتے گئے اور علم دین کی اشاعت میں لگے رہے۔ دوسری طرف حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ کی تحریک دعوت و عزیمت سارے برصغیر میں صحیح اسلامی شعور بیدار کر رہی تھی۔ وہ امراء، وزراء اور خود مغل شہزادوں کے ذہنوں کو اسلام کے قریب لانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اکبری بدعات و

---

[1] شیخ منور لاہوری: آپ شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی کے شاگرد اور خواہر زادہ تھے۔ قرآن کریم کے حافظ اور ہفت قرأت کے ماہر تھے۔ بیس سال کی عمر میں تحصیلِ علوم سے فارغ ہوئے اور مسندِ تدریس پر بیٹھے۔ بڑے ذہین اور طبّاع تھے۔ تفسیر قرآن بیان فرماتے اور متقدمین کی تفاسیر سے حوالے لکھاتے جاتے۔ آپ کی شہرت لاہور کی دیواروں سے نکل کر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اکبر نے ملازمت کی دعوت دی مگر آپ نے درس و تدریس کو ترجیح دی۔ جب ملک میں مذہبی اختلافات کا آغاز ہوا اور اکبری دربار علماء سوء کی بدولت ہر قسم کی بے دینیوں کا مرکز بن گیا تو آپ نے بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ سے مل کر صدائے احتجاج بلند کی۔ آپ لاہور میں اکبری بدعات کے خلاف دن رات کام کرتے۔ آخر شاہی حکام نے آپ کو کالے پانی کی عمر قید دی اور گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا جہاں آپ نے ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

آپ بڑے صاحبِ تصنیف تھے۔ فنِ حدیث میں مشارق الانوار کی شرح لکھی۔ شرح بدیع الزماں، شرح ارشاد قاضی اور مجمع البلدان کا فارسی ترجمہ کیا۔

[2] شیخ معین لاہوری: آپ حضرت معین واعظ کاشفی مصنف معارج النبوت کے پوتے تھے۔ بڑے فرشتہ سیرت عالمِ دین تھے۔ کچھ عرصہ کے لیے لاہور کے قاضی مقرر ہوئے اور عدالت کے فیصلوں میں فریقین کی مصالحت پر زور دیا کرتے۔ اپنا حکم یا تحریر نافذ کرنے کی بجائے فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن مجھے غلط فیصلہ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر کوئی عورت تنسیخِ نکاح کا دعویٰ کرتی تو اسے وظیفہ مقرر کر دیتے اور نصیحت کرتے کہ خاوند کے حالات کی بہتری کا انتظار کرو۔ عدالت سے باہر آپ طالبعلموں کو پڑھاتے۔ کاتبوں کو مزدوری دے کر نادر کتابیں لکھواتے اور طالب علموں کو مطالعہ کے لیے دیتے۔ آپ ۹۹۵ھ/۱۵۵۷ء میں فوت ہوئے۔

مناہیات کا رُخ بدل دیا۔ ادھر جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد تو ہوا کا رُخ بدل گیا تھا۔ علماء کے مدرسوں سے جو طلباء فارغ ہوتے وُہ بھی ملّت کی شیرازہ بندی میں ممد و معاون ثابت ہوتے۔

ان بزرگان اہلسنّت کے علاوہ جن علماء کرام نے لاہور کو علم و عرفان کی دولت بخشی ان میں سے ملّا ہادی محمد،[1] شیخ مُوسیٰ حدّاد،[2] مولانا محمد مفتی[3] اور مولانا الہٰ داد لنگر خانی[4] کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے وجود سے لاہور کی معاشرت میں اسلامی رنگ پیدا ہوا۔ ان بزرگانِ دین کے

---

[1] ملّا ہادی محمد لاہور میں پیدا ہوئے۔ یہاں ہی تعلیم پائی۔ قرآن و حدیث کے مطالعہ کو پسند کرتے اور معقولات کو گمراہی کا پیش خیمہ خیال کرتے تھے۔ فقہ میں کمال پیدا کیا۔ حدیث پڑھنے کے لیے جہاں کسی کا پتہ چلا، پہنچے۔ دینی علوم کی اشاعت میں ہمہ تن مشغول رہتے۔ دل محبتِ الٰہی سے لبریز تھا۔ اہل اللہ کی تلاش میں رہتے۔ اپنے مکان کے سامنے مسجد بنائی، وہاں ہی درس دیتے۔ بڑی شہرت و عظمت کے مالک تھے۔ ۱۰۱۰ھ میں فوت ہوئے۔

[2] شیخ موسیٰ حدّاد: آپ سنّت کے عاشق، امام ابوحنیفہؒ کے جاں نثار اور دلی عقیدت مند تھے۔ حنفی مسلک پر گامزن رہے۔ بہترین قاری تھے۔ قرآن کریم سوز و گداز سے تلاوت کرتے تو پرندے اپنی پرواز بُھول جاتے۔ سنگ دل سے سنگ دل لوگ موم کی طرح پگھل جاتے۔ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ولی کامل بھی تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد اَن گنت تھی۔ بعض تذکروں میں آپ کو موسیٰ قاری کے نام سے لکھا گیا ہے۔ قرأت و تجوید کے فن کو خوب جانتے تھے۔ اکبر کے ابتدائی عہد میں فوت ہُوئے۔

[3] مولانا محمد مفتی: اکبری دور کے زبردست مفتی تھے۔ ایک عرصہ تک لاہور میں عہدۂ قضا پر فائز رہے۔ مگر اکبری دور کی غیر اسلامی حرکات سے تنگ آ کر عوام الناس میں درس و تدریس کرنے لگے۔ فقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ علم حدیث و تفسیر میں کمال پیدا کیا۔ مُلّا بدایونی اپنی کتاب منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ آپ بخاری اور ترمذی شریف پڑھاتے، ختم کرتے تو پُر تکلف دعوت دیتے جس میں لاہور کے علماء و طلباء شرکت کرتے۔ جہاں کسی صاحبِ علم کی خبر پاتے خود حاضر ہو کر مسائل پر گفتگو کرتے۔ ۱۰۰۴ھ میں نوّے سال کی عمر تھی مگر درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔

[4] مولانا الہٰ داد لنگر خانی: لاہور میں مال روڈ کے ساتھ جہاں آج کل مسجد شاہ چراغ، سٹیٹ بنک کا اکاؤنٹنٹ جنرل آفس اور ہائی کورٹ کی عمارتیں ہیں یہاں لنگر خان کے محلات ہوتے تھے۔ یہ علاقہ محلہ لنگر خان کہلاتا تھا۔ مولانا الہٰ داد کا درس اسی محلہ میں تھا۔ آپ فرشتہ سیرت اور بلند اخلاق معلّم تھے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

علاوہ بہت سے علماء کرام نے اپنے ذاتی مدارس قائم کیے۔ وہ ہر محلہ اور ہر علاقہ میں درس و تدریس کا اہتمام کرتے۔ دربار کی چیرہ دستیاں ان سالکانِ راہِ اسلام کی رفتار کو نہ روک سکیں۔ اگرچہ "تاریخ ان نفوسِ قدسیہ کے اسمائے گرامی اور ان کے کارناموں کو محفوظ نہیں رکھ سکی تاہم بعض تذکروں میں جن بزرگوں کے اسمائے گرامی ملتے ہیں وہ اس دور میں اشاعتِ علوم میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے۔ قاضی صدر الدین لاہوری قاضیِ شہر ہونے کے باوجود علومِ دینیہ کی تدریس کرتے۔ ملا ابوالفتح لاہوری کا درس بڑا مشہور تھا۔ آپ کے بھائی عبدالجلیل شہر کے مفتی رہے۔ آپ کے متوسلین میں سے ملا عبدالرحمٰن لاہوری بڑے مشہور مدرس تھے۔ ملا امام الدین لاہوری ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہتے۔ ان کے پاس طلباء کا ہجوم رہتا۔ ملا اسحاق کاکو کا درس لاہور میں بڑا مشہور تھا۔ وہ اپنے تقوٰی اور طہارت کے لحاظ سے عوام کی نگاہ میں نہایت احترام سے دیکھے جاتے۔ شیخ نعمت اللہ لاہوری، شیخ نورالدین کمبوہ، ملا ہاشم کمبوہ، ملا شمس خان کمبوہ، ملا بایزید لاہوری بھی ان فضلائے روزگار میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے درس و تدریس میں حصہ لیا۔ ملا نوراللہ شوستری نے شیعہ طلباء کو لاہور میں بڑا سہارا دیا۔ وہ اکبر کے حکم سے لاہور کے قاضی تھے مگر فارغ اوقات میں شیعہ فقہ پر درس دیتے۔ آپ کی کتاب مجالس المومنین بڑی مشہور ہوئی۔ ملا حسام الدین لاہوری علوم عقلی یا علم الکلام میں بڑے ماہر تھے۔ اکثر طلباء آپ سے فنِ مناظرہ کے گُر سیکھتے۔

جہانگیری عہد ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء کے علماء

اکبر کی موت کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا تو اکبری دور کی تمام بدعات دم توڑ رہی تھیں۔ علماء اہل سنت کی شبانہ روز کوششوں سے معاشرے میں اسلامی احیاء کی تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اکبر کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سنت کے عاشق اور شیفتہ تھے۔ آپ کے تقوٰی اور طہارت کے پیش نظر لوگ آپ کو متقی کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ آپ علوم متداولہ کے زبردست عالم تھے۔ درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ اکثر امراء و وزراء آپ سے عقیدت رکھتے تھے۔ آپ کا ذریعہ معاش چند چکیاں تھیں جو کرایہ پر چلتی تھیں۔ جو کچھ آجاتا اسی سے گزر اوقات کرتے اور دینی تعلیم میں مشغول رہتے۔

ہندو نوازی نے مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی روایات کو زندہ رکھنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ادھر حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے رفقاء کی زبردست کوششوں سے دربار کا رنگ بھی بدل رہا تھا اور پھر عوام میں ایک شدید ردّ عمل نمودار ہو رہا تھا۔ جہانگیر بڑا عالم، شاعر، علم پرور اور سمجھدار بادشاہ تھا۔ اس نے مسلمان معاشرت کو اُبھرتے ہُوئے دیکھ کر حالات کا رُخ بھانپ لیا اور ان بدعات سے ہٹنے لگا جن سے اکبری دربار دنیائے اسلام میں بدنام ہو چکا تھا چنانچہ اس نے اور کارناموں کے علاوہ تخت نشین ہوتے ہی حکم دیا کہ اسلامی علوم کے وُہ مدارس جو رافضیوں یا ہندوُوں کے سیاسی دباؤ سے ایک عرصہ سے بند پڑے ہیں از سرِ نو آباد کیے جائیں۔ اساتذہ کا اہتمام کیا جائے، طلباء کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ تاریخ جانِ جہان کے مصنف (جہانگیر کا ہمعصر) لکھتے ہیں کہ اس حکم کے بعد گزشتہ تیس برس سے جو مدرسے پرندوں اور درندوں کا مسکن بنے ہُوئے تھے، پھر سے آباد ہُوئے۔ طلبہ جوق در جوق ان میں داخل ہونے لگے۔ جو لوگ حالات کی ناہمواری سے گوشہ نشین ہو گئے تھے از سرِ نو علوم و فنون کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ پُرانے مدرسوں کے ساتھ نئے مدرسے کُھلنے لگے۔ محمد صفی دیوان گجرات نے جبل پور میں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا۔ سیف خان ناظم گجرات نے احمد آباد میں ایک عالی شان عمارت بنوائی جس میں مدرسہ قائم کیا۔ جہانگیر نے مزید حکم نافذ کیا کہ جو شخص لاوارث مر جائے اس کی جائیداد اسلامی مدارس کے اخراجات پر لگائی جائے۔ اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو شخص بھی علم رکھتا تھا اشاعتِ علم پر کمربستہ ہو گیا۔

مغل دربار کی تبدیلی سے لاہور کی معاشرت نے بڑا خوشگوار اثر قبول کیا۔ تہذیب و ثقافت میں اسلامی رنگ بھرنے لگا۔ شعر و ادب کا مذاق بیدار ہوا۔ صنعتی اور تجارتی اداروں میں ملازمین بھی شعر و ادب کے دلدادہ ہوتے۔ سپاہی میدانِ جنگ میں تلوار کی ضرب کے ساتھ شعری ذوق کو زندہ رکھتا۔ جہانگیر فخریہ انداز میں لاہور کے متعلق کہا کرتا تھا ؎

لاہور را بجاں برابر خریدہ ایم
جاں دادہ ایم و جنّت دیگر خریدہ ایم

طالب عاملی نے لاہور کی زندگی کو کس انداز سے بیان کیا ؎

گمانم نیست کاندر ہفت کشور
بود شہرے چو آب و تاب لاہور
بیاں بکشاد خوش و اکش کہ در ہند
فراغت نیست جز در خوابِ لاہور

لاہور میں اشاعتِ علوم دینیہ کا جو زبردست اہتمام ہوا، اس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر ایران، توران اور روم تک جا پہنچی، علماء کرام کھچے آتے، طالبانِ علم دوڑے آتے۔ اکبر کے زمانہ میں رافضی علماء ایران سے درآمد ہو رہے تھے۔ عیسائی پرتگال سے اور دوسرے ملحدین دنیا کے گوشہ گوشہ سے۔ مگر جب یہاں اسلامی روایات کو فروغ ملنے لگا تو وہ صرف علم کی تحصیل یا اشاعت کے لیے ہی ادھر کا رُخ کرتے۔ اس دور میں لاہور کے جن علماء کرام نے علمی خدمات کو سرانجام دیا ان میں حضرت ملا عبدالسلام[1] لاہوری، میرک شاہ[2] ہروی،

[1] ملا عبدالسلام لاہوری: آپ معقولات و منقولات کے امام مانے جاتے تھے۔ جہانگیری دور میں آپ کا درس لاہور کی ایک عظیم الشان درس گاہ تھا۔ انہوں نے وقت کے مشاہیر علماء کرام سے استفادہ کیا اور پھر علم کو بکھیرا، اور اس کی اشاعت کا بڑا عمدہ اہتمام کیا۔ حضرت شیخ کاکو، شیخ سعداللہ بنی اسرائیلی، قاضی صدرالدین جالندھری کے درس میں شریک رہے۔ فقہ میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ اکبر کے وزیر الیات امیر فتح اللہ شیرازی سے ریاضی اور تفسیر پڑھی۔ آپ نے لاہور میں پچاس برس درس دیا۔ آخرین عمر میں تفسیر بیضاوی پر عمدہ حواشی لکھے جو علماء نے بے حد پسند کیے۔ آپ کی درس گاہ نے بڑے بڑے متبحر علماء پیدا کیے۔ ملا عبدالسلام دیوی، میرک شیخ ہروی جیسے نابغۂ روزگار علماء آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ ملا نظام الدین ہروی نے اپنی کتاب طبقاتِ اکبری میں آپ کو "فحول علماء لاہور" لکھا ہے۔ آپ نوے سال کی عمر میں ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء میں فوت ہوئے۔

[2] علامہ میرک شاہ ہروی: آپ ایران سے لاہور آ بسے۔ عہد جہانگیری کے مشہور عالم دین قاضی محمد اسلم کے برادر زادہ تھے۔ ملا عبدالسلام لاہوری کے درس میں داخل ہوئے اور اپنی فضیلت علمی کے باوجود استفادہ کرتے رہے۔ درس سے فارغ ہوئے تو مغلیہ شہزادوں کے خاص اتالیق مقرر ہوئے۔ شہزادہ دارا شکوہ اور دوسرے شہزادے آپ سے پڑھے۔ شاہجہان نے آپ کو دو ہزاری کا منصب عطا کیا اور صدر الصدور مقرر کیا آپ ۱۰۷۱ھ/ ۱۶۶۰ء میں فوت ہوئے۔

سید سرؒ، مولوی عبدالحکیم گیلانیؒ، ملا بایزیدؒ، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولوی سعید اعجاز کے

لہ سید سرؒ: لاہور میں سید سرؒ کا مدرسہ موجودہ برٹ انسٹی ٹیوٹ گڑھی شاہو کی جگہ پر واقع تھا۔ یہ دارالعلوم مدتوں علمِ دین کی دولت بانٹتا رہا مگر سکھا شاہی کے زمانہ میں اس علاقہ کو مسمار کر دیا گیا اور دارالعلوم کی عمارتوں کو مسمار کر کے پیوست زمین کر دیا گیا۔ تحقیقات چشتی کے مصنف نور احمد چشتی جب حکومت برطانیہ کے ابتدائی زمانے میں اس دارالعلوم کی مسجد اور تالاب کی تلاش میں گئے تو وہاں لہلہاتے کھیت تھے۔ لوگ جس تالاب سے پانی لے جاکر بچوں کے بدن کے پھوڑے پھنسی کا علاج کرتے تھے بند پڑا تھا۔ البتہ اب تک لوگ وہاں سے مٹی اٹھا کر لے جاتے اور پانی میں بھگو کر پھوڑے پھنسی والے بچوں کے جسم پر ملتے جن سے انہیں شفا ہو جاتی۔ اس مدرسہ کے صدر مدرس شہرۂ آفاق مفتی اور ممتاز فقیہہ سید سرؒ تھے۔ سید سرؒ کے جدِ امجد سکندر شاہ سوری کے لشکر میں سپاہی بھرتی ہوئے اور جنگوں میں دادِ شجاعت دیتے رہے۔ اکبر کے ابتدائی دورِ حکومت میں سرہند کے قریب میدانِ جنگ میں کام آئے۔ ان کا ایک بیٹا سید عبدالخالق بڑا عالم فاضل، عبادت گزار اور متقی انسان تھا اس نے علومِ دینیہ میں کمال حاصل کیا۔ فقہ، اصول، حدیث، معانی، ادب، منطق اور قرآنی علوم میں عالم اجل بنا۔ اس نے لاہور میں ایک دینی مدرسہ جاری کیا، ساتھ ہی ایک وسیع تالاب بنایا۔ یہ آبادی سید سرؒ اور گرد و نواح گذر سید سر کہلاتے تھے۔ سید عبدالخالق درس و تدریس کے بعد اپنا سارا وقت عبادتِ الٰہی میں گزار دیتے۔ اکبر لاہور میں قیام پذیر ہوا تو آپ کی شہرت اور علم سے بڑا متاثر ہوا۔ مدرسہ کے اخراجات کے لیے ایک گاؤں اور نوسے بیگھے زمین عطا کر دی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے بیٹے سید عبدالوہاب نے مسندِ تدریس سنبھالی۔ پھر ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سید عبدالقادر نے دارالعلوم کی رونق کو تازہ رکھا۔ ان کے بیٹے سید عبداللہ نے یہ ذمہ داری قبول کی اور نواب زکریا خاں کے زمانہ تک بڑی آب و تاب سے تدریس کا کام جاری رکھا۔ سکھوں کی تاخت و تاراج نے مدرسہ کو تباہ کر دیا۔

لہ آپ ملا بایزید کے نامور فرزند تھے۔ جہانگیری عہد میں علم و فضل کی اشاعت بڑی محنت سے کی۔ والد بزرگوار کے مدرسہ کو وسعت دی۔ تحقیقاتِ چشتی نے آپ کا سنِ وفات ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء لکھا ہے۔ آپ کا مزار شاہ شمس الدین قادری کے مزار سے مغرب اور گورنمنٹ ہاؤس کے جنوب میں واقع تھا۔ جب لاہور سے میاں میر چھاؤنی کی سڑک بنائی گئی تو مزار منہدم ہو گیا۔ آپ بڑے متوکل اور قناعت پسند تھے۔ دربارِ شاہی سے بار بار دعوت ملی مگر نہ گئے اور اشاعتِ علمِ دین میں مشغول رہے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

اسمائے گرامی آسمانِ شہرت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ ان حضرات نے عوام الناس کے دامن دولتِ علم سے بھر دیئے اور اپنی شبانہ روز کوششوں سے علومِ اسلامیہ کو ازسرِ نو زندہ کیا۔ درباری الحاد کو ختم کرنے اور اسلامی روایات کو لوگوں کے دلوں میں زندہ رکھنے میں ان بزرگانِ دین اور علماءِ لاہور کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے تلامذہ میں جن لوگوں نے شرکت کی وہ سارے برِّصغیر اور کابل و کشمیر تک پھیل جاتے اور دینی تعلیمات کو پھیلاتے رہے۔ جہانگیری دور میں لاہور کی اور درسگاہوں کے علاوہ مدرسہ گورنر قلیچ خان[۱] اور مدرسہ جہانگیری[۲] عیدگاہ نے اشاعتِ علوم میں بڑا حصہ لیا۔ یہ مدارس اپنے اہتمام اور خوشِ انتظامی کے لحاظ سے ہزاروں طالبانِ علم کی علمی تربیت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

[۱۲] مولوی محمد سعید اعجاز: آپ جہانگیری عہد میں دلّی سے لاہور آئے۔ چونکہ فاضلِ یگانہ تھے۔ لاہور میں تعلیم و تعلم کا کام شروع کیا۔ محمد افضل سرخوش نے لکھا ہے کہ آپ معقول و منقول میں متبحر تھے۔ طلباء کے "افادات و افاضات" میں مصروف رہتے۔ کلمات الشعراء میں آپ کا یہ شعر آپ کی لیاقتِ شعری کا پتہ دیتا ہے ؎

کشیدہ ام زجنوں ساغرے کہ ہوش نماند
دگر معاملہ با پیرے فروش نماند

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[۱] لاہور میں مغل عہد کے دوران قلیچ خان اندجانی کا مدرسہ بہت مشہور تھا۔ قلیچ خان اکبر کے نامی گرامی افراد میں تھا۔ وہ ایک طرف بہادر سپاہی، نغز گو شاعر اور زبردست عالمِ دین تھا تو دوسری طرف سالک راہ طریقت، عابد شب زندہ دار اور نہایت متقی و پرہیزگار تھا۔ وہ لاہور کا گورنر مقرر ہوا تو فرائضِ حکمرانی سے فارغ ہو کر تعلیم و تدریس میں مشغول رہتا۔ اس کے درس میں تفسیر، حدیث اور فقہ کے منتہی طالب علم شریک ہوتے۔ مآثر الامراء کے مصنف نے ذخیرۃ الخوانین کے حوالے سے قلیچ خان کے متعلق بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ...۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء میں وہ جون پور میں اپنا محل تعمیر کرانے کے لیے بنیادیں کھدوا رہا تھا۔ بنیاد کے نیچے ایک گنبد کے نشان نظر آئے۔ قلیچ خان کو اطلاع دی گئی۔ وہ اس کھدائی کی نگرانی کے لیے خود موقعہ پر آیا۔ دس دن تک اس مقام کی کھدائی کراتا رہا۔ (باقی برصفحہ آئندہ)

کفیل تھے۔ اور بڑی جامعیت کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ان درس گاہوں میں طلباء کو وُہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تمام امراء جمع تھے۔ آخر ایک دروازہ نمودار ہوا جس پر تالا پڑا تھا۔ قلیچ خان نے تالا توڑا اور جمِ غفیر لے کر گنبد میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا ایک شخص جوگیوں کی طرح آسن مارے بیٹھا ہے وُہ اتنے ہجوم کو دیکھ کر کہنے لگا: "کیا رام چندر کا اوتار ہو چکا؟" جواب دیا گیا: "ہاں"۔ "آیا سیتا راون کے نیچے سے نکل کر رام چندر کو مل گئی؟" بتایا گیا: "ہاں"۔ اس نے پھر پوچھا: "آیا کرشن کا اوتار متھرا میں ہو چکا"۔ سب نے جواب دیا: "ایک ہزار سال بیت گئے"۔ اس نے کہا: "کیا حضور کی بعثت ہو گئی؟" سب نے کہا: "ہاں اور آپ کے دین نے تمام ادیان کو باطل قرار دے دیا ہے۔" اس نے پھر پوچھا: "کیا گنگا کا پانی جاری ہے؟" جواب دیا گیا: "ہاں"۔ اس پر اس نے کہا: "مجھے باہر نکالو"۔ سات خیمے ایک دُوسرے کے ساتھ ساتھ لگائے گئے۔ وہ ہر روز ایک خیمے میں بسر کرتا۔ آٹھویں دن باہر آیا۔ عام کھانا آتا اور مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتا۔ چھ ماہ زندہ رہا اور پھر فوت ہو گیا۔ (مآثر الامراء ج ۳ ص ۴۰۲)

۲؎ عید گاہ جہانگیری، جہاں ان دنوں جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو کی عظیم الشان عمارت ہے۔ وہاں جہانگیر نے اپنے عہدِ حکومت میں ایک عظیم الشان مسجد بنوائی اور اسے عیدگاہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ ان عمارتوں پر اس وقت بیس لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا مدرسہ تھا یہ عمارت انگریزوں کے ابتدائی دور تک ٹھیک رہی۔ تحقیقاتِ چشتی کے مصنف نے ان کھنڈرات کو دیکھا جو مدرسہ، مسجد اور عیدگاہ کی پرشکوہ عمارت کا پتہ دیتی تھی۔ یہاں انگریزوں کی کوٹھیاں تھیں اور مسجد و مدرسہ مسمار ہو چکے تھے۔ شاہجہان نے اپنے عہد میں اس مدرسہ کو بڑی رونق بخشی۔ نورجہاں کے ایماء پر مولوی عنایت حسین اس مدرسہ کے مہتمم اور صدر مدرس مقرر ہُوئے مگر امامت حافظ حبیب کراتے تھے۔ سیّد مقبول حسین اس کے نگران تھے۔ اس مدرسہ میں ۵۰ مدرس، ۱۰۰ منشی اور تقریباً ۲۰۰ کارندے تھے۔ احمد شاہ ابدالی تک یہ مدرسہ علمِ دین کی اشاعت کا مرکز رہا۔ لیکن سکھ گردی نے اسے بالکل تباہ کر دیا۔ اس مدرسہ کے بانیوں کے خلوص کا یہ ثمرہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد لاہور کے ایک فاضل عالمِ دین حضرت مفتی محمد حسین صاحب نعیمی نے عیدگاہ کو دارالعلوم جامعہ نعیمیہ میں منتقل کر کے مغل دور کی اس علمی یادگار کو تازہ کر دیا۔ ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی۔ دارالعلوم کی عمارت میں طلباء کی رہائش کے انتظامات، بڑی عمدہ لائبریری اور ایک شاندار درس گاہ کا اہتمام کیا اور علمِ دین کی اشاعت میں سرگرمِ عمل ہُوئے۔

تمام سہولتیں میسر ہوتیں جو آج کی یونیورسٹیوں کے ان طالب علموں کو میسّر نہیں ہیں جو بیرونی ممالک کے وظائف پر کام کر رہی تھیں۔

شاہجہانی عہد کے علمأ (۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۷ء)

شاہجہان
مغل سلطنت

یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے برصغیر میں اسلامی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے بڑے ذوق اور شوق کا مظاہرہ کیا۔ وہ نہ صرف خود علم دوست اور فنون عالیہ کا قدر دان تھا بلکہ اس نے ساری مملکت میں ذوق سلیم کی وہ روایات قائم کیں جو صدیوں اس کے کمالات کا اعلان کرتی رہیں گی۔ اس نے مساجد بنائیں، عالی شان مقبرے تعمیر کیے، مدارس جاری کیے، گرانقدر کتب خانے جمع کیے اور اہل علم کے لیے اپنے دربار کے دروازے کھول دیئے۔ وہ اپنے دادا اکبر کے برعکس اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات کو تازہ کرنا چاہتا تھا۔ اس میں وہ کسی حد تک کامیاب رہا۔ یہ بات اس کی شاہی مساجد، مضبوط قلعوں اور تاج محل کے آثار سے نمایاں ہے۔

شاہجہان چونکہ لاہور میں پیدا ہوا تھا اس لیے اسے لاہور سے خاص محبت تھی اور اس فطری اُنس کے پیشِ نظر اس نے لاہور کو خاص ترقی دی۔ اگرچہ ایران اور ہندوستان کے سیاسی تعلقات بہت خوشگوار تھے لیکن ایران میں بڑھتی ہوئی شیعیت ایک مستقل خطرہ بنتی جا رہی تھی ان لوگوں نے وہاں کے علماء اہل سنت پر ظلم و ستم کے دروازے کھول دیئے تھے۔ ادھر دکن بیجاپور کی شیعہ ریاستیں تیموریوں سے دلی طور پر مطمئن نہ تھیں۔ ادھر افغانستان میں کئی بار شورش برپا ہوئی۔ اس طرح مغلیہ سلطنت کو آگرہ اور دلی کی بجائے لاہور پر خصوصی توجہ دینا پڑتی تھی تاکہ ہمسایہ ممالک کی سیاسی صورت حال سے نپٹا جا سکے۔ اس صورت حال نے لاہور کو قدرتی طور پر علم و ادب کا مرکز بنا دیا۔ وہ اسلامی تہذیب و تمدن کی وجہ سے رشک وسط ایشیا بن گیا تھا۔ دُور دور سے علماء و فضلاء اور پھر طلباء آنے لگے۔ بادشاہ نے بھی دل کھول کر اہل علم کو نوازا، جا بجا مدارس قائم ہوئے، علمأ نے اپنے فیضان کو عام کر دیا۔ گلی گلی کوچے کوچے مکتب کھل گئے اور تعلیم عام ہو گئی۔ طبقات شاہجہانی کا مصنف محمد صادق لکھتا ہے، لاہور سے لے کر پشاور تک ہر گاؤں میں ایک مدرسہ موجود تھا۔ یہ مدارس آزادانہ تعلیم دیتے اور ایسا

نظام قائم کر دیا گیا تھا کہ عوام الناس ہی ان مدارس کے اخراجات کی کفالت کرتے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے اپنی تصنیف مآثر الکرام میں اس دور کی علمی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"شرفائے اپنے اپنے علاقوں میں مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائی ہوئی تھیں۔ ان مدرسوں کے ہر جگہ کے طالب علموں کے لیے دروازے کھلے تھے اور ہر مدرسہ کے دروازے پر یہ قطعات آویزاں تھے "علم کے طلب کرنے والو! ادھر آؤ!" طالب علم جوق در جوق مدارس میں آتے اور جہاں چاہتے آزادانہ تعلیم حاصل کرتے۔ لوگ طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرتے، خدمت کرتے اور اس خدمت کو سعادت دارین کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔"

داراشکوہ ۱۰۴۳ھ میں اپنے والد کے ساتھ کشمیر گیا۔ لاہور میں قیام کے دوران وہ علماء، شعراء اور اولیاء اللہ سے ملتا رہا۔ اس نے اپنے تاثرات سفینۃ الاولیاء میں ان الفاظ میں ادا کیے ہیں:

"لاہور ایک نہایت معزز اور ممتاز شہر ہے۔ اس کا ثانی روئے زمین پر نہیں۔ آج یہ شہر اولیاء، صالحین، علماء، فضلاء اور شعراء کا مرکز بنا ہوا ہے یہاں بہت سے مشائخ اور اولیاء کے مزارات ہیں۔ شہر لاہور کے محلہ تلہ میں تین ہزار حافظانِ قرآن موجود تھے۔"

اس عہد میں جن مدارس نے خصوصیت کے ساتھ اپنے نقوش تاریخ پر ثبت کیے ان میں مدرسہ دائی لاڈو[1]، درس میاں وڈا[2]، مدرسہ میانی صاحب[3]، مدرسہ خیر گڑھ، مدرسہ ابوالحسن خان تربتی[4]

---

[1] مدرسہ دائی لاڈو: شاہجہان کی دایہ لاڈو ایک خداترس عورت تھی۔ وہ شیخ سلیم چشتی کی مریدہ تھی۔ یہ محلہ تلہ (موجود بھارت بلڈنگ، میو ہسپتال، رتن چند سرائے) کے محلات میں قیام پذیر تھی۔ اس نے ایک عظیم الشان مسجد بنوائی اور مسجد کے ساتھ ہی ایک مدرسہ قائم کیا۔ اپنی جائیداد کا بہت بڑا حصہ مدرسہ کے اخراجات کے لیے وقف کرا دیا۔ یہاں مولانا شیخ عصمت اللہ درس دیتے تھے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

مدرسہ شیخ بہلولؒ، مدرسہ ملا فاضلؒ، مدرسہ شیخ جان محمد سہروردی، مدرسہ وزیر خان لور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ معقولات و منقولات کے ماہر تھے۔ ان کی علمی شہرت نے دور و نزدیک سے طلباء کو جمع کر لیا تھا اور اس طرح یہ مدرسہ ایک زبردست تعلیمی مرکز بن گیا۔

دائی لاڈو اور اس کے خاوند کی وفات کے بعد (ان میاں بیوی کے مزار مسجد دائی لاڈو کے ساتھ ہیں) ان کا لڑکا محمد شکور ایک عرصہ تک اس مدرسہ کا انتظام چلاتا رہا۔ اس نے اپنی ساری جائیداد مسجد اور مدرسہ کے نام پر وقف کر دی تھی۔ یہ مدرسہ نواب زکریا کے زمانے تک جاری رہا۔ لیکن سکھوں کے قبضہ کے بعد مدرسہ کی عمارت پیوند زمین کر دی گئی، باغ ویران ہو گئے۔ ۱۸۵۰ء میں رتن چند داڑھی والے نے جب اپنی حویلی تعمیر کی تو اس تباہ شدہ مدرسے کی اینٹیں استعمال میں لاتا رہا۔ سکھوں کے بعد عیسائیوں نے اس جائداد پر قبضہ کر لیا۔ میڈیکل کالج کی گراؤنڈ، ہوسٹل اور دوسرے مشنری ادارے بنا لیے۔

ؒ درس میاں وڈا: اس دور کا ایک اہم اسلامی دارالعلوم "درس میاں وڈا" یعنی بڑے مولوی صاحب کا مدرسہ تھا۔ یہاں محلہ تیل واڑہ آباد تھا اور مغل شہزادوں کے محلات او رباغات کا علاقہ تھا۔ اس مدرسہ کے بانی حضرت میاں محمد اسمٰعیل سہروردی تھے جو ۹۹۵ھ/۱۵۰۶ء میں پوٹھوہار کے گاؤں ترکراں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام فتح اللہ بن عبداللہ بن سرفراز تھا۔ آپ شیخ عبدالکریم سہروردی کے مرید تھے پوٹھوہار سے چل کر آپ دریائے چناب کے کنارے موضع لنگر میں سکونت پذیر ہوئے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں لکھا ہے کہ آپ بارہ سال کی عمر میں مولانا عبدالکریم کے درس میں داخل ہوئے۔ اس مدرسہ میں طلباء نے تقسیم کار کیا ہوا تھا۔ میاں محمد اسمٰعیل آٹا پیسنے پر مقرر ہوئے۔ مدتوں اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ایک دن آٹا آنے میں تاخیر ہوئی تو طلباء کو تشویش ہوئی۔ آپ کے کمرہ میں جھانک کر دیکھا تو آپ مراقبے میں ہیں اور چکی چل رہی ہے، آٹا پس رہا ہے۔ استاد کو خبر دی گئی خود موقعہ پر مشاہدہ کیا تو بات درست نکلی۔ صبح میاں محمد اسمٰعیل معذرت کرنے آئے تو استاد نے کہا: "اے نورِ نظر! آج سے تم آٹا پیسنے کی تکلیف نہ کرنا، تمہارے روحانی مشاغل میں ہرج ہوتا ہے"۔ آپ استاد کا حکم سن کر ڈر گئے مگر استاد نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا: گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ (باقی برصفحہ ۱۱۱)

مدرسہ ملا خواجہ بہاری خاص طور پر اشاعت علوم اسلامیہ کے زبردست مراکز تھے - یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۹) تمہاری تکلیف سے ملائکہ کو تکلیف ہوتی ہے -

آپ بڑے صاحب کرامت بزرگ کی حیثیت سے شہرت یافتہ ہوئے - درس و تدریس کے ساتھ روحانی تعلیم بھی دیتے - آپ کے مدرسہ کے طالب علم ایک عالم دین بننے کے ساتھ ساتھ ولی کامل بن کر نکلتے - آپ ۳۵ سال کی عمر میں اپنے استاد محترم کے حکم سے لاہور آئے - محلہ تیل واڑہ کے ساتھ گنج پورہ میں ایک قدیم مسجد جس پر ایک ہندو جوگی قابض تھا جو اپنے آپ کو بڑا کامل سمجھتا تھا مگر میاں اسمٰعیل صاحب نے اسے ایک ہی نگاہ سے مسجد سے باہر نکال دیا -

میاں محمد اسمٰعیل کے درس میں فقہ، قرآن پاک، حدیث اور علوم دینیہ کی تعلیم کا چرچا ہونے لگا تو ہزاروں طلباء جوق در جوق پہنچے - کتنا ہی غبی یا کند ذہن طالب علم آپ کے حلقۂ درس میں آتا حافظِ قرآن ہو کر جاتا - آپ فرمایا کرتے تھے کہ "فیض قرآن بعد از خاک قبر ما جاری خواہد شد" چنانچہ یہ فیضان آج تک جاری ہے - آپ ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں واصل بحق ہوئے - آپ کا مزار درس کے احاطے میں ہے - آپ کی وفات کے بعد مولانا صالح محمد ۲۵ سال تک مدرسہ کا اہتمام کرتے رہے - ان کی وفات کے بعد حافظ محمود ان کے بعد حافظ معز الدین، ان کے بعد حافظ شرف الدین درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھے رہے - حافظ شرف الدین ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۲ء میں فوت ہوئے تو ان کا بیٹا حافظ احمد دین درس پر بیٹھا - لاہور میں دلیپ سنگھ کے زمانہ میں یہ مدرسہ ہیرا سنگھ اور سوچیت سنگھ کی باہمی جنگ میں تباہ ہو گیا - اس کی عمارت ملبے کا ڈھیر بن گئی، کتب خانہ تباہ ہو گیا - انگریزی عہد میں میاں سلطان ٹھیکیدار نے کچھ زمین مدرسہ کے نام پر وقف کر دی اور مدرسہ از سرِ نو آباد ہو گیا - اب یہ مدرسہ محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہے -

۳۵ مدرسہ میانی صاحب: قبرستان میانی کی جگہ حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ حضرت طاہر بندگی قادری نقشبندی نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا جو برسوں علم دین کی خدمت کرتا رہا - حضرت شیخ محمد طاہر لاہوری حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادوں کے اتالیق تھے - آپ حضرت مجدد کے حکم سے لاہور آئے اور بڑے ناخوشگوار حالات کے باوجود اشاعت علوم اسلامیہ میں مشغول ہو گئے - ہزاروں طلباء نے آپ سے استفادہ کیا - ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ وہ روحانی منزلوں کو بھی طے کرتے رہے - آپ ساری عمر دربار داری سے (باقی بر صفحہ آئندہ)

مدارس علم دین کی اشاعت عام کرتے۔ عوام میں اسلامی نظریات کو فروغ دیتے اور پھر ایسے شاگردوں کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دُور ہی رہے۔ قرآن وحدیث کی کتابت سے قُوتِ حلال کماتے اور بسر اوقات کرتے۔ آپ ۸ محرم الحرام ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء میں واصلِ بحق ہُوئے اور اپنے مدرسہ کے ایک گوشہ میں دفن ہُوئے۔ آج آپ کا مزار میانی کے قبرستان میں بڑے عالی شان گنبد میں ہے اور آپ کی اولاد میں سے سید بشیر حسین گیلانی طاہر بندگی مرحوم کے تمام انتظامات کی نگرانی کرتے ہیں۔ بڑے متوکل سجادہ نشین ہیں۔

حضرت طاہر بندگی کی وفات کے بعد آپ کے ایک شاگرد مولانا ابو محمد قادری نے مدرسہ جاری رکھا مدرسہ کے اردگرد ایک محلہ میانی آباد ہوگیا۔ اس مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ تھا جسے سکھا شاہی نے تباہ کردیا۔ رائے بہادر کنہیالال نے لکھا ہے کہ سکھوں نے اس محلے کو لُوٹتے وقت اس بیش بہا کتب خانے کو بھی جلا کر راکھ کردیا جس میں بڑی نادر کتابیں تھیں۔ سکھوں کے عہد میں یہ محلہ اور مدرسہ اُجڑ گیا اور آبادی معدوم ہوکر قبرستان میں تبدیل ہوگئی۔ اس وقت یہ علاقہ لاہور کا سب سے بڑا قبرستان ہے۔ قبرستان کے وسط میں حضرت طاہر بندگی کا مزار ہے۔ مولانا سعید احمد نقشبندی خطیب جامع مسجد داتا گنج بخش ایک عرصہ سے ہفت روزہ درسِ مکتوبات امام ربانی مزار کے پہلو میں بیٹھ کر دیتے ہیں۔

ے مدرسہ ابوالحسن خاں تربتی: لاہور کا یہ مشہور مدرسہ مغلپورہ میں واقع تھا۔ نواب ابوالحسن خان شاہجہان کے عہد میں وزارتِ عظمیٰ پر فائز تھا مگر اشاعت علوم اسلامیہ کا بڑا دلدادہ تھا۔ وہ ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء میں فوت ہُوا اور بڑی جائیداد چھوڑی۔ نواب مرحوم کی بیگم مخدومہ جہاں کہلاتی تھی۔ وہ اسلامی علوم میں بڑی ماہر تھی اس نے اپنے خاوند کے ایصالِ ثواب کے لیے یہ مدرسہ بطور یادگار صدقہ جاریہ بنایا۔ ایک ہزار حافظانِ قرآن مقرر ہُوئے جو دن رات نواب مرحوم کے مزار پر تلاوتِ قرآن کرتے۔ یہ نیک خاتون ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء بروز پیر ۴ شعبان کو فوت ہُوئی اور اسی مقبرہ میں دفن ہُوئی۔ اس مدرسہ میں مولانا حامد قاری درس دیا کرتے تھے۔ مولانا حامد قاری بڑے فصیح اور خوش بیان واعظ تھے۔ لوگ دُور دُور سے آپ کے پاس چل کر آتے اور استفادہ کرتے۔ آپ ۱۱۶۶ھ/۵۲-۱۷۵۳ء کو فوت ہُوئے اور مدرسہ کے ایک گوشے میں دفن ہُوئے (علماء کرام اور دینی مدرسے از مولانا علم الدین سالک) آپ کے ملفوظات اور حرمت حقہ بڑی مشہور کتابیں تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد حافظ رحمت اللہ صدر مدرس مقرر ہُوئے۔ (باقی برصفحہ آئندہ)

ذہنی تربیت کرتے جو مستقبل میں سیاسی اور سماجی ذمہ داریوں میں ایک صحیح انسان کی حیثیت میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لاہور میں سکھا شاہی نے اس مدرسہ کو بھی ویران کر دیا۔ یہ مدرسہ ریلوے سٹور کی چار دیواری میں گھرا ہوا ہے۔

۵ مدرسہ شیخ بہلول: یہ مدرسہ شاہجہانی دور میں بڑی علمی یادگار تھا۔ مآثر الآثار کے مصنف نے لکھا ہے کہ شیخ بہلول ایک جید عالم دین اور وقت کے ممتاز فاضل تھے۔ ان کی شہرت کا آفتاب جہانگیر کے آخری ایام حکومت میں نصف النہار پر تھا۔ اسی مدرسہ میں قاضی اسلم نے ہرات آکر تعلیم پائی اور اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں شمار ہوئے۔ قاضی اسلم کے صاحبزادے میر زاہد نے بھی اسی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی جو علم الکلام اور حکمت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے شرح مواقف اور دیگر کتب پر مفید حواشی لکھے۔

۶ مدرسہ ملا فاضل قادری: یہ مدرسہ جیل روڈ پر اس جگہ واقع تھا جہاں بورسٹل جیل کا دروازہ ہے۔ ملا فاضل قادری عالم دین اور ولی اللہ تھے۔ حکومت کی طرف سے آپ کو جو کچھ وظیفہ ملتا، طلباء پر خرچ کر دیتے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے شاگرد شاہ شرف نے تدریس جاری رکھی۔ استاد شاگرد دونوں اسی جگہ مدفون ہیں۔ صاحب تحقیقات چشتی نے لکھا ہے کہ اس مدرسہ کے ساتھ ایک مسجد بھی تھی جو اب بالکل مٹ گئی ہے۔

۷ مدرسہ وزیر خاں: یہ مدرسہ لاہور کے مشہور مدارس میں تھا۔ حکیم علیم الدین انصاری بانیٔ مسجد وزیر خاں نے جاری کیا۔ مسجد وزیر خاں کی بنیاد ۱۰۴۳ھ میں رکھی گئی اور ۱۰۵۱ھ کو مدرسہ جاری کیا گیا۔ اس مدرسہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے نواب وزیر خان نے بہت سی جائیداد وقف کی۔ اس وقت جائیداد کا وصیت نامہ سید محمد لطیف جج اور مولوی نور احمد چشتی نے اپنی تصانیف "تاریخ لاہور" اور "تحقیقات چشتی" میں درج کر دیا ہے۔ اس وصیت کے مطابق اس اسلامی درس گاہ کو ہر اس شعبہ سے مزین کیا گیا جو علمی استعداد اور ترقی میں کسی طرح بھی ممد و معاون ہو سکتا تھا حتیٰ کہ جلد سازوں، قلم کاروں اور کاتبوں کو دکانیں اور حجرے مہیا کیے گئے۔ یہ مسجد اور مدرسہ اہل علم کی نگاہوں کو متاثر کرتا اور دنیا بھر کے سیاح اس کے حسنِ انتظام کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتے۔ جمعہ کی نماز کے بعد مسجد کے صحن میں مختلف مدارس کے علماء، طلباء علمی موضوعات پر گفتگو کرتے۔ مسجد کے عالی شان دروازے کے سامنے ہفت روزہ منڈی لگتی جس میں کتابیں، قلمیں، روشنائیاں، سامانِ جلد سازی اور (باقی بر صفحہ آئندہ)

حصہ لیتے۔ ان مدارس کے علاوہ شاہجہانی دور کے وہ علماء جنہوں نے لاہور شہر کو اپنا مسکن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دیگر علمی ضروریات کی تمام اشیاء مہیا کی جاتیں۔ سامانِ نوشت وخواند کے سارے لوازمات کی خرید و فروخت ہوتی۔ سکھوں کے اقتدار تک یہ مدرسہ بڑی شان وشوکت سے جاری رہا۔

۵ مدرسہ ملا خواجہ بہاری: یہ مدرسہ اندرون دہلی دروازہ لاہور میں واقع تھا۔ نواب سعداللہ خاں اسی مدرسہ سے دستارِ فضیلت لے کر شہرۂ آفاق ہوئے۔ ملا خواجہ بہاری کا اصل وطن حاجی پورہ گوراپور (بہار) میں واقع تھا آپ ابتدائی عمر میں تحصیلِ علم کے لیے گھر سے نکلے۔ کچھ عرصہ جمال اولیا کے زیر تربیت رہے، وہاں سے لاہور آئے اور ملا فاضل لاہوری سے ظاہری علوم حاصل کیے۔ ملا فاضل قادری اپنے اس شاگرد پر فخر کیا کرتے تھے ان ایام میں حضرت میاں میر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا باطنی فیض عام تھا۔ آپ ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان کے فیضان سے کامل ولی اللہ بن گئے۔ تذکرہ علماء ہند کا مصنف لکھتا ہے:" ملا بہاری فقیہہ، محدث، مفسر، واقف اسرار حقانی بود۔" حضرت میاں میرؒ کی وفات کے بعد آپ کو روحانی تربیت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ لوگ جوق در جوق آپ کے حلقہ میں آنے لگے۔ داراشکوہ سکینۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ جاڑوں کے موسم میں آپ ایک عرس پر تشریف لے گئے، علماء کی مجلس میں توحید پر گفتگو ہونے لگی تو آپ پر رقت طاری ہوگئی۔ آپ اسی حالت میں آگ کے الاؤ میں جا بیٹھے، باہر نکلے تو بالکل صحیح وسالم تھے، فرمانے لگے:" توحید یہ ہے کہ اس کے قائل پر کوئی چیز اثر نہ کرے۔"

آپ کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ شاہجہان آپ کی ملاقات کو آیا تو آپ اپنی خانقاہ چھوڑ کر کہیں چلے گئے، سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:" میں طمانیتِ قلب کھونا نہیں چاہتا۔ فقیروں کو بادشاہوں سے کیا سروکار!" داراشکوہ نے آپ کی وفات کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ شالیمار باغ میں سیر کو گئے تو فرمانے لگے: مجھے طلب نہیں کرتے اگر طلب کریں تو مرشد کی قبر کے پاس دفن کر دیں۔ ۱۰۴۰ھ/۱۶۴۹ء کو واصلِ بحق ہوئے۔ آپ کے مدرسہ کی جگہ انجمن مرکزی حزب الاحناف نے ۱۹۲۶ء میں دار العلوم حزب الاحناف کی بنیاد رکھی جس میں حضرت مولانا دیدار علی شاہ الوری کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت استاذ العلماء سید احمد قادری دامت برکاتہ نے پچاس سال تک درس دیا۔ پنجاب کے اکثر علماء اہل سنت اسی دار العلوم کے فارغ التحصیل ہیں۔ اب اس مدرسہ کو وہاں سے منتقل کر کے گنج بخش روڈ۔ لاہور پر جاری کر دیا گیا ہے۔

بنا کر خدمتِ دین کے لیے شب و روز ایک کر دیئے۔ ان میں سے شیخ جان اللہ، شیخ عبدالکریم چشتی[1]، شیخ جان محمد لاہوری[2]، شیخ جان محمد سہروردی، مولانا محمد صدیق خطیب مسجد وزیر خاں، مولانا امام گاموں قادری، مولانا محمد فاضل چشتی[3]، مولانا عبدالسلام[4] دیوی، ملا یعقوب لاہوری،

---

[1] شیخ عبدالکریم چشتی: آپ مخدوم الملک عبداللہ انصاری کے صاحبزادے تھے۔ شیخ نظام الدین بلخی کے مرید تھے۔ جب سیاسی حالات نے مخدوم الملک کو مجبور کر دیا کہ وہ حج پر چلے جائیں تو شیخ عبدالکریم بھی ان کے ساتھ لاہور آ گئے۔ آپ کا مدرسہ اور خانقاہ نواں کوٹ لاہور میں افضل خاں علامی کے باغ میں تھا۔ آپ کی مشہور تصنیف "فصوص الحکم" نے بڑی شہرت حاصل کی۔ آپ کی ایک اور تصنیف اسرار عجیبہ در ذکر سلسلہ عالیہ چشتیہ بڑی مشہور ہوئی۔ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۵ء میں فوت ہوئے۔ مزار نواں کوٹ۔ لاہور میں ہے۔

[2] شیخ جان محمد لاہوری: کوٹ خواجہ سعید کی جگہ محلہ پرویز آباد تھا۔ اس محلہ میں شیخ جان محمد کا مدرسہ اور مسجد تھی۔ آپ ایک جید عالم دین اور واقف اسرار طریقت تھے۔ حضرت میاں کلاں کے خلیفہ اور شیخ عبدالحمید کے شاگرد تھے۔ شیخ عبدالحمید جب پہلی بار حضرت میاں وڈا کی خدمت میں آپ کو لے کر گئے تو آپ نے بچے کو عالم ہونے کی بشارت دی اور اپنے ساتھ تکرار حدیث کی تلقین کی۔ شیخ جان محمد اتنی بڑی بات سن کر فرطِ حیا سے خاموش رہے مگر میاں صاحب کی نگاہ نے اس ذرہ کو آفتاب بنا دیا۔ میاں صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، اور ایک وقت آیا کہ میاں صاحب کے ساتھ تکرار حدیث پر مامور ہوئے۔ ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں فوت ہوئے۔

[3] ملا محمد فاضل بدخشی: آپ لاہور کے مشہور اساتذہ میں سے تھے۔ عمل صالح کے مصنف نے آپ کو "بحر مواج فیض بخشی" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ آپ نے علوم متداولہ توران اور شیراز کے علما سے حاصل کیے تھے۔ تفسیر اور اصول ملا جمال لاہوری سے حاصل کیے۔ جہانگیر کے دور میں قاضی مقرر ہوئے مگر عمر کا آخری حصہ درس و تدریس میں صرف کیا۔

[4] ملا عبدالسلام دیوی: محمد فاضل بدخشانی کے معاصرین میں ملا عبدالسلام دیوی ایسے فاضل یگانہ تھے جنہوں نے لاہور کی علمی دنیا کو جواہرات علم سے مالا مال کر دیا۔ آپ بارہ بنکی کے قصبہ میں دیوہ میں پیدا ہوئے ملا عبدالکریم کے نواسے تھے۔ نشو و نما کاکوری میں ہوئی۔ تذکرہ نگار آپ کو "ملا اصولی" کے (باقی برصفحہ آئندہ)

ملا جمال نیشاپوریؒ، ملا جامیؒ لاہوری، مفتی محمدؒ باقر، ملا عبدالحمید لاہوریؒ، نواب سعد اللہ خاں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک مورخ نے آپ کو "اعلم علماء عصر و فخر کملائے دہر استادِ اساتذہ زمان قدوہ فضلائے دوراں" لکھا ہے۔ آپ نے ملا عبدالسلام لاہوری سے معقولات و منقولات میں استفادہ کیا۔ آپ کے نامور شاگردوں میں سے قطب الدین شہید سہالوی کے والد ملا عبدالحلیم، ملا دانیال چوراسی، ملا عبدالقادر فاروقی بڑے شہرت یافتہ ہوئے۔ مولانا شاہ تراب علی قلندر نے اپنی کتاب کشف المتواری میں آپ کو ملا عبدالحکیم کے شاگرد لکھا ہے۔ شاہی لشکر میں مفتی رہے مگر بعد میں لاہور آگئے۔ الشراحات معالیہ آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ رسالہ باغ و بہار کے مصنف لکھتے ہیں:

"در عہد خویش نظیر نداشت شاہجہان بادشاہ بہ سبب او ستادیش و تبحر علوم بسیار اکرام او می کرد نزد خود می نشاند سند رفقائے ار دوئے معلّی بنام ملا بود۔"

ایک دن جہانگیر قلعہ کی فصیل کی تعمیر کا کام دیکھنے کے لیے گیا تو ایک ضروری کام کے لیے ملا عبدالسلام کو طلب کیا۔ اونچی دیوار پر چلتے چلتے آپ کے پاؤں کانپ رہے تھے تو بادشاہ نے دیکھ کر کہا: "ملا! موت سے اتنے ڈرتے ہو کہ دیوار پر چل نہیں سکتے۔" آپ نے جواباً فرمایا: "کیوں نہ ڈروں، اگر یہ آسمان ہزار بار اپنی صدیاں گزارے تو میرے جیسا عالمِ دین پیدا نہیں کر سکتا آپ جیسے بادشاہ تو آئے دن آتے جاتے رہتے ہیں۔" قدردان بادشاہ کی طبیعت پر ایک عالمِ دین کی تلخ بات گراں نہ گزری بلکہ ان کی حاضر جوابی کی تعریف کی۔

آپ کی اولاد میں سے ملا نورالہدیٰ، ملا نظام الدین احمد، ملا عبدالحفیظ، ملا عبدالباقی شارح مثنوی، ملا عبدالصمد مفسر قرآن اور شاہ ابوالمعالی بڑے فاضل تھے۔ آپ نے تہذیب المنطق اور منار الاصول کی شرحیں بھی لکھیں۔

۵ ملا یوسف لاہوری: آپ حضرت ملا جمال تلوی کے نامور شاگرد تھے۔ باپ کا نام ملا جمال نیشاپوری تھا۔ آپ تفسیر، حدیث اور فقہ میں مسلّمہ شہرت رکھتے تھے۔ قرآنی تفسیر میں یکتائے روزگار تھے۔ جب قرآن کے رموز و اسرار بیان فرماتے تو دل میں اُترتے جاتے۔ ملا عبدالحمید لاہوری نے لکھا ہے کہ آپ پچاس سال تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ سلطان عبداللطیف سلطانپوری آپ کے ہی درس سے (باقی برصفحہ آیندہ)

حاجی محمد سعید اور ملا عصمت اللہ کے اسمائے گرامی لاہور کی علمی تاریخ میں رہتی دنیا تک درخشاں رہیں گے۔ یہ علمائے کرام لاہور کی معاشرتی اور دینی زندگی کے آفتاب و ماہتاب بنے۔ ان علماء کرام میں نواب سعد اللہ خاں گوناگوں علمی کمالات کی وجہ سے بہت شہرت یافتہ ہوئے۔ نواب سعد اللہ خاں شاہجہانی دور کی ایسی شخصیت تھی جسے چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ دربار سے وابستہ ہونے سے پہلے درس و تدریس میں مشغول رہے تاہم دربار میں پہنچ کر ان کی قابلیت کے جوہر کھلے۔ انہیں علم و فضل پر ناز تھا۔ تدبر و سیاست پر فخر کرتے تھے۔ وہ عالمگیر شہرت کے مالک بنے اور ایران و توران سے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا۔

سعد اللہ خاں چنیوٹ کے رہنے والے تھے، شیخ زادے تھے اور قریش کے قبیلہ بنی تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ مآثر الامراء کا مصنف لکھتا ہے: "از شیخ زادہائے قصبہ چنیوٹ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) فارغ ہوئے تھے۔ اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں مگر شرح دیوان حافظ بڑی مشہور ہوئی۔

۵؎ ملا جامی لاہوری: بڑے فاضل تھے اور درس و تدریس میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حضرت طاہر بندگی کے مدرسہ میں پڑھاتے تھے۔ نزدیک کی مسجد کے خطیب رہے اور ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء میں فوت ہوئے۔ قبر حضرت طاہر بندگی کے احاطہ قبرستان میانی لاہور میں ہے۔

۶؎ مفتی محمد باقر لاہوری: لاہور کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ شہر کے ایک حصے کے مفتی تھے۔ چوہٹہ مفتی باقر اندرون شہر لاہور آپ کے نام سے منسوب ہے۔ یہاں ہی آپ کا مدرسہ تھا اور یہاں ہی مزار ہے۔

۷؎ ملا عبد الحمید لاہوری: آپ عالم فاضل اور مورخ تھے۔ بادشاہ نامہ آپ کی تاریخی یادگار رہے۔ علامہ ابو الفضل کے شاگرد تھے۔ طرز انشاء میں وہی رنگ پایا جاتا تھا۔ لاہور میں ایک عرصہ تک درس تدریس دیا مگر حالات نے ساتھ نہ دیا تو ٹھٹھہ چلے گئے۔ ٹھٹھہ پہنچ کر آپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی مگر آپ کی علمی قابلیت اور شہرت کی وجہ سے بادشاہ نے حکم دیا کہ آپ کو دربار میں پیش کیا جائے۔ بادشاہ کے حکم سے واقعات شاہی لکھنے پر مامور ہوئے اور بادشاہ نامہ سے ایک یادگار زمانہ تالیف تیار ہو گئی۔

بود۔ واصلش از بنی تمیم قریش۔"

مولوی نور احمد چشتی نے آپ کے والد کا نام امیر بخش لکھا ہے۔ ۱۰۰۰ھ / ۱۵۹۱ء ، ۱۰ ر صفر بروز جمعرات پیدا ہوئے۔ اسی شام والد کا انتقال ہو گیا۔ پانچ برس کی عمر سے والدہ بھی فوت ہو گئیں۔ یتیم اور بے سہارا ہو کر لاہور پہنچے، علم حاصل کرنے لگے۔ رات کو گداگری کرتے دن کو مدرسہ میں پڑھتے۔ دہلی دروازے کے اندر مسجد وزیر خاں کے پاس ایک چھوٹی مسجد میں رہتے۔ بقول مصنف مراۃ العالم آپ نے ملا خواجہ بہاری کے ہاں کسب علوم ظاہری و باطنی کیا۔ خواجہ بہاری ایک دن عالم جذب میں فرمانے لگے، "وزیر اعظم شہنشاہِ ہند کو بلا لاؤ" مریدوں کو بڑا تعجب ہوا، انہیں کچھ سمجھ میں نہ آیا تو آپ نے عالم صحو میں آ کر کہا: سعد اللہ کو بلا لاؤ۔

سعد اللہ کی قابلیت کی شہرت نے مغل دربار کو بڑا متاثر کیا۔ خصوصی فرمان کے ذریعہ دربار میں بلایا گیا۔ ۱۰۵۰ھ / ۱۶۴۰ء میں آپ دربار میں حاضر ہوئے۔ ملازمت میں آئے اور اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔ وہ بڑے علم پرور وزیر تھے۔ ان کے عہد وزارت میں درس و تدریس کے مراکز آباد ہوئے۔ علماء کی قدر افزائی ہوئی اور مغل دور کے تمام علمی کارنامے علامہ سعد اللہ کے مشوروں کا ثمرہ تھے۔ نواب سعد اللہ خاں ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۵ء میں فوت ہوئے۔

شاہجہانی دور کے ایک اور عالم دین حاجی محمد سعید تھے جو بڑے متوکل اور قناعت پسند تھے۔ ملا عصمت اللہ بھی اسی دور کے زبردست عالم دین اور مدرس تھے۔ لاہور میں آپ کا درس طلباء کے لیے چشمۂ فیض تھا۔

عہدِ اورنگ زیب کے علماء کرام

۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء تا ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء

اورنگ زیب اپنے اجداد شہنشاہوں کی طرح صرف علم و فضل کا قدردان ہی نہ تھا بلکہ خود عالم فاضل تھا۔ اسے دینی تعلیم سے پورا پورا حصہ ملا تھا اور اس کے کردار کی تعمیر اتنے ٹھوس طریقے پر ہوئی تھی کہ ساری عمر اس کی قناعت پسند طبیعت دنیا کے مال و متاع کو نظر میں نہ لائی۔ ابتدائی تعلیم مولانا عبد اللہ سلطان پوری سے حاصل کی۔ اورنگ زیب کو معقولات و منقولات میں ماہر بنا دیا۔ وہ دینی کتب کے مطالعہ میں خاصا وقت دیتا۔ مولانا عبد اللہ

سلطان پوری کے علاوہ میر ہاشم گیلانی نے بھی اورنگ زیب کی ادب عربی فارسی میں تربیت کی۔ میر ہاشم بارہ سال تک حرمین الشریفین میں قیام پذیر رہے۔ شیخ محمد عربی محدث، شیخ عبدالرحیم اور ملا علی قاری اور میر نصیر الدین حسین سے علوم دینیہ پڑھے۔ ہندوستان میں حکیم علی گیلانی کے درس میں شریک رہے۔ احمد آباد گجرات میں مسند درس و تدریس بچھائی اور اپنی قابلیت کی شہرت سے دربار شاہجہانی سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ شاہجہان نے آپ کو اورنگ زیب کی تعلیم پر مقرر کیا اورنگ زیب نے ان علماء کرام کے علاوہ ملا موہن بہاری (نام محی الدین بہاری)، علامہ سعداللہ خاں، سید محمد قنوجی، ملا جیون اور دانشمند خاں (مصنف نزہت الناظرین) سے مختلف علوم حاصل کیے۔ اس طرح ان بزرگوں کی تربیت نے اورنگ زیب کو ایک کامل مومن بنا کر شاہی تخت پر بٹھایا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں اسلامی اور دینی علوم کی اشاعت میں بہت حصہ لیا۔ اس نے اسلامی شریعت کے قوانین کے نفاذ میں عملی طور پر کام کیا۔ علماء کا ایک بورڈ قائم کیا جو ملک میں اسلامی قوانین پر غور کرتا، اسے عملی طور پر نافذ کرتا۔

اورنگ زیب کا سب سے بڑا کارنامہ فتاوٰی عالمگیری کی تدوین ہے۔ کتاب وسنت کی تشریح اور قوانین اسلامی کے نفاذ کے لیے یہ کتاب برصغیر کا ایک بہت بڑا فقہی مرقع ہے یہ کتاب ملک کے ممتاز علماء کی محنت کا ثمرہ ہے۔ ملا محمد کاظم شیرازی نے عالمگیر نامہ میں ان اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جو فتاوٰی عالمگیری کی تدوین کا سبب بنے۔ یہ فتاوٰی آٹھ سال کی لگاتار محنت اور کاوش سے دو لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوا۔ فتاوٰی عالمگیری کے جمع کرنے میں جن علماء اہل سنت نے حصہ لیا ان میں سے ایک خاصی تعداد لاہور سے تعلق رکھتی تھی۔

اورنگ زیب دینی علوم کی اشاعت میں بڑا اہتمام کرتا۔ اس نے اپنے گورنروں کے نام کئی فرمان جاری کیے جن میں مساجد، مدارس اور علمی اداروں کی حوصلہ افزائی کے احکام جاری کیے۔ وہ ہر طالب علم کو وظیفہ کا مستحق سمجھتا تھا اور ہر کتاب کے ختم کرنے پر ایک انعام دیتا تھا عالمگیر علم دین کی اشاعت کے لیے ہر شہر اور ہر قصبہ میں مدارس قائم کرتا گیا۔ ان کوششوں سے ملک کے اکثر قصبے علمی مراکز بن گئے۔ کپتان الگزنڈر ۱۶۹۰ء میں خلیج فارس سے گزرتا ہوا ساحلِ سند

پر پہنچا تو سندھ میں قصبہ ٹھٹھہ کو دیکھ کر اپنے تاثرات بیان کرتا ہے:

"یہ شہر علوم فقہ، فلسفہ، ریاضی اور دینیات کے لیے مشہور ہے۔ ان علوم میں لڑکوں کے لیے چار سو کالج موجود ہیں۔"[1]

"اورنگ زیب پہلا بادشاہ ہے جس نے ہر علاقہ میں اسی علاقہ کی زبان میں دینی کتابیں لکھوائیں۔ پنجاب میں سب سے پہلے دینی ادب پر جس قدر کتابیں اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئیں ان سے پنجابی ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح مذہبی اور اخلاقی زندگی میں بڑی تبدیلی نمودار ہوئی۔ اور مسائل کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگئی۔"[2]

اورنگ زیب کی علماء دوستی اور دینی روایات پر پابندی کے مفصل واقعات تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس کی اس پالیسی نے ملک میں بڑے جید علماء پیدا کیے اور لاہور کی سرزمین میں بڑے بڑے نابغۂ روزگار ابھرے۔ ان علماء کرام میں سے مولوی نظام الدین[3]،

---

[1] نیو اکاؤنٹ آف ایسٹ انڈیا کمپنی ج ۱ ص ۱۲۷

[2] علمائے لاہور اور مدرسہ از مولانا علم الدین سالک مرحوم ص ۵۲۳

[3] مولوی نظام الدین: شاہجہانی دور کے قائم کردہ مدارس دینیہ کے علاوہ لاہور میں مولوی نظام الدین عرف پیر مکھا نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور پوری دلجمعی کے ساتھ ظاہری و باطنی علوم کی تدریس کا انتظام کیا۔ مولوی نور احمد چشتی مولف تحقیقات چشتی آپ ہی کی اولاد میں سے تھے آپ ۱۰ صفر ۱۱۱۱ھ/۱۷۰۵ء کو واصل بحق ہوئے اور مزار علامہ اقبال روڈ پر ریلوے کالونی میں واقع ہے پیر مکھا آپ وفات کے بعد مشہور ہوئے۔ آپ کے مزار کی مٹی لے کر لوگ مکھوں پر لگاتے تو وہ صاف ہو جاتے۔ اس طرح آپ کے مزار پر نذرانہ پیش کرتے جو فقراء میں تقسیم ہوتا اور چادریں چڑھاتے اور مزار پر پھول برساتے۔ عوام الناس نے اپنی آسانی کے لیے آپ کو پیر مکھا کہنا شروع کر دیا۔

٭ ٭ ٭

شاہ رضا شطاریؒ، ملا محمد اکرمؒ ولد یحییٰ لاہوریؒ، شیخ عبدالعزیزؒ، شاہ عنایتؒ قادری خصوصیت سے

لہ شاہ رضا شطاری: اسی زمانے میں شاہ رضاؒ نے لاہور میں درس و تدریس کا علم بلند کیا۔ وُہ اپنی محنت و لگن سے ظاہری اور باطنی علوم کی اشاعت کے سرچشمہ تھے۔ زبردست فقیہہ اور مفتی تھے۔ علم فقہ کے پڑھنے والے دُور دُور سے آتے اور آپ کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔

ٹہ ملا محمد اکرم: آپ عالمگیر کے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادہ کام بخش کے استاد تھے۔ طبیعت میں حلم، انکساری اور بُردباری کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی۔ اقلیم علم کے شہنشاہ کہلائے۔ جب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ کو اس مجلس علماء میں لے لیا گیا جو فقہ کا یہ عظیم کارنامہ سرانجام دے رہے تھے آپ نے فتاویٰ عالمگیری کا چوتھا حصہ ترتیب دیا۔ بختاور خاں کی رائے میں ملا محمد اکرم انسانی لباس میں فرشتہ تھے۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی آپ کو کہا کرتے تھے: "لاہور میں ملا یحییٰ کے بیٹے محمد اکرم کی علمی فضیلت کو کوئی نہیں پہنچتا۔" آپ کا انتقال ۱۰۹۴ھ میں ہوا۔

سٹہ شیخ عبدالعزیز: آپ اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد مکرم شیخ عبدالرشید سے پڑھیں۔ جوانی کے زمانے میں مختلف مدارس سے اکتسابِ علم کیا اور ایک زمانہ آیا کہ خود ایک کامل مدرس کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ہمت خاں اور بختاور خاں نے کئی بار عالمگیر کی خدمت میں شیخ کے کمالات کا تذکرہ کیا اور کچھ رسالے بادشاہ کے ہاں پیش کیے، جوہر شناس بادشاہ ان کی ذہانت سے بڑا متاثر ہوا" می خواستند کہ مرتبہ سعداللہ خاں رسانند" (سرخوش)، شیخ ترقی کرتے کرتے بادشاہ کے خاص مقرب بن گئے۔ حسن ابدال سے رخصت لے کر لاہور پہنچے اور اپنے دوست بختاور خاں کو ایک مرقع نظم لکھ کر بھیجی جس کا پہلا شعر یوں تھا ؎

زدرد دل چہ نگارم کہ جوش بے تابست
زشوق جاں چہ نویسم کہ نامہ سیماب است

سکہ شاہ عنایت قادری: عالمگیر کا زمانہ شریعت کے احیاء و نفاذ کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ لاہور کو اس زمانہ میں جو مرکزیت حاصل رہی وُہ پہلے نہ تھی۔ اس عہد میں جن لوگوں نے نام پیدا کیا۔ ان میں شاہ چراغ اور شاہ عنایت قادری خاص شہرت رکھتے ہیں۔ شاہ عنایت پیشے کے لحاظ سے (باقی برصفحہ آئندہ)

قابلِ ذکر ہیں۔

ان علماء کے علاوہ اس دور میں صوفیاء اور اولیاءاللہ نے بھی باطنی علوم میں عوام کی بڑی رہنمائی کی۔ لاہور کی سرزمین ان باطنی فیوض سے لبریز ہوگئی۔ اہل اللہ نے اس شہر کو مدینۃ الاولیاء بنادیا تھا۔ یہ صرف علمی لحاظ سے برصغیر کا بغداد ہی نہ تھا بلکہ اسے صوفیہ کی کوششوں نے پنجاب کا قصرِ عارفان بنادیا۔ ان میں حضرت میاں میر، شاہ ابوالمعالی، حضرت ملا شاہ بدخشی اور حضرت شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہم اجمعین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ارائیں تھے۔ آج تک وہ اس قوم میں بڑے احترام سے مانے جاتے ہیں۔ علمی خاندان میں آنکھ کھولی۔ آپ کے والد مولوی پیر محمد لاہور چھوڑ کر قصور چلے گئے تھے۔ شاہ عنایت قصور میں ہی پیدا ہوئے۔ (۱۰۵۶ھ) قرآن پاک حفظ کیا۔ بارہ سال کی عمر میں سندِ فضیلت حاصل کی۔ ظاہری علوم حاصل کرنے کے بعد تلاشِ مردِ کامل میں نکلے۔ لاہور میں حضرت شاہ محمد رضا کے درس میں آئے ان کی شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہی کے ہو کر رہ گئے۔ بیعت ہوئے، منازلِ سلوک طے کیں اور حضرت مرشد کے حکم سے واپس قصور آگئے۔ آپ کے درس میں تاریخ کے دو نامور فرزند حضرت سید وارث شاہ اور حضرت سید بلھے شاہ داخل ہوئے۔ ایک قلیل عرصہ میں وہ طلباء کو علمی مقامات عبور کرا دیتے۔ آپ کے درس میں طلباء اور صوفیاء دونوں قسم کے لوگ جمع ہونے لگے۔ اس مقبولیت کو دیکھ کر حسین خاں والیٔ قصور کو خدشہ ہوا کہ یہ لوگ جو ایک درویش کے گوشۂ ابرو پر جان دینے کو تیار ہیں، ایک دن مقامی سیاست کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ اس نے کوشش کی کہ آپ قصور چھوڑ جائیں۔ شروع شروع میں تو آپ نے پرواہ نہ کی مگر کچھ عرصہ بعد آپ نے لاہور شہر کو اپنا مسکن بنا کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپ کی درس گاہ میں قرآنی علوم و فنون، تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ تصوّف کی معروف کتابیں مثنوی مولانا روم، فصوص الحکم (ابن عربی) اور دیوان حافظ کو نصابی کتابوں کی حیثیت سے پڑھا جاتا۔ چونکہ آپ قادری شطاری سلسلۂ تصوّف سے تعلق رکھتے تھے، کبھی کبھی محفلِ سماع برپا ہوتی جس میں خواجہ حافظ، احمد جام، ملا محمد شریں، فخرالدین عراقی، ملا شاہ بدخشانی، شمس تبریز اور مولانا روم کا کلام بلند پایہ قوالوں سے سنا جاتا۔ آپ بڑے صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ غایت الحواشی کی دو جلدیں، کنز الدقائق کی شرح اور دوسری علمی کتابیں لکھیں۔ ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء پچاسی سال کی عمر میں واصلِ بحق ہوئے۔ مزار باغِ جناح کے پاس واقع ہے۔

عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ لاہور میں ایک عظیم الشان مسجد بنانے کا منصوبہ بنایا تاکہ اسلامی عظمت کا یہ نشان صدیوں تک اہلِ اسلام کو دعوتِ عمل دیتا ہے ہم یہ پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کعبۃ اللہ کی وسعت کو چھوڑ کر یہ مسجد دنیا بھر کی مساجد میں سب سے بڑی ہے۔ یہ عالمگیری مسجد ابوالمظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی ۱۰۸۴ھ میں مکمل ہوئی۔ اور فدائی خاں کوکہ نے اس کی تعمیر میں نگران کی حیثیت سے کام کیا۔ اس زمانے میں اس پر چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ مسجد کی عمارت مغل فنِ تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے اور جس پختگی اور عمدہ نقش و نگار کی پرکاری کا در و دیوار پر مظاہرہ کیا گیا ہے اس کی مثال ملنا بڑی محال ہے۔ مسجد اپنی عظمت اور تقدس کے باوجود لاہور کے سیاسی حالات کا نشانہ بنی اور ۱۸۴۰ء میں جب شیر سنگھ نے قلعہ لاہور کا محاصرہ کیا تو مسجد کے میناروں پر توپیں نصب کر کے قلعہ پر گولہ باری کی۔ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کے قتل کے بعد جب ہیرا سنگھ سندھانوالہ نے لاہور کا محاصرہ کیا تو میناروں سے قلعہ والوں پر گولہ باری کرتا رہا۔ سکھوں کے آخری دورِ حکومت میں اس مسجد کو اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے اس کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ انگریزوں کی آمد پر یہ مسجد نہایت خستہ حالت میں تھی۔ ۱۸۵۶ء میں سرجان لارنس چیف کمشنر پنجاب نے اسے واگزار کر کے مسلمانوں کے حوالے کیا۔ شاہی مسجد کے دونوں طرف حجروں میں طلباء کی قیام گاہیں بنائی گئیں۔ مسجد کی وقف املاک سے مدرسہ کے اخراجات پورے کیے جانے لگے۔

عالمگیری مسجد کی خطابت و امامت ہمیشہ علماء اہلِ سنت کے لیے مختص تھی۔ عالمگیر کے بیٹے بہادر شاہ ثانی کے عہد میں حاجی یار محمد خطیبِ مسجد تھے۔ وہ اپنے وقت کے جید عالمِ دین تھے بہادر شاہ نے ۱۱۲۱ھ/۱۷۱۰ء میں حکم دیا کہ امامیہ علماء کی طرح خطبے کے ساتھ حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ "علی ولی اللہ وصی رسول اللہ" کے الفاظ شامل کیے جائیں۔ مگر اس حکم کے خلاف سارے ملک میں شدید ردِّ عمل ہوا۔ ۱۷۱۱ء میں بہادر شاہ لاہور آیا تو اس نے مولانا یار محمد خطیبِ مسجد، مولانا محمد مراد اور چند دیگر علماء کو قلعہ کے تسبیح خانہ میں طلب کیا اور حکم دیا کہ اس کے احکامات پر عمل کیا جائے مگر خطیبِ مسجد مولانا یار محمد نے بڑی بے باکی سے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ بہادر شاہ طیش میں آگیا مگر مولانا یار محمد نے کہا، عالی جاہا! میں اللہ سے

چار چیزوں کی دعا کرتا رہا ہوں : اوّل وہ مجھے علم کی دولت دے ۔ دوم وہ مجھے قرآن پاک حفظ کرنے کی توفیق دے ۔ سوم روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبد خضرا کی زیارت سے میری آنکھیں ٹھنڈی کرے ۔ چہارم مجھے شہادت کی موت دے ۔ میری پہلی تینوں آرزوئیں پوری ہوگئی ہیں بس شہادت کی تمنا ہے ، وہ آپ کے ہاتھوں ہو جائے تو زہے نصیب !

مولانا کی حق گوئی پر آپ کو گرفتار کر کے آگرہ بھیج دیا گیا ۔ ان ایام میں رمضان شریف کی پہلی تاریخ کو شہزادہ عظیم الشان کو ایک خطیب کے ساتھ شاہی مسجد میں بھیجا گیا تاکہ حنفی مسلک کے خلاف خطبہ دیا جائے مگر داخل ہوتے ہی خطیب کا سر تن سے جدا کر دیا گیا ۔ بادشاہ نے اسلام خاں کو حکم دیا کہ لاہور کے علماء اور خطباء کو مسلح سپاہیوں کے ایک دستہ کی قوت سے خطبہ میں وہ الفاظ پڑھائیں جن کا حکم دیا گیا تھا مگر ۲۲ ، اکتوبر ۱۷۱۱ء کو جو خطبہ پڑھا گیا وہ عالمگیر کے خطبے کی طرح تھا ۔ چنانچہ سات جید علماء کو گرفتار کر کے گوالیار کے قلعہ میں بند کر دیا جس سے لاہور میں سخت مزاحمت ہوئی ۔ بادشاہ نے تنگ آکر اسی خطبہ کی اجازت دے دی جسے اورنگ زیب نے رائج کیا تھا ۔

مسجد کی واگزاری کے بعد سب سے پہلے خطیب مولوی غلام محمد بگوی[۱] مقرر ہوئے ۔ پھر مولانا ذاکر بگوی[۲] اور مولانا محمد شفیق بگوی خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ۔ کچھ عرصہ کے لیے مناظر اسلام حافظ ولی اللہ صاحب نائب خطیب رہے ۔ بگوی علماء کے بعد مولانا معوان حسین رام پوری اور ان کے بھائی مولوی ریحان حسین مجددی مسجد کے خطیب بنے ۔ ایک طویل عرصہ تک مولانا غلام مرشد[۳] شاہی مسجد کے خطیب رہے ۔ مسجد کا انتظام محکمہ اوقاف نے سنبھال لیا ۔

---

[۱] مفصل حالات کے لیے آئندہ صفحات ملاحظہ فرمائیں ۔

[۲] ایضاً

[۳] مولانا غلام مرشد سرگودھا کے قصبہ انگہ میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد حضرت سیالوی کے خاص مریدوں میں سے تھے ۔ مولانا غلام مرشد ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور کے مدرسہ نعمانیہ کے ایک عرصہ تک مدرس رہے ۔ صحاح ستہ پر بڑا عبور تھا اور بڑے ذہین ، قابل اور نامور عالم دین مانے جاتے تھے (باقی بر صفحہ آئندہ)

مولانا غلام مرشد کو علیحدہ کر دیا گیا اور اس کے بعد مولانا قیوم الٰہی عرفانی تین سال تک خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مولانا قیوم الٰہی کی علیحدگی کے بعد مولانا عبدالرحمٰن جامی کو خطیب مقرر کیا گیا۔ مگر جامی صاحب جوانی میں ہی وفات پا گئے۔ ان کے بعد موجود خطیب مولانا عبدالقادر آزاد شاہی مسجد کی خطابت فرما رہے ہیں اور مسجد کے سارے انتظامات محکمہ اوقاف کے پاس ہیں۔ مسجد میں تبرکات کے علاوہ ایک عمدہ لائبریری ہے، علماء اکیڈیمی قائم ہے۔ اس اکیڈیمی میں محکمہ اوقاف کی زیرِ تحویل مساجد کے علماء کو تربیت دی جاتی ہے۔

اورنگ زیب کی وفات (۱۱۱۹ھ) کے بعد مغل بادشاہوں میں نہ وہ علمی ذوق تھا اور نہ اپنے اسلاف کا سا کردار تھا۔ وہ سیاسی اعتبار پر ملک کی قیادت کے اہل نہ تھے۔ بہادر شاہ سب سے پہلا بادشاہ تھا جو وارثِ تخت بنا۔ وہ عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ حافظِ قرآن بھی تھا۔ علم حدیث میں بڑے بڑے محدثوں سے آگے بڑھا ہوا تھا۔ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر پوری دسترس رکھتا تھا مگر طبیعت میں شیعیت کا جوش تھا جس کی وجہ سے وہ ملک میں نظریاتی اور اعتقادی انصاف برقرار نہ رکھ سکا۔ لاہور میں اس کے رفض اور شیعیت کی وجہ سے بڑے ہنگامے ہوئے، علماء قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے لگے۔ عوام مظاہروں پر اُتر آئے۔ بہادر شاہ کی مختصر سی حکومت رہی۔ موت نے اسے آ دبوچا۔ اس کے بعد جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ تختِ شاہی پر براجماں ہوئے مگر وہ لہو و لعب کے دلدادہ تھے۔ شراب اور بازاری عورتوں کے فریفتہ تھے۔ نظامِ سلطنت کو برقرار نہ رکھ سکے۔ ملک طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا۔ ایسے حالات میں معارف پروری، علم نوازی اور درس و تدریس کے مواقع کہاں تھے بایں ہمہ جہاں جہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تقریباً تیس سال خطابت کی۔ پاکستان بننے کے بعد بھی کافی عرصہ خطابت کرتے رہے ان کے شاگردِ خاص محمد مسعود جگوان جب محکمہ اوقاف کے چیف مقرر ہوئے تو اپنے استاد محترم کو مسجد کی خطابت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ آپ کے دو لڑکے ہیں اور ابھی تک وہ بھاٹی دروازے کے اندر اپنے ذاتی مکان میں قیام پذیر ہیں۔ افسوس انہوں نے اپنی قابلیت کے باوجود کوئی علمی کارنامہ سرانجام نہ دیا جس سے ان کی یادگار باقی رہ سکتی۔

علماء کا بس چلتا ان حالات کے باوجود شمعِ علمِ دین کو فروزاں کیے ہوئے کام کرتے گئے۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جن علماء نے لاہور کی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر علمی اشاعت کے فریضہ کو سرانجام دیا ان میں مولانا حافظ روح اللہ[1] لاہوریؒ، مولانا شہر یار[2]ؒ، مولانا محمد صدیقؒ،

---

[1] حافظ روح اللہ لاہوریؒ: آپ ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء میں پیدا ہوئے، لاہور میں زندگی بسر کی۔ صرف و نحو، منطق و فلسفہ اور دیگر علوم دینیہ میں کمال حاصل کیا۔ آپ کو اساتذہ میں سے مولانا محمد سلیم لاہوری سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ کی عمر عزیز معلمی اور مدرسی میں گزری۔ یہ زمانہ پنجاب پر بڑا پُر آشوب تھا۔ سکھوں کی برچھاشاہی نے علمی مراکز کو تہس نہس کر دیا تھا۔ کوئی شخص بھی اطمینان سے دن نہیں گزار سکتا تھا۔ لاہور کے گلی کوچوں میں سکھوں کی چیرہ دستیوں نے زندگی اجیرن کر دی تھی مگر آپ حالات سے بے نیاز اہل ذوق کو علمِ دین کی دولت سے مالا مال کرتے رہے۔ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں امن وامان قائم ہوا تو اس نے آپ کے استقلال اور علمی خدمات کی شہرت سن کر دربار میں طلب کیا اور بڑے احترام سے رخصت کیا۔ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں بارادہ حج دیارِ حبیبؐ کو روانہ ہوئے۔ جہاز میں رمضان کی راتوں تراویح پڑھانے کے لیے لوگ آپ کو امام بناتے۔ آپ حافظِ قرآن نہ تھے مگر سارا دن ایک پارہ ازبر کر کے تراویح میں ہر روز سنا دیتے۔ اس طرح آپ نے دورانِ سفر قرآن حفظ کیا۔ مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد یمن تشریف لے گئے جہاں ۱۲۴۴ھ میں واصلِ بحق ہوئے۔

[2] مولانا شہریارؒ: احمد شاہ ابدالی نے میر منو کو شکست دے کر لاہور پر قبضہ کیا تو مولانا شہر یار مسجد چینیاں والی میں درس دیا کرتے تھے۔ آپ کے ایک شاگرد مولانا محمد صدیق (جن کے حالات آگے آئیں گے) مسجد وزیر خاں میں امامت وخطابت کرتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ وزیر خاں کی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرے۔ مولانا محمد صدیق خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے تو خطبہ کے دوران احمد شاہ ابدالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلطان العادل کہا۔ نماز کے بعد بادشاہ کی موجودگی میں اپنے شاگرد رشید کو کہا: "بیٹے! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ کون سا ظلم ہے جو اہل لاہور نے پٹھانوں کے ہاتھوں نہیں اٹھایا، ان لوگوں نے جبر و تشدد کی انتہا کر دی۔ کئی مرتبہ بادشاہ سے فریاد کی مگر اس نے کوئی تدارک نہ کیا۔ ایسے بادشاہ کو اسلام عادل کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

(باقی بر صفحہ آئندہ)

مولانا عابد لاہوریؒ اور مولوی غلام فریدؒ جیسے حضرات بڑے نامور تھے۔ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مولانا کی نصیحت سن کر اعیانِ سلطنت اور پاس کھڑے لوگ تھرا گئے۔ احمد شاہ نے آپ کو خاموش رہنے کا حکم دیا مگر آپ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ احمد شاہ آپ کی عظمت اور علمی مقام سے واقف تھا کہنے لگا: حضرت! آپ کس کے سامنے یہ بات کر رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھے خوب معلوم ہے کہ احمد شاہ ابدالی سے۔ احمد شاہ ابدالی نے کہا: اس بات کا انجام جانتے ہو؟ آپ نے فرمایا: ہاں! شہادت یا جلاوطنی۔ مگر میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔

احمد شاہ نے اسی وقت جلاوطنی کا حکم دیا۔ مولانا شہریار ٹانڈہ ضلع ہوشیار پور چلے گئے اور وہاں ہی فوت ہوئے۔

۳؎ مولانا محمد صدیق خطیب جامع مسجد وزیر خاں کے مفصل حالات آیندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

۱؎ مولانا عابد لاہوریؒ: آپ محمد شاہ کے دورِ حکومت کے ان باہمت علماء کرام میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے فسق و فجور کے طوفانوں کے باوجود علم دین کی شمع کو روشن رکھا۔ بڑے عابد و زاہد اور متقی تھے۔ آپ کی علمی مجلس میں روزانہ دو سو عالمِ دین استفادہ کرتے۔ قرآن پاک کے مفسر تھے اور آیات قرآنی کی تشریح کرتے وقت عالمانہ نکات بیان کرتے۔ ۱۱ رمضان ۱۱۹۰ھ / ۱۷۷۶ء میں وفات پائی۔ حاشیہ بیضاوی، خلاصہ کیدانی کی شرح، اعجاز قرآن اور شرح قصیدہ بانت سعاد آپ کی مشہور تالیفات ہیں۔

۲؎ مولوی غلام فریدؒ: وقت کے علامہ، ظاہری و باطنی اوصاف سے متصف تھے۔ حدائق الحنفیہ کے مصنف لکھتے ہیں:

"پنجاب میں کوئی عالم آپ سے افادہ و افاضہ میں ہمسری نہ کر سکتا تھا۔ خدا نے آپ کی ذات کو دریائے فیض اور چشمۂ فضل پیدا کیا تھا۔"

آپ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں واصل بحق ہوئے۔

میں خلیفہ غلام رسول[1] و غلام اللہ، مولوی جان محمد لاہوری، مولوی غلام محی الدین بگوی، مولوی احمد دین بگوی، مولوی غلام محمد بگوی، حافظ ولی اللہ، مناظرِ اسلام حافظ غلام رسول چٹ محلیا، استاد گاموں وغیرہم کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

---

[1] خلیفہ غلام رسول و خلیفہ غلام اللہ: آپ لاہور کے جید عالم دین مولانا غلام فرید کے صاحبزادے تھے۔ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں یہ دونوں بھائی نہایت ثابت قدمی سے لاہور میں علوم دینیہ کی اشاعت میں مصروف رہے۔ امرت سر کی مشہور طوائف دوراں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی منظورِ نظر تھی۔ مہاراجہ نے اپنا سکہ کچھ عرصہ کے لیے دوراں کے نام پر جاری کیا۔ اس طوائف نے شاہ عالمی دروازے کے اندر ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں ایک خوب صورت دو منزلہ مسجد بنوائی۔ طلباء اور امام کے لیے مکان بنوائے۔ دوراں نے ان دونوں علماء کرام کو مسجد کی خطابت کے لیے منتخب کیا مگر انہوں نے درس و تدریس کو اتنا رواج دیا کہ پنجاب کے گوشے گوشے سے طلباءِ علم جمع ہونے لگے۔ مہاراجہ زندگی سنگھ خلیفہ غلام اللہ کا بے حد احترام کرتا۔ دربار میں آتے تو سروقد احتراماً کھڑا ہو جاتا۔ ان دونوں بھائیوں نے بڑا کامیاب درس جاری رکھا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ یکساں طور پر ان کے درس میں شریک ہوتے۔ فارسی ادب پر خصوصیت سے توجہ دی جاتی تھی۔ یہ درس مولانا غلام اللہ کے صاحبزادے خلیفہ حمید الدین کے زمانہ تک بڑے زور شور سے جاری رہا۔

مولانا محمد صدیق لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد صدیق بن مولانا محمد حنیف بن محمد لطیف لاہوری ۲۹ محرم الحرام ۱۱۲۸ ہجری لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے زمانے میں ایک عالم اجل، فاضل بے بدل، فقیہ، محدث، ادیب اریب منشی کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ آپ کے والد مولانا محمد حنیف کابل سے واردِ پنجاب ہوئے اور لاہور میں مستقلاً قیام پذیر ہوئے۔ ایک عرصہ تک مسجد وزیر خاں کے امام رہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ تاشقند سے تعلق رکھتی تھیں۔

آپ نے پانچسال کی عمر میں قرآن پاک کی تعلیم کا آغاز کیا۔ اس وقت کے جید عالم دین حضرت مولانا محمد عابد رحمۃ اللہ علیہ نے بسم اللہ پڑھائی اور قرآن پاک ملا اسلام لاہوری سے پڑھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں حفظ کر لیا۔ تعلیم کی لگن نے آپ کو لاہور کے مشہور علمائ کے تلامذہ کی صف میں لا کھڑا کیا۔ چنانچہ آپ نے علم دین سے دامنِ مراد بھرنے کے لیے مولانا محمد عابد، مرزا مہراللہ، ملا حفیظ اللہ، مولوی عبداللہ، ملا ظہور اللہ اور مولانا شہر یار جیسی نابغہ روزگار ہستیوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور فقہ و حدیث کی سند لی اور علوم معقول و منقول کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ آپ کا زمانہ لاہور کی تاریخ میں بڑا ابتری کا زمانہ مانا جاتا ہے مگر اس کے باوجود ہمیں اس شہر میں آپ ایسے جید علماءِ کرام نظر آتے ہیں کہ ان کی مثال نہیں ملتی۔

آپ تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۱۷۵ھ میں مکہ مکرمہ پہنچے وہاں سے شیخ یحییٰ بن صالح مکی اور شیخ ابوالحسن سندھی مدنی سے اجازتِ تدریس حدیث و تفسیر لی۔ یہاں سے فارغ

لہ حدائق الحنفیہ از فقیر محمد جہلمی ص ۴۵۱، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ

ہو کر آپ لاہور واپس آ گئے جہاں اپنے والد محترم کی جگہ وزیر خاں کی مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دینے لگے۔

آپ کی علمی شہرت نے ملک کے گوشے گوشے سے طلبائے علوم دینیہ کو کھینچا اور آپ نہایت جاں فشانی سے قرآن وحدیث کی تعلیم میں مصروف رہتے تھے۔ آپ نے اسی زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر" مسلک الدرر الاکمل رسل اطہر" لکھی۔ یہ کتاب موارد الکلم فیضی کی طرح بالکل بے نقاط تھی۔ آپ نے اس کی تالیف وتصنیف میں صرف اٹھارہ دن صرف کیے اور رشیدی، مواہب اسعدی اور روضہ کے علاوہ کوئی کتاب پاس نہ تھی حالانکہ فیضی نے موارد الکلم کے وقت تینتیس کتابیں لغت وادب سے استفادہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف اہل علم کے لیے مشعل راہ ہیں۔

۱۔ مدار الاسلام فی علم الکلام
۲۔ شروط الایمان
۳۔ القول الحق فی ترک الشعر والخلق
۴۔ درار التعسف عن ساعۃ علمتہ یوسف
۵۔ ہدم الطاغوت فی قصۃ ہاروت وماروت
۶۔ نور صدقۃ الثقلین فی تمثال النعلین
۷۔ شرح القضات ابہا ہو فی الجواز القول المختہ
۸۔ الظاہرہ المسمّٰی بتوضیح السنۃ فی التفضیح البدعۃ
۹۔ ازالۃ الفسادات فی الشرح مناقب السادات
۱۰۔ تبیض الرق فی تبیین الحق فی رد ما تساہل فیہ شیخ عبدالحق
۱۱۔ جامع الوظائف نقطۃ الخطیب
۱۲۔ دیوان منزیل الاخران
۱۳۔ زبدۃ الشرح جامعہ طب احمدی
۱۴۔ ترجمہ فقہ محمدی

۱۵۔ ہدیۃ الامام للخطباء الکرام

سخت سُنّی العقیدہ ہونے کی وجہ سے اپنے عقاید کی تشریح بھی بسا اوقات شعروں میں کر جاتے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو: ؎

بیا اے مومن سنّی بہ بیت اللہ اندر شو
طہارت ساز از خونِ دل و یاقوتِ احمر شو
چو رو آری بہ محراب عبادت شاد کن محشر
گدازی از ریاضت نفس را و صدف چون زر شو
فریضہ چوں ادا کردی بہ امر حضرت رحمان
یکاں بار از مزار سیّد اسحاق انور شو
حصولِ غلبہ از قرب جنس کامل شود تارک
فدائے آل و اصحاب رسول اللہ اکبر شو[1]

فتح پنجاب کے بعد احمد شاہ ابدالی جب لاہور آیا تو آپ کی علمی قابلیت سے بڑا متاثر ہوا۔ آپ کے پیچھے اس نے نمازِ عید پڑھی تھی۔ آپ اپنے وقت کے زبردست عالم، فقیہ، محدث اور صاحبِ طرزِ انشاء پرداز تھے۔[2]

مولانا محمد صدیق کے والد مولانا محمد حنیف اور پیٹے مولانا غلام محمد عرف گاموں کی علمی مساعی سے نواب وزیر خاں کی مسجد کا وہ دینی مدرسہ ایک علمی سرچشمہ بنا رہا، جو بانی مسجد وزیر خاں حکیم علیم الدین انصاری (چنیوٹی) کی وصیت کے مطابق جاری تھا۔ ان تینوں بزرگوں نے سیاسی حالات کی ناہمواری کے باوجود اس دینی مدرسہ کی افادیت کو کم نہیں ہونے دیا اور بڑی جان فشانی سے طلبائے علم دین کو پڑھاتے رہے۔ اس مدرسہ کی وجہ سے مسجد اہل علم کا گہوارہ تھی اگرچہ مسجد کے ساتھ

---

[1] نقوش، لاہور نمبر ص ۴۰۴۔ مضمون از مولانا علم الدین سالک

[2] حدائق الحنفیہ از مولوی فقیر محمد جہلمی ص ۴۵۲ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ

پرانی کوتوالی سے لے کر دہلی دروازے تک کی ساری جائداد وقف تھی مگر پھر بھی مسلمانوں کے زوالی دور میں ان چیزوں کے انتظام کی کیا حالت ہو سکتی تھی۔ یہ مدرسہ لاہور کے علمی حلقوں میں مشہور تھا۔ جمعہ کے روز کاروباری حضرات چھٹی کرتے تو یہاں علما و فضلا اور شعرا کا ایک عظیم الشان اجتماع ہوتا جہاں لوگ علمی تشنہ کامی کا سامان بہم پاتے۔ بسا اوقات بیرونی تاجر اور علما بھی ان مجالس میں شریک ہوتے۔ چندر بھان برہمن نے اپنے قلمی رسالہ چہار چمن ورق ۵۳ پر اس علمی مقام کا یوں تذکرہ کیا ہے:

"کتب بے شمار از عربی و فارسی و دیگر نسخہ ہائے معتبر از تواریخ و مثنوی و دواوین متقدمین و منشآت و فکرات و رقعات و قطعات و نوشتہ جات خوش نویسانِ روزگار و سائر آلات و ادواتِ مشق از ہر قسم و ہر جنس بمعرض خرید و فروخت مے آید چو آزادی مکتب نشیناں مخصوص ایں روز است از ہر کوچہ و از ہر کوئے جواناں نو رسیدہ بیاض در دست و گل بر سر بمقتضائے عہد شباب خراماں خراماں بہ سیر بازار کتاب مے آیند"

ایسا علمی بازار صبح سے نمازِ جمعہ تک رہتا اور پھر لوگ نمازِ جمعہ کی تیاری کرتے۔

حسان الہند مولانا آزاد بلگرامی کے زمانہ تک مسجد وزیر خاں کا یہ دینی مدرسہ علمی اور ادبی قدروں کی نشوونما کا مرکز بنا رہا۔ آپ فرماتے ہیں کہ شاہ آفرین لاہوری نے حاکم لاہور سے ذکر کیا اور حاکم نے میرے سامنے بیان کیا کہ ایام سابق میں مسجد وزیر خاں کے صحن میں شعراء کی مجلسِ سخن آراستہ ہوتی اور دینی مباحث ہوتے۔

یہ علمی درس گاہ آپ کے بیٹے مولانا غلام محمد المعروف بہ استاد گاموں کی وفات تک بڑے زور و شور سے کام کرتی رہی مگر سکھوں کی چیرہ دستیوں نے اس علمی مقام کو محض نام نہاد مدرسہ میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد امامت، خطابت اور تولیت پر جھگڑے ہوتے رہے مگر ایک قدیمی مدرسہ کو وہ مقام نہ مل سکا جو ان علمائے کرام کے زمانہ میں تھا۔ مولانا محمد صدیق صاحب تیمور شاہ کے زمانہ میں ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں واصل بحق ہوئے۔ "حدائق الحنفیہ" کے مصنف نے آپ کی تاریخ وفات "فاضل فروزیاں" سے لی ہے۔

مولانا غلام محمد المشہود امام گاموں قادریؒ

مولانا غلام محمد المعروف امام گاموں لاہور کے مشہور عالم دین حافظ صدیق مرحوم کے بیٹے تھے۔ قرآن پاک کے حافظ اور ماہر علوم دینیہ تھے۔

آپ ایک عرصہ تک وزیر خاں کی مسجد کے امام رہے۔ آپ نے اس دور میں مسجد وزیر خاں کی امامت کے فرائض انجام دیتے جبکہ لاہور کی اکثر مساجد سکھوں کے زیر قبضہ آ کر چھاؤنیاں اور بارود خانے بن چکی تھیں اور اذان دینا جرم قرار دیا گیا تھا۔ آپ کی ذات اس پُرخطر دور میں مسلمانوں کے اعتقادی اور دینی امنگوں کا واحد سہارا تھی۔ آپ فقیر منش عالم دین تھے اور سلسلہ قادریہ سے منسلک تھے۔ آپ سید عبداللہ شاہ قادری بلوچؒ (جن کا روضہ مزنگ میں ہے) کے مرید صادق تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند مولوی الٰہ بخش صاحب ایک مدت تک مسجد وزیر خاں کے خطیب رہے۔ یہ امام صاحب ۱۲۷۰ھ میں فوت ہوئے تو ان کے بیٹے مولوی محمد امام مقرر کیے گئے جو دس سال تک امامت کے فرائض سرانجام دے کر فوت ہوئے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ آپ کا بڑا احترام کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سکھوں کو مسجد وزیر خاں کی بے حرمتی کی جرأت نہ ہوئی۔ آپ کا وجود طلباء علوم دینیہ اور نادار لوگوں کے لیے بڑا سہارا تھا اعلیٰ خوشنویس تھے۔ قرآن پاک کی کتابت کرتے اور معاوضہ غرباء میں تقسیم کر دیتے۔ خوش بیان واعظ تھے۔ سنگ دل سے سنگ دل انسان ان کے وعظ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ آپ نے "قصیدہ المقلدین" میں اپنا حسب ونسب ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

ایں غریب ابن حافظ صدیق — ازدل وجاں غلام ایں ہر چار
سنّی و قادری و حنفی امام — از روافض خوارجی بے زار

گر تو پرسی کہ اسم جسم چیست — تو غلام محمدم پندار
ور تخلص غریب پنداری — گر بخوانی تو نظم من اے یار
بہ حقیقت اگر نظر بہ کنی — نہ تخلص نہ اسم و جسم شمار

آپ صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔ کتاب شمس التوحید اور گنج مخفی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آپ شب شنبہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۷ء کو فوت ہوئے۔ آپ کا مقبرہ مسجد وزیر خان کے احاطے کے باہر جنوب میں ایک بلند گنبد میں واقعہ ہے۔ ایک عرصہ تک آپ کا سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا رہا ہے۔ صاحبِ "تاریخ لاہور" نے آپ کا وصال ۱۲۴۳ھ لکھا ہے۔ آپ کے خاندان کے دوسرے علماء اس مسجد کی امامت کے فرائض ایک عرصہ تک انجام دیتے رہے۔ آپ کے ایک پڑپوتے مولوی فرزند علی کا سابقہ متولی جج ظفر علی مرزا سے تولیت کے بارے میں مقدمہ چلتا رہا مگر محکمہ اوقاف کے انتظام کے بعد یہ سب چیزیں ایک کہانی بن کر رہ گئیں۔

حضرت شاہ غلام محی الدین نقشبندی قصوریؒ

مخدومانِ پنجاب کی ایک روحانی یادگار

مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے جدامجد حاجی حافظ قاری عبدالمالک صدیقی عہدِ شاہ جہانی میں واردِ سندھ ہوئے۔ ان کے ایک صاحبزادے مخدوم حافظ غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے "مخدوم پنجاب" کے لقب سے اپنے زمانہ میں خاصی شہرت حاصل کی۔ یہ وہی بزرگ تھے جن کے فیض سے عارف پنجاب حضرت بلھے شاہ اور ترجمانِ حقیقت حضرت سید وارث شاہ رحمۃ اللہ علیہما نے آسمانِ کمال تک رسائی حاصل کی۔ "مخدوم پنجاب" کے دو صاحبزادے شیخ محمد اور غلام مصطفیٰ تھے۔ حافظ غلام مصطفیٰ رحمۃ اللہ علیہ ہمارے مولانا غلام محی الدین قصوری کے والد اور شیخ محمد آپ کے مربی اور چچا تھے۔

اس صاحب علم و عرفان خاندان کی نسبت سے ضلع لاہور کا شہر قصور تاریخ میں بغدادِ ثانی بن کر طالبان علم یقین کا مرجع بن گیا۔ اس شہر سے علم و ہدایت کے چشمے رواں ہوئے۔ عرفان و تصوف کے دھارے بہے۔ سید بلھے شاہؒ اور سید وارث شاہؒ ایسے شاعر، مفتی عنایت علی ایسے ادیب اور مولانا غلام دستگیر ایسے مصنف و مناظر بن کر آسمان شہرت پر طلوع ہوئے اس خاک پاک نے مولانا غلام محی الدین قصوریؒ دائم الحضوری ایسے ولی اللہ اور جید عالم دین کو اپنی گود میں پرورش کی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان بزرگوں کے عزم و ہمت سے پاک و ہند کے اکثر علمی خانوادے علم و عرفان کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ للہ شریف اور بیربل شریف کی بارگاہیں اسی آفتاب روحانیت کی شعاعوں سے روشن ہیں اور اسی شہر کے بوریا نشینوں نے شاہانِ وقت کے قلب و نظر کو ضیا بخشی اور آسمانِ شہرت پر مہتاب بن کر چمکے۔ قصور کی خانقاہوں کے درویشوں نے برصغیر کے ذرہ ذرہ کو چمکا دیا اور اسی شہر کے

خرقہ پوشوں نے تاج و تخت کے وارثوں کو علوم تصوف کے رموز سے آگاہ کیا۔

آج بھی اس شہر کے مشرقی کنارہ پر پھیلے ہوئے وسیع قبرستان پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات ماننا پڑے گی کہ اس شہر خوشاں کا ذرہ ذرہ زندہ ہے اور خاموش مکینوں کی قبریں زندگی کی ضیا پاشیاں بیے بیٹھی ہیں۔ ان قبروں کی گود میں وہ اولوالعزم انسان سو رہے تھے جنہوں نے پاک و ہند کی علمی تاریخ میں عشق و تصوف کے رنگ بھرے تھے ؎

شدیم خاک و لیکن ز بوئے تربت ما
تواں شناخت کہ زیں خاک مردمی خیزد

اسی شہر قصور میں مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۰۲ھ میں اس مقتدر خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے آپ ابھی ایک سال ہی کے تھے کہ آپ کے والد مولانا حافظ غلام مصطفیٰ کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ آپ کے عم بزرگوار مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی تربیت کے ساتھ ساتھ آپ کی عمر کے ابتدائی برسوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرنے میں بڑی جانفشانی سے کام کیا۔ مولانا نے کتب منقول و معقول اپنے اسی قابل قدر چچا سے پڑھیں اور ابتدائی مقامات سلوک بھی ان ہی کے زیر نظر طے کیے۔

آپ کے چچا کو خاندان قادریہ سے خرقہ خلافت ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا غلام محی الدین قصوری رح کی ابتدائی زندگی قادریہ سلسلہ تصوف سے بڑی متاثر نظر آتی ہے۔ آپ کے ننھیال بریلی (یو پی) میں تھے۔ مولانا شیخ محمد رح بریلی جانے لگے تو اپنے ہونہار بھتیجے کو بھی ساتھ دیا اور چند روز بریلی قیام کے بعد دہلی روانہ ہو گئے۔ دہلی میں نقشبندیہ مجددیہ سلسلہ طریقت کی عظیم شخصیت حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب نے اس سالک نوخیز (مولانا غلام محی الدین) کی پیشانی سے آثار عرفان دیکھے تو آپ کو سلسلہ نقشبندیہ میں شمولیت کی دعوت دی۔ آپ اپنے عم بزرگوار کے پاس ادب سے چپ رہے اور قصور لوٹ آئے مگر حضرت شاہ غلام علی دہلوی کی نظر کیمیا اثر نے آپ کے دل میں ایک خاص کیفیت پیدا کر دی تھی جو آپ کی ساری زندگی کا سرمایہ بن گئی۔ چچا کے انتقال کے بعد

آپ برہنہ پا دہلی پہنچے اور شاہ غلام علی کی قدم بوسی سے مشرف ہُوئے۔

مولانا کی حاضری سے تھوڑی دیر پہلے حضرت شاہ غلام علی دہلوی حاضرینِ مجلس کو فرما رہے تھے:

"آج ایک امرِ عظیم ظاہر ہونے والا ہے۔ ایک فاضل اجل سلسلۂ نقشبندیہ میں شامل ہونے والا ہے۔"

حالات مشائخ نقشبندیہ میں لکھا ہے کہ جب آپ تشریف لائے تو حضرت شاہ صاحب نے مولانا غلام محی الدین قصوریؒ کا ہاتھ اٹھا کر فرمایا:

"اے میرے اللہ! جو فیض حضرت غوث پاک سے وراثتاً، عطاءً یا کسباً پہنچا ہے، وُہ انہیں نصیب فرما۔"

پھر آپ نے دایاں ہاتھ اٹھا کر فرمایا:

"تمہارا ہاتھ غوثِ اعظمؓ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔"

اپنی ٹوپی اتار کر آپ کے سر پر پہنائی اور دعائے خیر فرمائی۔

حضرت شاہ غلام علی دہلوی نے مولانا کی روحانی تربیت میں جانفشانی اور شفقت سے کام لیا۔ آپ اس خصوصی توجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں سلوک کی منازل طے کر گئے آپ کی رُوحانی تربیت کے واقعات کو سامنے رکھا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مولانا غلام محی الدین قصوریؒ کو ایک خاص نصب العین کے تحت تربیت دی جا رہی تھی۔ حضرت شاہ صاحب کے سامنے پنجاب کی روحانی تربیت کا بہت بڑا منصوبہ تھا جو آپ اس روحانی شاگرد سے پُورا کرانا چاہتے تھے۔

مولانا غلام دستگیر الہاشمی قصوریؒ اپنی کتاب "تحفۂ دستگیریہ" کے صفحہ ۱۳ میں یُوں رقم طراز ہیں:

"در مقامات شریفہ در احوال حضرت مولانا غلام محی الدین قصوریؒ مرقوم است کہ زبانی یکے از ثقات شنیدہ ام کہ استاد ایشاں مولوی بشارت اللہ ارادہ زیارت مزار فائض الانوار حضرت غوث الثقلین نمود دیر آں حضرت در خواب

ایشاں آمدہ فرمودند فرزندم غلام محی الدین پیشِ شما تلمذے نماید۔ دیدن او دیدن من است۔ حاجت اغنیاء رنجِ سفر نیست۔"

۲۷ رمضان ۱۲۳۴ھ کو آپ کو خرقۂ خلافت عطا ہُوا۔ صاحبزادہ رؤف احمد (مؤلف تفسیر رؤفی) مولانا محمد عظیم اُس مبارک تقریب میں شامل تھے۔ ان دونوں بزرگوں کو حضرت شاہ صاحب نے حکم دیا کہ خلعت خلافت پہناتے وقت میرے شریک کار رہیں کیونکہ بزرگانِ نقشبندیہ کا طریقہ یہی ہے۔

"حالات مشائخ نقشبندیہ" کے مصنف، مولانا محمد حسن نقشبندی قدس سرہٗ نے آپ کا سلسلہ طریقت یُوں لکھا ہے:

"مولانا غلام محی الدین قصوری، شاہ غلام علی دہلوی، مرزا مظہر جان جاناں، سید نور محمد بدایونی، خواجہ محمد معصوم اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔"

شاہ غلام علی دہلوی نے جس رنگ میں آپ کی تربیت کی وہ آپ کی خوش نصیبی کی بڑی دلیل ہے۔ حالاتِ مشائخ نقشبندیہ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مولانا رمضان کے روزے کی افطاری کے لیے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ٹھنڈا پانی لے کر حاضر ہُوئے اور آپ نے ازراہِ محبت فرمایا: ع

بگو مجنوں چہ آوردی برائے تحفہ لیلیٰ!

آپ نے ہاتھ بڑھا کر ٹھنڈا پانی پیش کرتے ہوئے کہا: ع

دل صد پارہ آوردم اگر داری بدان میلیٰ

شاہ صاحب نے خوش ہوکر فرمایا:

"اللہ تمہارے دل کو اپنی معرفت کی ٹھنڈک سے نوازے۔"

حضرت شاہ غلام علی نے مولانا خدا لدرومی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

"منجملہ انعاماتِ الٰہی سبحانہٗ، ہست کہ مولوی غلام محی الدین از قصور نزد بندہ لاشئ آمدہ در چند ماہ نسبت ہائے احمدیہ رسیدہ و باجازت و خلافت انتیائے

یافتند۔"

حضرت شاہ غلام علی دہلوی اپنی کتاب "مقاماتِ مظہریہ" میں لکھتے ہیں:

"جامع الکمالات علوم ظاہر و باطن حضرت مولوی غلام محی الدین قصوری کہ تلامذہ و مستفیدان بسیار دارند از بلدۂ قصور نزد ایں سراپا قصور آمدہ سعادت فیوض باطن کردند، بعنایت الٰہی سبحانہ، در اندک مدت بہ نسبت ہائے احمدیہ مناسب بہم رسانیدہ اجازت بلکہ خلافت یافتند۔"

ایک خط میں جو حضرت مولانا شہادت اللہ براہیجی کو تحریر کیا گیا تھا۔ فرماتے ہیں:

"اکثر می گویم کہ سہ چہار کس در یاران من شاہ میاں ابوسعید، رؤف احمد و احمد سعید و دیگر مولوی قصوری غلام محی الدین پیدا شدہ است۔"

ان خطوط و ارشادات سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا غلام محی الدین قصوری کی روحانی تربیت پر حضرت شاہ صاحب کو کس قدر اطمینان خاطر تھا اور ان کا داخل سلسلہ ہونا خود ان کے لیے کتنا باعثِ فخر تھا۔

دہلی میں ایک عرصہ قیام کے بعد مولانا قصور لوٹ آئے۔ اس چھوٹے سے شہر میں جو سکھوں کی دست برد سے ویران ہوتا جا رہا تھا، جان پڑ گئی۔ علوم و عرفان کی بارشیں ہوئیں۔ تصوف و طریقت کے چشمے پھوٹ پڑے، تشنگانِ علم گوشے گوشے سے اُمڈے چلے آئے ؎

تشنگانِ علم دوڑو وقتِ نوشا نوش ہے

آپ کے فیضانِ نظر اور علمی تربیت نے بڑے بڑے روحانی خانوادے پیدا کیے۔ ان علماء و صوفیاء پر تاریخ سنیت جس قدر ناز کرے وُہ کم ہے۔ حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری، مؤلف تقدیس الوکیل، حضرت مولوی غلام نبی للّٰہی اور حضرت مولانا غلام مرتضیٰ بیربل شریف کے نام تو آسمانِ شہرت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ آگے چل کر ان خانوادوں سے روحانیت کے چشمے پھوٹے اور نور و فضل کی نہریں جاری ہوئیں جن سے سارا ملک سیراب ہو گیا۔

آپ کو جس دور میں علمی اور روحانی کام کرنے کا موقعہ ملا وُہ بڑا پُر فتن اور بدامنی کا

زمانہ تھا۔ سکھ چیرہ دستیوں نے مسلمانوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ مغلیہ خاندان کے زوال کے ساتھ ساتھ پنجاب کے مسلمانوں کو من حیث القوم جس ابتلاء سے گزرنا پڑا اس کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لاہور کی تاریخ کا یہ باب اس قدر خونچکاں اور مکروہ ہے جس کی مثال ہمیں صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسلامی تمدن کے آثار کی تباہی اس زمانے سے بڑھ کر کبھی نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کی تہذیب کی عمارت کی بنیادیں ہلا دی گئیں۔

مگر بایں ہمہ وہ عزم و ہمت کی دولت لے کر ایسے نامساعد حالات میں میدانِ عمل میں نکلے اور پنجاب کی دکھی انسانیت کو جس طرح سہارا دیا وہ اہل اللہ کا ہی حصہ ہے، وہ علم مصطفوی کی شمع کو فروزاں رکھنے کے لیے ان طوفانوں کے سامنے سینہ سپر رہے۔ سیاسی ابتری کے باوجود علمی اور روحانی تربیت کو جاری رکھا۔ اس باعزم شخص نے اس ظلمت کدہ میں نور کی شعاعیں بکھیرنے میں جس پامردی سے حصہ لیا اس کی مثال عصرِ حاضر کے سیاسی تحریک سازوں کے ہاں کبھی نہیں ملتی۔

آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "ذکرِ خیر حضرت قصوری رحمۃ اللہ علیہ" میں اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ آپ خدمتِ خلق میں بہت دلچسپی لیتے تھے اور اس دور میں جس جبر و تشدد نے بڑے بڑے صاحب اثر مسلمانوں کی گردنیں خم کر دی تھیں آپ نہایت جرأت کے ساتھ پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں مدد فرماتے نواب امام الدین گورنر کشمیر آپ کے عقیدت مندوں میں سے تھے سکھ امراء ملک میں طوفان بن کر چلتے تھے لیکن جب آپ کے سامنے آتے تو سر جھکا دیتے تھے۔ آپ قصور سے لے کر ڈیرہ جات تک مخلوقِ خدا کی امداد فرماتے۔

مولانا کی روحانی اور دینی مصروفیات میں یہ بات بڑی قابلِ غور ہے کہ شعر و ادب میں بڑا کمال تھا۔ آپ کا کلام عربی، فارسی اور اردو ادب کا بہترین حصہ ہے۔ آپ نے "تحفہ رسولیہ" اور عربی خطبات میں جس بلند خیالی کو پیش کیا ہے وہ آپ کے معاصرین کے ہاں بہت کم ملتی ہے آپ کے کلام میں دنیا کی بے ثباتی ملاحظہ ہو۔

اشعار

کجا رفتند شاہان و وزیراں
کہ می بودند با تدبیر و راہا
بنوشیدند شیر و شہد و شکر
بپوشیدند از دیبا قبا ہا
چو موت آمد ہمہ بیچارہ گشتند
شدند آخر غریق آب فنا ہا
غلام محی الدین مگذار غفلت
چو از مرگت بگوشش آمد ندا ہا

دیوان حضوری[1] آپ کی مشہور یادگار ہے۔

جناب غوث الاعظمؓ کی مشہور کرامت جس میں آپ نے بارہ سال بعد ایک غرقاب کشتی کو برات سمیت نکالا تھا مولانا نے فارسی نظم میں بیان فرمایا ہے۔ اس واقعہ کو پیش کرتے وقت مصنف نے جن تشبیہات و استعارات کو پیش کیا ہے اس میں اساتذہ کی سی پختگی چمکتی ہے غمزدہ بڑھیا کی یوں تصویر کھینچتے ہیں: ؎

قدش خم کماں زہ از عصاء تیرش ز آہِ جانگزا
اشک رواں چوں سیلہا لرزاں ولغزاں دست و پا

بڑھیا اپنا خونچکاں واقعہ سناتی گئی اور سیل اشک بہاتی گئی۔ ؎

در کشتی ایں بحر خون آمد برات از بخت دوں
کشتی چو گردوں شد نگوں شد غرقِ طوفانِ فنا
نوشہ عروس و ہمرہاں در طرفہ عین ناگہاں
گشتند در دریا نہاں گویا نبودہ گاہ بقاء

[1] دیوان حضوری کا ایک قلمی نسخہ صاحبزادہ شبیر احمد صاحبؒ کے پاس موجود ہے وہ اسے چھپوانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر زندگی نے وفا نہ کی۔

یک من بماندم زاں ہمہ بیشے نشانی زاں رمہ
ورد زبانم ہر دمہ ہیہات واویلا و واہ

مولانا کشف کی دولت سے بہت نوازے گئے، مستقبل کے کوائف کو حال کے آئینہ میں دیکھنا تو آپ کا معمول بن چکا تھا۔ لوگ بعض معاملات جن کے نتائج عام حالات میں کتم غیب میں ہوتے آپ کے سامنے پیش کرتے اور صحیح نتائج پر پہنچتے۔ آپ کے اس واقعہ سے تو آپ کے کشف کو تاریخی شہرت دی کہ آپ نے اپنے صاحبزادہ عبدالرسول رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش سے ایک سال قبل ہی ان کا نام، کنیت، عمر، اشغالِ زندگی، حلیہ اور دیگر کوائف اور حالاتِ زندگی "تحفہ رسولیہ" میں ایک طویل نظم میں بیان فرما دیئے تھے۔ یہ کتاب ۱۲۳۴ھ میں چھپی، جبکہ صاحبزادہ عبدالرسول کا سالِ پیدائش ۱۲۳۵ھ ہے۔ آپ لکھتے ہیں: ؎

اے کہ ہنوزی تو بکتم عدم
زود بہ گلزارِ جہاں نہ قدم
منتظرِ تست دل و جانِ من
مثلِ گہر جلوہ کن از کانِ من
راحتِ دل و نورِ جاں چشم منی
آب زنِ آتشِ خشم منی

ہر کہ نہم نام تو عبدالرسول
باد بدرگاہِ رسولت قبول
کنیت تو بہ کہ نہم بوسعید
عمر تو باید کہ بود بر مزید

اس طویل نظم میں بیٹے کی ساری زندگی کی داستان درج کی ہے۔ یہ نظم ۱۲۳۴ھ میں لکھی گئی اور مولانا عبدالرسول ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ "تحفہ رسولیہ" میں فرماتے ہیں:

تاریخ تمام ایں رسالہ شد لفظ "چراغکے" حوالہ
۱۲۳۴ھ

صاحبزادہ عبدالرسولؒ کا وصال ۱۲۹۴ھ میں ہوا جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آپ ۱۶ سال زندہ رہے۔ حضرت مولانا غلام محی الدین قصوریؒ نے اپنی مندرجہ بالا نظم میں فرمایا ہے: ع

عمر تو باید کہ بود بر مزید

لفظ "مزید" کے عدد ۱۶ بنتے ہیں۔ یہ نکتہ تذکرہ نگاروں کی نگاہ سے اس لیے پوشیدہ رہا ہے کہ مولانا کے کلام و تصانیف پر اس پہلو سے تحقیقات نہیں کی گئی۔

ہدیۃ الشیعتین میں مولانا غلام دستگیر قصوریؒ لکھتے ہیں کہ ۱۲۔ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ والے مولوی صاحب حضرت خواجہ غلام نبی رحمۃ اللہ علیہ کو درسِ مثنوی مولانا رومؒ دے رہے تھے۔ گو کتاب ابھی باقی تھی مگر آپ نے فرمایا:

"مولوی صاحب! کتاب ختم ہو گئی۔"

اسی دن دوپہر ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ کو اسمِ ذات کا ورد کرتے کرتے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کا مزار مقدس قصور کے قبرستان میں مرجع خلائق ہے۔ مولانا غلام دستگیر قصوریؒ نے "بنے نظیر زماں" سے تاریخ وفات لی ہے۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے تاریخ پیدائش و وصال کو یوں بیان فرمایا ہے: ؎

آں شہ والا غلام محی الدین
مرشدِ دیں رہبر ہر خاص و عام
چوں بدنیا آمد آں مرد سخی
بخشش آمد سال تولیدش تمام
۱۲۰۲ھ

مرشد حق متقی ہم گفتہ ام
نیز کردستم رقم "شیخ الکرام"
کن بیاں تاریخ "منظور جمال"
ہم بخواں "بحرِ سخاوت" والسلام
۱۲۷۰ھ

صاحب "انوار مرتضوی" حکیم عبدالرسول نے یہ تاریخ نقل کی ہے:

"شمس دین نبی زوال گرفت"

۱۲۷۰ھ

۱۲۹۵ھ میں مولانا غلام دستگیر قصوری رح نے جو آپ کے شاگرد، ہمشیر زاد اور داماد تھے اور اہل سنت وجماعت کے جید عالم دین تھے۔ ایک معرّا نظم سنگِ مرمر کے تختے پر لکھوا کر آپ کے مزار اقدس پر نصب کی ہے۔

اب آپ کا مزار بڑے عالیشان انداز میں سیّد شبیر احمد نقشبندی کے اہتمام میں تعمیر ہو رہا ہے۔

ﻟﮧ صاحبزادہ سیّد شبیر احمد شاہ قصوری رح نومبر ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی سیّد نذیر شاہ اور جدِ امجد کا سیّد احمد شاہ بن سید غلام حسین تھا۔ ساہیوال نزد بھیرہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پردادا سیّد غلام حسین شاہ کی شادی حضرت مولانا غلام محی الدین قصوری رح کی پوتی یعنی صاحبزادہ عبدالرسول قصوری کی بیٹی سے ہوئی۔ نانا کی زیرِ نگاہ تربیت پائی۔ ان کی وفات کے بعد سیّد محمد شاہ قصوری رح کے زیر تربیت رہے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول قصور میں حاصل کی۔ علومِ دینیہ اپنے والد سے حاصل کیے نامور علماء وقت کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ سلسلہ نقشبندیہ قصوریہ کے سجادہ نشین اور مخدومان پنجاب کے سچے جانشین تھے۔

قصور سے موضع دھولری کمالیہ ضلع لائلپور منتقل ہو گئے مگر حضرت خواجہ کے مزار کی نگرانی اور اس سلسلہ کی روحانی قدروں کو زندہ رکھا۔ اس علاقہ میں آپ نے بڑا تبلیغی کام کیا۔ علماء اہل سنت سے جلسے کروائے۔ دینی مدارس قائم کیے اور مساجد و مزارات کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے۔ بڑے علم دوست، ملنسار اور با اثر بزرگ تھے۔ راقم کے ساتھ خاص شفقت تھی۔ علمی کوششوں کی قدر کرتے اور بڑا تعاون فرماتے۔ ایک صاحبزادہ یادگار ہے۔ ۱۹۷۰ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ "انوار محی الدین" آپ کی تصنیف ہے۔

مولانا غلام محی الدینؒ

مولانا غلام محی الدین بگوی رحمۃ اللہ علیہ بن حافظ نور حیات بن حافظ محمد شفا بن حافظ نور محمد بگوی بروز پیر ماہ محرم[1] ۱۲۱۰ھ میں بگہ نزد بھیرہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حافظ نور حیات صاحب مقبولِ الٰہی اور صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ آپ کو مولانا غلام محی الدین سے دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ پیار تھا۔ وہ آپ کے بچپن کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں :

"میں دریا موکے کنارہ پر سحری کے وقت نمازِ تہجد ادا کیا کرتا تھا۔ یہ بچہ ابھی گود میں ہی تھا کہ اسے بھی ساتھ لے کر وہاں پہنچا اور ایک کپڑے پر اُسے لٹا کر مشغول نوافل ہوگیا۔ چونکہ ابھی تک رات کی سیاہی تھی مجھے نفل پڑھتے معاً خیال پیدا ہوا کہ بچے کو کسی درندے سے نقصان نہ پہنچے، اُس کے پاس گیا تو دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ اُسے گود میں لیے بیٹھے ہیں میں نے انھیں بزرگ خیال کرتے ہوئے التجا کی کہ اس بچے کے لیے دُعا فرمائیں کہ عالمِ باعمل ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ ازل سے ہی عالمِ باعمل ہیں اور خلقِ خدا ان سے فیض یاب ہوگی۔ یہ کہتے ہی غائب ہوگئے۔ اللہ نے میرے بیٹے کو ایسا ہی کیا۔"

آپ بچپن میں کھیلنے نکلتے تو لڑکوں سے الگ تھلگ رہتے اور اکثر خاموش رہتے۔ لڑکوں کو اچھی عادتوں کی ہدایت فرماتے۔ آپ کا احترام تمام لڑکوں کے دلوں میں ہوتا۔

---

[1] حدائق الحنفیہ از مولوی فقیر محمد جہلمی صفحہ ۴۷۶۔ حدائق حنفیہ کے مصنف نے آپ کا سنِ ولادت ۱۲۰۳ھ لکھا ہے مگر آپ کے پوتے جناب مولانا ظہور احمد بگوی مرحوم نے "تذکرہ مشائخ بگہ" میں اپنے خاندانی کاغذات و دستاویزات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ آپ کا صحیح سنِ ولادت ۱۲۱۰ھ ہی ہے۔

چار برس کی عمر یعنی ۱۲۱۴ھ میں حافظ حسن صاحب کی شاگردی میں آئے۔ حافظ حسن صاحب اپنے شاگردوں کو پیٹنے میں بدنام تھے۔ مگر آپ کی ذہانت کا کرشمہ ہے کہ اتنا سخت اُستاد ایک دن بھی آپ پر ہاتھ نہ اُٹھا سکا۔

آپ نے ایک مختصر سے عرصہ میں قرآن پاک پڑھ لیا۔ اگرچہ حفظ کی طرف توجہ نہ کی مگر رمضان کی تراویح پر تنگجر کے لوگوں نے آپ کے والدِ ماجد سے اصرار کیا کہ رمضان کے نوافل میں بچے سے قرآن پاک سنوائیں۔ بچے نے صبح مصمم ارادے سے والدِ محترم کو کہا کہ اگر آپ دن کے وقت میرے ساتھ ایک سیپارے کا دَور کر لیا کریں تو ان شاء اللہ رات کے نوافل میں قرآن سنانے کے قابل ہو جاؤں گا، چنانچہ آپ نے اسی رمضان قرآن حفظ کیا اور سُنایا۔

عمر کے ساتھ علمی تشنگی بڑھتی گئی۔ آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ جس عالمِ دین کے پاس جاتے وُہ انہیں دہلی جانے کا مشورہ دیتا۔

دہلی کو روانگی اور تحصیلِ علم[1] آپ اپنے چھوٹے بھائی مولوی احمد الدین کو ساتھ لے کر تحصیلِ علم کے لیے دہلی روانہ ہُوئے اور وہاں بارہ برس تک رہے اور مختلف مکاتیب سے تحصیلِ علم منقول و معقول فرماتے رہے۔ حدیث کی تکمیل مولانا محمد اسحٰق صاحب[2] سے کی۔ مولانا محمد اسحٰق آپ کو شاہ عبدالعزیز کے پاس لے گئے۔ آپ نے مولانا غلام محی الدین حدیث کے متعلق مختلف سوالات کیے۔ آپ نے اپنے جوابات سے حضرت شاہ صاحب کو بڑا مسرُور کیا اور آپ سے سندِ حدیث حاصل کی۔ شاہ صاحب نے آپ کو نصیحت فرمائی:

"ان شاء اللہ آپ سے بڑا فیض ہوگا۔ جب وطن جاؤ ایسی بات نہ کرنا جس سے لوگوں میں تفرقہ پیدا ہو۔"

---

[1] حدائق الحنفیہ از مولوی فقیر محمد جہلمی صفحہ ۴۷۰

[2] مولانا محمد اسحٰق دہلوی شاہ ولی اللہ دہلوی کے نواسے تھے۔ علومِ فقہ، حدیث اور تفسیر میں یگانہ عالم تھے بڑے بڑے علماء نے آپ سے اکتسابِ علم کیا۔ مولانا نواب محمد قطب الدین محدث دہلوی مصنف مظاہر حق ترجمہ اُردو مشکوٰۃ شریف آپ ہی کے شاگرد تھے۔ آپ مکہ معظمہ میں ۱۲۶۲ھ میں فوت ہوئے۔ تاریخ وفات "بشیخ آفاق" سے نکلتی ہے۔ بقیع میں دفن ہوئے۔

بیعت دہلی میں آپ شاہ غلام علی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوئے۔ یُوں وُہ نقشبندیہ ومجددیہ سلسلہ سے منسلک ہو گئے۔

وطنِ مالوف کو واپسی علمِ شریعت وطریقت سے فارغ ہو کر آپ واپس گجرہ میں تشریف لے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آپ کے والد حافظ نور حیات رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو چکا تھا۔ سکھوں کی تاخت وتاراج سے مسلمانوں کی معاشی اور مذہبی زندگی رو بزوال تھی اسلامی تہذیب کے آثار مٹائے جا رہے تھے۔ مسلمان مایوسی کے عالم میں دل گرفتہ ہو چکے تھے مولانا غلام محی الدین نے ایسے دور میں مسندِ ارشاد پر قدم رکھا تو پُورے عزم کے ساتھ دین کی خدمت کرنے لگے۔ آپ کی شہرت نے سارے پنجاب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر فقیر عزیز الدین گجرہ میں آئے اور مولانا کی علمی قابلیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ لاہور جانے کی تمنا کا اظہار کیا۔ انھیں یقین تھا کہ ایسا فاضل انسان لاہور میں بیٹھ کر زیادہ خدمتِ دین کر سکتا ہے۔ آپ لاہور پہنچے اور مسجد بازارِ حکیماں میں شمعِ علم فروزاں کی۔ پروانگانِ علمِ دین چاروں سمت سے ٹوٹ پڑے اور یہ مُتّقی عالمِ دین صبح وشام طالبانِ علم کے سینوں کو نورِ علم سے منور کرنے لگا۔

غیر مسلم دامنِ اسلام میں خلقِ خدا سے حُسنِ سلوک اور علمِ دین کی اشاعت کا نتیجہ تھا کہ ہزار ہا اچھوت آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ حالانکہ اس دور میں اسلام میں داخل ہونا تو کجا اسلام پر قائم رہنا بھی بڑا کام تھا۔ آپ اپنی اخوت، مساوات اور حمیتِ اسلامی کے علمی مظہر تھے غیر مسلم بھی آپ سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہتے تھے۔

علمِ حدیث کی اشاعت مولانا کی درس گاہ علمِ حدیث کی تدریس کا بہت بڑا ادارہ تھا پنجاب کی شاید ہی کوئی علمی درسگاہ ہو جس میں اس مکتبِ حدیث کا فارغ عالمِ دین نہ پڑھا رہا ہو۔ آپ سے کم وبیش دو ہزار اشخاص نے علمِ حدیث کی سند حاصل کی۔ صاحبِ "تذکرہ مشائخ گجرہ" نے مشہور اور نامور شاگردوں میں سے ان حضرات کے اسمائے گرامی خاص طور پر لکھے ہیں:

مولانا نور الدین چکوڑی والے، مولانا شاہ محمد مرحوم فیروز پوری، مولانا غلام رسول

قلعہ میہاں سنگھ، حافظ ولی اللہ لاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

یہ وہ بزرگ تھے جو دنیائے علم وفضل میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ آپ نے لاہور کے تیس سالہ قیام میں ہزارہا تشنگانِ علومِ دینیہ کو سیراب کیا۔ اس تیس سالہ عرصہ میں آپ نے جس خلوص، پامردی اور جانفشانی سے علمی کام کیا وہ مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ زندگی کے آخری ایام میں بیمار ہو کر وطن مالوف تشریف لے گئے جہاں چودہ سال بیمار رہ کر شب دوشنبہ ۳۰ رشوال ۱۲۷۳ھ کو وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

"خورشید عالم" سے تاریخ وفات نکلتی ہے [1]

آپ کے دو بیٹے مولانا غلام محمد بگویؒ اور مولانا عبد العزیز بگویؒ علمی دنیا میں بڑے مشہور ہوئے۔ اول الذکر ایک عرصہ تک شاہی مسجد لاہور کے خطیب رہے اور مولانا عبد العزیز بگویؒ بھیرہ کی جامع مسجد کی خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

---

[1] مہر ۔۔ حنفیہ مولوی فقیر محمد جہلمی ص ۴۸۲

مولانا جان محمد لاہوریؒ

ایک خوش بیان مقرر جس کے وعظ پر اہل لاہور نے اپنی حویلیاں ہبہ کر دیں

آپ کا خاندان ضلع سیالکوٹ میں آباد تھا۔ آپ اپنا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

"فقیر حقیر ہیچمداں خاک پائے عالماں جان محمد بن غوث بن ولی اللہ السیالکوٹی ثم اللاہوری عفر لہ"[1]

آپ سکھ دور میں تعلیم سے بہرہ ور ہوئے اور علم دین میں بڑی شہرت حاصل کی۔ "قابل مدرس، خوش بیان واعظ، مشہور فقیہہ مانے جاتے تھے۔ ہزاروں طلباء آپ سے علم دین سیکھ کر فارغ ہوئے۔

مفتی غلام سرور لاہوریؒ نے اپنی کتاب حدیقۃ الاولیاء میں آپ کے حالات میں آپ کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے:

"عالم اجل، فاضل اکمل، حاوی فروع و اصول، واعظ، متقی اور صاحب خرق عادات"[2]

حدائق الحنفیہ کے مصنف مولوی فقیر محمد جہلمی نے لکھا ہے کہ آپ علوم مروجہ کی ہر شاخ پر بڑی دسترس رکھتے تھے۔ درس میں تشنگان علوم دینیہ کے جمگھٹے رہتے۔ پنجاب کے دور افتادہ اضلاع سے لوگ آتے اور علم و فضل سے دامن بھر کر لے جاتے۔ جو آپ کا وعظ سنتا، گناہ سے تائب ہو جاتا۔ درس میں شریک ہونے والے جنید و بایزید

---

[1] بیان فی قباحۃ الدخان ص ا قلمی [2] حدیقۃ الاولیاء مفتی غلام سرور لاہوری

کہلائے۔ آپ کے شاگرد علم وعمل کے پیکر بن کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ ان میں مولوی محمد عالم کھوڑی، مولوی کرامت اللہ، مولانا غلام محمد اور مولانا فخر الدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پنجاب کا شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہو جہاں آپ کا شاگرد علمِ دین کا نور نہ بکھیرتا رہا ہو[1]

آپ کے گوہر بار قلم سے زبدۃ التفاسیر، شرح قصیدہ بردہ، بیان فی قباحۃ الدخان، شرح قصیدہ امالی، معراج نامہ، رسالہ عدم فرضیت جمعہ اور رسالہ اثبات خلافت امیر معاویہؓ وغیرہ تصانیف چھوڑی ہیں۔

تاریخ لاہور کے مصنف رائے بہادر کنھیا لال نے آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ اپنی مشہور تصنیف تاریخ لاہور کے صفحہ ۱۴۱ پر لکھتے ہیں:

"واعظ شیریں بیان مولانا جان محمد لاہوری اپنے وعظ کی سحر بیانی سے قلوب و اذہان کو مسحور کر لیا کرتے تھے۔ آپ سکھ عہد میں کشمیری بازار کی مسجد (جسے مسجد ثانی دِ نور محمد ایمان والا کہتے تھے) کے خطیب مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں یہ ایک وسیع مسجد تھی جس میں ہزاروں لوگ جمعہ کا خطبہ سننے آتے تھے۔ ایک دفعہ جمعہ کا وعظ سننے کے لیے متولیِ مسجد نور محمد ایمان والا بھی آیا۔ وعظ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی دستار اور قیمتی کوٹ اتار کر مولوی صاحب کو پیش کر دیا اور نماز سے فارغ ہو کر آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی عظیم الشان حویلی میں لے گیا اور اپنے اہل و عیال کو دوسرے مکان میں منتقل کر کے ساری حویلی معہ سامان آپ کے حوالے کر دی۔ مولوی جان محمد صاحب تاحینِ حیات اسی حویلی میں قیام پذیر رہے بعد میں آپ کی اولاد کے نام منتقل ہو گئی۔

آپ کا ایک لڑکا محمد فیض اپنے باپ کی طرح ظاہری و باطنی علوم میں یگانۂ عصر تھا، وہ جوانی کے عالم میں فوت ہُوا۔ دوسرا بیٹا محمد فضل مولانا

---

[1] حدایق حنفیہ مولوی فقیر محمد جہلمی

جان محمد کے درس میں سبق دیا کرتا تھا، علمِ طلب میں بھی یہ شخص یگانہ تھا۔"

سکھ دور میں لاہور کے علمی مراکز بند ہو گئے تھے مگر بعض دینی درس گاہیں اور مدرسے باہمت اہل سنت وجماعت کے علماء کی ذاتی کوششوں سے جاری تھے۔ ان مدارس میں مولوی بُگّے والوں کا مدرسہ بازار حکیماں، مولانا غلام رسول اور مولوی غلام اللہ کا مدرسہ مسجد موراں، مسجد خراسیاں کا مدرسہ اور مسجد نور ایمان والا واقعہ کشمیری بازار میں اہل علم کا آخری سہارا تھے۔ ان تمام دینی مدارس میں مولانا جان محمد کا درس بڑے منظم طریقہ سے چل رہا تھا جس میں ہزاروں طلبائے علمِ دین دُور دُور سے آکر علم کی تشنگی کو دُور کرتے۔

وفات ۱۰ محرم ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء کو آپ کا وصال ہُوا۔ آپ نے جس مسجد میں امامت کی اسے مرجع خلایق و مکتب دینیات بنا دیا تھا۔ اس کی تعمیرِ نو کا پتھر ابھی تک آپ کی خدمت کی نشان دہی کرتا ہے۔

این مسجدے کہ مظہرِ نورِ محمدؐ است — دروے ہنوز امامتِ جان محمد است

این فضل حق فرید چہ سالِ بناش گفت — این سجدہ گاہ سلامت جان محمد است

۱۲۷۹ھ

حضرت مولانا احمد الدین بگویؒ

آپ کی ولادت ۱۲۲۳ھ بمقام بگہ ہوئی۔ آپ حضرت مولانا غلام محی الدین بگویؒ کے چھوٹے بھائی اور حافظ نورحیات کے لائق فرزند تھے۔ چھ سال تک اپنے والدِ محترم سے کتب دینیہ کا مطالعہ کیا۔ حافظ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے آٹھ پارے حفظ کیے۔ ۱۲۲۹ھ میں اپنے برادرِ اکبر کے ساتھ علمِ دین کے شوق میں دہلی پہنچے۔ مطوّل، شرح وقایہ تک کتابیں تو بھائی سے پڑھیں اور قرآن پاک بھی حفظ کیا اور علمِ حدیث کی سند شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ دہلوی سے حاصل کی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے دستارِ فضیلت حاصل کی۔

آپ شاہ غلام علی مجددی نقشبندی دہلویؒ کے مرید تھے۔ سلسلۂ مجددیہ سے فیض روحانیت حاصل کیا۔ حضرت شاہ صاحب کی روحانی تربیت میں کئی سال گزارے اور مدارجِ سلوک طے کیے۔ شب بیدار، زاہد اور مستجاب الدعوات تھے۔ بیمار طلبہ کی تیمارداری فرماتے۔ کوئی ہم سبق بیمار پڑجاتا تو نہ صرف اس کی عیادت کرتے بلکہ ادویات تیار کرتے اور جب تک وہ بیمار رہتا آپ اس پر جان چھڑکتے۔

آپ کی عمر کا کافی حصہ بگہ اور لاہور کے دارالعلوم میں اپنے بھائی غلام محی الدین بگویؒ کی علمی خدمات میں ہاتھ بٹاتے گزرا۔ وہ مسجد بازارِ حکیماں میں نہ صرف مدرسِ حدیث تھے بلکہ مفتیِ پنجاب بھی تھے۔ وہ چھ ماہ کے لیے اپنے وطن مالوف جاتے تو مولانا احمد الدین ہی ان کی جگہ فرائض فتاویٰ نویسی اور تدریسِ علوم دینیہ سرانجام دیتے۔

۱۲۶۲ھ کے بعد آپ مستقلاً بھیرہ ضلع سرگودھا میں مقیم ہو گئے۔ بھیرہ کے رئیس اعظم شیخ غلام حسن مرحوم آپ کے معتقد تھے۔ شیخ صاحب نے بھیرہ میں ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر و مرمت کرانے میں آپ کا ہاتھ بٹایا اور آپ نے وہاں جس دارالعلوم کی بنیاد رکھی اس کے

روحِ رواں رہے۔ اس مدرسہ سے آگے چل کر ہزاروں علماء نکلے۔ آپ کو اپنے بھائی غلام محی الدین سے بہت محبت تھی۔ آپ کی وفات کے بعد اُن کا عرس کرواتے اور ہر سال اس تقریب پر ہر طالب علم کو نیا لباس پہنایا جاتا۔ آپ اپنے بھائی سے تیرہ سال چھوٹے تھے اور حسنِ اتفاق دیکھیے کہ تیرہ ہی سال بعد واصلِ بحق ہو گئے۔

علمائے بگھر میں سے مولانا احمد الدین بڑے صاحبِ تصنیف عالم تھے۔ آپ نے تدریس کے ساتھ ساتھ درسی کتب کی تصانیف اور حواشی سے طلبہ کی بڑی خدمت کی۔ تصانیف میں سے آپ کی مندرجہ ذیل علمی یادگاریں علمی دنیا میں تابندہ و درخشندہ رہیں:

۱۔ ضیاء الصرف شرح صرفِ میر

۲۔ احمدیہ حاشیہ مُلّا جامی

۳۔ احمدیہ حاشیہ خیالی

۴۔ احمدیہ حاشیہ مطول

شیر شاہ سُوری کے جانشینوں نے بھیرہ شہر کی مرکزی حیثیت کے پیشِ نظر ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی تھی۔ حوادثِ زمانہ اور امتدادِ وقت نے اس مسجد کے در و دیوار کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا تھا۔ سکھ دور نے اس مسجد کو خاص طور پر پامال کر دیا اور اب مسجد کے بعض نشانات، کچھ ٹوٹی پھوٹی قبریں اور ایک پُرانا کنواں اس بات کی علامت تھا کہ یہاں کسی صاحبِ ایمان نے خلوص کی چند اینٹیں چُنی تھیں۔ ایک دن مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے بھیرہ میں تقریر کر رہے تھے والہانہ انداز میں مسجد کی بے بسی اور کسمپرسی کا نوحہ بیان کیا۔ مولانا احمد الدین صاحب ۱۲۷۶ھ میں اپنے شاگردوں کو لے کر ان کھنڈرات کو دیکھنے گئے تو وہاں ایک مجذوب ملا، جس نے مسجد کی تعمیرِ نو کی سعادت حاصل کرنے کی ہمت دلائی۔ رات کو گھر آئے خواجۂ دو عالم کی خواب میں زیارت ہوئی۔ علی الصبح تعبیر یہ لی کہ خدا کا گھر بنانا میری قسمت میں ہے۔ دوسرے ہی دن ان کھنڈرات کی کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ آپ کی ہمت اور عزمِ صمیم دیکھ کر پہلے طلبہ پھر قصبہ کے تمام لوگ مسجد کی تعمیر میں اس طرح مشغول ہوئے کہ جب تک یہ عظیم مسجد مکمل نہ ہو گئی دم نہیں لیا۔ جب یہ مسجد دوبارہ اُبھری تو قلعہ نما عمارت دکھائی دینے لگی۔ ان دنوں

انگریز پنجاب میں اپنے قدم جما چکا تھا۔ اسے علمائے حق سے خاص طور پر خطرہ رہتا تھا۔ کسی نے رپورٹ کی کہ بھیرہ کا ایک مولوی قلعہ بندی میں مصروف ہے۔ ایک فوجی جرنیل دستہ لے کر وہاں پہنچا تو ایک کھدرپوش کو خود گرد آلود ہونے کے باوجود شاگردوں کو قرآن پڑھاتے دیکھا تو کہنے لگا ایسے لوگ قلعہ نہیں بنایا کرتے۔

آپ کی آمد سے بھیرہ کی قسمت بدل گئی۔ علم و فضل کے چشمے پھوٹنے لگے، بھیرہ کے لوگ علم کی دولت سے مالا مال ہونے لگے۔ اطراف و اکناف سے ہزاروں طلبہ جمع ہو گئے۔ آپ کے شاگردوں میں سے حکیم شیخ احمد، حکیم تاج محمود، حکیم نورالدین تو یونانی طب کے امام کہلائے اور مولانا غلام رسول قلعہ والے، مولوی سلطان احمد کٹھالہ شیخاں، حافظ ولی اللہ مناظر اسلام لاہوری، مولوی کرم الٰہی بھیروی، مولوی غلام علی قصوری، مولانا غلام قادر بھیروی، مولوی محمد بخش جلال پوری، مولوی نوردین چکوڑی۔ مولانا زین العابدین چنیوٹی دنیائے علم و فضل میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

مولوی فقیر محمد جہلمی اپنی کتاب "حدائق حنفیہ" میں لکھتے ہیں کہ پنجاب میں علم منقول و معقول کی اشاعت ان دونوں بھائیوں کی علمیت کا نتیجہ تھی۔ ان کے زمانہ کا کوئی عالم، مدرسہ یا دینی ادارہ ایسا نہ تھا جہاں آپ کی شاگردی کے آثارِ فیض نہ پائے جاتے ہوں۔ ہر مکتبِ فکر نے آپ سے علم لیا اور دنیا میں تقسیم کیا۔

آپ ۱۲۸۶ھ میں کٹھالہ شیخاں تشریف لے گئے، وہاں بیمار ہوئے۔ واپسی پر ۱۲ شوال ۱۲۸۶ھ کو ۹۲ سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ بھیرہ کی جامع مسجد کے جنوبی احاطہ میں مدفون ہوئے۔

صاحبزادہ مولانا عبدالرسول قصوریؒ

مخدومانِ قصور کے روحانی فیضان کی آخری کرن

مولانا عبدالرسول قصوریؒ حضرت مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزندارجمند تھے۔ پیدائش ۱۲۳۵ھ میں شہر قصور میں ہوئی۔ آپ کے والدمکرم نے آپ کی پیدائش سے بہت عرصہ پہلے ہی اپنی تصنیف تحفۂ رسولیہ میں آپ کی پیدائش کی بشارت دی۔ آپ تحفۂ رسولیہ کی اشاعت سے ایک سال بعد پیدا ہوئے۔ تحفۂ رسولیہ میں آپ کا سنِ پیدائش، نام، کنیت، معمولاتِ زندگی حتّٰی کہ سالِ وفات تک ایک طویل نظم میں لکھ دیئے۔ یہ کتاب ۱۲۳۴ھ میں لکھی گئی، جس کا سالِ تصنیف یوں ہے:

تاریخ تمام ایں رسالہ شد لفظ چراغ کے حوالہ
گشت پدید ایں گوہر آبدار درسنِ یک الف دوصدوسی وچہار

مولانا عبدالرسولؒ نے ابتدائی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ قرآن و تجوید کے اصول وقوانین کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ علوم ظاہری اپنے والد بزرگوار کے مدرسہ میں پڑھے۔ روحانی تربیت بھی اپنے والد کے زیر اثر رہ کر حاصل کی اور آپ ہی سے خلافت واجازتِ بیعت سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ حاصل کی۔

مفتی غلام سرور لاہوریؒ مولف خزینۃ الاصفیأ نے آپ سے ملاقات کی۔ اپنی مشہور تصنیف حدیقۃ الاولیأ کے صفحہ ۹۶ پر لکھتے ہیں کہ:

"صاحبزادہ عبدالرسول قصوریؒ عالم اعلم، فاضل افضل، کاملِ اکمل، جامع شرافت ونجابت، ہادیِ شریعت وطریقت، واقفِ حقیقت و معرفت تھے۔ آپ مغتنمات وقت سے تھے۔ ان کی زیارت سے خدا

یاد آتا تھا۔ وعظ میں اثر تھا۔ دورانِ وعظ آنکھیں اشکبار رہتیں۔"

تحفۂ رسولیہ میں آپ کی زندگی کے جن پہلوؤں کی پیشگوئی کی گئی۔ آپ نے ساری زندگی اس سے سرِ مو تجاوز نہ کیا۔ صاحبِ "تحفۂ رسولیہ" فرماتے ہیں:

اکیہ ہنوزی تو بکتم عدم — زود بہ گلزار جہاں نہ قدم
شکر چنیں منعم فیاض کن — از رہ کفر و دے اعراض کن
عمر جوانی بہ عبادت گزار — تاکہ بہ پیری نشوی خاکسار
باز ز خدام مساجد عوام — خدمتِ مسجد دہدت جملہ کام
سایہ اتش از فرق جہاں کم مباش — باد بقا تا دم یوم التناد

"حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" کے مصنف نے لکھا کہ آپ کی جبلت اخلاق حمیدہ پر تھی۔ سخاوت مزاج میں اس قدر غالب تھی کہ دوسرے کی حاجت کو اپنی حاجت پر ترجیح دیتے۔ موسمِ سرما میں مہمان آتے، اگرم لحاف اور بستر انھیں دے دیتے اور خود نوافل میں رات بسر کرتے۔ اپنی تعریف سے ناخوش ہوتے۔ کتب منقولہ پر اتنا عبور تھا کہ طلبہ کو دُور بیٹھے پڑھاتے رہتے اور کبھی ایک لفظ بھی غلط نہ ہوتا۔ عاجزوں اور مسکینوں کی امداد فرماتے۔ امراء و اغنیاء سے کنارہ کش رہتے۔"

مسجد کے حجرے میں رہتے۔ مزاج میں سخاوت اس قدر تھی کہ جو کچھ آتا لٹا دیتے عیب پوشی اور اخفائے حال غالب تھا۔ کنایۃً بھی ایسی بات نہ کہتے جس سے کسی کی دل آزاری ہوتی۔

مولانا غلام دستگیر قصوری مناقب نعمان میں لکھتے ہیں کہ "صاحبزادہ عبدالرسول کو لوگوں نے بتایا کہ لاہور اور اس کے نواح کے غیر مقلد آپ کو گالیاں دیتے ہیں اور آپ کو بُرے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ آپ نے سُن کر فرمایا: الحمدللہ! ان کا گالیاں دینا اس بات کی علامت ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں شامل کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی زبانیں میرے خلاف کھلتی ہیں۔ ان لوگوں کی زبانیں اکثر اہل اللہ کے خلاف ہی وا ہوتی ہیں۔ میں ان لوگوں کا ممنون ہوں کہ مجھے سلسلہ اہل اللہ میں منسلک سمجھنے لگے ہیں۔"

آپ قصور کے دینی مدرسہ کے بڑے نامور شاگردوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ حضرت مولانا غلام مرتضیٰؒ بیربل شریف، خواجہ غلام نبیؒ للّٰہ شریف آپ کے ہم درس تھے۔ آپ عربی وفارسی ادب میں کمال رکھتے تھے۔ عربی وفارسی کلام میں اساتذہ کی سی پختگی اور روانی تھی۔ الفاظ میں شکوہ اور استعارات میں جدت آپ کے کلام کا امتیازی شان تھا۔ فارسی میں یوں گلفشانی کرتے:

بیا کہ رنگِ گل وگلستان نخواہد ماند ؛ بیا کہ غلغلۂ بلبلاں نخواہد ماند
منازِ بلبل کایں گلستان نخواہد ماند ؛ تدرو قمری و سروِ جہاں نخواہد ماند
غنی ومفلس وشاہ وگدا مال جہان ؛ ملوک وملک زمین وزماں نخواہد ماند
کجاست آں جم جام جہاں نمائش کجا ؛ چو خضر زندگیش جاوداں نخواہد ماند
تن تو درشکم گور خاک خواہد شد ؛ بقبرِ تو گزرِ دوستاں نخواہد ماند۔

فروش شاہی خود را اے عبید رسول
کہ شان وشوکت ونام شہاں نخواہد ماند

عربی زبان میں زیر زبر کی تبدیلی سے آپ نے شعری کلام میں جو انداز پیدا کیا اس کی مثال "مجموعہ خطب مولوی قصوری" سے ملاحظہ فرمائیں۔ آپ نے ابنائے زمانہ کا نفسیاتی تجزیہ کس انداز سے کیا۔

اَخوَانُنا فدخَانَنا اعضانا عضو اننا ؛ اذَا تَنا اذی لَنا اللّٰہ جلّ جلالہٗ
اعمالنا اعلٰی لنا افعالنا افعیٰ لنا ؛ اَحوالُنا احوٰی لَنا اللّٰہ جلّ جلالہٗ

مولانا غلام دستگیر قصوریؒ اپنی کتاب ہدیۃ الشیعتین میں ذکرِ خیر حضرت قصوریؒ کے ضمن میں صاحبزادہ سید عبدالرسول رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دو روز قبل از وفات سب سے وداع فرما کر دولت خانہ کے بالاخانہ پر گوشہ نشین ہو گئے۔ اور تہیہ سامانِ موت میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ بظاہر کوئی آثار نہ تھے۔ کسی کو ان کی وفات کا گمان تک نہ تھا۔ بروز انتقال کفن خود تیار کروایا۔ فاتحہ درود کی نسبت وصیت کی۔ فقیر (غلام دستگیر قصوریؒ) اور حافظ مولوی غلام مصطفیٰ خاں صاحب کو فیروز پور سے طلب کیا اور حکیم

چراغ دین صاحب قصوری کو بھی بلوایا اور فرمانے لگے اب حالت نزع ہے انہوں نے عرض کی آپ بالکل تندرست ہیں۔ ایسی نزع ہم نے کبھی نہیں دیکھی آپ تو خوشی بخوشی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں آپ نے فرمایا مجھے رحمت الٰہی کے دروازے کھلے نظر آتے ہیں۔ بہت سے لوگ کلمہ پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔"

الغرض نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد کلمہ او صفت ایمان باآواز بلند پڑھ کر سر بگریباں ہوئے اور واصل جناں ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی وفات کا مادۂ تاریخ طبعزاد فقیر یہ ہے۔ :

الحمید رضی اللہ عنہ
۵ ۱۲ ۹ ۴۷

مولانا غلام دستگیر قصوری نے نماز جنازہ پڑھائی اور قصور کے عظیم قبرستان میں آرام فرما ہوئے۔ یہ اشعار آپ کے مزار کے مرمریں کتبہ پر کندہ ہیں :

عبدالرسول قبلہ عالم بخواب ناز — صد باب فیض واشدہ اللہ اکبری
اے ختم خاندانِ قصوراز تو بے قصور — خلف الرشید از اب واجداد برتری
برخدا بہمت پیران باصفا — اُمدُد بحال زار من از بندہ پروری
تاریخ وصل از سر برکت غلام خواند — رونق فزائے دین متین پیمبری

۱۲۹۴ = ۱۲۹۲ + ۲

طبعزاد فقیر غلام دستگیر الہاشمی کان اللہ لہٗ

آپ کے مزار پُر انوار پر یہ عربی اشعار کندہ ہیں :

الاعبدالرسول الشیخ قد مات — ہوالکامل بلا نقص ولا عیب
فان تسألنا عام ارتحالہ — اقل تاریخہ غوث بلا ریب
۱۰۹

آپ کی وفات نے قصور کے اس عظیم مکتب کی بساط اُلٹ دی جو ناسازگاری حالات کے باوجود اس برصغیر میں پوری دو صدیاں علم و عرفان کا مرکز بنا رہا۔ جن علمی مراکز نے بُلھے شاہ پیدا کیے، وارث شاہ کو زمانے میں چمکایا، بیربل اور لِند کی بارگاہوں کو سجایا۔ مولانا غلام دستگیر قصوری ایسے نابغۂ روزگار عالم دین پیدا کیے۔ اس مکتب نے

نہ صرف کتابی علم دیا بلکہ ذہنوں کو ایک فکر دیا جس سے عالم، فاضل، صوفی، خطیب اور ولی اللہ دامن مراد بھر کر اُٹھے۔ آج قصور کی تاریخی مساجد کے محراب و منبر ان جانفزا نغماتِ توحید و رسالت کو ترس رہے ہیں جو مردانِ خدا کی آوازوں سے بیدار ہوتے تھے۔

ع وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

حضرت حافظ ولی اللہ قدس سرہٗ

ایک نابینا عالم دین اور مناظر اسلام، جن کا نام سن کر عیسائی پادری میدانِ مناظرہ چھوڑ کر بھاگ جاتے

برصغیر پاک و ہند میں جہاں دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے قدرت نے سینکڑوں علماء، صوفیہ، مشایخ اور مناظرانِ اسلام پیدا کیے وہاں لاہور کے ایک نابینا عالمِ دین، فاضلِ اجل حافظ ولی اللہ قدس سرہٗ جیسی عظیم شخصیت کو بھی پیدا فرمایا تھا، جن کا نام سن کر عیسائی پادری دم بخود ہو جاتے اور مناظرہ کے میدان سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ ایک وقت تھا کہ انگریز بہادر کی مضبوط حکومت کے زیر سایہ سینکڑوں عیسائی پادری یورپ سے نکل کر برصغیر کے ہر شہر میں علمائے اسلام کو مناظرہ کے لیے کہا کرتے اور عیسائیت کے محاسن و کمالات سے عوام کو متاثر کرتے۔ اگرچہ اس وقت کے علمائے ربانی نے ان فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان عیسائی پادریوں کے اعتراضات کے مسکت جواب دیے مگر مناظرِ اسلام حافظ ولی اللہ کے ہاتھوں ان پادریوں کی جو درگت تھی اس کی مثال نظریاتی مباحث کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہ بزرگ نابینا تھے، حافظ قرآن و انجیل تھے اور انھیں انجیل کے مختلف ایڈیشنوں کے صفحات اور سطریں از بر تھیں۔ وہ میدانِ مناظرہ میں اپنے مدِمقابل اور حریف کو انھی کی کتابوں کے حوالے سے لاجواب کر دیتے۔ معاندین کے فرار کے بعد قرآنی آیات کے حُسنِ تلاوت سے سارے مجمع پر چھا جاتے اور محاسنِ اسلام کو اس خوبی سے بیان کرتے کہ سامعین اپنی جگہ سے ہل نہ سکتے تھے وہ ایک عرصہ تک بادشاہی مسجد لاہور کے نائب خطیب رہے۔ حوض کے کنارے بیٹھ کر درسِ قرآن دیتے۔ پنجاب کے تمام شہروں میں جہاں کوئی عیسائی پادری سر اٹھاتا بہ نفس نفیس پہنچتے اور اسے للکار کر میدانِ مناظرہ میں لے آتے۔ بھرے مجمع میں اس کو لاجواب کر کے تائب کرا دیتے یا بھاگ جانے پر مجبور کر دیتے۔ ان کی آمد کی خبر سن کر عیسائی مبلغ شہر چھوڑ کر

بھاگ کھڑے ہوتے۔ بیمار بن کر گھر میں دبکے رہتے یا حکومت سے فریاد کر کے نقصِ امن کے بہانے مناظرہ کے انعقاد کو روک دیتے۔

پنجاب میں سکھ دور پورے شباب پر تھا۔ ریاست جموں و کشمیر میں سکھ راجہ کی بے جا سختیوں سے مسلمانوں کے لیے بڑے مشکل دن تھے۔ دُوسرے کشمیری مسلمانوں کی طرح حافظ ولی اللہ کے والدین بھی اس معصوم بچے کو گود میں اٹھائے وادیٔ کشمیر سے پنجاب میں وارد ہوئے اور سیالکوٹ کے قصبہ پسرور میں چند روز قیام کر کے لاہور آ گئے۔ لاہور پہنچے تو حافظ ولی اللہ کی عمر ابھی پانچ سال کی تھی۔ آتے ہی چیچک کی منحوس بیماری نے آ دبوچا اور اس طرح آپ بصارت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ آپ نے ابھی ہوش نہ سنبھالا تھا کہ والدین کا انتقال ہو گیا اور یہ معصوم بچہ اپنے غریب الدیار اور مفلوک الحال بھائیوں کے رحم و کرم پر آ پڑا۔ آپ کے چار دوسرے بھائی لاہور میں محنت و مشقت سے روزی کماتے۔ چونکہ باہمت تھے اس لیے جوان ہو کر تمام کشمیری خاندانوں میں مقبول ہو گئے۔ انگریز کے زمانے میں جب انتخابات ہوئے تو آپ کے بڑے بھائی شیخ صدیق کے اثر و رسوخ سے ہی کشمیریوں کے تمام ووٹ نواب علی رضا خاں قزلباش کو ملے۔ ولی اللہ نابینا تھے، کم سن تھے اور اپنے غریب خاندان پر ایک بوجھ تھے آپ کی بھاوج کا سلوک آپ سے اچھا نہیں تھا۔

ان دنوں لاہور میں قلعہ مہیاں سنگھ والے مشہور عالم دین مولوی غلام رسول صاحب تشریف لائے تو اس بچے کی کسمپرسی پر ترس کھا کر ساتھ لے گئے اور اپنی نگرانی میں قرآن پاک حفظ کرایا۔ مولوی غلام رسولؒ کے درس میں طلباء علمأ کا جمگھٹا رہتا۔ حافظ ولی اللہ کو حفظ کے بعد سماعت سے ہی ساری کتابوں پر عبور حاصل ہو گیا۔ وہ اس دینی درسگاہ میں ایک عرصہ تک رہے اور اس طرح ایک منفرد اور عالم دین بن کر اُبھرے۔ مولوی محمد حسین اہلحدیث (جو بعد میں مرزا غلام احمد قادیانی کے اوّلین موئیدین میں سے تھے) آپ کے ہم درس اور ہم مکتب تھے۔

قدرت نے حافظ ولی اللہ کو بے پناہ حافظہ عطا کیا تھا۔ جس کتاب کو ایک بار سُن لیتے وہ اُن کے ذہن پر نقش ہو جاتی تھی۔ کسی شخص کا ہاتھ ایک بار ہاتھ میں لیتے تو پندرہ بیس سال کے بعد اگر ملاقات ہوتی تو پہچان لیتے کہ یہ فلاں شخص کا ہاتھ ہے۔

۱۸۴۹ء میں پنجاب بھی انگریزی سلطنت میں شامل ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی نے ایک منصوبے کے تحت یورپ کے عیسائی پادریوں کو دعوتِ عام دی کہ وہ برصغیر میں پہنچ کر مشنری مراکز قائم کریں۔ حکومت کی سرپرستی میں یہ لوگ دوسرے علاقوں کے علاوہ پنجاب میں بھی پہنچے۔ ان پادریوں میں سے جن پادریوں نے لاہور کو اپنی آماجگاہ بنایا تھا، ان میں پادری فورمین (بانی ایف سی کالج لاہور)، پادری فونڈر اور پادری عماد الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف مسیحیت کے محاسن پیش کرتے بلکہ اسلام پر جا و بے جا اعتراضات کر کے عوام النّاس کو زک پہنچاتے تھے۔

اسی زمانہ میں حافظ ولی اللہ قدس سرہٗ گوجرانوالہ سے لاہور پہنچے اور شاہی مسجد کے نائب خطیب مقرر ہوئے۔ آپ کے حلقۂ احباب میں منشی محمد اسماعیل وکیل (جن کے لڑکے خان بہادر منشی سراج الدین احمد اور منشی معراج الدین احمد کشمیر میں محکمۂ بندوبست اراضی کے مہتمم تھے) منشی عبدالکریم مختار (م ۱۹۲۶ء)، مولوی الٰہی بخش وکیل (یہ بزرگ میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء مالواڈا کے والد تھے) اور مولوی فتح محمد ہوشیارپوری وغیرہ صفِ اوّل میں شمار کیے جاتے تھے۔

ہوشیارپور میں آپ کے ایک شاگرد مولوی فتح محمد ٹبی والا کے خلاف عیسائیوں نے ایک جھوٹا مقدمہ قائم کر دیا تھا جس سے مولوی فتح محمد بہت پریشان تھے۔ لاہور سے حافظ ولی اللہ خلیفہ رجب دین کے ساتھ ہوشیارپور پہنچے اور وہاں مولوی الٰہی بخش وکیل کی معرفت پادری فورمین کو کہلا بھیجا کہ میرے شاگرد کے خلاف مقدمات واپس لو ورنہ کھلے میدان مناظرے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ پادری فورمین ایک بار مجمع عام میں آپ سے شکست کھا کر بھاگ چکا تھا۔ اس کو آپ کی شہرت، زورِ بیان اور عوام پر اثر کا علم تھا۔ اس نے فوراً حکومت سے مل کر مقدمہ واپس لیا اور صلح کر لی۔

مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی کیرانوی جو خود بھی ایک بے مثال مناظرِ اسلام تھے۔ سیاسی وجوہ کی بنا پر برصغیر چھوڑ کر حرمین الشریفین میں قیام پذیر ہوئے۔ انہوں نے پنجاب میں حافظ ولی اللہ کی شہرت سنی تو بے حد مسرت کا اظہار کیا۔ مقامِ ابراہیمؑ پر کھڑے ہو کر ان کی کامیابیوں کے لیے دعا کی اور اپنی کتاب 'اظہار الحق' (عربی) آپ کو بطور ہدیہ بھیجی۔

حافظ ولی اللہ کے قیامِ لاہور میں علمائے دین آپ کا بڑا احترام کرتے۔ اپنی مجالس میں دعوت دیتے۔ ان ممتاز علماء کرام میں سے مولانا غلام قادر بھیروی، مولوی غلام محمد گھوی، مولوی محمد الدین، مولوی سعد الدین خطیب مسجد حویلی میاں خان، مولوی حسام الدین ستھان والے اور مولوی نور احمد خطیب مسجد انارکلی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ عیسائی موضوعات پر بیرونی حضرات بھی استفسارات کرتے تو آپ بذریعہ ڈاک جوابات بھیجتے۔

آپ فنِ مناظرہ کے علاوہ عربی زبان پر اس قدر حاوی تھے کہ عرب سیاح لاہور آتے تو آپ سے بلا تکلف عربی میں گفتگو کرتے۔ یہاں کے حالات پر تبصرہ کرتے اور پھر علمی مسائل پر بحث کرتے۔ مولوی فقیر محمد جہلمی مولف حدایق الحنفیہ آپ کے معاون تحریر ہوتے۔ مولوی فقیر محمد کو اعتراف ہے کہ جب وہ دہلی سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تو حافظ ولی اللہ کی ڈاک اور دیگر سوالات کے جوابات کی املا لینا آپ کے ذمہ تھی۔ حافظ صاحب مسئلہ سُن کر جواب لکھا دیتے اور ساتھ ساتھ کتابوں کے حوالے بھی لکھواتے جاتے۔ بعض اوقات مجھے شک گزرتا تو میں یہ کتابیں دیکھتا تو سطر بہ سطر صحیح عبارات لکھائی ہوتیں۔ مولوی فقیر محمد لکھتے ہیں کہ مجھے آپ کی صحبت میں رہ کر عیسائیت کے خلاف اتنا مواد مل گیا کہ میں ردِّ عیسائیت میں کئی ایک کتابیں لکھنے کے قابل ہو گیا۔

اگر ہم یہاں حافظ صاحب کے ان معرکوں کی تفصیلات درج کریں جو انھوں نے ردِّ عیسائیت میں سرانجام دیئے تھے تو مضمون بڑا طویل ہو جائے گا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے لاہور کا ایک واقعہ درج کیے دیتے ہیں۔ لاہور میں پادری فونڈر نے چیلنج کیا کہ میں مسلمانوں کے علماء سے مناظرہ کرنا چاہتا ہوں۔ سرائے سلطان میں عظیم اجتماع ہُوا۔ تین روز تک مناظرہ ہوتا رہا۔ حافظ ولی اللہ ان دنوں لاہور سے باہر تھے، واپس آئے تو آتے ہی کہنے لگے کہ مجھے مناظرے کے میدان میں لے چلو۔ آپ وہاں پہنچے تو مجمع میں ایک شور برپا ہو گیا۔ نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ آپ نے سارے علماء کرام سے اجازت لی اور پادری کے مقابلہ میں تنِ تنہا کھڑے ہوئے۔ آپ نے کہا کہ میں نابینا ہوں میں اپنے مدِ مقابل کو پاس جا کر دیکھنا چاہتا ہوں، چنانچہ آپ کو پادری فونڈر کے قریب لے جایا گیا۔ وہ ایک پُر رعب شخصیت کا مالک تھا۔ بھری ہوئی بھوری ڈاڑھی اور سر پر بڑا سا ہیٹ۔ حافظ صاحب نے اس کے چہرے کو ٹٹولا اور پھر مُنہ پر ایک ایسا زوردار طمانچہ

مارا کہ پادری کے دانتوں سے خون بہہ نکلا، بس پھر کیا تھا مجمع میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مناظرہ درہم برہم ہو گیا اور حافظ صاحب گرفتار کر لیے گئے۔

حکومت کو خدشہ تھا کہ یہ معاملہ کوئی تحریک نہ بن جائے۔ دوسرے روز ہی لاہور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو جو انگریز تھا، مقدمہ کی سماعت کے لیے مقرر کیا گیا۔ عدالت کے اردگرد بڑا ہجوم تھا۔ حافظ صاحب کو بیان دینے کے لیے بلایا گیا آپ نے انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے بتایا کہ استغاثہ کا مجھ پر یہ الزام کہ میں نے ارادۂ قتل سے تھپڑ مارا ہے بالکل غلط ہے۔ میں دراصل دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ پادری صاحب انجیلِ مقدس پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں، میں نے تھپڑ مارا۔ حالانکہ انجیل میں لکھا ہے کہ اگر تمہیں ایک تھپڑ مارا جائے تو دوسرا گال پیش کر دو۔ مگر پادری صاحب نے انجیل پر عمل کرنے کے بجائے مقدمہ کر دیا ہے۔ یہ بیان دیتے ہی حافظ صاحب نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے انجیل کے ۲۱ ایڈیشن کے حوالے صفحہ سطر سمیت سنا دیئے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ فلاں ایڈیشن فلاں لائبریری میں ہے، فلاں ایڈیشن فلاں پادری کے قبضہ میں ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پادری فونڈر کو جواب دینے کے لیے کہا تو اس نے اُٹھ کر اعتراف کیا کہ واقعی انجیل مقدس میں یُونہی لکھا ہے۔ میں مقدمہ واپس لیتا ہوں اور حافظ صاحب سے صُلح کرتا ہُوں۔

حافظ صاحب کے مناظرانہ معرکوں کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں یادگارِ زمانہ ہیں۔ ان کتابوں کو دنیائے اسلام میں بڑی شہرت ملی۔ یہ ردِّ نصارٰی میں بڑے زوردار دلائل کی حامل ہیں: مباحثہ دینی، صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیطان اور ابحاث ضروری وغیرہ کتابوں کے جو ایڈیشن راقم کے مطالعہ میں آئے ہیں انہیں مولوی فقیر محمد جہلمی مرحوم کے حواشی نے مدلل بنا دیا ہے۔ عیسائی سوالات اور اعتراضات پر آپ کے مبسُوط فیصلے یکجا نہیں ہو سکے۔ اس طرح ردِّ نصارٰی کا یہ ایک بے بہا ذخیرہ امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔ صاحبِ حدایق حنفیہ نے ایک رسالہ میں حافظ ولی اللہؒ اور پادری عماد الدین کے ایک مشہور مناظرہ کی روئداد لکھی تھی۔ یہ مناظرہ امرتسر میں پادری عماد الدین کے ساتھ ہوا تھا، غالباً یہ رسالہ "تصدیق المسیحؑ" کے نام سے شائع ہُوا تھا۔

آپ نے لاہور ہی میں کشمیری خاندان میں شادی کی۔ آپ کا بڑا لڑکا عبدالعزیز بعمر ۹ سال فوت ہُوا۔ چھوٹے لڑکے کا نام اسحاق تھا (اسی نام پر آپ کی کنیت ابواسحاق تھی) مگر یہ بچہ کمسنی میں فوت ہوگیا۔ آپ کا ایک نواسہ بشیر عالم مدتوں آپ کے مزار کی نگرانی کرتا رہا آجکل غالباً وسن پورہ لاہور میں سکونت پذیر ہے۔

آپ ایک عرصہ تک شاہی مسجد میں رہے، پھر وزیر خاں کی مسجد میں خطابت کی۔ ڈپٹی برکت علی مرحوم آپ کے بڑے مداح تھے۔ آپ ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ کو واصلِ بحق ہوئے اور آپ کو احاطہ شاہ ابوالمعالی میں دفن کر دیا گیا۔ یہ سارا قبرستان اب مکانات کی نذر ہو گیا ہے آپ کا مزار فلیمنگ روڈ کے کنارے ایک مختصر سے احاطے میں ہے جہاں بعض صاحبِ دل حضرات سال بعد عرس کروا دیتے ہیں۔ لاہور کی دنیا کی بے خبری کے قربان جائیں کہ ہزاروں انسان فلیمنگ روڈ سے گزرتے ہیں اور کسی کو علم نہیں کہ سڑک سے دس گز کے فاصلے پر ایک مناظرِ اسلام، فاضل اجل، حافظِ قرآن، مصنف و مولف اور ممتاز عالمِ دین آسودۂ خاک ہے۔ ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تُو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

مولانا فیض الحسن سہارنپوری[1]

"خاکِ ہند نے شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو!"

علامہ سید سلیمان ندوی

مولانا فیض الحسن سہارنپوری پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے سب سے پہلے صدر شعبۂ عربی تھے۔ پاک و بھارت نے ایسا امام الادب آج تک پیدا نہیں کیا۔

اورینٹل کالج لاہور

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے ایک سال قبل پنجاب کا محکمہ تعلیم قائم ہو چکا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور قائم ہوا جس کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائیٹنر تھے۔ وہ مشرقی علوم فنون کے زبردست حامی تھے۔ ان کی مساعی تھی کہ پنجاب کے دار السلطنت لاہور میں اورینٹل یونیورسٹی قائم کی جائے۔ ۱۸۷۰ء میں انہیں انجمن پنجاب کا سرپرست چُنا گیا۔ یہ انجمن اس زمانہ کی واحد علمی اور ثقافتی مجلس تھی۔ اس مجلس کو ڈاکٹر لائیٹنر کی تحریک اور کوشش سے ۱۸۶۹ء میں یونیورسٹی کالج قائم کرنے کی اجازت ملی جس میں مشرقی علوم کا ایک شعبہ بھی جاری کیا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ مشرقی علوم کا ایک الگ سکول قائم کیا جائے۔ یہی اورینٹل سکول بعد میں اورینٹل کالج بنا۔ ۱۸۸۲ء میں جب پنجاب میں باقاعدہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کالج کا الحاق یونیورسٹی سے کیا گیا۔

اورینٹل کالج کے بنیادی مقاصد میں مشرقی علوم کی ترقی اور فروغ۔ مشرقی زبانوں کی تدریس

---

[1] مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے حالاتِ زندگی کی ترتیب و تالیف کے لیے محترم بزرگ مولانا محمد عبد اللہ قریشی مدیر "ادبی دنیا" لاہور کی علمی کاوشیں میری ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ یہ انہی کی تحقیق کا ثمرہ ہے۔

اور دوسری ملکی زبانوں کی حوصلہ افزائی شامل تھی۔ یہی مقاصد آج تک کالج کا لائحہ عمل ہیں البتہ اس کے دائرہ عمل میں وقتاً فوقتاً توسیع و ترقی ہوتی رہتی ہے۔

ماضی میں اس کالج سے جو شخصیتیں متعلق رہی ہیں ان میں سرارل شٹائن، پروفیسر میکڈانلڈ، ڈاکٹر وولنر، مولانا فیض الحسن، علامہ اقبال، ڈاکٹر لچھمن سروپ، شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی، سید اولاد حسین شاداں بلگرامی، مولانا نور الحق، مولانا غلام قادر بھیروی، مولانا عبدالعزیز میمن، پروفیسر محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، مولانا رسول خاں اور ڈاکٹر محمد اقبال کے نام سر فہرست ہیں۔

نام ونسب مولانا فیض الحسن محلہ شاہ ولایت سہارنپور (یو۔ پی بھارت) کے رہنے والے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد خلیفہ علی بخش، دادا خدا بخش اور پر دادا قلندر بخش تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ کا اسم گرامی فیض النسا تھا علم دوست ہونے کی وجہ سے اس خاندان کے افراد کو لوگ "خلیفہ" کہتے تھے۔ مولانا فیض الحسن نے اپنی بعض کتابوں[۱] میں اپنے نام کے ساتھ "قرشی، حنفی، چشتی" کا اضافہ بھی کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نسباً قریشی[۲] تھے۔ چشتی سلسلہ میں منسلک تھے اور عقیدہ کے

---

[۱] ریاض الفیض ص ۱، نسیم فیض مطبوعہ مطبع فیض عام لاہور (۱۳۲۱ھ) صفحہ ۲۴

[۲] قریشی یا قریش کو قرشی بھی کہتے ہیں اور یہ عرب کے ایک قبیلے کا نام ہے۔ جس شخص کو سب سے پہلے قریش کے لقب سے ملقب کیا گیا وہ نضر بن کنانہ تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تیرہ پشت اوپر تھا۔ بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا اور انہی کی اولاد قریشی ہے۔ حافظ عراقی سیرت منظوم میں لکھتے ہیں ؎

اما قریش فالاصح فہر جماعہا والاکثرون النضر

فہر کی ساتویں پشت میں قصی بن کلاب کو بھی قریش کے لقب سے یاد کرتے ہیں چنانچہ ملا ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں لکھا ہے کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسا لیا تھا اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں کیونکہ قریش کے معنے جمع کرنے کے ہیں۔ پھر یہ ایک مچھلی کا نام بھی ہے جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے۔ چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے اس لیے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی گئی۔ (سیرۃ النبی شبلی جلد اول طبع دوم صفحہ ۱۵۳-۱۵۴)

لحاظ اہل سنت والجماعت تھے۔ چنانچہ جب مضافات سہارنپور کے قصبہ لکھنوتی میں شیعہ سُنّی فساد کے بعد مقدمہ جان جنکین کی عدالت میں پیش ہُوا تو مولینا فیض الحسن نے ۱۱ اگست ۱۸۷۲ء کو سُنّیوں کی طرف سے گواہی دی۔ آپ کے بیان سے عدالت متاثر ہُوئی۔ اِس مقدمہ کی کارروائی اسی زمانہ میں کتابی طور پر شائع ہو گئی تھی جس کا نام "مقدمہ شیعہ وسُنّی تھا اس وقت مولانا کی عمر ۵۶ برس تھی۔

مولانا فیض الحسن کے والد خلیفہ علی بخش فہم وذکاء کی دولت سے مالامال تھے۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ آپ نے زود نویسی میں حیرت انگیز مشق بہم پہنچائی تھی۔ قرآن مجید کے بھی حافظ تھے۔ عربی فارسی کے زبردست فاضل تھے۔ بخاری شریف کو ایک ماہ میں مکمل لکھ لیا کرتے تھے کہا کرتے تھے: تین سطریں پڑھ لیتا ہُوں اور لکھ لیتا ہُوں۔ پھر جو لفظ قلم سے نکلتا ہے مجھے یقین ہوتا ہے کہ اس سے اگلا لفظ یہ ہوگا۔[1] یہ بات ان کی عربی دانی پر کتنی قوی دلیل ہے۔

پیدائش اور بچپن مولانا فیض الحسن ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے۔[2] ابتدائے ہوش سے ہونہار تھے۔ بچپن میں سر ہلانے کی عادت سی پڑ گئی تھی ضعیف الاعتقاد لوگ بُھوت پریت کا اثر سمجھتے تھے۔ شرارتی ہم عمر لڑکے آپ کو "فیضو بھوت" کہا کرتے تھے۔ شوخی کا یہ عالم کہ مکتب سے آئے پیر کو جھٹکا دیا اور ایک پوائی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اب دوسرا پیر جھٹکا تو یہ پوائی پہلی کے پاس جا پہنچی۔ تختی ادھر پھینکی بستہ ادھر ٹپکا اور یہ جا وہ جا۔ تھوڑی دیر میں ہر طرف سے ہاہاکار اور چیخ وپکار کی آوازیں آنے لگتیں اور تمام محلے والوں کی جان عذاب میں مبتلا ہو جاتی۔

لڑکپن کھیل کُود اور کنکوے بازی میں گزرا۔ آغازِ شباب میں پہلوانی کا شوق ہو گیا۔ اپنی برادری کے ایک پہلوان استاد معز الدین کے اکھاڑے میں جا کر ورزش کرنے لگے

---

[1] یہ روایت مولانا نصر العزیز قریشی نبیرہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی ہے۔

[2] مضمون بعنوان مولانا فیض الحسن از سید عابد علی عابد ایم۔ اے مندرجہ ذیل رسالہ شباب اردو بابت ماہ مئی ۱۹۲۲ء ص ۶۸۔

جن کے صاحب زادے نیاز احمد صاحب تا دمِ تحریر زندہ ہیں۔ تیرہ چودہ برس کی عمر تک اس دھندے کے سوا دُوسرا کوئی ہنر نہ سیکھا مگر فطرت کو تو ان سے کچھ اور ہی کام لینا منظور تھا۔ آخر اس کے لیے اسباب پیدا ہو گئے اور طبیعت پہلوانی سے خود بخود اُکتا گئی۔ اس دوران میں اُن کے والد ان کو چالیس جمعرات حضرت قطب تبریزؒ کے مزار پر لیجا کر حصولِ علم کے لیے دُعا بھی کرتے رہے۔

تحصیلِ علم

جب غفلت کے پردے آنکھوں سے ہٹ گئے تو آپ تحصیلِ علم کی طرف متوجہ ہُوئے۔ دماغ تر و تازہ اور ذہن رسا تھا۔ باپ نے آپ کا شوق دیکھ کر فارسی گویا گھول کر پلادی اور عربی کی مروجہ ابتدائی کتابیں بھی گھر ہی میں پڑھا دیں[1]۔ اس کے بعد حالت یہ تھی کہ علم کی پیاس کسی طرح بجھتی ہی نہ تھی۔ چنانچہ آپ کے اس ذوق نے آپ کو دُوسرے خرمنوں کی خوشہ چینی پر آمادہ کیا اور انیس بیس برس کی عمر میں آپ فیض الحسن منطقی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

اساتذہ

اسی زمانے میں محلہ شاہ ولایت کے ایک معزز گھرانے میں آپ کی شادی ہُوئی مگر عروسِ ادب کا خیال بہرعنوان غالب رہا۔ گھر بار چھوڑ کر دہلی گئے۔ کچھ عرصہ مفتی صدرالدین آزردہ[2] صدرالصدور دہلی سے اکتساب کیا۔ قدرے محدث شاہ احمد سعید

[1] رسالہ شباب اردو بابت ماہ مئی ۱۹۲۲ء۔ صفحہ ۶

[2] مفتی صدرالدین آزردہ ۱۲۰۴ھ ربیع الاول ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء کو بعہد شاہ عالم ثانی دہلی میں پیدا ہُوئے۔ منقولات مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا شاہ عبدالقادر اور مولانا محمد اسحاق منطقی رام پوری سے اور معقولات مولانا فضل امام خیرآبادی سے حاصل کرنے کے بعد دہلی کے صدرالصدور مقرر ہُوئے۔ عدالتی کاروبار سے فارغ ہو کر مدرسہ دارالبقاء متصل جامع مسجد دہلی میں طالب علموں کو درس دیتے اور یہی آپ کا دل پسند مشغلہ تھا اکثر غریب طالب علموں کے طعام اور لباس کا خرچ بھی آپ نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ سرسید احمد خاں بانیٔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ، نواب صدیق حسن خاں قنوجی جو نواب شاہجہان بیگم والیہ بھوپال سے نکاح کرنے کے بعد رئیس بھوپال کہلائے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ ریاست رام پور بھی آپ کے حلقۂ درس میں رہ چکے ہیں۔ آپ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ان سُنّی علماء میں منفرد حیثیت رکھتے تھے جو انگریز کے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔

۱۱ دسمبر ۱۸۶۲ء کو آپ پر فالج گرا اور کچھ عرصہ اسی حالت میں رہ کر ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء کو

(باقی اگلے صفحہ پر)

مجددی دہلوی سے پڑھی [۱] پھر آخون صاحب ولایتی سے حدیث کی سند فراغ حاصل کی اور آخر میں مولانا فضل حق خیر آبادی [۲] سے معقولات اور ادب کی کتابیں پڑھیں اور فلسفہ کی تکمیل کی۔ اب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) پنجشنبہ کے روز یہ چراغ علم و فضل ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ شمس الشعراء مولوی ظہور علی ظہور نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح کہی ہے ؎

چراغش ہست تاریخ ولادت
کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود

آپ کی قبر شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی درگاہ میں ہے۔ تصنیفات میں منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشدد الرحال اور دار المنصور فی حکم امراۃ المفقود اور جواب استفتاء آپ کی یادگار ہیں۔ اُردو شعراء کا ایک تذکرہ بھی فارسی میں لکھا تھا جو اب نایاب ہے۔

[۱] شمع انجمن از نواب صدیق حسن خاں مطبوعہ ۱۲۹۳ھ صفحہ ۳۷۹۔

[۲] مولانا فضل حق خیر آبادی خیر آباد کے مشہور عالم مولانا فضل امام کے جانشین فرزند اور شاگرد تھے۔ ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے۔ معقولات میں نئی رُوح پھونکی اور منطق کو ملک میں از سرِ نو رواج دیا۔ افق المبین کی کسی قدر شرح اور قاضی مبارک کا حاشیہ لکھا۔ فلسفہ میں ہدیہ سعدیہ اور شرح ہدایۃ الحکمت وغیرہ کتابیں عربی طلبہ کی تعلیم کے لیے تصنیف کیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ عربی قصائد بھی ان کی یادگار ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ان پر بغاوت کا الزام لگایا گیا جس کی پاداش میں جلاوطن کر کے جزیرہ انڈیمان بھیج دیے گئے وہیں ۱۲ صفر المظفر ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو انتقال فرمایا نواب ضیاء الدین خاں نے جو تاریخ کہی ہے اس میں ایک سال کا فرق ہے اور وہ غلط ہے ؎

فضل حق مُرد وائے سالِ وفات

محبوسی کی حالت میں آپ نے ایک رسالہ غدریہ لکھا جس میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے المناک حادثات، حکومت مسلط کے جرائم اور اپنی تباہ و بربادی کا حال اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا۔ جب مفتی عنایت احمد کاکوروی (استاد مفتی لطف اللہ علی گڑھی) ایک انگریز افسر کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کر کے ۱۲۷۷ھ میں رہائی پاکر عازم ہندوستان ہوئے تو علامہ فضل حق خیر آبادی نے یہ رسالہ (باقی اگلے صفحہ پر)

آپ فیض الحسن ادیب کے نام سے مشہور ہوئے۔ متذکرۃ الصدر چاروں استاد اپنے وقت کے جلیل القدر عالم تھے جن کے درس کا شہرہ دُور دور تک پھیلا ہُوا تھا۔ مشقِ سخن مولوی امام بخش صہبائی سے کی۔ شیفتہ، مومن، ذوق اور غالب سے صحبت رہی۔ طب حکیم امام الدین شاہی طبیب سے سیکھی۔

مولانا کا تعلیمی سفر

دہلی سے نکل کر مولانا فیض الحسن رام پور اور لکھنؤ گئے اور وہاں کے اساتذہ میں کچھ وقت گزار کر فقہ، اصول، معانی اور منطق کی تعلیم حاصل کی مگر تسلی و تشفی نہ ہوئی۔ واپس دہلی آکر باقی کسر پُوری کی اور وہیں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس وقت اُن کی عمر اکیس بائیس برس کے قریب تھی۔ آٹھ نو برس کی لگاتار محنت کے بعد ان کی شہرت یہاں تک پہنچی تھی کہ ۱۸۴۶ء میں جب سر سید احمد خاں صدر امین کی حیثیت سے فتحپور سیکری سے بدل کر دہلی آئے تو انہوں نے مقاماتِ حریری کے چند مقالے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے مولانا سے پڑھے، اس وقت مولانا کی عمر تیس برس کی تھی۔

ادب میں امامت

اس طرح مختلف چشمہ ہائے فیض سے شادکام ہونے کے بعد مولانا فیض الحسن نے جملہ علوم ادب، فقہ، اصولِ فقہ، حدیث اور طب میں کامل مہارت حاصل کرلی۔ انہوں نے ہندوستان کے عربی ادب میں عظیم انقلاب پیدا کیا۔ ان سے بیشتر نکتہ آفرینی کو اہمیت دی جاتی اور متاخرین شعرائے عرب کو جن کا سرخیل متنبی ہے شعرائے جاہلیت پر ترجیح دی جاتی تھی مگر مولانا فیض الحسن نے دُنیا ہی بدل دی اور متاخرین سے ہٹا کر طلبہ کو متقدمین شعرائے ادب کی طرف مائل کیا جن کی سادہ اور بے تکلف شاعری تاثیر میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مختلف کاغذ کے پرزوں اور کپڑوں پر کوئلہ وغیرہ سے لکھ کر اپنے خلف الرشید مولانا عبد الحق خیر آبادی کے پاس بھیج دیا۔ اسی رسالہ میں قصائد فتنۃ الہندبھی تھے۔ مولانا عبد الحق نے بڑی محنت و کاوش سے اسے مرتب کیا۔ مولوی محمد مجید حسن مالک اخبار مدینہ بجنور نے مولانا عبد الشاہد شروانی سے اس کا اردو ترجمہ کرا کے ۱۹۴۰ء میں الثورۃ الہندیہ دباغی ہندوستان، کے نام سے اسے شائع کیا۔ امتناع نظیر سید البشرؐ پر رسالہ لکھا جس میں اپنے عقیدہ کی وضاحت کی۔ اسی عقیدہ کی وجہ سے دیوبندی مکتبِ فکر اپنی کتابوں میں آپ کا تذکرہ کرنے ہچکچاتا ہے

ڈوبی ہوئی ہے۔ حماسہ کا درس پہلے پہل آپ ہی نے شروع کیا اور حماسہ کی شرح فیضی کے نام سے لکھی۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی" مولانا اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔"[1]

سلسلۂ ملازمت

۱۸۵۷ء کے پُر آشوب زمانے میں مولانا فیض الحسن دہلی سے بچتے بچاتے سہارنپور پہنچے اور آتی دفعہ اپنی کتابوں کا ذخیرہ اپنے استاد مفتی صدر الدین آزردہ کے سپرد کر آئے جو اُن کے اپنے قیمتی کتب خانے کے ساتھ تباہ ہو گیا۔

مولانا کی طاقت اور ہمت کے بھروسے پر کچھ لوگ اور بھی آپ کے ہمراہ ہو گئے اور یہ بھروسا بجا بھی تھا کیونکہ مولانا پہلوانی اور بنوٹ وغیرہ کے فن میں ماہر تھے اور ان کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ لوہے کی زنجیر کو پکڑ کر توڑ موڑ دیتے تھے۔ راستے میں ، وہاں جو نشوب پر تکرار کی صورت بھی پیش آئی مولانا کی تلوار کا تسمہ کھل چکا تھا کہ گاؤں کے چودھری نے بیچ بچاؤ کر دیا اور صلح و آشتی سے کام بن گیا۔

سہارنپور پہنچ کر اسی لگی آگ میں اپنی زوجۂ ثانی کو لینے انبیٹھ گئے جو وہاں سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، وہاں سے بیوی کو لے کر آئے۔ بیوی بہلی میں تھیں اور خود تلوار ہاتھ میں لیے آگے آگے چلے آرہے تھے۔ ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا مگر کسی کو ان سے آنکھ ملانے کی جُرأت نہ ہوئی۔

قیامِ سہارنپور میں کچھ عرصہ طب کی آمدنی سے بسر اوقات کی مگر کسی نے آپ کی شایانِ شان قدر نہ کی ایک نودولتیے رئیس نے ستّر روپیہ ماہوار پر بحیثیت طبیب خاص ملازم رکھ لیا۔ ایک روز نواب صاحب کو زکام ہوا۔ مولانا نے گل بنفشہ، تخم خطمی اور سپستان وغیرہ دوائیں تجویز کیں۔ خوشامدی مصاحبوں کی بن آئی انہوں نے نواب صاحب کے کان بھرے کہ حکیم مزاج شناس نہیں۔ نواب صاحب نے نسخہ دیکھا تو کہا: حکیم صاحب! اس میں مروارید ناسفتہ تو ہے ہی نہیں اور اقِ طلاء اور مشک و عنبر کے بغیر فائدہ کیا خاک ہوگا؛ مولانا نے کہا کہ انہیں تنخواہ دے کر

[1] حیاتِ شبلی از سید سلیمان ندوی صفحہ ۸۰

رخصت کر دو یہ ہماری سرکار میں رہنے کے قابل نہیں۔

مولانا دل برداشتہ ہو کر چلے آئے اور چند روز علی گڑھ میں عربی کی بعض کتابوں کا ترجمہ اُردو میں کرنے پر مامور ہوئے مگر ان کا مرغِ ہمت کسی بلند آشیانے کا طالب تھا۔ آخر ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو لاہور اورینٹل کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔[1]

مولانا کے لاہور تشریف لانے کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے جو ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی کے الفاظ میں حسبِ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم ڈائرکٹر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور درج ذیل ہے:

"جب مسٹر لائٹنر نے مولانا فیض الحسن صاحب کو کالج میں تقرری کے لیے لکھا تو مولوی صاحب نے مندرجہ ذیل موانع کی بنا پر تشریف لانے سے انکار کر دیا۔

۱۔ آپ کی تعلیم گاہوں میں اوقاتِ تدریس کی پابندی ہے اور ہمارا دستور یہ ہے کہ جس وقت چاہا پڑھا دیا اور جب چاہا التوا کر دیا۔

۲۔ آپ کے ہاں اوقاتِ تدریس کی تعیین ہے اور ہمارے مدرسوں میں وقت کی تقلیل و تکثیر دونوں یکساں۔ جب تک گوارا ہوا پڑھاتے رہے اور اگر طبیعت مائل نہیں تو کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا۔

۳۔ آپ کے ہاں میز اور کرسی کے ساتھ لگ کر پڑھانے کا دستور ہے مگر ہم تدریس کے وقت پلنگ پر بیٹھ کر پڑھاتے ہیں۔ طبیعت استراحت کی طرف مائل ہوئی تو لیٹ کر پڑھانے لگے۔ اُونگھ آ گئی تو سو جانے میں بھی مضائقہ نہیں مگر شاگردوں کے لیے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے کا حکم ہوتا ہے اور جب آنکھ کھل گئی پھر پڑھانا شروع کر دیا۔

۴۔ آپ کے مدرسوں میں تحدیدِ اوقات پر گھنٹی کی پابندی بھی ہم گوارا نہیں کر سکتے (وغیرہ)

---

[1] دیکھو پروسیڈنگ کمیٹی یونیورسٹی منعقدہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۰ء جلد ۶ نمبر ۱ صفحہ ۲

[2] از مضمون بعنوان "گلدستۂ سخن" مندرجہ اورینٹل کالج میگزین لاہور بابت نومبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴۔

مولانا فیض الحسن صاحب نے اسی قسم کے متعدد عذرات لکھنے کے بعد لاہور آنے سے انکار کر دیا لیکن لائٹنر (رجسٹرار تعلیم گاہ) نے مولوی صاحب کے تمام شرائط من وعن تسلیم کر لیے اور ممدوح لاہور تشریف لے آئے۔

درس گاہ کے ایک کمرے میں پلنگ لگا دیا۔ مولانا اپنی عادت کے مطابق پڑھاتے۔ سونے میں خرّاٹے لیتے اور شاگرد اپنی اپنی جگہ پر کتابیں ہاتھ میں لیے بیٹھے رہتے آنکھ کھل جاتی تو جہاں سے سلسلہ منقطع ہوا تھا وہیں سے سر رشتہ میں گرہ لگا کر علم کے موتی پرونا شروع فرما دیتے۔"

اورینٹل کالج لاہور میں مولانا فیض الحسن کی علمیت کے حقیقی جوہر کھلے اور یہ چشمہ فیض دریائے فیض بن گیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:[۱]

تھی فیض کو جو پھولنے پھلنے کی آرزو
یاں تک گل اس نے کھلائے کہ پھولوں سے پھل گیا

انہی دنوں اورینٹل کالج میں قاضی ظفر الدین، حافظ عبد العزیز اور مولوی غلام قادر بھیروی شعبۂ عربی میں آپ کے نائبین تھے۔ مولوی عبد الحکیم کلانوری و محمد الدین اور شاہ چراغ فارسی کے اور اُردو میں مولوی غلام مصطفیٰ اور پشتو میں میر عبد اللہ استاد تھے۔[۲]

رسالہ شفاء الصدور کی ادارت

جب اورینٹل کالج لاہور سے عربی زبان کا رسالہ شفاء الصدور نکلنے لگا تو اس کی ادارت کے فرائض بھی مولانا فیض الحسن ہی کے سپرد ہوئے۔ اس ذمّہ داری کے لیے مولانا کے مقررہ مشاہرے میں پندرہ روپے ماہوار کا اضافہ کیا گیا۔[۳] دُوسرے سال پانچ روپے اور بڑھا دیے گئے۔ اخبار شفاء الصدور کے ذریعے سے مولانا نے کالج کے ماحول کو علمی رنگ میں رنگ کر اپنے شاگردوں میں عربی تحریر و انشا کا ذوق پیدا کر دیا اور آپ سے فیض حاصل کرنے والے علم و فضل کے

---

[۱] رسالہ گلدستۂ سخن بابت مارچ ۱۸۸۰ء

[۲] تاریخ اورینٹل کالج لاہور ص ۱۳

[۳] رسالہ شباب اُردو بابت ماہ مئی ۱۹۲۲ء ص ۶۸

آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

وطن اسی کا نہ یہ وقت ہے نہ ایمن کا
مگر یہ وقت کوئی وقت ہے مرے من کا

یہ وقت وہ ہے کہ اب من چلے اُبھر کے چلیں
یہ وقت وہ ہے کہ بد خواہ کا ڈھلے منکا

بناوٹ اس میں نہیں ہے کہ ان دنوں لاہور
بُرے بھلے کا ٹھکانا ہے دوست دشمن کا

مخالف ایسے موافق ہوئے یہاں باہم
کہ آج برق بھلا چاہتی ہے خرمن کا

وہ لوگ یاں نظر آتے ہیں آج کل کہ کوئی
نہ ان کے میل کا ساتھی نہ ان کے تن من کا

کہیں کہیں سے مشقت اٹھا کے آئے ہیں
کوئی یمن کا مسافر ہے کوئی ارمن کا

عجب نہیں کہ یہاں تربیت کی خوبی سے
بہار آنب کی لائے درخت جامن کا

مرے کلام کو وہ شوق سے سُنے جس نے
سُنا ہو باغ و بہار آج میرا من کا[۱]

مولانا آزاد اور مولانا فیض الحسن

منشی محفوظ علی صاحب بدایونی ناقل ہیں کہ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا فیض الحسن جن دنوں اورینٹل کالج لاہور میں برسرِ خدمت تھے، دونوں میں اعتقادی اختلاف پر کچھ شکر رنجی تھی۔ جب مولانا فیض الحسن مولانا آزاد کے کمرہ کی طرف سے گزرتے تو اُدھر مُنہ کر کے کھنکار کر تھوک دیتے۔ جب دو ایک مرتبہ یہ حرکت ہُوئی تو آزاد سمجھ گئے کہ یہ اتفاقی نہیں بلکہ ارادی ہے تو ایک مرتبہ جب مولوی فیض الحسن اُدھر سے گزرنے لگے آزاد اپنے کمرہ کے دروازہ پر آکر مُنہ بنا کر کہنے لگے "ارے میں تو تھوکتا بھی نہیں"۔[۲]

---

[۱] ماخوذ از رسالہ گلدستۂ سخن بابت مارچ ۱۸۸۰ء۔ یہ رسالہ ہر سال انجمن پنجاب کی طرف سے ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹز پرنسپل اورینٹل کالج، گورنمنٹ کالج و رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں اردو، فارسی، عربی، ترکی، پشتو اور گورمکھی کا وہ تمام کلام درج ہوتا تھا جو انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پڑھا جاتا تھا۔

[۲] فوادر مؤلفہ مرزا محمد عسکری بی۔اے لکھنوی صفحہ ۱۱۲۔ مطبوعہ ادبی پریس لکھنؤ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

علمی شہرت

لاہور میں مولانا فیض الحسن پندرہ سولہ برس تک علوم مشرقی کے پروفیسر رہے اور صدہا شاگردوں نے آپ سے فیض پایا۔ صاحب سیر المصنفین کے الفاظ میں "مولوی فیض الحسن صاحب اس زمانہ کے اصمعی اور ابو تمام سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے تمام دورۂ اسلامی میں قاضی عبدالمقتدر کے سوا یہی ایک فرد ہے جو عربی شاعری کا صحیح مذاق رکھتا تھا۔"[1]

اورینٹل کالج سے مولانا کی علمی فتوحات اور درس و تدریس کی شہرت ہندوستان کے تمام علمی حلقوں میں پہنچی۔ یہاں تک کہ علم کے شائق دُور دراز گوشوں سے کھنچ کر یہاں آنے لگے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم[2] نے حماسہ آپ سے یہیں لاہور میں آکر پڑھا۔ ممدوح ۱۲۹۲ ہجری (۱۸۷۵ء) میں چھ مہینے مولانا کی صحبت میں رہے۔ اس سلسلے میں طریق درس و افادہ کی داستان بھی سننے کے قابل ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے بزرگوں میں علمی شغف کس حد تک تھا۔ اس نئی روشنی کے زمانے میں جب کہ کالج عام ہو چکے ہیں ہمارے آرام طلب طالب علم اور عیش پسند استاد اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ علامہ سید سلیمان ندوی حیاتِ شبلی میں لکھتے ہیں:

"مولانا فیض الحسن مرحوم کالج میں ملازم تھے اس لیے زیادہ وقت وہیں صرف ہو جاتا۔ بقیہ وقت بھی خالی نہ تھا کیونکہ متعدد ایسے اشخاص اس وقت استفادہ کر رہے تھے جن کا کالج سے کوئی تعلق نہ تھا اور ہر ایک کے اوقات مقرر تھے اس ماحول میں اگر کوئی دُوسرا اُستاد ہوتا تو مولانا شبلی جیسے فارغ التحصیل

---

[1] سیر المصنفین از محمد یحییٰ تنہا جلد دوم صفحہ ۴۰۵

[2] مولانا شبلی ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں پیدا ہُوئے اور ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء) میں انتقال فرما گئے یعنی ہنگامۂ غدر کے آغاز میں پیدا ہُوئے اور جنگِ عظیم اوّل کے زمانے میں جانِ شیریں جان آفریں کے حوالے کی۔ آپ کے علمی کارناموں سے پڑھا لکھا طبقہ بخوبی واقف ہے۔

[3] سیر المصنفین از محمد یحییٰ تنہا جلد دوم ص ۴۰۵

طالب علم کو درس دینے سے یقیناً انکار کر دیتا اور مولانا کے بجائے کوئی دوسرا طالب علم اسی استعداد کا ہوتا جن کو انہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تو ہر گز غریب الوطنی کی زحمت برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا مگر ایک طرف تو مولانا شبلی کا عزم راسخ بے نیلِ مرام واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، دوسری جانب مولانا فیض الحسن کا ذوقِ افادہ ایسے مشتاق و مستعد طالب علم کو محروم دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا۔ آخر یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اسی میں مولانا ادبیات کا درس دیا کریں یعنی آنے جانے میں معلم یا متعلم کا جو قدم بھی اُٹھے وہ افادہ واستفادۂ علم سے خالی نہ ہو سے

ہیچ گر ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

اسی تعلیم کے زمانے میں تعطیل ہوئی اور مولانا فیض الحسن دو ماہ کے لیے سہارنپور اپنے وطن تشریف لے گئے تو اس خیال سے کہ ناغہ نہ ہو شاگرد نے بھی ساتھ ہی سفر کا ارادہ کیا" [۲]

مولانا فیض الحسن تعطیلات میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے۔ سہارنپور میں اکثر تفسیر کا درس دیا کرتے۔ یہ درس شہر کی جامع مسجد کی جنوبی سہ دری میں ہوتے تھے۔

---

[۱] لاہور کے ایک بزرگ حکیم روح اللہ صاحب سے جو مولانا فیض الحسن کے شاگرد اور جانشین مفتی عبداللہ ٹونکی کے جاننے والوں میں ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ مولینا فیض الحسن بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں رہا کرتے تھے۔ مولانا کی مثنوی صبحِ عید ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے جس پر ملنے کا پتا یوں لکھا ہے: "بازار حکیماں حویلی فقیر چراغ الدین مرحوم جو متصل مکان فقیر قمر الدین رئیس لاہور واقع ہے۔"

[۲] حیاتِ شبلی از سید سلیمان ندوی صفحہ ۸۲۔ (کالج کی طرف سے مولانا شبلی کو کلاس میں بیٹھنے کی اجازت بھی مل گئی تھی)

اب یہ پرانی جامع مسجد کہلاتی ہے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا عبدالعلی مدرس مدرسہ حسین بخش دہلی اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی یہیں شریکِ درس ہوتے تھے۔ مولوی خلیل احمد انبیٹھوی تو آپ کے جوتے سیدھے کرنے میں فخر محسوس کیا کرتے تھے مگر مولوی رشید احمد گنگوہی پر ایک تنقیدی مضمون لکھنے کی وجہ سے مولوی خلیل احمد ناراض ہو گئے۔[۱]

مولانا فیض الحسن کا سب سے بڑا فیض قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی تھی وہ اسی اصول سے قرآن پاک کا بامحاورہ اُردو ترجمہ اپنے خاص طالب علموں کو پڑھاتے اور فصاحت و بلاغت کے نکتے بتاتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ندوہ کے ایک جلسہ کی تقریر میں جو چھپی ہوئی ہے اس طرف اشارے کیے ہیں۔[۲]

غرض مولانا فیض الحسن کی یہ مختصر سی صحبت مولانا شبلی کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ شعرائے جاہلیت کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور شستہ و رفتہ زبان دل میں اُتر گئی یہاں تک کہ حماسہ گویا حفظ ہو گیا اور سادہ عربی نگاری کا صحیح مذاق حدِ کمال کو پہنچ گیا۔

جمہرۃ العرب شعرائے جاہلیت کے قصائد کی دوسری کتاب تھی جو مولانا فیض الحسن نے مولانا شبلی کو پڑھنے کے لیے دی۔ انہوں نے خود پڑھی اور اپنے استاد مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی[۳] کو بھی دکھائی۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مولانا فیض الحسن کے پوتے مولوی نصر العزیز قریشی کے پاس اب بھی موجود ہے جس پر مولانا شبلی مرحوم کے ہاتھ کی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

---

[۱] تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل صفحہ ۹۲۔ از مولانا غلام دستگیر قصوری

[۲] حیاتِ شبلی از سید سلیمان ندوی صفحہ ۸۲

[۳] مولانا محمد فاروق عباسی بن قاضی علی اکبر بن قاضی عطا رسول چڑیا کوٹی اس زمانے کے مشاہیر علماء میں تھے۔ عربی و فارسی نظم و نثر کے بعض رسائل مثلاً منظومہ تحریہ، فارسی خالق باری، کشف الاقناع عن وجوہ الامتناع اور تعلیقات ثلثہ کی بحث پر ایک رسالہ ان کی یادگار رہیں۔ دو اردو مسدس چھپے ہیں: ایک مسدس فاروقی، دوسرا مسدس عوالی جو مسدس حالی کے جواب میں ہے۔ رمضان ۱۳۲۷ھ (۲۸ اکتوبر ۱۹۰۹ء) کو وفات پائی۔ (حیاتِ شبلی صفحہ ۷۳-۷۶)

"درتحریر ایں کتاب بیش از ہشت روپیہ خرچ کردم۔"

مولانا شبلی نے جب ایشیا کا سفر کیا تو واپسی پر چند نادر کتابیں ہمراہ لائے لیکن جو کتاب بھی انہوں نے مولانا فیض الحسن کے سامنے پیش کی مولانا نے بغیر دیکھے بتا دیا کہ اس میں یہ مضمون ہے۔ مولانا شبلی حیران تھے کہ ایسی کتابیں مولانا کی نظر سے کیسے گزریں۔ یہ مولانا کی ذہانت کی دلیل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون یا اس قسم کی کوئی اور کتاب مولانا کی نظر سے گزر چکی ہوگی جس کے مطالب حافظے میں محفوظ ہوں گے یا پھر یہ کتابیں مولانا نے سرسید احمد خاں کے کتب خانے میں دیکھی ہوں گی۔

سنینِ اسلام کی تالیف میں مولانا کا حصّہ

ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹز جیسا کہ ابتداء میں لکھا جا چکا ہے اورینٹل کالج کے بانی اور پرنسپل تھے۔ وہ عربی اور فارسی کے بڑے دلدادہ تھے اور ان چند انگریزوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں جو مشرقی علوم کی ترویج و اشاعت کو نظم و نسقِ حکومت کا ایک اہم جزو سمجھتے تھے اور تعلیم کے علمی مقاصد کے ساتھ ساتھ قومی روایات اور تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ وہ یورپ کی سائنس اور دوسرے علوم و فنون کی تعلیم و اشاعت میں آسانی پیدا کرنے کے لیے ملکی زبانوں کے ذخیرے کو وسیع کرنے کے بجد حامی تھے انہوں نے جب علومِ شرقی کی تجدید و اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو انہیں پرانے نصابِ تعلیم میں یہ کمی محسوس ہوئی کہ اس میں تاریخی کتابیں نہیں ہیں۔ بہت سے متبحر عالم عربی ادب اور علوم کے تاریخی پس منظر سے ناواقف اور تاریخ کے معمولی واقعات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس خیال سے انہوں نے عربی کے طالب علموں کے لیے ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں سنینِ اسلام کے نام سے اُردو میں اسلام اور عرب کی ایک مختصر سیاسی اور علمی تاریخ لکھی جو دو جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب کی تالیف اور اضافہ میں مولانا فیض الحسن، مولوی غلام مصطفےٰ اور مولوی کریم الدین نے مدد دی تھی جس کا اعتراف کتاب کے دیباچہ میں موجود ہے۔ "شاید تاریخ کی یہی پہلی کتاب تھی، جو عربی خواں طالب علموں کے ہاتھوں میں آئی۔"[1]

[1] حیاتِ شبلی از سید سلیمان [illegible]

اس کتاب میں مسلمان حکمرانوں کے حالات اور مسلمانوں کے علمی کمالات نہایت مختصر پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ "تاریخِ اسلام دراصل تاریخِ عالم ہی کا ایک حصہ ہے اور اسلامی ادب و علوم تاریخی مطالعہ کے بغیر اچھی طرح سمجھے نہیں جا سکتے۔ مولانا شبلی جب لاہور آئے تو اس کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان کا تاریخی ذوق جن کتابوں سے متاثر ہو کر اُبھرا اُن میں ایک یہ بھی ہے۔ بعد میں انہوں نے نامورانِ اسلام مثلاً الفاروق، المامون، الغزالی اور سیرۃ النعمان وغیرہ جیسی بہترین کتابوں کا سلسلہ شروع کیا اور آخر میں سیرت النبیؐ کتاب لکھ کر زندگیٔ جاوید حاصل کی۔

لاہور میں مطلب

قیامِ لاہور کے زمانے میں مولانا فیض الحسن مطلب بھی کرتے تھے۔ اتفاقاً ایک سال سخت ہیضہ پھیلا۔ مولانا نے ایک دوا ایجاد کی جو اس مرض کے لیے تیر بہدف ثابت ہوئی۔ مولانا کتھ کی گولیاں رات کو پانی میں بھگو رکھتے تھے اور صبح وہ پانی مریضوں کو پلا دیتے تھے۔ اس طرح سینکڑوں آدمیوں کی جانیں بچ گئیں اور اس طرح فن میں بھی آپ کی شہرت ہو گئی۔ طب اور دوسرے علوم میں تبحر کی وجہ سے آپ کا تعلق بعض اسلامی ریاستوں سے بھی تھا۔ چنانچہ رام پور، بھوپال اور بہاولپور کے والی کبھی کبھی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ جب مولانا کے صاحبزادے مولوی رشید احمد کی شادی ہوئی تو بعض ریاستوں نے خاص عطیات بھیجے۔

خطاب شمس العلماء

آج سے قریباً دو سو برس پیشتر کلکتہ میں ایرانی تاجروں کی آمد کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کی اولاد جب زمینداری بنی اور دُوسرے پیشوں میں پڑی تو تاجرانہ جاہ و جلال قائم نہ رہا۔ کلکتہ میں اُن کی ایک چھوٹی سی نو آبادی قائم ہو گئی۔ ان میں بڑے بڑے عالم اور مجتہد گزرے ہیں۔ لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے زمانے میں ایران سے ایک بزرگ آقا شیخ محمد جیلانی نامی عراق سے تحصیلِ علم کر کے پہلے بمبئی اور پھر کلکتہ آئے۔ اس وقت ایرانیوں کا دَور دَورہ تھا اور لارڈ ڈفرن

فارسی کے دلدادہ اور علماء کے قدر دان تھے۔ ان کو جب ایک فارسی عالم کی تلاش ہوئی تو آقا شیخ محمد جیلانی کی اس سے ملاقات کرائی گئی۔ وائسرائے اُن کی علمیت، اُن کے خیالات اور ان کی وجاہت و فصاحت سے اتنا خوش ہوا کہ ان کو اسنادی کا درجہ دیا اور باقاعدہ فارسی کتب اُن سے پڑھنے لگا۔ یہاں تک اُن کی عزت و وقعت ہوئی کہ بڑے بڑے رؤسا، نواب اور راجے مہاراجے اُن سے ملاقات کرنا فخر سمجھنے لگے۔ وائسرائے کو اپنے اُستاد کے لیے خطاب کی ضرورت پیش آئی تو "شمس العلماء" کا لفظ جو اس کے گوش گزار کیا گیا اسے بہت پسند آیا۔ اس کے بعد تو اس خطاب کی وہ مٹی پلید ہوئی کہ ہر جُغادری شمس العلماء بن کر جگنو کی طرح چمکنے لگا۔ چنانچہ جب مولانا الطاف حسین حالی کو یہ خطاب ملا تو نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے ۲۰ رجون ۱۹۰۴ء کو حبیب گنج (ضلع علی گڑھ) سے مولانا حالی کو مبارکباد دیتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا اور لکھا:

"جناب خواجہ صاحب سر آمد کملائے عصر!

سلطنت کے خطاب پر اہل کمال کو مبارک باد دینا غالباً ایک سخت مرحلہ ہے۔ میں نے کلکتہ میں جتنے اور جیسے شمس العلماء دیکھے ہیں اُن کو دیکھ کر آپ سے اہل کمال کو اس خطاب پر مبارک باد دینے کا حوصلہ باقی نہیں رہا ہے۔ جہاں غیر مستحقوں نے کسی نہ کسی طرح اس خطاب کے پانے میں کامیابی حاصل کی ہے وہاں مولوی فیض الحسن صاحب، مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی اور مولوی شبلی صاحب بھی کسی نہ کسی طرح اس زمرہ میں آ گئے تھے۔ پس میں اس پُر شکوہ گروہ کو آنکھوں سے لگا کر آپ کو شمس العلماء ہونے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ خدا تعالیٰ آپ کے فیض کے انوار سے ملک و ملت کو عرصہ دراز تک روشن رکھے۔

نیاز مند حبیب الرحمٰن"

لہ اخبار کشمیری۔ لاہور ۲۱ رنومبر ۱۹۲۶ء

اس خط سے جہاں شمس العلماء کے خطاب کی غلط بخشیوں کا پتا چلتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فیض الحسن بھی اس اعزاز سے معزز تھے مگر اس کی کسی دوسرے ذریعے سے تصدیق و تائید نہیں ہوتی۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا کی علمی شہرت اور اثر و نفوذ کو دیکھ کر پنجاب یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد نے حکومت سے مولانا کے لیے اس خطاب کی سفارش کی تھی مگر مولانا نے اسے قبول نہیں کیا تھا بلکہ کہا تھا کہ شمس العلماء تو میرے شاگرد ہیں۔ میرے لیے اگر کوئی خطاب موزوں ہو سکتا ہے تو وہ شمس شموس العلماء ہے مگر یہ بات آگے نہ بڑھی اور وہیں ختم ہوگئی۔

اولاد و احفاد مولانا فیض الحسن نے دو شادیاں کیں۔ پہلی زوجہ محلہ شاہ ولایت سہارنپور کے ایک معزز گھرانے سے تھیں۔ اُن کے بطن سے صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی جو کم سنی میں انتقال کر گئی۔ یہ زوجہ بھی چند سال ہی حیات رہیں۔ ان کی دُوسری شادی انبیٹھ کے شیخ امداد علی کی صاحبزادی وجیہۃ النساء سے ہوئی جو اپنی خوش اخلاقی کے لیے مشہور تھیں۔ مولانا کی تمام اولاد اسی زوجہ سے ہے، جن میں دو صاحبزادے رشید احمد اور سعید احمد اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی تاحین تحریر زندہ ہیں لیکن بہت بیمار اور نحیف۔ مولانا کے خلفِ اکبر مولوی رشید احمد آج سے چالیس پچاس سال قبل اورینٹل کالج لاہور میں منشی فاضل کلاس کے اُستاد تھے۔ ۱۹۲۲ء (۱۳۴۰ھ) تک لاہور میں رہے۔ اس[1] کے بعد چار سال بے کار رہے۔ پھر اسلامیہ ہائی سکول سہارنپور میں نو سال ملازمت کی اور ۱۹۳۸ء (۱۳۵۷ھ) میں راہگرائے ملکِ بقا ہوئے۔ اُن کے فرزند مولوی نصر العزیز قریشی اورینٹل کالج لاہور کے فارغ التحصیل ہیں اور آج کل سہارن پور کے اپنے آبائی مکان میں مقیم ہیں۔ ان کے پاس مولانا فیض الحسن مرحوم کی بعض نادر تالیفات کے مسودات اب تک موجود ہیں، جن میں دیگر کتابوں کے علاوہ قرابا دین فیضی (فارسی)،

---

[1] تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ص ۱۳۰۔

فیض القاموس (عربی)، شرح تاریخ تیموری (عربی)، ضوء المشکوٰۃ (عربی)، اختصار ایلاقی (عربی)، قابلِ ذکر ہیں۔

شخصیت مولانا کا رنگ سانولا، قد میانہ، جسم بھاری، چہرہ بڑا اور رعب دار، داڑھی گھنی اور سیدھی تھی۔ جب ان کو زکام ہوتا تو ناک پر رومال رکھ کر دائیں بائیں جلدی جلدی ہلایا کرتے تھے۔ مولانا کے پوتے مولوی نصر العزیز قریشی ہُوبہُو انہی کا نمونہ ہیں۔

مولانا بہت سادگی پسند تھے۔ لباس نہایت معمولی پہنتے۔ اپنی لیاقت اور واقفیت علوم خواہ مخواہ کسی پر نہ جتاتے۔ ابتدائے ہوش سے نماز روزہ کے پابند تھے۔ کھانوں میں کھچڑی اور میووں میں آم اور خربوزے بہت مرغوب تھے۔ بے حد وضعدار اور ملنسار تھے۔ جب کبھی پردیس سے وطن لوٹتے تو تمام اقرباء سے خود ملنے جاتے۔ ایک ایک کا حال پُوچھتے اور مزاج پُرسی کرتے۔

مولانا بڑے صاحبِ ذوق، زندہ دل، خوش مزاج اور ظریف طبع تھے۔ روتوں کو ہنسانا اُن کے لیے معمولی بات تھی۔ دِلّی میں بارش ہو رہی تھی۔ مولانا درس سے فارغ ہو کر کتابیں بائیں بغل میں دبائے اور جُوتے دائیں ہاتھ میں لیے پائنچے چڑھائے جا رہے تھے۔ دِلّی کے ظریف الطبع یاروں نے عربی کے ایک طالب علم کو اس ہیئت سے آتے دیکھ کر مشورہ کیا کہ آؤ ان کو چھیڑیں اور سلام کریں ان کے دائیں ہاتھ میں جُوتے ہیں یقیناً یہ جواب میں جُوتے اپنے سر کی طرف اٹھائیں گے۔ چنانچہ ایک شخص نے زور سے "السلام علیکم" کہا۔ مولانا نے بائیں ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور دایاں ہاتھ جس میں جُوتے تھے اُٹھا کر اور ہلا کر کہا "مزاج شریف" چھیڑنے والے بے حد خفیف ہُوئے اور اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے[1]۔

غالبؔ سے ہنسی مذاق اسی زمانے میں مرزا غالبؔ کے ساتھ جو دو موقعوں پر مزاح ہُوا وہ بھی بہت مشہور ہے۔ جب مولانا

---

[1] حسنِ خیال از صفدر مرزاپوری ص ۱۳۵

فیض الحسن نئے نئے دہلی گئے تو ایک روز غالب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اتفاق سے کوڑے سے لدے ہوئے کچھ گدھے ادھر سے گزرے۔ مولانا نے کہا: "دہلی میں گدھے بہت ہیں" مرزا غالب نے فوراً سر اٹھا کر کہا: "ہاں بھائی باہر ہی سے آجاتے ہیں" (مرزا کو معلوم تھا کہ مولانا فیض الحسن سہارنپور سے آئے ہیں) مولانا اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن بعد میں اپنے یارانِ طریقت سے کہا کہ ادب مانع تھا ورنہ یوں کہتا کہ صاحب ادب مانع تھا ورنہ یوں کہتا کہ صاحب یہاں گدھیاں زیادہ اور شوخ ہوں گی۔

ایک روز غالب کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ غالب نے ایک گلی کی طرف اشارہ کر کے کہا: "لو میاں ادھر کو چلے جاؤ اور فلاں کام کر آؤ" یہ کہہ کر خود آگے بڑھ گئے مولانا کو راستہ معلوم نہ تھا۔ اس گلی میں گھس گئے۔ وہ گلی دراصل ایک زنانہ مکان تھا یہ جو بے دھڑک گئے اِن کی نظر عورتوں پر اور عورتوں کی نظر ان پر پڑی۔ عورتوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ انہیں کیا سوجھی جھٹ اندھے بن کر ٹامک ٹوئیے مارنے لگے۔ کسی نے کہا! ارے یہ بیچارا تو اندھا ہے۔ پھر ہاتھ پکڑ کر سڑک پر پہنچا دیا۔

غالب سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا: "کہو میاں فیض الحسن! راستہ ملا تھا یا نہیں؟ اور کچھ تواضع بھی ہوئی یا یونہی چلے آئے؟" جب انہوں نے واقعہ سنا تو غالب مسکرائے اور لوگ اُن کے انتقال ذہنی پر عش عش کر اُٹھے[1]

موسیقی سے لگاؤ اوائل شباب میں مولانا کو موسیقی سے دلی لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں منشی صفدر علی صفدر مرزا پوری مؤلف مرقع ادب، مشاطۂ سخن اور بزمِ خیال وغیرہ نے اپنی کتاب حُسنِ خیال میں آپ کے متعلق چند دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں جو سید زاہد حسین زاہد سہارن پوری نے انہیں بتائے تھے۔ حضرت زاہد کے کتب خانے میں مولانا فیض الحسن کی دو فارسی مثنویاں بھی موجود تھیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں۔ لکھا ہے:

---

[1] بروایت مولوی نصر العزیز قریشی نبیرہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری مرحوم۔

"ایک دفعہ (مولانا) طلبہ کو فلسفہ کا درس دے رہے تھے۔ مضمون یہ تھا کہ انسان کا خیال اضطراری ہے، اختیاری نہیں۔ ہر شے اور ہر بات کی طرف بے ارادہ پہنچ جاتا ہے۔ درس کے بعد بازار سے گزرے تو ایک جگہ ناچ ہو رہا تھا۔ آپ ہمراہی طلبہ کو چھوڑ کر ناچ کے مجمع میں کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ طلبہ نے کہا: مولانا یہ تو آپ کے علم و فضل، ورع اور سن کے بالکل شایانِ شان نہیں۔ آپ نے ہنس کر فرمایا: ہوں ہوں، ابھی تو پڑھ کر آئے ہو التصور یتعلق بکل شیئ ؕ" [1]

ایک مولوی صاحب کے جو واعظ بھی تھے اپنے تقدس پر بہت ناز تھا۔ ایک دن مولانا کی آزاد وضعی پر معترض ہوتے اور دفترِ پند و ملامت کھولا۔ مولانا سُنتے رہے لیکن جب وہ حدِ اعتدال سے بڑھے اور کسی طرح سلسلۂ ملامت ختم کرنے پر نہ آئے تو آخر تنگ آ کر مولانا نے اشعارِ ذیل سے جواب دیا ؎

ہم وہ نہیں کہ وعظ کہیں دن کو بیٹھ کر
اور خلوتوں میں کام کریں چھپ کے رات کو
تفضیح ہے خلافِ مروت خلافِ دیں
ورنہ دکھا دیں گر کہو ہم پانچ سات کو

یہ اشعار سن کر حضرت واعظ دم بخود ہو گئے اور پھر زبان نہ کھولی۔ [2]

مولانا محمد قاسم سے دل لگی

مولانا محمد قاسم نانوتوی بانیِ دارالعلوم دیوبند اور مولانا فیض الحسن ہم عمر تھے۔ اس وجہ سے دونوں میں ایک گونہ ایسے تعلقات تھے کہ باہم مزاح و ظرافت کی گفتگو کبھی کبھی ہو جایا کرتی تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی سوانح قاسمی جلد اوّل میں ارواحِ ثلاثہ (ص ۲۰۷)

---

[1] حسنِ خیال از صفدر مرزا پوری ص ۱۳۵

[2] " " " " ص ۱۳۶

کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

"ایک دن مولانا فیض الحسن صاحب نے مولانا نانوتوی کو خطاب کر کے کہنا شروع کیا۔ ارے اسد علی کے بیٹے (مولانا کے والد ماجد کا نام ہے باوجود خواندہ ہونے کے کھیتی باڑی کرتے تھے) تو تو کھیتی کرتا ہے تجھے کس نے مولوی بنا دیا۔ تیرے پاس دو بیل ہوتے اور اُن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تک تک، بربر کرتا ہوتا۔"

مولانا فیض الحسن کا رنگ سانولا تھا اور طول وعرض میں بھی جسم کو ترقی کرنے کا موقع قدرت کی طرف سے ملا تھا۔ رنگ اور ڈیل ڈول کی انہی خصوصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر (مولانا محمد قاسم) کی طرف سے ان کو یہ جواب ملا:

"خیر ایک بھینسا تو موجود ہے۔" [1]

ایک دفعہ مولانا فیض الحسن لاہور سے وطن آئے اور مولانا محمد قاسم سے ملنے دیوبند گئے۔ برسات کے دن تھے، ترشح ہو رہا تھا۔ مولانا گلیم خشن سر پر رکھے اور پاپوش ہاتھ میں لیے پورے گرالے بنے ہوئے مسجد میں پہنچے۔ مولانا محمد قاسم نے انھیں دیکھتے ہی پکارا: ارے یہ گڈریا مسجد میں کہاں سے گھس آیا اسے باہر نکالو۔ مولانا نے فوراً جواب دیا: اجی حضور! میرے دو مینڈھے کھو گئے تھے، ایک تو بول پڑا اور مل گیا اب دوسرے کی تلاش ہے۔ [2]

بیعت دونوں بزرگ ایک ہی شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ارواحِ ثلاثہ میں اشرف التنبیہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ "مولوی فیض الحسن صاحب نے حضرت حاجیؒ سے بیعت ہونے کے وقت یہ کہا تھا کہ دو شرط کے ساتھ بیعت ہوتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ کبھی نذرانہ نہ دوں گا، دوسرے یہ کہ

---

[1] سوانح قاسمی از مولانا مناظر احسن گیلانی ج ا، ص ۱۱۹، ۱۲۰، ۴۶۴، ۴۶۵۔

[2] بروایت مولوی نصر العزیز نبیرہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری

کبھی خط نہ بھیجوں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ شرطیں کر و تو وہ بھی منظور ہیں۔ اُن کو حاجی صاحبؒ کے ساتھ اس قدر محبت تھی کہ ان کا نام آنے سے روتے تھے۔ حضرت حاجی صاحبؒ کی تعریف میں اُن کے بڑے چلتے پھرتے دو ہرے ہیں[۱]۔

بیعت ہونے کے بعد مولانا نے تمام منہیات سے توبہ کی۔ پھر ساری عمر دلائل الخیرات وغیرہ کتب پڑھنے میں گزاری۔ پیر اور جمعرات کے روزے کبھی قضا نہ کیے۔ لاہور میں جب تک رہے ہر جمعہ کو بلاناغہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں بیٹھ کر دس ہزار بار درود شریف کا ورد کرتے۔ تہجد گزار تھے۔ ہر ہفتے یا ہر مہینے صلوٰۃ التسبیح پڑھتے۔

انگریزی نہ پڑھنے کا افسوس

ایک دفعہ سر سید احمد خاں نے علی گڑھ میں کوئی جلسہ کیا اور دروازے پر خوش آمدید کی جگہ انگریزی میں ویلکم (WELCOME) لکھوا کر لگایا۔ مولانا کو جب اس لفظ کا تلفظ اور معنی معلوم ہوئے تو سر سید کو مخاطب کر کے کہا: "ویلکم یا سید احمد ویلکم"۔

آخری عمر میں مولانا کو انگریزی نہ پڑھنے پر افسوس ہوتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جو لوگ انگریزی پڑھ کر گمراہ ہو جاتے ہیں ان کو راہِ راست پر لانا انگریزی تعلیم کے بغیر مشکل ہے۔ اس کے باوجود مولانا شبلی کو انگریزی لباس میں دیکھ کر فرمایا کہ "اگر آپ جیسے لوگ انگریزی وضع قطع اختیار کر لیں گے تو مسلمانوں کا خدا ہی حافظ ہے۔"

حج بیت اللہ

مولانا نے حج بھی کیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ واقعہ کب کا ہے البتہ حجاز میں دو تین لطیفے ہوئے جو سننے کے لائق ہیں۔

اس زمانے میں سفر بڑا دشوار تھا۔ بدو قافلوں کو لوٹ لیتے۔ مال و اسباب کے علاوہ پانی پر بھی ہاتھ صاف کرتے۔ ایک رات مولانا نے دیکھا کہ چند بدو ایک جگہ جمع ہو کر سازش میں مصروف ہیں۔ مولانا بھی چپ چاپ ایک طرف جا کر کھڑے ہو گئے۔ بدوؤں کے سردار نے ان سے پوچھا: آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ مولانا نے اس کے

---

[۱] ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۷۷-۲۷۸

جواب میں جو کچھ کہا اس کا ایک جزو یہ تھا:

"انھم یشربون ماء نالا یشربون ماءنا بل یشربون دماءنا"

یعنی یہ لوگ ہمارا پانی پی رہے ہیں اور پانی ہی نہیں پی رہے بلکہ ہمارا خون پی رہے ہیں۔

بدوؤں کا سردار مولانا کی گفتگو سے ایسا خوش ہوا کہ اس نے اپنے لوگوں کو اس قافلہ کے لوٹنے سے منع کر دیا اور قافلہ صحیح سلامت منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ ایک روز ایک بدو نے مولانا کو بھائی کہہ کر مخاطب کیا اور کہا ذرا میرے اونٹ کی نکیل تو پکڑنا۔ مولانا نے کہا میں تیرا بھائی کیونکر ہوا۔ میں فلاں ابن فلاں ابن فلاں اور تو فلاں ابن فلاں ابن فلاں، اور دونوں کا سلسلۂ نسب عربوں کے دو مختلف اور مخالف قبیلوں کے مورثِ اعلیٰ تک پہنچا دیا۔ بدو بہت حیران ہوا۔ اس نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا: "واللہ ھٰذا الھندی واقف بانساب العرب"۔ (خدا کی قسم! یہ ہندی تو انسابِ عرب سے واقف معلوم ہوتا ہے)

مکہ معظمہ کے قیام کا واقعہ ہے کہ ایک استاد کتاب پڑھا رہا تھا۔ مولانا بھی حلقے میں بیٹھ کر سنتے رہے۔ استاد نے کچھ غلط پڑھایا۔ مولانا نے فوراً ٹوک دیا اور اس کی تصحیح کر دی۔ استاد نے پوچھا، آپ کون ہیں؟ مولانا نے جواب دیا میں اس کتاب کا مصنف ہوں۔ اس پر استاد نے اٹھ کر قدم لیے، مولانا کو عزت سے اپنی مسند پر بٹھایا اور خود حلقے میں بیٹھ کر کہا ہاں اب پڑھائیے۔ مولانا نے پڑھانا شروع کر دیا، استاد ان کی ذہانت اور علمیت کا لوہا مان گیا۔[1]

یہ تحقیق نہ ہو سکی کہ وہ کون سی کتاب تھی اور استاد کون تھا؟

ہمعصر علماء مولانا فیض الحسن سہارن پوری کا زمانہ گو لاہور کی علمی ترقی کے آغاز کا زمانہ تھا تاہم علماء دین کی ایک خاصی جماعت آپ کے حلقۂ احباب

---

[1] یہ روایت مولوی نصر العزیز قریشی نبیرہ مولانا فیض الحسن سے ہم تک پہنچی ہے۔

میں شامل تھی۔ مولانا غلام دستگیر قصوری؟، مولانا غلام قادر بھیروی؟، مولانا غلام محمد؟ گھوی خطیب شاہی مسجد، خلیفہ حمید الدین نہ صرف آپ کے ہم عقیدہ اور ہم مشرب تھے بلکہ اعتقادی مسائل میں آپ سے مشورے لیتے۔ اہل سنت وجماعت کی اکثر اعتقادی کتابیں آپ کی قابل قدر آراء وتائید سے مزین ہیں۔ مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل" میں آپ کی اعتقادی پختگی پر خراج تحسین ادا کیا ہے۔ آپ نے بہاولپور کے مشہور مناظرہ میں دیوبندی مکتب فکر کے علماء کے کھوکھلے استدلال کے خلاف مولانا فیض الحسن سہارن پوری کا ایک عربی مکالمہ پیش کیا جو دیوبندی اعتقاد کے تابوت پر آخری کیل ہے۔

طرزِ تحریر مولانا بائیں ہاتھ سے لکھا کرتے تھے کیونکہ دایاں ہاتھ کسی قدر ماؤف ہوچکا تھا اس لیے باریک کاموں کے لیے بیکار ہوگیا تھا، موٹے موٹے کام کرلیتے تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ جوانی کے عالم میں کسی مزدور کو بے رحمی سے ایک قمچی ماری تھی، اسی وقت سے ہاتھ میں تکلیف شروع ہوگئی۔ مولانا کے مسودات دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی تمام تصانیف سیاہ روشنائی سے اور عنوانات شنگرف سے لکھتے۔ نقطے بہت کم لگاتے۔ عربی خواں مشاق کاتبوں کے سوا دوسرا کوئی ان کی تحریر آسانی سے نہیں پڑھ سکتا تھا۔

مولانا کے شاندار علمی کارناموں پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے مگر یہاں ہم ان کی تصانیف کے نام لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں:[1]

۱۔ شرح سبعہ معلقہ (عربی، فارسی، اردو)
۲۔ شرح حماسہ
۳۔ رشیدیہ
۴۔ فیضیہ (علم مناظرہ اردو)
۵۔ دیوان حسان کی ترتیب
۶۔ التعلیقات علی الجلالین
۷۔ تحفۂ صدیقیہ رض

---

[1] تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ص ۱۳۰۔

۸۔ عروض المفتاح | ۹۔ ریاض الفیض

۱۰۔ دیوان الفیض | ۱۱۔ حلِ ابیات بیضاوی

۱۲۔ شرح مشکوٰۃ المصابیح

وفات مولانا فیض الحسن ۶۔ فروری ۱۸۸۷ء (۱۳۰۴ھ) کو اکہتر برس کی عمر پاکر لاہور میں فوت ہوئے[1] نظامی بدایونی نے قاموس المشاہیر میں آپ کی تاریخ وفات ۱۸۹۰ء (۱۳۰۸ھ) لکھی ہے جو غلط ہے۔ بعضوں کے نزدیک آپ کا انتقال ۱۳۰۰ھ میں ہوا مگر اس کی بھی کسی معتبر ذریعے سے تصدیق و تائید نہیں ہوتی۔ مولانا کے عربی کلام یعنی دیوان الفیض کے مرتب و جامع مولانا حمید الدین فراہی نے بھی آپ کا سنِ وفات ۱۸۸۷ء (۱۳۰۴ھ) لکھا ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

انتقال کے وقت اُن کے پاس صرف مولوی ظہور الدین مرحوم تھے جو سہارنپور سے پڑھنے کے لیے لاہور آئے ہُوئے تھے۔ مولانا باہر سے تشریف لائے اور مولوی ظہور الدین سے کہا کہ لے بھائی ظہور! یہ تالیاں ہیں یہ رشید کی ماں کو دے دینا۔ اس صندوق میں روپے ہیں، ضرورت پڑی تو ان کو خرچ کرنا اور مجھے میرے ہڑوار (خاندان) کے ساتھ دفن کرنا۔ اور دیکھو فلاں کام اس طرح کرنا اور فلاں کام اس طرح، اور میں ذرا لیٹتا ہُوں، میری ٹانگیں دبا دو۔ مولوی ظہور الدین نے حیران ہو کر پُوچھا۔ مولانا! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ مولانا نے کہا: گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب کام ہوشیاری سے کرنا اور ذرا میری ٹانگیں دبا دو۔ یہ کہہ کر مولانا سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر لیٹ گئے مولوی ظہور الدین ٹانگیں دبانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب کو کچھ شک سا ہُوا چہرہ کھول کر دیکھا تو مولانا اعلیٰ علیین کو سدھار چکے تھے۔

مولانا کی وصیت کے مطابق لاش تابوت میں ڈال کر ریل کے ذریعے سہارنپور پہنچائی گئی۔ کئی اسٹیشنوں پر نمازِ جنازہ ہُوئی۔ سہارن پور میں انہیں آباؤ اجداد کے

[1] تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ص ۳۴۳، ۱۳۰ اور ۲۱۱۔

قبرستان درہ آلی میں سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا کی وفات حسرت آیات پر یوں تو ساری علمی دُنیا نے ماتم کیا مگر مولانا شبلی نعمانی نے جب اپنے فاضل اُستاد کے انتقال کی خبر سُنی تو اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ اس وقت علی گڈھ کالج میں طلبہ کو درس دے رہے تھے۔ انہوں نے اسی وقت درس بند کر کے شاگردوں کو رخصت کر دیا اور ایک نہایت ہی دلگداز مرثیہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں: ؎

دریں آشوبِ غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم
جہانے را جگر خوں شد ہمی تنہا نہ من گریم

بتحسینِ صبوری چند بفریبی مرا ناصح
دمے بگذار تا در ماتمِ فیض الحسن گریم

بر گِرش علم و فن در نالہ با من ہمنوا باشد
ہنر بر خویشتن گرید چو من بر خویشتن گریم

دو تا غم دارم و ہر یک ز دیگر حسرت افزون تر
بر گِرش گریم و آنگاہ بر مرگِ سخن گریم

گہے بے خود بہ برہم گشتنِ بزمِ ہنر نالم
گہے بے خویش بر روزِ سیاہِ علم و فن گریم

آگے چل کر دوسرے بند میں فرماتے ہیں: ؎

نہ گویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید
عرب را زندہ کردن وانگہ زہندوستان بودن

بہ آئین دری بر جادۂ پیشینیاں رفتن
بہ آہنگِ حجازی یادگارِ پاستان بودن

مفتی غلام سرور لاہوریؒ[1]

ایک مورخ، تذکرہ نویس، ادیب، شاعر اور عالمِ دین

مفتی غلام سرور لاہوریؒ ایک مایۂ ناز مصنف تھے۔ آپ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی، سہروردی، قریشی، اسدی الہاشمی کی اولاد سے تھے اور اپنی مشہور تصنیف حدیقۃ الاولیاء میں اپنا شجرۂ نسب لکھا ہے۔

اسلاف آپ کے جدِ اعلیٰ حضرت مخدوم شیخ محمد المعروف "میاں وڈا" نے محلہ علاول خان لوہانی کوٹلی مفتیاں میں زمین خرید کر آباد کی تھی۔ حضرت مخدوم کو سلطان بہلول لودھی نے عہدۂ افتاء پر مامور کر کے ملتان سے لاہور بھیجا اور علاقہ ہیبت پور جسے اب پٹی کہتے ہیں، جاگیر میں دیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند مولانا کمال الدین اس عہدہ پر فائز ہوئے جنہوں نے کوٹلی مفتیاں میں ایک عالی شان مسجد، کتب خانہ اور طلبہ کے لیے دارالاقامت تعمیر کروائے اور افتاء اور تدریس علم دین کے ساتھ ساتھ سہروردی سلسلۂ روحانیت کو فروغ دینے میں سرگرم رہے۔ ان کی اولاد صدیوں تک اس عہدہ پر نسلاً بعد نسلٍ فائز رہ کر دین اسلام کے احکام و قوانین کو جاری کرتی رہی۔ لاہور کے مفتی مولانا عبدالسلامؒ اور شیخ الاسلام مفتی محمد مکرمؒ تو لاہور کے دینی مشاہیر میں سے صفِ اوّل میں تھے۔ یہ وہی مفتی محمد مکرمؒ ہیں جنہیں احمد شاہ ابدالی نے ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۷۵ھ سے ایک

---

[1] مفتی غلام سرور لاہوریؒ پر یہ مضمون مفتی صاحب کے نبیرہ علامہ مفتی محمود عالم ہاشمی (مرحوم) کی کاوشِ فکر و تحقیق کا نتیجہ ہے۔ آپ کا یہ مفصل مضمون پہلے "نقوش لاہور" میں چھپا۔ پھر آپ نے مستقل کتاب بنام "ذکر حبیب" میں مفتی صاحب کے مفصل حالات سپردِ قلم کیے۔

محررہ فرمان کے ذریعہ لاہور کا مفتی اعلیٰ مقرر کیا۔ انہی کی پوتی مفتی غلام سرور کی والدہ تھیں۔

والد مکرم مفتی غلام سرورؒ کے والد ماجد مفتی غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے بلند پایہ عالم دین اور حاذق طبیب تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد رحیم اللہ المتوفی ۱۲۳۵ھ سے حاصل کی اور اپنے والد ہی کے مرید ہوئے۔ علم دین میں فقہ حنفی کے تابع تھے۔ علوم ظاہری مولانا غلام رسول فاضل لاہوری سے حاصل کیے۔ مولانا رحمان علی "تذکرہ علماءِ ہند" کے صفحہ ۱۵۹ پر آپ کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

"مفتی غلام محمد لاہوری از اولاد و امجاد شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی است۔ پدر مفتی غلام سرور است جامع علوم و فنون بود۔ پدرم بکار تدریس طبابت سرگرم ماند۔ قوتِ حلال از کتابت قرآن حاصل می کرد۔ درسال دوازدہ صد و ہشتاد و شش ہجرہ وفات یافت "خورشید دین محمد" ۱۲۸۶ تاریخ وفات است۔"

مفتی غلام سرورؒ نے ابتدائی کتب والد سے پڑھنے کے بعد مولانا غلام اللہ فاضل لاہوری کے درس میں شامل ہو کر تفسیر، حدیث، فقہ و تاریخ، صرف و نحو، معانی و منطق کی تکمیل کی علم طب اپنے والد سے حاصل کیا اور فارغ التحصیل ہو کر ہمہ وقت تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی تصانیف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بیک وقت بے مثال بلند پایہ شاعر، مستند مورخ، سوانح نگار اور ماہر لغت تھے۔ ایسے طباع، عالی دماغ اور جامع علوم و فنون پاک و بھارت کی سرزمین میں بہت کم پیدا ہوئے ہیں۔ اس یگانۂ روزگار عالمِ دین نے اپنی بیش بہا اور قابلِ قدر تصانیف سے علم و ادب اور تاریخ و لغت کے دامن کو گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا۔

ملازمت ۱۸۷۰ء میں آپ نے لاہور کے ایک جاگیردار سردار بھگوان داس رئیس فتح گڈھی ملازمت اختیار کر لی مگر ملازمت کے ساتھ ساتھ سلسلۂ تالیف و تصنیف جاری رہا اور معیشت کے اسباب تصنیف کے ذوق پر کبھی غالب نہیں آنے دیا۔

۱۸۸۲ء میں رائے بہادر کنھیا لال ایگزیکٹو انجینئر لاہور ڈویژن (جو صاحب تصنیف ہیں اور ان کی کتاب "تاریخ لاہور" اور "تاریخ پنجاب" نے تو بہت شہرت پائی۔ یہ صاحب بہادر

مفتی صاحب کے شاگرد بھی تھے، نے اپنے محکمے میں ایک معقول مشاہرے پر ملازمت دلادی مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مستعفی ہو گئے۔ درحقیقت وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کے لیے ہی موزوں تھی۔ چنانچہ اس فن میں شہرت و ناموری حاصل کی اور اسی شغل میں عمر گزاری۔

عاشقِ رسول ﷺ

مفتی غلام سرور کا شعری کلام اکثر و بیشتر نعتِ رسول اللہ ﷺ پر مشتمل ہے۔ آپ عشقِ رسول ﷺ میں فنا تھے۔ جو نعت بھی لکھتے محبتِ رسول ﷺ سے بھرپور ہوتی اور عشق کے جذبات جھلکتے۔ حج بیت اللہ اور زیارتِ گنبدِ خضرا کے لیے تو ان کے اشعار زبان زدِ خلق ہو گئے تھے اور روضۂ رسول ﷺ پر جانے کے لیے ہمیشہ بے تاب رہتے۔ جناب غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت عشق کے درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ آپ نے گلدستۂ کرامات لکھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

تصانیف

آپ کے قلم سے بیس کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں بعض تو اپنے موضوع اور مضمون کے اعتبار سے نہایت اہم، بلند پایہ اور قابلِ قدر ہیں۔ یہ کتابیں نولکشور لکھنؤ نے ہزاروں کی تعداد میں چھپوائیں اور کئی ایڈیشن فروخت کیے۔ ذیل میں آپ کی تصانیف کے نام دیئے جاتے ہیں:

۱۔ خزینۃ الاصفیاء فارسی نثر میں ہے۔ متقدمین و متاخرین صوفیاء، علماء و شعراء کے حالات میں ہے۔ ساتھ ساتھ ماخذ بھی بیان کیے ہیں۔ دورِ حاضرہ میں صوفیاء کی زندگی کے مطالعہ کے لیے اس سے بہتر ماخذ نہیں ملتا۔ اب اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

۲۔ گنجِ تاریخ: حضور سرورِ دو عالم ﷺ کے عہد مبارک سے لے کر تمام خلفاء و سلاطینِ اسلام اور مشاہیر صوفیاء و علماء و شعراء کے مختصر حالات اور ولادت و وفات کے قطعاتِ تاریخ ہیں۔

ان دونوں بلند پایہ کتابوں میں کم از کم دس ہزار قطعاتِ تاریخ ہیں اور بعض حسبِ حال اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ تاریخ گوئی کا اتنا ضخیم ذخیرہ کسی اور مجموعہ میں نہیں ملتا۔

۳۔ بہارستانِ تاریخ کا مختصر مگر نہایت جامع ممالکِ اسلامیہ کی تاریخ ہے، ساتھ ہی

تاریخ ہندو انگلستان کے واقعات بھی درج ہیں۔

۴۔ تاریخ مخزن پنجاب، پنجاب کی لبیط تاریخ اور جغرافیہ ہے۔

۵۔ حدیقۃ الاولیاء: پنجاب کے اولیائے کرام کے ذکر میں ہے۔ اسی طرح مدینۃ الاولیاء پاک و ہند کے اولیائے کرام کے حالات کا مجموعہ ہے۔

۶۔ مخزن حکمت: متقدمین و متاخرین فلاسفہ صوفیا، فضلاء و شعراء کے تاریخی حالات اور ان کے پند و نصائح کا ذکر ہے۔

۷۔ لغات سروری، عربی، فارسی و ترکی الفاظ پر مشتمل ہے۔ معانی اردو میں بیان کیے ہیں۔

۸۔ جامع اللغات: دو جلدوں میں ہے۔ عربی، فارسی، ترکی اور اردو کے الفاظ اور فارسی و اردو کے محاورات و اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ معنی اردو میں بیان کیے ہیں۔ سند میں اساتذہ کا کلام ہے۔

ان کے علاوہ مناقب غوثیہ، گلدستۂ کرامات حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کے مناقب اور حالات پر ہے۔ تحفۂ سروری، گلشنِ سروری، اخلاقِ سروری، دیوانِ نعتِ سرور، دیوان سروری، کلیاتِ نعتِ سرور، دیوان حمدِ ایزدی۔ یہ تمام کتابیں نظم میں ہیں۔ حمد، نعت، منقبت اور اخلاقی و متصوفانہ و عارفانہ مضامین پر مشتمل ہیں۔

شعر و ادب شعر و ادب کے انحطاطی دور میں مفتی غلام سرور لاہوریؒ نے اردو فارسی نظم کے اچھے نمونے پیش کیے۔ آپ کی تصانیف کا اکثر حصہ نظم و شعر پر مشتمل ہے۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ، تاریخ گوئی، تضمین، نعت غرضیکہ ہر صنفِ سخن پر قلم اٹھایا اور بات تو یہ ہے کہ حق قلم ادا کر دیا۔ مفتی صاحب نے نعت سرورِ دو عالم میں جس والہیت کا ثبوت دیا ہے وہ آپ کے ایمان و اعتقاد کی علامت ہے۔ اس مختصر مضمون کی تنگ دامانی اجازت نہیں دیتی کہ تفصیلی قلم اٹھایا جائے تاہم چند منتخب اشعار ہدیۂ قارئین ہیں جس سے آپ کے اعتقاد اور محبت کا اندازہ ہوگا۔ ؎

ہر اک موتی کی قیمت گھٹ گئی بازارِ عالم میں
مقابل اُن کے جب وہ بے بہا دُرِّ یتیم آیا

نبی کو دیکھ کے بے تاب آفتاب ہوا
فروغِ حسن سے شرمندہ ماہتاب ہوا
چلے جو عرش پہ خیر البشر شبِ معراج
اٹھا کے غاشیہ جبریل پا رکاب ہوا

از لامکاں بلند مقامِ محمدؐ است — بالا ز عرش عزت و شانِ محمدؐ است
مفتاحِ علم و فضل دہانِ محمدؐ است — گنجینہ دارِ فیضِ زبانِ محمدؐ است
سرور مدار باک کہ انجامِ کارِ تو — در حفظِ احمدی ز امانِ محمدؐ است

کوئے مدینہ میں جگہ پانے کی تمنا کا اظہار یوں کرتے ہیں: ؎

پائیں جگہ جو ڈھونڈ اطہر کے سامنے — گھر اپنا ہم بنالیں اسی گھر کے سامنے
بے شک خدا کا گھر ہے اسی گھر کے سامنے — جنت کا در کھلا ہے اسی در کے سامنے
گھر ہو اگر مدینہ میں اپنا تو ہم رہیں — جیتے نبی کے سامنے اور مر کے سامنے

فقیر شمس الدین اور پنڈت بیج ناتھ کے ذریعے حکومتِ پنجاب نے مفتی صاحب سے کچھ کتابیں لکھوانا چاہیں۔ ان دونوں صاحبوں نے مفتی صاحب سے درخواست کی اور مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کی مثال پیش کی اور حکومت کے الطاف و عنایات کی طرف بھی توجہ دلائی۔ آپ نے فرمایا مجھے جاگیر و خطاب کی ضرورت نہیں اور نہ حکومت کے زیرِ اثر اور اس کی ہدایت کے مطابق کتابیں لکھنا چاہتا ہوں۔ حکومت کا اپنا ایک خاص مقصد ہے۔ یہ حضرات حکومت کے زیرِ سایہ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ ایسے اہلِ خرد علماء کو ہی زیب دیتا ہے فقیروں کے ہاں یہ چیز کہاں۔ ؎

شدند ہم نفساں وقفِ کاروبارِ خرد — من جنون زدہ کارے کہ داشتم دارم

اسی طرح ان کے ایک بے تکلف دوست نواب نوازش علی قزلباش نے ایک محفل میں مفتی صاحب سے کہا: حضرت مفتی صاحب! آپ کی تصانیف پر مسلمانوں کے تمام فرقے خوش نہیں ہیں (اس سے مراد شیعہ فرقہ تھا)۔ آپ نے فرمایا: صاحب میں کوئی کتاب کسی فرقہ کی خوشی یا ناخوشی کے لیے نہیں لکھا کرتا۔ یہ میرا مطالعہ اور علمی تحقیق کا میدان ہے۔ یہ فیصلہ تو اہل علم کریں گے کہ میری کتابیں ذہن و قلب کو کتنی پسند ہیں۔

اولاد و اخلاف آپ کے پانچ فرزند اور ایک لڑکی تھی۔ مفتی غلام حیدر، مفتی غلام صفدر، مفتی غلام اکبر، مفتی محمد انور، مفتی غلام اصغر اور اقبال بیگم (دختر مرحوم) اقبال بیگم آپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کے ایک فرزند مفتی محمود عالم لاہور میں طبابت کرتے ہیں بڑے علم دوست اور صاحب تصنیف ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی کے ایک مشہور ادارہ میں تدریس فرماتے ہیں۔ مفتی غلام صفدر کے ایک بیٹے مفتی محمد والا گوہر شادانی کراچی میں وزارت تجارت و صنعت میں کام کر رہے ہیں۔

عادات و خصائل مفتی صاحب نہایت شگفتہ مزاج، خلیق، شفیق، عابد، شب زندہ دار اور صوفی باصفا تھے۔ اپنے آبائی سلسلہ سہروردیہ چشتیہ نقشبندیہ مجددیہ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت غوث الاعظم؁ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ تفسیر و حدیث و شریعت و طریقت علم و ادب کا کوئی مسئلہ ہوتا بے تکلف گفتگو فرماتے۔ مسئلہ کی تمام جزئیات صاف طرح بیان کرتے۔ ادق سے ادق مضامین کو نہایت خوبی سے بیان فرماتے۔ حلقۂ احباب بڑا وسیع تھا۔ عوام سے لے کر خواص تک آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتے۔ طبیعت میں استغنا تھا۔ خان بہادر برکت علی خاں ایکسٹرا اکسٹر لاہور رئیس شاہجہان پور، پنڈت بیج ناتھ، فقیر شمس الدین نواب نوازش علی قزلباش، دیوان امرناتھ اکبری آپ کے بے تکلف دوست تھے۔ ان احباب نے مفتی صاحب کو مشورہ دیا کہ گورنمنٹ برطانیہ کے ایماء پر چند کتابیں لکھیں تاکہ آپ کو کوئی خطاب شاہی یا جاگیر ولا دی جائے مگر مفتی صاحب نے نہایت استغناء سے جواب دیا کہ میری تصانیف کا مقصد "شمس العلماء" کا خطاب لینا نہیں بلکہ ادب و علم کی

خدمت ہے۔

سر سید اور مفتی صاحب

سر سید مرحوم جب علی گڑھ کالج کے قیام کے سلسلے میں لاہور آئے تو آپ نے مخلص اور دیرینہ دوست خان بہادر برکت علی خاں ایکسٹرا کمشنر لاہور رئیس شاہجہان پور کے یہاں فروکش ہوئے۔ خان بہادر نے سر سید مرحوم کے اعزاز میں دعوت دی جس میں بعض اکابر لاہور کے ساتھ مفتی صاحب بھی مدعو تھے۔ خان بہادر نے آپ کا تعارف سر سید مرحوم سے کرایا۔ سر سید آپ کی شخصیت اور فضل و کمال سے بے حد متاثر ہوئے اور اپنے مشن کے سلسلے میں کچھ کام مفتی صاحب کے سپرد بھی کرنا چاہا۔ مفتی صاحب نے فرمایا؛ قبلہ سید صاحب! میں درویش گوشہ نشین ہوں۔ تصنیف و تالیف میرا مشغلہ ہے۔ جن لوگوں کی جماعت آپ نے اپنے گرد اگرد جمع کرلی ہے وہ آپ کے مقاصد کے لیے ٹھیک اور موزوں ہیں۔ جماعتی اتحاد کے لیے اعتقادی ہم آہنگی لازمی ہے۔ یہ چیز آپ کے ہاں مفقود ہے۔ سر سید آپ کا جواب سن کر خاموش ہو گئے۔

سلسلۂ بیعت

اثنائے حج آپ نے مکہ مکرمہ میں حضرت شیخ العالم حاجی امداد اللہ[1] المتوفیٰ ۱۳۱۷ھ کے ہاتھ پر سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کی تھی۔ یہ رنگ

۱؎ حضرت حاجی صاحب مغفور یو پی تھانہ بھون کے رہنے والے۔ تعلیم و تربیت دہلی میں پائی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے اور وہاں مثنوی مولانا روم اور امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم کا درس دیتے اور یہیں آپ نے ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ خود حضرت حاجی صاحب قبلہ شاہ محمد اسحاق نواسہ شاگرد حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے داماد شاگرد مولانا نصیر الدین دہلوی کے ہاتھ سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت تھے اور شاہ صاحب ہی کے ایک اور خلیفہ شیخ نور محمد جھنجھانوی سے چاروں سلسلوں میں بالعموم اور طریقہ چشتیہ میں بالخصوص تکمیلِ سلوک کی تھی۔ ہندوستان کی دیگر اکابر ہستیاں بھی مثلاً مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی، مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دار العلوم دیو بند، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولانا عبد السمیع رام پوری (مولف انوار ساطعہ)، مولوی اشرف علی تھانوی آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھیں۔
• فیصلہ ہفت مسئلہ آپ کی [illegible]

آپ پر ابتداء ہی سے غالب تھا۔ اسی وجہ سے بقدر ذوق کچھ سماع سن لیتے تھے۔ گاہے گاہے اپنی اقامت گاہ پر خاص مجلس سماع منعقد کرتے تھے جس میں ان کے ہندو دوست بھی شریک ہوتے تھے۔

وفات آپ نے نعتیہ کلام میں کوئے حبیب خدا میں پہنچنے کی جس دردمندانہ آرزو کا اظہار کیا تھا وہ بر آئی اور آپ ۱۸۸۹ء / ۱۳۰۶ھ کو حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ۲۵ ذوالحجہ ۱۳۰۶ھ کو آپ مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ تیسری منزل پر پہنچ کر مسافروں میں اچانک وبائے ہیضہ پھوٹ پڑی۔ پانچویں منزل میں آپ پر اس موذی مرض کا حملہ ہوا اور ساتویں منزل کے قریب پہنچ کر جمعرات مورخہ ۲۷۔ ذوالحجہ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۹۰ء داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ کو بیر بالاحسانی مضافات بدر کے پاس دفن کر دیا گیا۔ ؎

جب خاک اُڑے میری مدینے کی ہوا ہو

حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری مؤلف تقدیس الوکیل آپ کے شریک سفر حج تھے نماز جنازہ آپ نے پڑھائی اور یوں مفتی صاحب کی آرزو پوری ہوئی کہ آپ کو اپنے آقا کے قدموں میں جگہ ملی۔ آپ نے مکہ مکرمہ میں ایک غزل لکھی تھی تاکہ روضہ اقدس کے سامنے جا کر ہدیہ کریں۔ اس کا مطلع یہ تھا: ؎

ہے پہنچا سرور عالم کے آج گھر سرور | کھڑا ہے صورتِ دیوانہ زیر در سرور
اب اپنے در پہ ہی رکھوا سے کہ آئندہ | پھر سے جہاں میں نہ آوارہ در بدر سرور

زیارت روضۂ اطہر کے متعلق آپ نے ایک قطعہ کہا تھا جس کا مادۂ تاریخ ۱۳۰۶ھ تھا۔ یہی قطعہ آپ کی تاریخِ وفات بن گیا۔ ؎

ابھی سرور نے کی ہے سرورِ عالم کی پابوسی

حضرت مولانا غلام دستگیر الہاشمی القصوری رحمۃ اللہ علیہ

اہل سُنّت وجماعت کی برھنہ شمشیر

خاندان حضرت مولانا محمد ابوعبدالرحمٰن غلام دستگیر قصوری الہاشمی، قریشی، صدیقی لاہور کے محلہ چلہ بی بیاں اندرون موچی دروازہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی مولانا "حسن بخش" صدیقی تھا۔ مولانا حسن بخش صدیقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دونوں بیٹوں مولانا محمد بخش المتخلص بہ بسمل اور مولانا غلام دستگیر کو دینی علوم و فنون میں بہرہ ور کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ آپ کی والدہ سیدہ مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ تھیں۔ مولانا اپنی مشہور تصنیف "ہدیۃ الشیعتین" میں اپنا رشتہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"باحضرت قصوری نسبت خواہر زادگی فرزندی و شاگردی دارم"[2]

آپ کے آباؤ اجداد اور اساتذہ کے متعلق ۲۵ جنوری ۱۸۸۲ء کے ایک مناظرہ غیر مقلدین میں حافظ محمد لکھوی مؤلف "تفسیر محمدی پنجابی" نے سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

تعلیم و اساتذہ

"میرا خاندان بزرگوار قصور بہت مشہور رہے جن سے اطراف ہند و پنجاب و ڈیرہ جات تک کے خاص و عام فیض یاب و تاثیر ارام ہیں ما سوائے اس فقیر کے قبلہ و کعبہ استاد و مرشد میاں صاحب قصوری علیہ الرحمۃ نے اپنے خاندان کے فیض سے بڑھ کر رئیس اہل علم و تمیز ختم المحدثین والمفسرین مولانا شاہ

---

[1] تاریخ جلیلہ صفحہ ۲۸۴ از مولانا نامی لاہوری

[2] ہدیۃ الشیعتین صفحہ ۸ از مولانا غلام دستگیر قصوری

عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ دہلوی سے علمِ حدیث و تفسیر میں سندِ مستند حاصل کی، اور فقیر نے ان سے بہرہ یاب ہو کر کتابیں لکھیں جن کو علمائے عرب و عجم نے پسند فرمایا۔"[1]

اس اقتباس کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے مولانا نے قصور کے اس عظیم الشان دینی مدرسہ میں تعلیم پائی جہاں سے سید وارث شاہؒ، سید بلھے شاہؒ، خواجہ غلام نبی للٰہیؒ اور خواجہ غلام مرتضیٰؒ بیربل شریف رحمہم اللہ علیہم جیسے نامورانِ اہلِ سنت زیورِ علم سے آراستہ ہو کر نکلے۔ اگرچہ سکھ دور کی چیرہ دستیوں نے اسلامی علوم کے مراکز کو بند کر دیا تھا تاہم مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ نہایت عالی ہمتی سے قصور میں شمعِ علمِ دین کو فروزاں کیے ہوئے تھے۔ خواجہ غلام مرتضیٰؒ بیربلوی، خواجہ غلام نبیؒ للٰہ شریف والے آپ کے ہم مکتب بزرگ تھے۔ اس مدرسہ سے آپ نے سندِ حدیث و تفسیر حاصل کی" تصریح الجاث فریدکوٹ" کے صفحہ نمبر ۳ پر آپ نے صراحت سے لکھا ہے کہ حضرت قصوریؒ کی وفات کے بعد آپ نے اپنے ماموں زاد صاحب زادہ سید عبدالرسول رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بعض کتب درسیہ کا مطالعہ کیا[2]۔ آپ ایک مناجات میں اپنے پیرو مرشد اور اساتذہ کا ذکرِ خیر اس طرح کرتے ہیں:

بہ پیر دہلوی پیر قصوری
بہاں غواص دریائے حضوری

غلام شاہ علی آں پاک مدفن
غلام محی الدین آں قبلۂ من

اخی عبدالرسول استاد احقر
فرضی اللہ علیہم تاج برسر

آپ قرآن پاک کی تلاوت کے عاشق تھے۔ قرآن پاک خوش الحانی اور قرأت سے

---

[1] تحفۂ دستگیریہ ص ۱۵۵

[2] ابحاث فریدکوٹ ص ۳۰

پڑھتے اور خوش الحانی سے پڑھنے والوں کی عزت کیا کرتے تھے۔ ناظرہ پڑھنے کے باوجود قرآن پاک حفاظ کی طرح پڑھتے جاتے ۔ ۱؎ "تحفہ دستگیریہ" میں آپ نے لکھا ہے کہ: "میں نے جو کچھ پایا قرآن خوانی سے پایا ؎

روح پدرم شاد! کہ می گفت باستاد
فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ!"

آپ کی ذہانت، ارتقاء اور محنت نے آپ کے استاد مولانا غلام محی الدین قصوریؒ کو بڑا متاثر کیا۔ چنانچہ حضرت نے اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کر دی۔ آپ کی علمی قابلیت کی شہرت زمانۂ طالب علمی سے مسلّم ہو گئی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے اعتقادی نکھار کے لیے جس پامردی سے کام کیا سارے ہندوستان کے زعماء نے آپ کا لوہا مان لیا۔ اس دور کی علمی اور فقہی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جوان سال غلام دستگیر "مولوی قصوری" کے نام سے ہر مجلس علم و کمال کا مرکزی کردار ہیں۔ علمائے بگّہ مولانا غلام محمد بگویؒ، مولانا ذاکر بگویؒ، خلیفہ حمید الدینؒ، مولانا نور احمد انارکلیؒ، مولانا غلام قادر بھیرویؒ، مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ اور مولانا عبد اللہ ٹونکیؒ اس وقت لاہور کی علمی دنیا کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ مگر ان بزرگوں کی اکثر و بیشتر علمی مجالس "مولوی قصوری" کے دم قدم سے بارونق تھیں۔

انجمن حمایت اسلام لاہور نے جب درسی کتب کا سلسلۂ اشاعت شروع کیا تو آپ کی قابلیت کے پیش نظر اراکین انجمن نے شعبۂ تصانیف کا آپ کو انچارج مقرر کر دیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۸۸۰ء میں آپ نے عیسائیوں کے ایک رسالے تحریف القرآن کے جواب میں ایک رسالہ تحریر کیا جسے انجمن نے شائع کیا۔ آپ نے اس رسالہ اور دوسری تصانیف کی ساری آمدنی انجمن کے فنڈ میں شامل کرا دی۔ ۲؎

۱؎ "تحفۂ دستگیریہ۔ مصنفہ مولانا غلام دستگیر قصوریؒ"

۲؎ نوائے وقت [illegible] اسلام لاہور" محررہ جناب خالد کاشمیری

شہرت و مقبولیت آپ تعلیم سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دینی حلقوں میں شہرت و مقبولیت نے آپ کے قدم چُومے۔ لوگ آپ کی علمی وجاہت کے پیش نظر احترام کرتے۔ جس شہر میں چلے جاتے اہلِ ذوق جوق در جوق جمع ہو جاتے۔ بعض علمی خانوادے تو آپ کی اعتقادی خدمات کے پیش نظر اتنا احترام کرتے تھے کہ اپنے بچوں کے نام تک آپ کے نام پر رکھتے۔ چنانچہ مولانا غلام دستگیر نامی لاہوری[1] (المتوفی ۱۹۶۱ء) اپنی سرگذشت لکھتے ہُوئے "تاریخ جلیلہ"[2] میں بیان کرتے ہیں؛

"مولانا غلام دستگیر قصوری میرے آبائی گاؤں رتہ پیراں میں تشریف لائے میں ابھی پیدا نہیں ہُوا تھا۔ آپ کی دینی خدمات سے متاثر ہو کر میری پھوپھی نے میری پیدائش سے پہلے دُعا کی: "اے اللہ! اگر میرے بھائی کو بیٹا دے تو اس کا نام مولوی قصوری کے نام پر غلام دستگیر رکھوں گی۔ چنانچہ اسی وجہ سے میرا نام غلام دستگیر رکھا گیا۔"

بنامِ نیک مولانا قصوری
غلام دستگیرم نام کردند

بدرسِ اغ او بلبل تخلص
بہ قرآن خواندنم خوش کام کردند

زفیض نام آں ہر دو برادر
نصیبم خدمتِ اسلام کردند

---

[1] مولانا غلام دستگیر قصوری کے بھائی مولانا محمد بخش المتخلص بلبل بڑے فاضل، شاعر اور ادیب تھے۔ مسجد طلا مسجد میں خطیب و مدرس تھے۔ مولانا غلام دستگیر نامی نے آپ سے قرآن مجید پڑھا۔ رائے بہادر کنہیا لال نے تاریخ لاہور میں آپ کو انگریز کے ابتدائی دور کے مشاہیر علمائے لاہور میں شمار کیا ہے۔ آپ نے نعتوں کا ایک مجموعہ بھی لکھا۔ ۲۰ر اگست ۱۸۹۲ء میں وفات پائی۔

[2] تاریخ جلیلہ مصنفہ مولانا غلام [illegible]

اعتقادی خدمات

مولانا کی زندگی اہلسنت وجماعت کی اعتقادی زندگی کو سنوارنے کے لیے ایک مسلسل جہاد تھی۔ انگریز بہادر کی آمد کے ساتھ ساتھ پنجاب وہند میں کئی قسم کے اعتقادی اور نظریاتی فرقوں نے جنم لیا اور نظریاتی الجھنیں پیدا کر دی گئیں۔ چونکہ اس ملک میں اہل سنت وجماعت ہی سوادِ اعظم اور علمائے اہل سنت و جماعت ہی جنگِ آزادی میں پیش پیش تھے۔ انگریز نے ان علمائے کرام کو جو تحریکِ جنگ ہوئے تختہ دار پر لٹکانے اور کالے پانی کی عمر قید کے بعد اہل سنت وجماعت کے اعتقادی قلعے کے نئے نئے پرردوں سے کھوکھلا کرانے کی بھرپور سازش کی۔ مولانا اس طوفان کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ وہ وہابی، نیچری، دیوبندی، مرزائی اور عیسائی معاندین کے اعتراضات کا جواب دیتے تھے۔ ان فتنہ ریزیوں کی بیخ کنی کے لیے آپ ہر شہر، ہر قصبہ میں پہنچے۔ مناظروں کے لیے ہر محاذ پر ڈٹ جاتے۔ بداعتقاد مناظرین کو شکست فاش دینے کے بعد موضوع مناظرہ پر مفصل کتاب لکھتے اور مُفت تقسیم کرتے۔ وہ پنجاب بھر میں قریہ قریہ گئے۔ لوگوں کے سینوں کو نورِ سنیت سے معمور کرتے گئے۔ اس کام کے لیے آپ نے زندگی وقف کر دی تھی۔ وہابی مُنہ چھپاتے پھرتے۔ دیوبندی آپ کی آمد سُن کر علاقہ چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ مرزائی ان کی للکار سے گھبرا جاتے۔ نیچری مقابلہ کی تاب نہ لا کر دم بخود ہو جاتے اور عیسائی مشنیری اپنی مادی قوتوں اور حکمرانی کے باوجود میدان مناظرہ میں نہ ٹھہر سکتے۔ امام اہل سنت وجماعت مجدد زمانہ حاضرہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کو پنجاب کے لوگوں نے دعوت دی تو آپ نے فرمایا:

"وہابیوں کے سرکوب مولانا غلام دستگیر قصوری کے ہوتے ہوئے مجھے آنے کی ضرورت نہیں۔"

آپ کی اعتقادی مصروفیتوں کی جھلک ہمیں آپ کی کتاب "ہدیۃ الشیعتین" کے دیباچہ میں ملتی ہے جو ہم انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ شیعوں کا یہ مجاہد کس قدر بلند عزم اور راسخ العقیدہ تھا اور سُنی اعتقاد کی حفاظت کے لیے کس قدر سینہ سپر رہا۔

"فقیر نے تائیدِ دینِ متین کے واسطے کئی کتابیں لکھیں جن کو علمائے عرب و عجم نے پسند فرمایا۔ ان میں سے "تحفۂ دستگیریہ" بر جواب "اثنا عشریہ" "عمدۃ البیان فی اعلان مناقب نعمان" جو "جواب معیار الحق" میں ہے چودہ برس سے چھپ کر مشتہر ہوئی۔ پھر "رسالہ تحقیق تقدیس الوکیل رد مقلدین ابن تیمیہ" اور "تحقیق صلوٰۃ الجمعہ" جواب "تذکرۃ الجمعہ" اور جواب اعتراضات "بر تحفۂ رسولیہ" یہ تینوں بھی چند سال سے مطبوعہ ہو کر وقف تقسیم ہوئے۔ یہ رسالے علمائے نے پسند کیے۔ اب اردو کا رواج ہے۔

اس لیے یہ آرزو تھی کہ رسالہ "ہدیۃ الشیعتین" کو جس میں فقیر نے فارسی زبان میں قرآن مجید سے شیعہ خوارج کا جواب لکھا ہے۔ اُردو ترجمہ کر کے فارسی اُردو یک جا چھپوایا جائے تاکہ سب کو فائدہ ہو۔ یہ ارادہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ فقیر نے رسالہ "مخرج عقائد نوری" پادری عماد الدین کے "نغمۂ طنبوری" کے رد میں لکھ کر رام پور کا عزم کیا۔ وہاں کے نواب صاحب کی امداد سے وہ رسالہ چھپوا کر مفت تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ شعبان ۱۲۹۴ھ میں فقیر رام پور گیا۔ ہنوز ارادہ کسی سے ظاہر نہ کیا تھا کہ جذب باطنی بریلی کو کھینچ لایا۔ بسبب خشک سالی اور گرانی کے لوگ پریشان تھے۔ بریلی کے علمائے نامدار کی تجویز سے بامامتِ خاکسار نمازِ استسقاء ادا ہوئی۔ ارحم الراحمین نے رحم فرمایا، بہت سا پانی برسایا۔ عمائد بریلی کا فقیر کی نسبت حُسنِ اعتقاد بڑھا۔ مولوی محمد بشیر الدین صاحب وکیل کی اطلاع سے جناب الطاف علی خاں صاحب رئیس بریلی اپنے مقدمہ کی دعا حُسنِ اسلوبی کے لیے فقیر کو اپنے باغیچہ میں لے گئے۔ فقیر ختم خواجگان کے بعد دست بدعا ہوا۔ مجیب الدعا نے اس مقدمہ کو جس میں خاں صاحب کا پچاس ہزار روپیہ نقصان ہو گیا تھا ان کی حسبِ مراد کر دیا اور اس اثناء میں رسالہ موصوفہ کی ایک ہزار جلدیں عمائدین بریلی کی سعی سے چھپ کر مفت تقسیم ہوئیں۔ وہ رسالہ نواب صاحب محمد ابراہیم علی خاں صاحب بہادر والی مالیر کوٹلہ کی نظر سے گزرا تو فقیر کو انہوں نے کوٹلہ میں بلایا۔ چنانچہ فقیر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۵ ہجری میں ان کے پاس آیا اور اُن کے حسنِ اخلاق سے چند روز قیام پذیر رہا۔ اس اثناء میں "ہدیۃ الشیعتین" کا اُردو ترجمہ

مرتب ہُوا۔ پھر ۱۲۹۸ھ میں فقیر نے بدیں غرض سفر کیا۔ اس کی فتوح سے یہ کتاب چھپ کر مفت بانٹی جائے تاکہ اجرِ نشر علوم حقہ ہاتھ آئے۔ پس فقیر کا گوجرانوالہ، وزیر آباد، گجرات، سیالکوٹ، جموں سے ہو کر ڈیرہ اسمٰعیل خاں، بنوں، عیسیٰ خیل میں جانا ہُوا۔ حق تعالیٰ ان دینی بھائیوں کو جزائے خیر دیں جن کی امداد سے یہ رسالہ گیارہ سو جلد چھپوا کر تیار ہو گیا۔ اب مسلمان بھائیوں کو بلا قیمت دیئے جائیں گے"۔[1]

یہ لوگ کتنے باہمت تھے! کتنے باعزم تھے اور اپنے کام میں کتنے مخلص تھے۔ اعتقادی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے صبح و شام، دشت و صحرا ایک کر دیتے تھے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ؎

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں

اہل اللہ سے عقیدت مولانا غلام دستگیر قصوریؒ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود اہل اللہ سے بڑی عقیدت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ جہاں کوئی صاحبِ نظر دیکھا پا برہنہ پہنچے اور زانوئے ادب تہہ کیا۔ حضرت مخدوم علی الہجویریؒ داتا گنج بخش، بابا فرید شکر گنجؒ پاک پٹن، دربار عالیہ چاچڑاں شریف، اوچ شریف اور ملک کے دُوسرے مزارات پر آپ اہتمام سے حاضری دیتے۔ آپ نے اپنی کتاب "تحفہ دستگیریہ" کے صفحہ نمبر ۱۳۲ پر خواجہ فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے عرس پاک پر زائرین کے بے پناہ ہجوم کا منظر یُوں کھینچا ہے:

"فقیر مزار پُر انوار حضرت شیخ فرید شکر گنجؒ پاک پٹن شریف گیا۔ وہاں حضرت مولانا مولوی داد بخش مرحوم مجھے ایک بلند مقام پر لے گئے، جہاں سے زائرین کا ہجوم صاف دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہُوئی کہ ہزاروں لوگ صف بستہ رواں دواں بہشتی دروازہ کو جا رہے ہیں اور کئی لوگ ان زائرین کے سر پر پاؤں رکھ کر بڑی تیزی سے

---

[1] ہدیۃ الشیعتین مصنفہ مولانا غلام دستگیر قصوریؒ

دروازے کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ دروازہ کے قریب جا کر وہ انسانوں کے ہجم غفیر میں غوطہ لگاتے اور دروازے سے گزرتے ہیں۔ جن لوگوں کے سر اور کندھوں پر سے یہ لوگ گزر رہے تھے وہ نہ تو شکایت کرتے اور نہ ہی کسی تکلیف کا اظہار کرتے۔ ان محبت کیش عوام کی عقیدت و محبت کی محویت کا یہ منظر میرے لیے حیران کن تھا۔ اور جن بزرگانِ دین کی کرامات کا میں علمی طور پر قائل تھا اپنی آنکھوں دیکھ کر یقین کے رُتبہ کو پہنچا۔"[1]

از کرامت خار گلشن مے شود
دیدۂ بے نُور روشن مے شود

بہاول پور کا تاریخی مناظرہ

اہل سنّت و دیوبند کے نظریاتی اختلاف میں بہاول پور کا مناظرہ بڑی تاریخی اہمیت کا معرکہ ہے۔ اعتقادی دُنیا میں غالباً یہ پہلا معرکہ ہے جس میں دیوبندی مکتبِ فکر کے جلیل القدر مشاہیر آئے اور مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں شکست فاش کھا کر ریاست بدر کر دیئے گئے۔ مولانا کے ایک دوست مولوی خلیل احمد صاحب بہاول پور کے اسلامی مدرسہ میں عربی مدرس تھے۔ انہوں نے اعتقاد اہل سنّت کے برعکس مولانا عبدالسمیع رام پوری رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف "انوار ساطع" کے جواب میں ایک کتاب "براہین قاطعہ" لکھی۔ اس کتاب میں اہل سنّت کے اعتقادات کے بالکل برعکس خیالات کا اظہار کیا گیا جس سے علمائے اہل سنّت میں ایک اضطراب پھیل گیا۔ اس کتاب کی تائید جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے کی اور مولوی خلیل احمد صاحب کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا۔ اس کتاب میں مندرجہ ذیل مسائل کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی:

۱۔ انعقادِ محفلِ میلاد اور قیام ذکر پیدائش آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرونِ ثلثہ سے ثابت نہیں لہٰذا یہ بدعت ہے۔

---

[1] تحفۂ دستگیریہ صفحہ ۳ ۱۴ مولانا غلام دستگیر قصوری۔

۲۔ بروز عیدین، پنج شنبہ وغیرہ میں فاتحہ مرسومہ ہاتھ اٹھا کر برائے ایصال ثواب بدعات ناپسندیدہ شرعیہ ہیں۔

۳۔ مسئلہ امکان کذب باری تعالیٰ۔

۴۔ مسئلہ امکان نظیر سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔

۵۔ تمام بنی آدم کا بشریت میں آپ کے برابر ہونا۔

۶۔ آپ کا علم شیطان کے علم سے کمتر ہے [۱]

اس تاریخی مناظرہ میں حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین چاچڑاں شریف کو حکم مناظرہ مقرر کیا گیا اور فریقین کے مقتدر علمائے فکر شریک ہوئے۔ نتیجۃً مولوی خلیل احمد صاحب انبیٹھوی نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور انہیں ریاست بہاولپور چھوڑنا پڑی۔ چونکہ اس معرکۃ الآراء مناظرہ کو اعتقادی دنیا میں ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ بدیں وجہ ہم اس کی روئداد کا اقتباس "تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل" سے ہی بلفظہ نقل کرتے ہیں۔

رمضان المبارک میں حسب الطلب ریاست بہاولپور کے فقیر مناظرہ کے لیے وارد بہاولپور ہوا اور خلیل احمد صاحب جو رخصت پر تھے بھی ہم مشرب علماء لے کر عشرۂ آخر رمضان المبارک میں وارد بہاولپور ہوئے جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ مولوی محمود حسن مدرس مدرسہ دیوبند۔

۲۔ مولوی صدیق احمد مقیم ریاست مالیر کوٹلہ۔

۳۔ مولوی محمد مراد۔

۴۔ مولوی عبدالحق متوطن پور قاضی۔

۵۔ مولوی جمعیت علی مدرس فارسی بہاول پور۔

علمائے اہل سنت سے مندرجہ ذیل علمائے کرام تشریف لائے تھے:

---

[۱] تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل مصنفہ مولانا غلام دستگیر قصوریؒ۔

۱۔ مولوی سلطان محمود تلیری والے۔

۲۔ مولوی عبدالرشید مدرس مدرسہ حضرت صاحب السیر رحمۃ اللہ علیہ۔

۳۔ مولوی عمر بخش صاحب مرحوم۔

۴۔ مولوی غلام نبی مرحوم۔

۵۔ مولوی اللہ بخش صاحب مرحوم۔

رمضان المبارک میں شدتِ گرما کے سبب سے انعقاد مجلسِ مناظرہ بعد عید سعید قرار پایا۔ پس ۲ شوال کو حضرت صاحب کے قیام فرودگاہ پر اراکین ریاست بہاولپور جمیع علماء و شرفاء جمع ہوئے تو فقیر راقم الحروف نے محض تائید دین متین کی غرض سے چند اعتراضات مسائل براہین قاطعہ پر عرض کیے اور اول سے آخر تک پڑھ سنائے"[1]

مناظرہ کے اختتام پر اہل سنت وجماعت کو فتح ہوئی اور شیخ الشیوخ خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ حَکَم مناظرہ نے فیصلہ لکھا۔

"مولف براہین (مولوی خلیل احمد صاحب انبیٹھوی) معہ اپنے معاونین کے وہابی ہیں اور اہل سنّت سے خارج ہیں۔"

اس مناظرہ کی تفصیلی روئداد "تقدیس الوکیل" میں قلم بند کی گئی مگر یوپی کے بعض علمائے دیوبند نے اسے جانب دار قرار دے کر فیصلہ سے انحراف کر لیا۔

حضرت مصنفؒ ۱۳۰۷ھ جمادی الاخریٰ میں بہ عزم حج بیت اللہ شریف وارد بمبئی ہوئے اور جہاز پر سوار ہوتے ہی مناظرہ کی کارروائی کو عربی میں لکھنا شروع کر دیا۔ حجاز مقدس پہنچ کر علمائے حرمین الشریفین کے سامنے پیش کر دیا اور فتویٰ حاصل کر کے کتاب کی تائید و تصدیق حاصل کی۔ جن علمائے حجاز نے آپ کی اس مشہور کتاب کی تائید فرمائی ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ مولانا مولوی رحمت اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ۔

---

[1] تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل۔ مولانا غلام دستگیر قصوریؒ

۲۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

۳۔ محمد صالح کمال رح مفتی حنفیہ مکہ مکرمہ

۴۔ حضرت مفتی شافعیہ و شیخ العلماء مکہ معظمہ محمد سعید رح۔

۵۔ مفتی مالکیہ مکہ محمد عابد بن شیخ حسین رح

۶۔ مفتی حنبلی مکہ معظمہ خلف بن ابراہیم رح۔

۷۔ مفتی حنفیہ مدینہ شریف عثمان بن عبدالسلام داغستانی رح۔

۸۔ مولوی محمد علی بن سید ظاہر وتری حنفی مدنی مدرس مسجد شریف نبوی۔

تقدیس الوکیل کی اشاعت نے دنیائے اہل سنت میں مسرت و افتخار کی لہر دوڑا دی۔ یہ کتاب عربی اردو دونوں زبانوں میں چھپی[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درود پاک الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پر قدغن لگانا ہمارے ملک کے بد اعتقاد علماء کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ مولانا غلام رسول مرحوم قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ نے اپنے ایک قصیدۂ مدحیہ میں بڑے پُر درد انداز میں اپنے آقا و مولا کو مخاطب کیا تھا:

صبا روضے رسول اللہ تے جائیں
میرا احوال رو رو کے سنائیں
میرا دل چور کیتا درد تے غم
ترحم یا نبی اللہ ترحم

اس عاشقِ رسول مولوی صاحب کے برادر زادہ مولوی احمد علی اور آپ کے صاحبزادہ مولوی عبدالعزیز نے گوجرانوالہ میں ۱۳۱۲ھ میں ایک اشتہار شائع کیا،

---

[1] حال ہی میں یہ کتاب از سر نو مکتبہ نبویہ لاہور نے چھپوا کر اعتقادیات کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک ... مواد بہم پہنچایا ہے۔

جس میں "الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ" کہنا بدعت سیئہ قرار دیا گیا۔ اس اشتہار نے گوجرانوالہ کے عوام میں نفرت واضطراب کی لہر دوڑا دی۔ مولانا غلام دستگیر قصوری ۵۔ جمادی الاوّل کو گوجرانوالہ پہنچے۔ آپ نے ان حضرات کو للکارا اور کہا کہ اس مسئلہ پر مجمع عام میں گفتگو کے لیے تیار ہوجائیں مگر مولوی احمد علی کوٹ بھوانی داس والے مولوی عبدالعزیز قلعہ میاں سنگھ والے شہر چھوڑ کر ایک گاؤں میں چلے گئے۔ مولانا نے ان کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ وہاں سے بھی آگے نکل گئے۔ اسی گروہ کے ایک مولوی عبدالقادر تو مناظرہ کی بجائے صلح جوئی پر آمادہ ہوگئے اور اپنے عقیدہ سے تائب ہوگئے مگر مولوی عبدالعزیز اور مولوی احمد علی مجمع عام میں مناظرہ کے لیے تیار نہ ہوئے۔ حضرت مولانا قصوری نے ایک رسالہ "جواب اشتہار کفریت درود شریف الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ لکھا جسے شیخ رحیم بخش (گوجرانوالہ) نے شائع کر کے عوام میں تقسیم کیا۔

آپ محض مناظرہ اور مکالمہ سے ہی اعتقادی خدمات سرانجام نہیں دیا کرتے تھے بلکہ علمی تصانیف کو بڑی اہمیت دیتے۔ آپ کی تالیفات کے کئی ایڈیشن چھپے اور تقسیم ہوئے۔ بعض اوقات آپ امراء عقیدت مندوں کو حکم دیتے۔ وہ کتاب چھپوا کر غرباء و اہلِ ذوق میں مفت تقسیم کرتے۔ آپ کی تصانیف کا تفصیلی جائزہ لینے اور ان پر تعارفی نوٹ لکھنے کی بجائے ہم یہاں اُن کے نام اور سنِ سال تصنیف لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو علمی اور قلمی جدوجہد کا بھی اندازہ ہو سکے۔

	سالِ طباعت
۱۔ عمدۃ البیان فی اعلان مناقب النعمان	۱۲۸۵ھ
۲۔ تحفہ دستگیر بر جواب آنا عشریہ	" " ۱۲۹۴ھ
۳۔ تحقیق صلوٰۃ الجمعہ[1]	" " ۱۲۸۸ھ
۴۔ مخرج عقائد نوری عقائد پادری عماد الدین فتنہ طنبوری	" " ۱۲۹۴ھ
۵۔ ہدیۃ الشیعین منقبت چہار یار معہ حسنین	" " ۱۲۹۵ھ

[1] یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں حضرت میاں رکت علی صاحب گھنگ شریف (ضلع لاہور) نے شائع کرا کے اپنے علاقہ میں تقسیم کی تھی۔

۶۔ توضیح دلائل وتصریح الجاث فرید کوٹ — سالِ طباعت ۱۳۰۰ھ
۷۔ غزوۃ المقلدین بالہام القوی المبین — 〃 〃 ۱۳۰۰ھ
۸۔ ظفر المقلدین — 〃 〃 ۱۳۰۲ھ
۹۔ رجم الشیاطین براغلوطات البراہین — 〃 〃 ۱۳۰۲ھ
۱۰۔ جواہر تقفیہ ردّ نیچریہ — 〃 〃 ۱۳۰۴ھ
۱۱۔ ظہور اللمعہ فی ظہر الجمعہ — 〃 〃 ۱۳۰۴ھ
۱۲۔ تحقیق تقدیس الوکیل — سالِ طبع ندارد
۱۳۔ تحقیقات دستگیریہ فی ردّ ہفوات براہنیہ — 〃 〃 〃
۱۴۔ کشف السور عن مسئلہ طواف القبور — سالِ طباعت ۱۳۰۵ھ
۱۵۔ نصرۃ الابرار فی جواب الاشتہار — 〃 〃 ۱۳۰۵ھ
۱۶۔ تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل (عربی اردو) — 〃 〃 ۱۳۰۷ھ
۱۷۔ فتح الرحمانی بہ دفع کیدِ قادیانی — ۱۳۱۴ھ

مندرجہ بالا تصانیف برِّصغیر پاک وہند کی اعتقادی کش مکش کی ایک اہم کڑی ہیں۔

برصغیر کی فکری واعتقادی تاریخ مرتب کرتے وقت ان تصانیف کو سامنے رکھے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی۔ ان تصانیف سے ہم یہ اندازہ لگانے میں بھی کامیاب ہوجائیں گے کہ ہمارے علماء ربّانی نے عقائد ونظریات کی حفاظت کے لیے کتنا کام کیا اور پھر ان حالات میں جب کہ اسلام کو مٹانے کے لیے ہزاروں طوفان اُٹھے اور استقلال کے ان پہاڑوں سے ٹکرائے۔

مرزا قادیانی سے مباہلہ حضرت مولانا غلام دستگیر قصوریؒ نے قادیانی نبوت کا ۱۳۰۱ھ سے سخت نوٹس لیا۔ عوام الناس کو خبردار کیا کہ قادیانی تحریک مسلمانوں کو کس سمت لے جانا چاہتی ہے۔ ذوالحجہ ۱۳۰۱ھ میں پہلی بار براہین احمدیہ سامنے آئی یہ پہلی کتاب تھی جس نے مرزا صاحب کے الہامات کو پیش کیا

برصغیر کے اعتقادی حلقوں کو ایک ذہنی کش مکش سے دوچار کر دیا۔ چنانچہ مولوی رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے (جو ان دنوں سلطان ترکی کے شیخ الاسلام تھے) مولانا غلام دستگیر قصوری کے ایک رسالہ رجم الشیاطین کو دیکھا اور مرزا کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ اس رسالہ پر اس وقت کے علماء حرمین اور عجم نے اپنی مہریں لگائیں لیکن بایں ہمہ مولانا نے کوشش یہ کی کہ مرزا صاحب اپنی غلطیوں کا ازالہ کریں اور تائب ہو جائیں۔ یہ کوشش ۱۳۱۲ھ تک جاری رہی۔ آخر کار ماہ صفر ۱۳۱۲ھ میں یہ فتاویٰ شائع کر دیا گیا۔ اس فتویٰ کی اشاعت سے قادیانی بوکھلا اٹھے کیونکہ ان کے ہاں یہ پراپیگنڈہ عام تھا کہ صرف ہندوستان کے چند مولوی مرزا صاحب کے عقاید کے خلاف ہیں۔ عالم اسلام تو انہیں نبی مانتا ہے جب علمائے حرمین الشریفین کا فتویٰ سامنے آیا تو مرزا صاحب نے ۱۳۱۴ھ میں رسائل اربعہ کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا اور مولانا غلام دستگیر کو دعوتِ مباہلہ دی۔ اس مباہلہ کی مفصل کیفیت کتاب فتح رحمانی بہ دفع کید قادیانی کے دیباچہ میں ان الفاظ میں شائع ہوئی:

"اخیر رجب ۱۳۱۴ھ میں مرزا صاحب نے رسائل اربعہ فقیر کو بھیج کر دوسرے علمائے کرام کے ساتھ فقیر کو بھی مباہلہ کے لیے قسمیں دے کر بلایا اور مباہلہ سے بھاگنے والوں کو ملعون بتایا۔ فقیر نے بہ نظر صیانت عقاید اہل اسلام مرزا جی کو قبولیت مباہلہ لکھ کر بھیج دیا۔ ۱۳۱۴ھ تاریخ مقرر کر کے مع اپنے دونوں فرزندزادوں کے ۲ شعبان وارد لاہور ہوا جس پر مرزا صاحب کی طرف سے حکیم فضل دین لاہور میں آیا اور ایک مجمع کثیر کر کے مسجد ملا مجید (واقع چہل بیبیاں موچی دروازہ) فقیر پر معترض ہوا کہ حضرت مرزا صاحب نے آپ کی یہ غلطی نکالی ہے کہ مباہلہ قرآن میں صیغہ جمع ہے اور آپ تنہا کیونکر کر سکتے ہیں۔ فقیر نے اسی مجمع میں اپنے رقعہ قبولیت مباہلہ سے اپنے فرزندوں کی شمولیت سے اپنا جمع ہونا ثابت کر دیا بلکہ اس وقت دونوں کو رُو برو کر دکھایا جس پر مسیح موعود اور اس کے حوارین کی غلطی مانی گئی۔ پھر ظہور اثر

مباہلہ کے لیے مرزا جی نے ایک برس میعاد رکھی تھی۔ فقیر نے بدلیل قرآن و حدیث اٹھانا چاہا۔ اس پر حکیم مذکور اور مرزا صاحب نے ہٹ کی جس پر فقیر نے ۲۴ شعبان کو اشتہار شائع کیا اور میعاد ۱۰ شعبان مقرر کی اور اخیر شعبان تک منتظر رہا۔ اور امرت سر جا کر مرزا جی کو قادیان سے بلایا وہ مباہلہ کے لیے نہ آئے اور اشتہار مورخہ ۱۰ شعبان بجواب اشتہار فقیر اس مضمون کا شائع کیا کہ تمام احادیث صحیحہ سے ظہور اثر مباہلہ کی میعاد ایک سال ثابت ہے اور مدعی نبوت پر لعنت بھیجتا ہوں اور میری تکفیر کرنے والے تقویٰ اور دیانت کو چھوڑنے اور مجھ کو باوجود کلمہ گو اور اہل قبلہ ہونے کے کافر ٹھہراتے ہیں۔ اس کے جواب میں فقیر نے پندرہ اکابر علماء اہلسنت لاہور، قصور اور امرت سر سے بدلیل قرآن کریم تصدیق کرایا کہ مباہلہ شرعی میں کوئی میعاد سال نہیں ہے۔ مرزا قادیانی نے محض بغرض دھوکہ دہی جواب کا جھل وطیرہ قید ایک سال کی لگائی ہے۔"

جب مرزا صاحب کسی مباہلہ، مباحثہ، مناظرہ اور مفاہمہ کے لیے تیار نہ ہوئے تو مولانا نے ان الفاظ میں دعا کی:

"اے مالک الملک جیسا کہ تو نے ایک عالم ربانی حضرت محمد طاہر مولف مجمع الانوار کی دعا و سعی سے اس مہدی کاذب اور جعلی مسیح کا بیڑہ غرق کیا تھا ویسا ہی دعا و التجا اس قصوری کان اللہ لہٗ سے جو سچے دل سے تیرے دین متین کی تائید حتی الوسع ساعی ہے۔ مرزا قادیانی اور اس کے حواریوں کو توبہ نصوح کی توفیق رفیق عطا فرما۔ اگر یہ مقدر نہیں تو ان کو مورد اس آیت قرآنی کے بنا: فقطع دابر القوم الذین کفروا۔"

آپ کی وفات کے بعد مرزا صاحب کو فوراً "الہام" ہوا کہ مولوی غلام دستگیر قصوری اس مباہلہ سے مرے ہیں۔ حقیقۃ الوحی کی عبارت ملاحظہ ہو:

مولوی غلام دستگیر قصوری نے اپنے طور پر مجھ سے مباہلہ کیا۔ اپنی کتاب میں دعا کی جو کاذب ہے، خدا اسے ہلاک کرے۔[۱]

---

[۱] حقیقۃ الوحی ص

مولوی ثناء اللہ اور مرزا صاحب

لطف کی بات یہ ہے کہ اس الہام کو اصولِ صداقت بنانے والے مرزا صاحب خود موت کے دروازے پر پہنچ کر اس اصول کو توڑ دیتے ہیں۔ مرزا صاحب نے ۵، اپریل ۱۹۰۷ء کو ایک اشتہار بدیں مضمون نکالا:

"اے خدا! مجھ میں اور ثناء اللہ (امرت سری) میں سچا فیصلہ فرما اور جو تیری نگاہ میں حقیقت میں جھوٹا وکذاب ہے اس کو صادق کی زندگی میں ہی دنیا سے اٹھا لے۔"

اس اشتہار کی اشاعت کے ایک سال تین ماہ بعد مرزا صاحب تو دنیا سے اٹھ گئے اور مولوی ثناء اللہ نشانِ صداقت بن کر کئی سال زندہ رہے۔ اب ساری مرزائی امت ہمارے مولانا غلام دستگیر قصوریؒ کی وفات پر نشانِ صداقت ونبوت کا اعلان کرنیوالے مولوی ثناء اللہ امرت سری کی صداقت کا اعلان اس لیے نہیں کرتے کہ الہامات میں ترمیم کرنے والی نبوت خود زینت لحد ہو چکی تھی۔ اب اس جماعت کے بعض محققین اس مباہلہ اشتہاری کو اس لیے مباہلہ کی صف میں نہیں لاتے۔ وہ اس مباہلہ کا ذکر ضرور کرتے ہیں جو مولوی غلام دستگیر قصوریؒ سے یک طرفہ ہوا تھا، مگر کہتے ہیں کہ مولانا ہماری دعا سے فوت ہوئے حالانکہ مولوی غلام دستگیر قصوریؒ کی دعا میں یہ کہیں نہیں کہ جو جھوٹا ہو گا آگے مار، بلکہ فقطع دابر القوم الذین ظلموا میں قادیانیوں کی جڑ (مرکز قادیان) کو ختم کرنے کی التجا کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرکز کٹ گیا ہے۔

شعری ذوق

اپنی مصروف زندگی کے باوجود بھی طبیعت میں شعر گوئی کا بڑا ذوق سلیم تھا۔ گاہے گاہے شعر کہتے اور خوب کہتے۔ تضمین بہت خوب ہوتی۔ فارسی اشعار پر تو خاص طور پر داد حاصل کرتے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جاں فدائے تو یا رسول اللہ ۔۔۔ دیدہ جائے تو یا رسول اللہ
جملہ عالم رضائے حق جویند ۔۔۔ حق رضائے تو یا رسول اللہ
ہم مخلوق شد ز کتم عدم ۔۔۔ از برائے تو یا رسول اللہ

حضرت مولانا جامی کی ایک مشہور نعت پر آپ یوں تضمین کرتے ہیں:

حبذا حسن کہ شد عاشق از رحمانم — از روئے صدق بود روئے خوشت قرآنم
گفت یوسف بخدا گو کہ مہ کنعانم — من بے دل کمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

اور

دیدہ گریاں سینہ بریاں آہ و نالہ دمبدم — ہے یہ ذوق اپنا ہے یہ اپنا زیروبم
دل کو ہے یہ فکر جی میں رات کو بھی ہے یہ غم — کے بود یارب کہ سوئے یثرب و بطحا کنم
گہ بہ بطحا منزل و گہ در مدینہ جا کنم

فن شعر گوئی میں تاریخ گوئی ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوریؒ، اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء اس فن میں بڑے ماہر تھے۔ مولانا غلام دستگیر قصوریؒ بھی اس فن میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ وُہ اپنی تصانیف کا نام تاریخی رکھتے۔ ایک کتاب کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرتے ہُوئے بدیں الفاظ تاریخ کہتے ہیں:

گویم ز جان و دل ثنا بر خالق ہر جزو کل — کایں تحفہ گشتہ منطبع از عون آں ہادی سبل
تاریخ طبعش در دلم القا شد از غیب ایں چنیں — از قطع راس انترا ایں ہدیہ فخر الرسل
۱۲۸۵ھ

"تحفۂ دستگیریہ بہ جواب اثنا عشریہ" کا سالِ تصنیف یوُں لکھتے ہیں:

بحق کہ بر حق ایں دماغ سوختنم — نہ آرزوست بمدحے نہ نفرت از ذمم
رجائے اجر ندارم دریں عمل ز کسے — مگر بدیدۂ انصاف پسند اہل علم
ز طعن حضرت نجدیہ ہم نیندیشم — کہ تا قلم من و در نقل نیست ہیچ ندم
بفضلِ خویش گرامی کند خداوندا — کہ ہدیہ الیست بدرگاہِ شاہِ فخر امم
چو خواہی از سن انجام و سال ختم خبر
ہزار و صد و ہشتاد و نہ بخواں درم
۱۲۸۹ھ

اولاد و اخلاف آپ کے ایک صاحبزادے مولانا عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ انہی کی وجہ سے آپ کی کنیت ابو عبدالرحمٰن تھی۔ بڑے پارسا،

عابد اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ علم میں یکتائے روزگار مانے جاتے تھے۔ نام و نمائش سے گریزاں تھے۔ ان کے دوسرے صاحبزادے مولانا غلام ابوبکر بھی اپنے والد محترم کی طرح بڑے زاہد و عابد تھے۔ آپ کا مزار موضع رتیکے تحصیل منچن آباد بہاولنگر میں ہے جہاں آپ کے صاحبزادے مولینا محمد اشرف ایک عرصہ سجادہ نشین رہے اور ۱۹۷۰ء میں واصل بحق ہوئے۔ مولانا غلام دستگیر قصوری کے عقیدت مند بہاولپور ڈویژن میں ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مولانا غلام دستگیر قصوریؒ کی ایک صاحبزادی ہاجرہ بیگم مرحومہ سید وزیر علی (المتوفیٰ ۱۹۰۰ء) والد جناب سید مراتب علی شاہ رئیس اعظم لاہور کی بیوی تھیں جن کے بطن سے چار بچے سید علی اکبر، سید اصغر علی، سید صفدر علی اور سیدہ منور بیگم تاہنوز خدا کے فضل سے خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ وضاحت ہمیں اس لیے ضروری محسوس ہوئی کہ مرزائی اپنی تحریروں میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ مولوی غلام دستگیرؒ ہمارے مرزا صاحب کی بددعا سے بے اولاد تھے۔

ع درازدستی این کوتاہ آستیناں بیں

آپ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کی گہما گہمی میں ۱۳۱۵ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی موت نے مکتب قصور کا ایک قابل شاگرد، اہل سنت کا جری مجاہد، علم و فضل کا دریا، ہمت و استقلال کا کوہ الوند پیوستِ خاک کر دیا۔

مولانا مفتی غلام محمد بگوی

جن کی تحریک سے جامع مسجد عالمگیری واگزار ہوئی اور اذان وجماعت کا اہتمام کیا گیا

حضرت مولانا غلام محی الدین بگوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند مفتی غلام محمد بگویؒ ۱۲۵۵ھ میں بگہ میں پیدا ہوئے۔ بھیرہ کے بازاروں میں گھومنے والے ایک صاحبِ حال بزرگ نے آپ کے والد کو بیٹے کے صاحبِ علم وفضل ہونے کی بشارت دی تھی۔

کتب درسیہ اپنے والد محترم سے پڑھیں علم حدیث کی سند بھی آپ ہی سے لی۔

آپ فرمایا کرتے تھے :

"والد محترم علوم ظاہریہ کے ساتھ ساتھ اصلاحِ باطن کی طرف خاص توجہ دیا کرتے تھے ایک رات ایک خاص وظیفہ پڑھنے کا حکم دیا تو خواب میں سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ میں نے بارگاہِ رحمتِ دوعالم میں التجائے کرم کی تو ایک جان بخش مسکراہٹ سے جواب ملا : کل امرٍ مرھونٌ بوقتہٖ۔ صبح ہوئی تو خواب والد صاحب کو سنایا۔ آپ نے فرمایا :" مبارک ہو! دین ودنیا کے امور کی درستگی کی بشارت مل گئی ہے" اور والد مکرم سے کہا اس خواب کے بعد مجھ پر اتنے علوم منکشف ہوئے جو میرے حوصلے سے بھی زیادہ تھے۔"

بیعت وکسب سلوک آپ حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر بیعت تھے۔ اس طرح آپ سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک ہوگئے اور سلوک کی منازل طے کرنے لگے۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت قبلۂ عالم خواجہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی فیض حاصل کیا اور اس طرح چشتیہ برکات سے فیض یاب ہوتے رہے۔ آپ کو حضرت داتا گنج بخش لاہوری، سلطان العارفین حضرت

سلطان باہو رحمہا اللہ تعالیٰ سے خاص عقیدت تھی۔ حضرت باباجی فقیر محمد نیراہی سے تو آپ نے خصوصی توجہ حاصل کی چنانچہ صاحبزادہ باولی شریف ضلع گجرات والے فرمایا کرتے تھے کہ "باباجی نے جو کچھ آپ کو دیا کسی دوسرے کے حصہ میں نہیں آیا۔" [1]

شاہی مسجد لاہور کی خطابت سکھوں نے اپنے عہدِ سلطنت میں جامع مسجد عالمگیری المعروف شاہی مسجد کو چھاؤنی میں تبدیل کر دیا تھا۔ سکھ فوجیوں کے گھوڑے مسجد کے وسیع صحن میں بندھتے اور حوض سے پانی پیتے۔ بارود خانہ مسجد کے حجروں میں تھا۔ جب کوئی دوسرا حملہ آور سکھ آتا تو مسجد کے مینار سے نصب شدہ توپوں سے گولے برسائے جاتے۔ جواباً جو گولہ باری ہوتی وُہ اکثر مسجد کے محراب و منبر کو مجروح کرتی اور میناروں کو ہلا دیتی۔ انگریزوں نے ۱۸۴۷ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا تو مسجد بدستور چھاؤنی ہی بنی رہی۔ آپ تصور کریں کہ لاہور کے مسلمانوں کے قلب و جگر پر کیا گزرتی ہوگی۔ جب ان کی اتنی بڑی مسجد ان کی آنکھوں کے سامنے اس حالت میں ہو۔ حالات معمول پر آئے تو مولانا غلام محمد بگوی رحمہ نے ایک تحریک شروع کی جس کا مقصد مسجد کو خالی کرانا تھا۔ ان کی لگاتار جدوجہد نے لاہور کے متقدر مسلمانوں کو بھی اس مطالبہ کا ہمنوا بنا دیا تھا اور وُہ بھی جرأت اور دیانت داری کے ساتھ آپ کے معاون بن گئے۔ ڈپٹی برکت علی مرحوم اور فقیر جمال الدین مرحوم اور دیگر اکابرین نے مولانا کے ساتھ مل کر اس مسجد کو مسلمانوں کی عبادت کے لیے حاصل کر لیا اور اسے پاک کیا گیا اور مرمت کر کے باقاعدہ اذان و خطبہ جماعت کا اہتمام کیا گیا۔ مولانا غلام محمد بگوی رحمہ کو نہ صرف شاہی مسجد کا پہلا خطیب اور امام مقرر کیا گیا بلکہ مسجد کی تولیت بھی آپ کے سپرد کی گئی۔ [2]

مسجد کی رونق میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ مولانا غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک دارالافتاء قائم کیا جہاں اہلِ سنّت وجماعت کے علماء کا ایک بورڈ قائم کر دیا گیا جو

---

[1] حدائق حنفیہ ص ۴۸۰

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۴۰۰

دینی مسائل کے جوابات دیتا اور عوام کے استفسارات کا جواب دیتا۔ ملت اسلامیہ کے تمام مسائل پر رائے زنی کرتا اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی راہنمائی کرتا تھا۔ لاہور کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی ابتری کے باوجود مولانا نے اسلامی زندگی کو ہموار رکھنے کے لیے بڑا اہم کام کیا۔ علماء کرام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے آپ دن رات کوشاں رہتے۔ انجمن نعمانیہ کے ذہین طلباء دقیق مسائل پر آپ سے تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ شہر کے تمام سنی علماء مسائل کے حتمی فیصلے کے لیے آپ سے ہی رجوع کیا کرتے تھے۔ ملک کے اعتقادی لٹریچر پر نظر ڈالی جائے تو اس دور میں شاید ہی کوئی کتاب اہل سنت کے مسلک پر چھپی ہو جس پر آپ کی مہرِ تصدیق ثبت نہ ہوئی ہو۔ مولانا غلام قادر بھیروی، مولانا محمد ذاکر بگوی، مولانا محمد عالم آسی امرت سری، مولانا غلام دستگیر قصوری، مولانا نور احمد صاحب تو آپ سے اکثر استفادہ کیا کرتے تھے۔

آپ کے دو نامور صاحبزادے مولوی محمد رفیق المتوفی ۱۳۴۳ھ خطیب جامع بگہ اور مولانا محمد شفیق بگوی جو شاہی مسجد کی سولہ سال خطابت کرنے کے بعد ۱۳۳۹ھ میں اپنے وطن مالوف بگہ میں چلے گئے۔ یہ دونوں صاحبزادے بڑے عالم دین، خدا ترس اور متقی فقیہہ تھے۔

آپ حضرت مجدد الف ثانی کے عرس پر ہر سال سرہند شریف حاضر ہوتے۔ وہاں بزرگانِ دین اور اولیائے وقت کا اجتماع ہوتا آپ ان کی زیارت سے فیض حاصل کرتے۔ حج بیت اللہ کے موقعہ پر جب روضۂ اقدس کے سامنے حاضر ہوئے تو جس عقیدت و والہیت کا مظاہرہ کیا وہ آپ کی محبت اور روحانی عظمت کی علامت ہے۔[1]

وفات آپ ۱۲ رجمادی الآخر ۱۳۱۸ھ کو واصل بحق ہوئے۔ مادۂ تاریخ

بجھا ہے پنجاب کا چراغ آہ اب

ہے۔ آخری آرام گاہ بگہ میں ہے۔

---

[1] تذکرہ مشائخ بگہ

حضرت مولانا غلام احمد رحمۃ اللہ علیہ

انجمن نعمانیہ کی علمی جدوجہد کے رُوحِ رواں

مولانا غلام احمد مرحوم کے والد کا نام شیخ احمد تھا۔ آپ ۱۲۷۳ھ میں بمقام کوٹ اسحاق تحصیل حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالتے ہی تحصیلِ علوم میں منہمک ہو گئے اور اطرافِ ملک کے اہلِ علم کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کی۔ آپ نے جن جلیل القدر علماء و فضلاء کے چشمۂ فیض سے اپنی تشنگیِ علم کو دُور کیا۔ ان کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:

مولانا علاؤالدین بھابھڑہ ضلع ہوشیارپور۔ مولانا شاہ دین۔ مولوی محمد الدین ساکن احمد نگر گوجرانوالہ، مولانا ابواحمد مراد علی صاحب بیگووال علاقہ کپورتھلہ۔ مولانا محمد عمر رام پور منہاراں، مولوی عبداللہ تلونڈی ہوشیارپور اور حضرت مولانا غلام قادر صاحب بھیروی بیگم شاہی مسجد لاہور۔ مولوی محمود حسن دیوبندی۔ مولوی محمد یعقوب۔ میاں نذیر حسین دہلوی۔

بعد فراغ تعلیم آپ اُس عہد کی عظیم سُنّی درس گاہ دارالعلوم نعمانیہ لاہور میں بحیثیت مدرس دوم طلبہ کو درس دینے میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے اپنی خداداد ذہانت و قابلیت کی بدولت بہت جلد اپنی فضیلت علمی کا لوہا منوا لیا اور تھوڑے عرصے بعد صدر المدرسین اور مفتی اعظم انجمن نعمانیہ کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ آپ کے زمانے میں مدرسہ نعمانیہ نے بے حد ترقی کی اور اطراف و اکناف ملک سے طلبائے دینیہ کھنچے چلے آنے لگے۔ چنانچہ اُن کے عہد میں منتہی طلبہ کی تعداد تین صد کے قریب تھی۔ جن کی کلاسیں شاہی مسجد لاہور میں لگا کرتی تھیں۔

آپ کو انجمن نعمانیہ کے دارالعلوم نعمانیہ میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ ہزاروں طلبائے علوم اسلامیہ جو پاک و ہند میں آسمانِ علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ آپ کے فیض کے مرہونِ احسان ہیں۔ مولانا فیض الحسن جہلمی، مولانا محمد عالم آسی امرت سری، مولانا احمد علی سابق نائب شیخ الجامعہ جامعہ عباسیہ بہاولپور، مولانا عبد اللہ پروفیسر اسلامیہ کالج لائلپور، حضرت مولانا صاحبزادہ محمد حسین خلف الرشید پیر حافظ سید جماعت علی شاہؒ، مولانا غلام محمد گھوٹوی شیخ الجامعہ بہاول پور، مولانا محمد عالم مدرس مدرسہ نعمانیہ، مولانا شہاب الدین خطیب مسجد چوبرجی کوارٹرز آپ کے نامور شاگردوں میں سے تھے۔ علومِ عربیہ کے ہزاروں طلبہ آپ سے پڑھ کر فارغ ہوئے اور پاک و ہند کا شاید ہی کوئی مکتب ایسا ہو جہاں آپ کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد کام نہ کر رہے ہوں۔

مولانا مفتی غلام احمدؒ کو علومِ معقول و منقول پڑھانے میں یدِ طُولیٰ حاصل تھا اور اس کے ساتھ فتویٰ نویسی میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ اُن کے عہد کے فتاوے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کوئی ایسا فتویٰ نہیں ملتا جس پر مولانا مرحوم نے دستخط نہ کیے ہوں یا جواب استفتا نہ لکھا ہو۔ اگر اُن کے فتاویٰ کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو سکتا ہے۔ رسالہ انجمن نعمانیہ میں آپ کے ہزاروں فتوے شائع ہوئے۔ کمال یہ ہے کہ آپ کا ایک بھی فیصلہ احتیاط اور علمی تحقیق سے خالی نہ تھا۔ عربی ادب میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ دورانِ درس مفتی عبداللہ ٹونکی جو اِن دنوں اورینٹل کالج میں پروفیسر عربی تھے کے حواشی پر اعتراضات کرتے اور عند الملاقات ان کے سقم سے مصنف کو آگاہ فرماتے جنہیں وہ تسلیم کرتے تھے۔

ندوۃ العلماء جب قائم ہوا تو کچھ عرصہ تک اس ادارے کو سُنّی علماء کی بھی سرپرستی حاصل رہی۔ چنانچہ اکثر شہروں کے جلیل القدر سُنّی علماء عمائدین ندوہ کی دعوت پر ندوہ کے جلسوں میں شرکت کرتے رہے۔ لاہور سے انجمن نعمانیہ کی طرف سے مولانا غلام احمد شریکِ اجلاس ہوا کرتے تھے اور ان کی تقریروں کو بہت سراہا جاتا تھا۔

آپ ۱۶ اپریل ۱۹۰۷ء کو کوٹ اسحاق میں واصل بحق ہوئے۔ مزار کوٹ اسحاق میں ہی ہے۔

مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ

انگریزی دور کا ایک راسخ العقیدہ سُنی عالم دین

حضرت مولانا عبد القادر المعروف مولوی غلام قادر بھیروی متولی و خطیب "بیگم شاہی مسجد" لاہور ضلع سرگودھا کے مردم خیز قصبہ بھیرہ میں پیدا ہوئے۔

ولادت

آپ کے والد غلام حیدر صاحب بڑے صاحبِ علم اور متدین انسان تھے۔ مولانا غلام قادر ابھی ایامِ طفلی میں ہی تھے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے علمِ دین کی تحصیل اور انسانیت کی ہدایت و خدمت کی بشارت دی۔ اور وطن سے باہر رہ کر علم سیکھنے کا حکم دیا۔ اس پر آپ حصولِ علم کی خاطر گھر سے نکلے اور پاک و ہند کے مختلف مدارسِ دینیہ سے اکتسابِ علم کرتے رہے۔

ان دنوں مولانا غلام محی الدین صاحب بگوی (متوفی ۱۲۷۳ھ) اور مولانا احمد دین بگوی (۱۲۸۶ھ) اندرون بھاٹی دروازہ میں فقیر عزیز الدین کے مکتب میں معلّم تھے۔ مولانا غلام قادر نے ان دونوں بزرگوں سے ابتدائی کتب دینیہ پڑھیں۔ کچھ عرصہ بعد دہلی کا رُخ کیا وہاں صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ[1] (متوفی ۱۲۸۵ھ) جو معقولات و منقولات کے عالم، شاعر اور بہترین معلّم کی حیثیت سے مرجع خلائق تھے، کے ہاں علومِ دینیہ کے طلبہ دُور و نزدیک سے کھنچے چلے آرہے تھے۔ مولانا غلام قادرؒ بھی لاہور سے دہلی پہنچے اور پہنچتے ہی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان کے خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کی۔

---

[1] حالات کے لیے مولوی فیض الحسن سہارنپوری کے حالات کے حواشی دیکھیں۔

علمی خدمات ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے دہلی کے علمی چشموں کو بند کر دیا تھا۔ مولانا غلام قادر بھیروی انہی دنوں دہلی سے لاہور تشریف لے آئے اور بھاٹی دروازے کے اندر "اونچی مسجد" میں وعظ فرمانا شروع کیا۔ آپ کے جوشِ تبلیغ نے لاہور کی مسلمان اکثریت کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ "بیگم شاہی مسجد" کی متولیہ مائی جیواں (مدفون گڑھی شاہو لاہور) بھی آپ کی علمی خدمات سے بہت متاثر ہوئیں۔ وہ نیک بخت بی بی مالدار تھی مگر لاولد تھی۔ مولانا کو اپنی مسجد کی خطابت کے لیے منتخب کیا۔ جب آپ وہاں آئے تو مائی جیواں نے آپ کو اپنا متبنّی قرار دیتے ہوئے مسجد کی تولیت بھی آپ کے سپرد کر دی۔

بیگم شاہی مسجد یہ مسجد مغلیہ خاندان کی مشہور خاتون ملکۂ اکبر بادشاہ مریم زمانی نے ۱۶۱۴ء (۱۰۲۳ھ) میں شاہی قلعہ کے مشرقی دروازے کے سامنے تعمیر کروائی۔ قدیم شہر کا مستی دروازہ اسی مسجد کی نسبت سے "مسجدی دروازہ" کہلاتا تھا مگر غلط العوامی کے کرشموں نے اب اسے "مستی دروازے" سے مشہور کر دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس مسجد پر سکھوں نے قبضہ کر لیا اور اسے بارود خانہ بنا لیا۔ ۱۸۵۰ء میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر میجر میگریگر نے مسلمانوں کے حوالے کی۔ بارود دریائے راوی کی نذر کیا گیا اور مسجد کے منقش در و دیوار نغمۂ توحید سے معمور ہو گئے۔ مسجد کے دروازہ پر یہ شعر کندہ ہے:

شاہ عالمگیر نورالدین محمد بادشاہ

باد یارب در جہاں روشن چو نورِ مہر و ماہ

شمالی دروازہ پر یہ قطعہ سنگ بنیادِ مسجد کی تاریخ کا پتہ دیتا ہے:

منتِ ایزد کہ آخر گشت کار از ابتدا — ہم بتوفیقِ خدا و حکم صاحب مسندی

حضرت مریم زمانی بانیٔ لہذا المکان — کز عنایاتِ الٰہی ساختہ جائے بدی

از پئے تاریخ ختم ایں بنا چوں بہشت — فکر می کردم کہ آخر یافتم خوش مسجدے
۱۰۲۳

خوش مسجدے سے تاریخ بنیاد نکلتی ہے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا غلام قادر ۱۸۶۷ء سے پہلے اس مسجد میں تشریف

لے آئے تھے اور علمی خدمات میں منہمک ہو چکے تھے۔ آپ کی وجہ سے بیگم شاہی مسجد تشنگانِ علم مصطفیٰ کے لیے صلائے عام بن چکی تھی اور لوگ شہر کے گوشے گوشے سے سمٹے چلے آتے تھے۔

مسیحی مشنری کی سرگرمیاں

جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے ذہنوں کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا ایک پروگرام مرتب کیا۔ انگلینڈ کے عیسائی مبلغین نے ملکہ وکٹوریہ کی حکومت پر زور دیا کہ ہندوستان میں کالج اور مشنری ادارے قائم کیے جائیں۔ چنانچہ لاہور میں ۱۸۶۴ء سے لے کر دس سال کے قلیل عرصہ میں گورنمنٹ کالج، اورینٹل کالج، سنٹرل کالج، فورمن کرسچین کالج، چیف کالج، کنگ ایڈورڈ کالج اور پنجاب یونیورسٹی کالج جاری کر دیے گئے۔

لاہور طوفانوں کی زد میں

یہ زمانہ لاہور کے لیے فکری اور اعتقادی ابتلاء کا دور تھا۔ کمزور مسلمان سکھ دور کی چیرہ دستیوں سے جانبر نہیں ہوا تھا کہ اُسے جنگِ آزادی کے سارے تلخ نتائج سے گزرنا پڑا۔ قید و بند کی صعوبتوں کے علاوہ اُن کے سینوں سے رُوحِ اسلام کو خارج کرنے کی منظم سازشیں ہونے لگیں۔ کالجوں میں اُن کے علم کو بدلا جانے لگا، گرجوں میں دین کو مسخ کیا جانے لگا اور عوام کے اسلامی اعتقادات کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے وہابی، نیچری، مرزائی اور دہریت جیسے ہزاروں فتنے حشرات الارض کی طرح چھوڑ دیے گئے۔

ان اعتقادی فتنوں کی پُشت پناہی میں انگریز کی ساری مشینری کام کر رہی تھی۔ بے پناہ روپیہ دیا جاتا، خطابات عطا ہوتے، جاگیریں الاٹ ہوتیں اور باقاعدہ تحریکیں چلائی جاتیں۔ ان شیطانی مشیروں نے اپنی سیاسی قوم کے نام جو پیغام دیا تھا اسے علامہ اقبالؒ نے کتنے درد سے پیش کیا ہے: ؎

وُہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں کبھی
رُوحِ محمدؐ اُس کے بدن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
مُلّا کو اُن کے کوہ و دمن سے نکال دو

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو"

ان حالات میں لاہور کے سُنّی علمائے کرام نے اپنی بے سروسامانی اور تہیدستی کے باوجود اسلام کی ٹمٹماتی ہوئی شمع کو جان کی بازی لگا کر طوفانوں کی زد سے بچایا۔ وُہ اپنے آقا کے دین کی خاطر جس پامردی سے حالات کا مقابلہ کرتے رہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

مولانا اور اُن کے معاصرین — مولانا غلام قادر بھیروی اور اُن کے ہمعصر سُنّی علمائے کرام نے عوام کے اعتقاد کو بچانے کے لیے دِن رات ایک کر دیا۔ وُہ پیغامِ مصطفےٰ کو لاہور کے گلی گلی کوچہ کوچہ لیے پھرے۔ ہر مسجد، ہر مکتب، ہر باغ اور ہر مدرسہ قرآنی تعلیمات سے معمور ہو گیا۔ اس زمانے کا لاہور مولانا فیض الحسن سہارن پوری شاگردِ رشید مولانا فضل الحق خیر آبادی، حافظ ولی اللہ مناظرِ اسلام المتوفی ۱۸۷۹ھ، مولانا نور احمد خطیب مسجد نیلا گنبد، مولوی غلام محمد بگوی المتوفی ۱۹۰۰ء (۱۳۱۸ھ) خطیب شاہی مسجد، مولانا سعد اللہ خاں، مولانا محمد الدین مصنف روضۃ الادباء اور خلیفہ حمید الدین وغیرہم کی اعتقادی خدمات کو کسی طرح بھی بھول نہیں سکتا۔ اِن وارثانِ علمِ رسُول ؐ نے علمِ دین کی بہت بڑی خدمت کی اور مذاہبِ باطلہ کے طوفانوں کے سامنے ڈٹے رہے۔

مولانا کی علمی قابلیت — حکیم احمد شجاع نے اپنے فاضلانہ مضمون "لاہور میں چلیسی" میں جو "نقوش" لاہور میں شائع ہوا تھا مولانا غلام قادر بھیروی کی رفعتِ علمی کو اِن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"عربی اور فارسی علوم میں آپ کو وہ دستگاہ حاصل تھی کہ بڑے بڑے عالم و فاضل اُن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ میرے والد (حکیم شجاع الدین احمد مرحوم) جو اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے میں دہلی میں قاضی القضاۃ ہند صدر الصدور مفتی صدر الدین سے اکتسابِ علم کر چکے تھے۔ عربی زبان کے فاضلِ اجل ہونے کے باوجود اپنی عربی اور

فارسی زبان کی تصنیفات مولانا غلام قادرؒ ہی کو دکھاتے اور ان سے اصلاح لیتے تھے۔ مجھے اپنے بچپن میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہُوا اور میں نے اکثر دیکھا کہ وہ درسِ قرآن دیتے وقت بھُنے ہُوئے چنے اور منقیٰ چباتے رہتے تھے بعد میں معلوم ہوا کہ اسی پر ان کی خوراک کا دارومدار ہے۔ ہاں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے درس و تدریس کا سلسلہ انہی لوگوں تک محدود ہے جو علم و فضل میں منتہائے کمال کو پہنچ چکے تھے۔ بچوں کو درسِ قرآن دینے کے لیے ان کے ایک شاگرد اور مرید تھے جو قاضی جی کہلاتے تھے۔ اس فقیر گوشہ نشین کو میں نے اس زمانے میں دیکھا جب مجھ میں ان کے علم و فضل کو پرکھنے کی استعداد نہ تھی۔ پھر بھی مجھے فخر ہے کہ اس مردِ حق آگاہ نے مجھے آغازِ کلام اللہ کے وقت بسم اللہ پڑھائی۔"[1]

اورینٹل کالج میں پروفیسر

پنجاب یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار اور اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لائیٹز ادب عربی اور فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے علوم عربیہ کے ذریعہ لاہور کے پڑھے لکھے دینی طبقہ کو متاثر کیا اور کالج میں ان علوم کو فروغ دینے کا پروگرام بنایا جس میں مسلمانوں کا دینی ورثہ تھا۔ یہ کالج دراصل ایک خطرناک ذہنی ٹکسال تھی جہاں سے انگریز اپنے مقاصد کے لیے دینی علوم کی وساطت سے لوگوں کے ذہنوں کو تبدیل کرسکتا تھا۔ لوگ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان علوم کو حاصل کرتے۔ انہیں عربی و فارسی کے مختلف درجات طے کرانے کے بعد مستشرق بنا دیا جاتا۔ وہ سٹائلش مولانا اور ماڈرن علامہ بن کر "شمس العلماء" جیسے بارعب خطابات پاتے۔ اس طرح اسلام کی حقیقی رُوح کھینچ لی جاتی۔ مولانا غلام قادر بھیرویؒ اور مولانا فیض الحسن سہارنپوریؒ ایسے جوان ہمت علماء اس "بُت خانہ فرنگ" میں کود پڑے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ طلباء کو حتی الامکان ان مسموم خیالات سے بچایا جائے جو اس کالج میں سے لائے جا رہے ہیں۔ ان خیالات سے انگریز "مولویت" اور "فضیلت" کے رنگ میں ذہنوں تک پہنچانا چاہتے تھے

---

[1] نقوش۔ ص ۳۲ (لاہور کا چیلسی)

وہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب رہے۔ یہ فکری انقلابات کا مؤرخ ہی لکھے گا۔ مگر "صنم خانۂ فرنگ" میں بیٹھ کر مولانا غلام قادر بھیروی ؒ نے ایک عرصہ تک جو جہاد کیا وہ علمائے اہلسنت کی تاریخ میں ایک یادگار ہے۔

کالج سے استعفاء

اورینٹل کالج کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۸۷۹ء میں عربی کے دوئم مدرس کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ۱۸۸۱ء میں انگریزوں کو ایک فتوٰی کی ضرورت پیش آئی جس پر ملک کے علمائے حقانی نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ ان علمائے کرام سے مایوس ہو کر گورنمنٹ کو اپنے ملازمین اور ان کاسہ لیس علماء کی طرف رجوع کرنا پڑا، جو ہر دور میں اقتدار کی غلط باتوں پر اپنی مہریں لگانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مولانا غلام قادر ؒ کے پاس جب یہ فتوٰی پہنچا تو آپ نے دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ حکومت نے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر سے رجوع کیا تاکہ وہ اپنے کالج کے مولویوں سے دستخط لیں۔ ڈاکٹر ان دنوں شملہ میں گرما کی چھٹیاں گزار رہے تھے انہوں نے سارے سٹاف کو ہدایت کی کہ وہ حکومت کے منشاء کے مطابق فتوٰی دیں کیونکہ یہ استاد سرکاری ملازم ہیں۔ مولانا نے اس چٹھی کے پڑھتے ہی سب سے پہلے ملازمت سے استعفا دے دیا اور پھر یہ کہا میں غلط فتوٰی نہیں دوں گا۔ پرنسپل کو اتنے فاضل کا کالج چھوڑ جانا بڑا ناگوار تھا۔ انہوں نے پھر لکھا کہ آپ فتوٰی نہ دیں مگر کالج کو نہ چھوڑیں مگر آپ نے لکھا کہ میں غلط فتوے لکھنے کے لیے ملازمت نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر نے لاہور واپس آکر حضرت مولانا کو بلایا تو آپ نے فرمایا مجھے خواب میں میرے آقائے مدنی ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اب میں صرف قرآن وحدیث پڑھایا کروں۔ میری تنخواہ اللہ کے خزانے سے ہر ماہ آیا کرے گی۔ اندریں حالات میں اورینٹل کالج کی پروفیسری سے معذور ہوں۔

مدرسہ نعمانیہ کا آغاز

لاہور میں مختلف مکاتب فکر کی سرگرمیوں کو دیکھ کر چند حساس سنّی مسلمانوں نے مختلف مدارس قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا چنانچہ ان دنوں اہلسنّت کی انجمن حنفیہ نے مدرسہ نعمانیہ قائم کیا۔ حضرت مولانا غلام قادر ؒ بھیروی کے علاوہ مختلف سنّی علماءِ کرام تعلیمِ دین کے دریا بہانے لگے۔ اس مدرسہ نے

ملک کے جن نامور علماء کو تربیت دی وُہ آسمانِ شہرت پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔
مولانا کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک ہے جو پاک و ہند کی دینی دنیا میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ مگر ان حضرات میں سے حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری، مولانا غلام حیدر قریشی پونچھ والے، مولانا مفتی غلام احمد صاحب شیخ التفسیر مولانا مولوی محمد نبی بخش حلوائی مؤلف تفسیر نبوی پنجابی، مولانا محمد عالم آسی امرتسری (مصنف الکاویہ علی الغاویہ) قاضی ظفر الدین صاحب اور صوفی غلام قادر صاحب چشتی سیالوی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

بد اعتقادی کی بیخ کنی

اس دور میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے بد اعتقاد علماء بھی مختلف نظریات لے کر لاہور کی اعتقادی فضا کو مسموم کرنے کے لیے لاہور کا رُخ کر رہے تھے۔ وہابی، نیچری، شیعہ اور مرزائی تو خاص طور پر سادہ لوح عوام کے اذہان و افکار میں شک و شبہ پیدا کرنے کے لیے مساجد میں گھس آتے، مناظرہ بازی شروع کر دیتے۔ جس سے اکثر فساد کا خطرہ ہوتا۔ چونکہ بعض فتنے تو انگریز کے خود کاشتہ پودے تھے اس لیے انہیں سُنّی علمائ سے فساد کرتے وقت انگریز کی شہ حاصل ہوتی۔ سُنّی علماء کی ایک جماعت تو ایسے مناظرہ بازوں کا سختی سے نوٹس لیتی۔ اس جماعت میں مولانا تاج الدین مرحوم (مدفون گڑھی شاہو) نزد ریلوے لائن۔ مولانا نبی بخش حلوائی جامع مسجد کوتوالی، مولانا غلام قادر بھیروی، مولانا غلام دستگیر قصوری اور آخر میں سید دیدار علی شاہ صاحب رحمہم اللہ علیہم تو بڑی شدت سے ان لوگوں کو آڑے ہاتھوں لیتے۔ ان بزرگوں کے ہاں سب کچھ قبول تھا مگر اپنے آقا و مولیٰ کی توہین کا خفیف پہلو بھی ان کی قوتِ برداشت کا امتحان ہوتا۔ مولانا غلام قادر بھیرویؒ نے ان مفسد لوگوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی مسجد کی پیشانی پر یہ عبارت کندہ کروا دی تھی جو اب بھی موجود ہے۔

باتفاق انجمن حنفیہ و حکم شرع شریف قرار پایا کہ کوئی وہابی، رافضی، نیچری، مرزائی مسجد ہذا میں نہ آئے اور خلاف مذہب حنفی کوئی بات نہ کرے۔

فقیر غلام قادر عفی عنہ، متولی بیگم شاہی مسجد

کتبہ، عبد الحمید خوشنویس

اخراج الوہابیین

مولانا کی یہ بات مسجد کی تختی تک ہی محدود نہ تھی بلکہ بیگم شاہی مسجد میں جب بھی کوئی بد اعتقاد بغرض فساد گھس آتا تو مولانا اسے بہ یک بینی دو گوش باہر نکال دیتے۔ مسجد کا فرش دھلاتے ۔ اگر وہ بد اعتقاد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ کلمات کہتا تو اُسے دھکے دے کر باہر کرتے اور مسجد کا وہ فرش اکھاڑ دیتے جہاں ایسا بدزبان کھڑا ہوا ہوتا۔ آپ کے اس عمل نے معاندین کو یہ پروپیگنڈا کرنے کا موقع دیا کہ آپ کی مسجد لوگوں کے لیے بند ہے ۔ آپ مسجد کا فرش دھلاتے اور اکھاڑتے ہیں ۔ یہ بات تنقیدی زبانوں پر کرنے کے باوجود ہم یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں پاتے کہ اس زمانے میں اتنے راسخ الاعتقاد علماء تھے جو اپنے سر پر آرا چلتے دیکھ سکتے تھے مگر گستاخانِ رسول کو برداشت نہیں کر سکتے تھے ان لوگوں نے حضور کی محبت اور عداوت کو کسی مصلحت کی چادر میں نہیں لپیٹا تھا۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ وہابیت تمام فکری گمراہیوں اور اعتقادی خرابیوں کی جڑ ہے ۔ مرزا صاحب کے ابتدائی پیروکار غیر مقلد تھے۔ ترک تقلید کی بادِ سموم جب قادیان پہنچی تو کیا کیا گل کھلائے۔ آج " تاریخ احمدیت "نے واضح کر دیا ہے کہ مرزا صاحب کے مصدقین اولین غیر مقلد ہی تھے جن کے ناموں کی ایک طویل فہرست موجود ہے ۔ اسی زمانہ میں وہابیت نے فتنۂ انکارِ حدیث کو جنم دیا اور مولوی عبد اللہ چکڑالوی ، وہابی نے احادیث کا انکار کیا ۔ یہ وبا لاہور سے امرتسر پہنچی وہاں کے وہابی خواجہ احمد دین نے اس فتنہ کو خوب ہوا دی ۔ علیٰ ہذا القیاس پاک و بھارت کے جتنے بد اعتقاد فتنے پیدا ہوئے ہیں وہ سب اسی باغ نجدی کی بہاریں ہیں ۔

تصنیفات

مولانا نے اعتقادی تربیت اور حمایت مسلک حقہ اہلسنت کے لیے بہت اہم کام کیا ہے بچوں کی ابتدائی تعلیم سے لے کر عمر رسیدہ مسلمانوں کے لیے مختلف تصانیف پیش کیں۔ "اسلام کی گیارہ کتابیں" نصابی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان کتابوں میں چھوٹے چھوٹے جملوں اور آسان زبان میں اعتقاد کے اہم مسائل کو پیش کیا گیا ہے ان کتابوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ پچاس سال کے اندر لاکھوں کی تعداد میں چھپیں اور پڑھی گئیں۔ آپ کی دیگر تصانیف یہ ہیں :

۱۔ نماز حضوری
۲۔ نماز ضروری
۳۔ ختمات خواجگان
۴۔ حقیقت انوار محمدیہ
۵۔ شمس الحنیفہ بجواب نور الحنفیہ
۶۔ جوہر ایمانی
۷۔ نور ربانی فی مدح محبوب السبحانی
۸۔ عکازہ در صلوٰۃ جنازہ
۹۔ شوارق صمدیہ ترجمہ بوارق محمدیہ فی رجم الشیاطین النجدیہ مولفہ مولانا فضل رسول بدایونی
۱۰۔ شمس الضحیٰ فی مدح خیر الوریٰ
۱۱۔ فاتحہ خوانی

اولاد وازواج آپ کے دو صاحبزادے مولانا رفیع الدین اور مولانا زین العابدین اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ مولانا رفیع الدین حجاز مقدس میں تشریف لے گئے اور دیارِ حبیبؐ کے ہی ہو کر رہ گئے۔ اب تک ان کی اولاد مکہ مکرمہ میں موجود ہے۔ مولانا زین العابدین کے ایک صاحبزادے مولانا محمد مظہر تھے جو بڑے علم دوست اور فاضل تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد آپ کی بہت سی تصانیف صاحبزادہ محمد مظہر کے زیر اہتمام چھپیں۔ ان کا مزار مولانا کے قدموں میں ہے جس پر تاریخ وفات کندہ ہے:

"۲۵۔ ذلیقعدہ ۱۳۴۴ھ بروز دوشنبہ"

آپ کی ایک صاحبزادی جن کی وفات لاہور میں ہوئی۔ ان کا مسقف اور باپردہ مزار مولانا کے مرقد کے قدموں میں ہے۔ لوحِ مزار کے کتبہ پر یہ لکھا ہوا ہے:

"مزار دخترِ اکبر مولانا اشرف النساء"

یوم وصال جمعۃ المبارک ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ

آپ کی دوسری صاحبزادی کے داماد جناب فضل الحق قریشی موجودہ متولی مسجد بیگم شاہی بڑے علم دوست بزرگ ہیں۔ مسجد کے اخراجات آپ ہی کے ذمہ ہیں اور آپ ہی کے اہتمام میں حضرت مولانا کا سالانہ عرس ہوتا ہے۔

سلسلۂ بیعت آپ شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی متوفی ۱۳۰۰ھ کے خلیفہ اور مرید خاص تھے۔ چشتیہ نسبت کے باوجود سماع سے اجتناب کرتے اور مجالسِ سماع سے کنارہ کش رہتے۔ آپ قادری سلسلہ سے گہری دل چسپی

رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ فلسفہ وحدت الوجود کے بڑے زبردست حامی تھے۔ آپ کی کتاب شمس الحنفیہ منکرانِ وحدت الوجود کا جواب ہے۔

وفات آپ طویل عمر پا کر ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ کو واصل بحق ہوئے۔ نمازِ جنازہ شاہی مسجد میں پڑھنے کا اہتمام کیا گیا۔ مسجد بھر چکی تو لوگ حضوری باغ میں صف بستہ ہو گئے۔ آپ کے شاگرد مولانا محمد عالم آسی امرت سریؒ نے "منبع فیض رب جلیل ۱۳۲۷ھ" تاریخ وفات نکالی اور "در خلدِ بریں رفت قبلۂ من" سے سنِ وفات نکالا۔ مزار پُرانوار بیگم شاہی کے جوار میں ہے یہ کتبہ آویزاں ہے۔

استاذ العلماء شمس الفضلاء عمدۃ المحققین، زبدۃ العارفین، سراج السالکین، حامیِ سنن، ماحیِ بدعت والسنن حضرت مولانا مولوی عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ المعروف مولانا غلام قادر رحمۃ اللہ علیہ قریشی، ہاشمی، چشتی، قادری، سیالوی، بھیروی، ثم لاہوری قدس سرہ العزیز۔"

وصال مبارک ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۸ء"

پیش کردہ خلیفہ محمد یار ابن خلیفہ اوّل۔

آج سُنّیوں کا یہ عظیم الشان مکتب خاموش ہے۔ مسجد حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں اپنے نقش و نگار کھوتی جا رہی ہے۔ محکمہ آثارِ قدیمہ نے موجودہ متولی اور مہتمم انجمن حنفیہ قادریہ کے تعاون سے ان پُرانے نقش و نگار میں رنگ بھرنا شروع کیا ہے۔ یہ کوششیں مسجد کی آب و تاب کو یقیناً کچھ عرصہ کے لیے واپس بُلا لیں گی مگر مسجد کے محراب و منبر مولانا غلام قادر بھیرویؒ جیسے راسخ العقیدہ اور جری سُنّی عالم دین کی آواز کو ترستے ہی رہیں گے۔ ع

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں میں

مولانا محمّد ذاکر بگوی رحمۃ اللہ علیہ

جنہوں نے نانِ جویں کھا کر شمع اسلام کے نور سے لوگوں کے سینے منور کر دیے

زبدۃ العارفین مولانا عبدالعزیز بگوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اکبر مولانا محمد ذاکر رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۹۲ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام "گلِ رنگین محتشمدذاکر" (۱۲۹۳ھ) رکھا گیا۔ والد نے پیدائش پر یہ شعر پڑھا:

ہاتفِ خدا آوازہ داد
مذاکرہ کشادہ باد

کتب مروجہ معقول و منقول اپنے والد ماجد کے مدرسہ سے پڑھیں۔ علوم دینیہ سے فارغ ہو کر دہلی کا رُخ کیا جہاں طبیہ کالج دہلی میں حاذق الملک حکیم عبدالحمید خاں مرحوم سے علمِ طب حاصل کیا۔ واپسی پر اپنے عم بزرگوار مولانا غلام محمد صاحب بگوی رح کے پاس لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ لاہور ان دنوں اعتقادی کش مکش سے گزر رہا تھا مگر آپ ان فرقہ وارانہ مباحث سے علیحدہ ہی رہے اور مسائل تصوف پر غور فرمایا کرتے۔ آپ نے چودہ سال کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی سے ۱۳۰۷ھ میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۳۱۱ھ میں لاہور کے مدرسہ حمیدیہ نیلا گنبد میں عربی کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ آپ نے تھوڑے ہی عرصہ میں مشہور مدرس کی حیثیت سے نام پایا۔ تشنگانِ علوم دینیہ دُور دُور سے آپ کے درس میں پہنچنے لگے۔

آپ طبعاً صوفی منش اور درویش تھے۔ ابتدائی عمر میں ہی اہل اللہ کے عقیدت مند تھے ایک دفعہ والد محترم سے التجا کی کہ اپنے ساتھ تونسہ شریف لے چلیں مگر سفر کی تکلیف کے پیش نظر والد ساتھ لے جانے پر رضامند نہ ہوئے ادھر ذوق غالب تھا۔ پیدل

روانہ ہوئے۔ آبلہ پا، غبار آلود چہرہ، پھٹے کپڑے اور نڈھال بدن۔ یہ تھی وہ متاع جو آپ لے کر تونسہ شریف جا پہنچے۔ واقفیت نہیں تھی۔ مسجد کے صحن میں سو رہے نمازِ صبح کے بعد مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ حضرت خواجہ اللہ بخش تونسوی کی زیارت کی تدبیر سوچ ہی رہے تھے کہ خواجہ صاحب خود ہی ادھر آ نکلے۔ مولانا قدم بوسی کو آگے بڑھے تو خواجہ صاحب نے اس غبار آلود مسافر کو گلے لگا لیا اور ساتھ لے کر مجلس میں جا بیٹھے۔ والد محترم نے اپنے بیٹے کو دیکھا تو مجسمۂ حیرت بن گئے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا: "مولوی صاحب! آپ کا فرزند بلند اقبال اور عالی ہمت ہوگا۔ اللہ کے نزدیک ایسے لوگوں کا رتبہ بڑا اونچا ہوتا ہے۔"

مولانا غلام دستگیر بیخود نے اپنی مشہور تصنیف "برکات سیال" میں آپ کی بیعت کے متعلق واقعہ لکھا ہے کہ بھیرہ میں ایک صاحبِ حال درویش نظر آئے تو مولانا کا میلانِ طبع ان کی طرف ہو گیا اور اکثر خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ والد ماجد نے یہ کیفیت دیکھی تو فرمانے لگے: "بیٹا! خوانچہ فروشوں سے کیا لینا چاہتے ہو۔ مٹھائی کی اعلیٰ دکان پر پہنچو۔ اگر کچھ نہ خرید سکے تو دل خوشبو سے دل سیر ہو جائے گا۔" یہ بات سن کر اسی وقت ۱۳۲۲ھ میں حضرت اشرف الاولیاء خواجہ محمد دین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے اور قدم بوسی کے بعد التجائے بیعت کی۔ خواجہ صاحب ایک صاحبِ نظر بزرگ تھے۔ توجہ فیض نے اس ذرے کو آفتاب بنا دیا۔

ع زنثر ستارہ سازند ز ستارہ آفتابے

اس طرح آپ سلسلۂ چشتیہ عالیہ سے منسلک ہو گئے اور خواجہ اجمیری کا فیض طالبانِ حق تک پہنچنے لگا۔ "شمس الاسلام" بھیرہ کی ایک خاص اشاعت میں آپ کو ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر ہے:

"لاہور کے قیام کے دوران شاہی مسجد کی امامت و خطابت آپ کے ذمہ تھی مگر اس جلیل عہدہ پر فائز ہوتے ہوئے بھی اہل دل کی جستجو میں رہے جہاں کوئی درویش یا ولی سنتے خود پہنچتے اور فیضِ صحبت حاصل کرتے۔

مخدوم علی الہجویری داتا گنج بخشؒ کا مزار تو آپ کے لیے مقامِ سکون تھا۔"

لاہور میں پرنس آف ویلز کا جلوس شاہی منعقد ہوا تو آپ بھی شاہی مسجد کے خطیب کی حیثیت سے معزز مہمانوں میں شریک تھے۔ آپ نے پرنس کے ساتھ عیسائی پادریوں کو دیکھا کہ وہ داڑھی رکھتے ہیں۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا: "خدا کا شکر ہے داڑھی ہر قوم میں احترام کی علامت ہے۔"

مصنف برکات سیال نے آپ کے اخلاق و عادات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حسن و جمال میں یکتا، نزاکت و لطافت میں منفرد تھے۔ علم و فضل میں کامل تھے شریعت و عشق سے بہرہ وافر رکھتے تھے۔ نہایت خوش مذاق و خوش مزاج دل ذکر و فکر سے معمور تھا، زبان اولیاء اللہ کے ذکر سے سرشار تھی۔ عامۃ الناس کو خدا اور رسول کے احکامات کا پابند بناتے۔"

۱۹ صفر ۱۳۲۳ھ بروز جمعہ بھیرہ تشریف لے گئے اور جامع مسجد میں "قد افلح من تزکی" کی تفسیر بیان کی۔ مولانا ظہور احمد بگوی مرحوم کو چار گھنٹے تلقین کی اور اہلسنت وجماعت کی اعتقادی اہمیت پر زور دیتے رہے۔ ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ صفر کو سیال شریف حاضر ہوئے۔ حضرت خواجہ عبدالعزیز چاچڑوی نے فرمایا:

"شیخ کی سیرت اپنا کر فنافی الشیخ کے مقام پر ہو، شاید یہ ملاقات آخری ہو۔ ۵ ربیع الاول کو لاہور واپس آئے۔ مدرسہ حمیدیہ کی تمام کتابیں لائبریری کو واپس کر دیں۔ ضروری کاغذات انجمن کے حوالے کیے ۸۔ ربیع الاول کو معمولی سا بخار ہوا۔ آپ کے دوست اور مخلص مولوی محرم علی چشتیؒ[1] ایڈووکیٹ عیادت کو آئے تو کہنے لگے: "چشتی جمعہ کو ہم بھیرہ پہنچیں گے۔"

---

[1] مولوی محرم علی چشتی مرحوم اپنے وقت کے بہت بڑے طباع، قانون دان، صحافی اور سیاست فہم تھے۔ وہ علمائے اہل سنت کی دینی اور علمی خدمات میں ہر مرحلہ پر ممد و معاون تھے۔ وہ بازار

(باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا یحییٰ صاحب ، ڈاکٹر اللہ جوایا علاج کرتے رہے مگر رات کے تین بجے ۱۲ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ کو یہ آفتاب علم وتصوف غروب ہوگیا۔ نماز جنازہ مسجد وزیر خاں میں پڑھائی گئی۔ زندہ دلانِ لاہور نے اس عالمِ دین کے آخری سفر میں بڑے جوش ومحبت سے ساتھ دیا۔ جنازہ ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ دہلی دروازہ سے لے کر ریلوے اسٹیشن تک اشکبار انسانوں کا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ آپ کا تابوت بھیرہ پہنچایا گیا جہاں سے آپ بگہ کے مشہور قبرستان میں سپردِ لحد کر دیئے گئے۔

مولانا غلام دستگیر نامی مرحوم نے ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کے مقطع سے تاریخ وفات ظاہر ہوتی ہے:

سوالِ سالِ رحلت پر بتایا دل نے نامی کو
پسند اولیاء ذاکر ہوا واصل بحق لکھو (۱۳۴۴ھ)

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شیخو پوریاں (اندرون بھاٹی دروازہ لاہور) کے کونے پر ایک مکان میں رہتے تھے۔ اخبار "رفیق ہند" کے مدیر شہیر تھے۔ اس اخبار کی شہرت نے انہیں یہاں تک پہنچایا کہ بقول حکیم احمد شجاع (نقوش۔ لاہور نمبر ۲۹) کہ جسے وہ چاہتے لاہور میونسپل کمیٹی کا ممبر بنے دیتے۔ اس لیے لوگ انہیں "کنگ میکر" کہتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ ہیرا منڈی کے عقب میں ایک وسیع حویلی میں جا بسے۔ بڑے علم دوست تھے۔ خود بھی اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر تھے۔ علماء و مشائخ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حضرت مستان شاہ کابلی کے مرید تھے۔ ان کی زبان اکثر حال وقال کی تصویر ہوتی دینی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ان کا دسترخوان اس قدر وسیع تھا کہ مشائخ کرام اپنے مریدوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے سے آتے اور انہی کے ہاں قیام کرتے۔ وہ گورنر کی لیجسلیٹو کونسل کے ایک عرصہ تک رکن رہے۔ ابتدائی دور میں انگریزی تعلیم کے مخالف تھے اور سرسید احمد خاں کی ہر تحریک کی ڈٹ کر مخالفت کرتے۔ قانون دانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سادہ لباس، ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا اور کلام میں خود اعتمادی ان کے امتیازی نشان تھے۔ مدرسہ نعمانیہ، مدرسہ غوثیہ ان کی جدوجہد سے ایک عرصہ تک منبعِ علم و فن بنے رہے۔

مادۂ تاریخ عیسوی ذاکر ذاکر نبی بود سے نکلتا ہے۔ ۱۹۱۴ء

یہ وہ علمائے کرام تھے جنہوں نے لاہور کی علمی اور دینی زندگی سے پورے ستر سال اپنی عظمت اور قابلیت کا اعتراف کرایا۔ اس خاندان کے دوسرے علماء آپ کے بعد اگرچہ لاہور نہیں آئے مگر دینی خدمات میں وقت کے اساتذہ شمار کیے گئے۔ مولانا عبدالعزیز بگوی بھیرہ کی جامع مسجد کے خطیب اور دینی درس گاہ کے مہتمم رہے۔ یہ وہ مدرسہ تھا جہاں سے پاک و ہند کے جلیل القدر مدرس، عالم، مفتی اور خطیب تربیت پا کر نکلے۔ مولانا الحاج نصیر الدین بگوی اور شفیق احمد بگوی، ظہور احمد بگوی علمی اعتبار سے بہت بلند رتبہ علماء تھے۔

لاہور کی دینی اور علمی تاریخ میں بگوی علماء کا اہم حصہ ہے۔ اس طویل عرصہ میں کوئی دینی فیصلہ کوئی فتویٰ اور کوئی اعتقادی کتاب اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ جب تک ان علماء میں سے کسی ایک کی مہر تصدیق ثبت نہیں ہوتی تھی۔ سکھوں سے حقوق کی بازیابی، انگریزوں سے اسلامی افکار کی کش مکش، مسلمانانِ لاہور کی علمی راہ نمائی اور اسلامی اقدار کی پرورش کا سہرا ان علماء کے سر پر ہے۔ وہ اتنے اولوالعزم تھے کہ ایک طرف وہ حالات کی ناہمواری کا مقابلہ کرتے، دوسری طرف دینی فرائض کی بجا آوری کے لیے دن رات کوشاں رہتے۔

لاہور میں مسلمانوں کو معاشرتی اور دینی بدحالی نے ان علمائے کرام کے فرائض میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا اور پھر علمی درس گاہیں مالی زبوں حالی کا شکار ہو کر دم توڑ رہی تھیں۔ صرف دہلی کے بعض مکاتیب علمائے اہل سنت کی تربیت کے ضامن تھے۔ مگر دہلی کے دینی مدارس کے یہ فارغ التحصیل علماء پنجاب کی دینی رہنمائی کے لیے لاہور کی سرزمین کو دینی تعلیمات کا گہوارہ بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ گو اہلِ ثروت انگریز کی خوشنودی کے لیے ان کی پناہ حاصل کرنے میں عافیت خیال کرتے تھے مگر ان علمائے اہل سنت نے ان مایوس کن حالات کے باوجود دینی خدمات کو بدل و جان ادا کیا۔ عیسائی مشنریوں کی چیرہ دستیاں، بداعتقاد علماء کی فتنہ پردازیاں اور سیاسی حالات کی فتنہ سامانیاں علمائے حق کو کلمۂ حق سے روک نہ سکیں ان علمائے اہل سنت و جماعت کی شبانہ روز دینی مساعی سے لاہور کی دینی زندگی میں جان پڑ گئی اور انگریزی تہذیب کا زور دن بدن ٹوٹتا گیا۔

پیر عبد الغفار شاہ کاشمیریؒ

للناس شغل ولی شغل فی تصوّر النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(دیباچہ خزائنِ برکات)

کشمیر میں شیخ مسعود نروری اپنے علم و عمل اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں ان کے اسلاف بغداد سے ملتان اور ملتان سے لاہور آئے۔ شیخ مسعود اپنے خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جو لاہور سے کشمیر تشریف لے گئے اور سری نگر کے محلہ نرورہ میں رہنے کی وجہ سے نروری کہلائے۔ شیخ الحدیث دیو بند علامہ محمد انور کاشمیری شیخ مسعود ہی کی اولاد سے تھے۔ اپنے "مکتوبات الخطبہ" میں اپنے بزرگوں کے واردِ ہندوستان ہونے کا قصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"وفی المکتوب الخطبہ عند خلف الشیخ ان سلفہ جاء من بغداد الی الہند ودخلوا ملتان ثم دخلوا الی بلدۃ لاھور ثم الی الکشمیر"

یہ خاندان پشت ہا پشت سے اہل علم اور اہل اللہ چلا آتا ہے۔ اس خاندان کی شاخیں کشمیر، مظفر آباد، دیوبند، پونچھ اور لاہور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

شیخ مسعود کی ذرّیات سے جو شاخ لاہور میں ہے۔ اس کے بزرگ شیخ غلام مصطفیٰ شاہ تھے، جن کا سلسلہ شیخ مسعود تک آٹھ واسطوں سے یوں ملتا ہے:

مصطفیٰ شاہ بن نور شاہ بن فاضل شاہ بن عبدالوہاب بن عبدالقادر شاہ بن طاہر شاہ بن یعقوب شاہ بن شیخ عبداللہ بن شیخ مسعود۔ (عبدالقادر شاہ کا مزار ترگہ پورہ علاقہ تحصیل ہندواڑہ کشمیر میں ہے۔ یہ شاخ ترگپوری کہلاتی ہے) [1]

شیخ مسعود بڑے سیلانی تھے۔ بھارت و پاکستان کے اکثر شہروں کے علاوہ بغداد تک پہنچے۔ جب لوٹے تو ملتان کی بار کے بیابانوں میں مصروفِ ریاضت و مجاہدہ ہو گئے۔ لوگ اس جنگل کا رُخ کرتے اور آپ سے فیض یاب ہوتے۔ آپ کا تصرف تھا کہ کچھ عرصہ بعد یہاں نہریں جاری ہوئیں، ویرانے آبادیوں میں بدل گئے۔ بیابان گلستان بن گئے اور آپ کی قیام گاہ پر چک $\frac{۵۷}{۱۵ - ج}$ آباد ہو گیا۔ آبادی کے نو سال بعد آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس علاقہ کے لوگ آپ کو قطبِ زماں اور صاحبِ کرامت تصوّر کرتے ہیں۔ آپ کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ اس مزار کی سجادہ نشینی ہمارے ممدوح پیر عبدالغفار شاہ صاحب کے اکلوتے بیٹے پیر اشرف کے پاس تاحینِ حیات رہی۔

پیر مصطفیٰ شاہؒ کے فیضان سے پنجاب روحانیت کی تشنہ کامی کا سامان حاصل کرتا رہا۔ ان کے فرزند احمد پیر یا پیر احمد شاہ کشمیر کی حسین مگر خاموش وادی کی روحانی تربیت میں مصروف رہے۔ ایک وقت آیا کہ پنجاب کی کشش نے انہیں کشمیر کے حسن و جمال کو خیرباد کہنے پر مجبور کر دیا اور وہ قیام فرمائے لاہور ہوئے۔ لاہور کی آمد کے وقت ہمارے پیر عبدالغفار کی عمر گیارہ برس تھی۔ اس ذہین بچے کی تعلیم پر بڑی توجہ دی جانے لگی۔ آپ اس وقت کے ایک دینی مدرسہ واقعہ مسجد بکن خاں اندرون موچی دروازہ لاہور داخل ہوئے۔ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری رحمہا اللہ اسی سال فارغ التحصیل ہوئے جس سال پیر صاحب کو دستارِ فضیلت ملی۔

---

[1] مآثر لاہور، مولفہ مولوی محمد دین فوق مرتبہ محمد عبداللہ قریشی مطبوعہ نقوش لاہور نمبر

آپ نے لاہور ہی میں ایک سیدزادی سے نکاح کیا۔ مگر دو سال بعد ہی جب اس نیک بخت خاتون کا انتقال ہوگیا۔ تو پیر صاحب نے مجرّد زندگی بسر کرنے کا عہد کیا اور اُسے پُورا کردیا۔ آپ کے اکلوتے بیٹے پیر محمد اشرف[1] (المتوفی ۱۳۸۴ھ) آپ کی نسبی یادگار بنے۔

آپ کا لباس سادہ، کشمیری ٹوپی، لمبا پیرہن اور تہمد پر مشتمل ہوتا۔ اہل اللہ سے بڑی عقیدت تھی۔ علی الصبح چند احباب کو ساتھ لیتے۔ اجزائے کلام اللہ، دلائل الخیرات، حصن حصین، درود و وظائف کے مجموعے، گلاب کے پھُول، عطریات، اگر بتیاں اور سامان چائے نوشی ساتھ لیتے اور حضرت داتا گنج بخش، یا میاں میر، حضرت ایشاں، یا شاہ حسین زنجانی کے دربار پر پہنچتے اور یُوں یکسوئی سے مراقبہ و مجاہدہ فرماتے۔

آپ نے تعلیمی انحطاط کے سنگین نتائج کے پیش نظر، رجنوری ۱۹۱۵ء کو مسجد تکیہ سادھواں لاہور میں "مدرسہ عالیہ غوثیہ" کی بنیاد رکھی۔ دین پسند طبقوں نے

---

[1] پیر محمد اشرف بڑے خوش شکل اور تنومند نوجوان تھے۔ ابتدائی کتب درسیہ مدرسہ غوثیہ سے پڑھیں اور جوانی میں علمی ذوق کے ساتھ ساتھ فنِ پہلوانی میں بھی کمال حاصل کیا۔ تحریک خلافت میں ترکِ وطن کرکے بغداد شریف چلے گئے اور ایک عرصہ تک وہاں قیام کیا۔ وہاں فنِ پہلوانی کا ایک بہت بڑا معرکہ سر کیا اور سرکاری اعزاز و انعامات سے نوازے گئے۔ بغداد میں حضرت نقیب سید سلیمان آفندی سید عبدالرحمٰن آفندی بغدادی کے زیر توجہ رہتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد بحرین میں شیخ قاسم بن مہدی قاضی القضاۃ بحرین کے پاس چلے گئے۔ ملکی حالات ٹھیک ہونے پر آپ واپس آگئے اور لاہور سے ۱۹۲۷ء میں ایک تبلیغی ماہانہ رسالہ "الاشرف" کے نام سے جاری کیا جو ایک عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ مدرسہ غوثیہ کا انتظام و انصرام آپ کے پاس ہی رہا۔ اپنے والد کا عرس منانے اور علماء کرام کے خیالات سے اہل لاہور کو مستفیض ہونے کا ذریعہ بنتے مگر ۸، ۱ اگست ۱۹۳۵ء کو آپ نے اپنے والد مکرم کا تابوت تکیہ سادھواں کشمیری کی قبر سے نکال کر قبرستان میانی میں دفن کردیا تو مدرسہ غوثیہ کا انتظام بھی درہم برہم ہوگیا۔ ۱۴ جمادی الاخریٰ کو فوت ہوئے اور والد مکرم کے پہلو میں دفنائے گئے۔

اس ادارہ کی بڑی قدر کی۔ مدرسہ میں ایک سو طلبہ تعلیم دین سے بہرہ ور ہوتے، جن کے سارے اخراجات مدرسے کے ذمے تھے۔ ان طلبہ میں اعتقادیات کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا۔ عالم باعمل اور عاشقِ رسولؐ بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ درود پاک سے لگن اور ریاضت کا خوگر بنا دیا جاتا۔ اس دور کے اکثر علماء اسی مدرسۂ فیض سے فارغ ہوئے۔ لاہور کے زعماء اس مدرسہ کی سرپرستی فرماتے۔ معاصرین علماء اعزازی طور پر تدریس میں ہاتھ بٹاتے۔ پیر عبدالغفار کے ایک شاگرد فرمان علی جہلمی نے مدرسہ غوثیہ کی علمی خدمات کے پیشِ نظر "کشمیری میگزین" کی ۱۶ ر مئی ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

من چہ گویم شانِ درسِ غوثیہ — نامِ آں ذی شان درسِ غوثیہ
عبدِ غفار آنکہ پیر بندہ است — ہست پشتیبان درسِ غوثیہ
طالبانِ علم آیند جوق جوق — سوئے کانِ علم درسِ غوثیہ
عالمِ علمِ حدیث و فقہ ہم — ہست قرآں خوانِ درسِ غوثیہ
می دہد تعلیم دیں جملہ علوم — ایں عظیم الشان درسِ غوثیہ[1]

اس مدرسہ نے بڑے بڑے سنّی علماء کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ لاہور کے نامور عالمِ دین اور مصنّف مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی مدرسہ غوثیہ کے طالب علم تھے۔

اس دینی ادارہ نے ملک کے اہل سنّت وجماعت کے اذہان و فکر کو ہی فروغ نہیں بخشا بلکہ قلوب و وجدان کو بھی دولتِ ایقان و ایمان بخشی، رموزِ تصوف علومِ شریعت کے ساتھ ساتھ سمجھائے جاتے۔ مذاکرہ و مناظرہ کے فن کے ساتھ ساتھ مجاہدہ و مکاشفہ کی بھی منزلیں طے کرائی جاتی تھیں۔ طلبہ صرف و نحو کے اسباق کے ساتھ ساتھ ذکر و افکار کو جزوِ تعلیم سمجھتے تھے۔ اس پاکیزہ ماحول کا یہ

---

[1] کشمیری میگزین لاہور مورخہ ۱۶ ر مئی ۱۹۱۶ء

اثر تھا کہ شہر کے اکثر علمائے دین اعزازی طور پر وقت دیتے اور قلب و فکر کی یکسوئی حاصل کرنے کے لیے پیر صاحب کے مدرسہ میں شریک ہوتے۔ مولانا احمد علی شاہ بٹالوی، مولانا نور بخش توکلی، مولانا اصغر علی رُوحی، مولانا تاج الدین قادری، مولانا نبی بخش حلوائی (مؤلف تفسیر نبوی پنجابی) جیسے اہل علم آپ کی صحبت کو غنیمتِ روزگار شمار کرتے۔ اس مدرسہ کے جلیل القدر اساتذہ میں سے مفتی عبدالقادر، قاضی حبیب نواز، مولانا محمد شاہ صاحب میر واعظ، مولانا محمد اکرم جہلمی، مولانا محمد اسحٰق صاحب ایبٹ آبادی اور مولانا نوبت علی صاحب ہزاروی (رحمہم اللہ علیہم) کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں ؎

مقدور ہو تو خاک سے پُوچھوں کہ اے لئیم
تُونے وُہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے؟

آپ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کی اہمیت کا بڑا احساس رکھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے درود پاک کے مجموعے شائع کراتے اور اہل دل کو "ارمغانِ رُوحانیت" کے طور پر تقسیم فرماتے۔ آپ کی مسجد سے درود پاک کی تجلیاں اُٹھتیں۔ صلوٰۃ وسلام کی وجد آفرینیاں رشکِ عرش بریں بن جاتیں۔ پتھر سے پتھر دل وہاں آکر موم ہو جاتے۔ آپ کا یہ خلوص تھا یا دردِ نبیؐ کا اعجاز کہ بدعقیدہ لوگ آپ کی مسجد میں آکر یکسوئی کی دولت حاصل کرتے اور ذہنی کجی کو یکسر بھول جاتے [1]

---

[1] آپ کے ساتھ ہی اس مدرسہ کی بساط اُلٹ گئی۔ پاکستان بننے کے بعد اس محلہ کے ایک زندہ دل اور باہمت نوجوان عنایت اللہ قادری نے آپ کی مسجد میں از سرِ نو تعمیر و تزئین میں حصہ لے کر پیر صاحب کی رُوح کو خوش کر دیا ہے۔ لاہور کے قلب میں عظیم الشان مسجد کے مینار عر سے صدائے بلالی سارے شہر میں گونج کر پیر صاحب کی یاد کو زندہ کر دیتی ہے۔ عنایت اللہ قادری نے اس رُوحانی مرکز سے اُٹھ کر عید میلادالنبیؐ کے سالانہ جلوس کے اہتمام میں اس

(باقی صفحہ آئندہ پر)

آپ بڑے متوکل اور بابرکت بزرگ تھے۔ ساری زندگی کسی امیر کے دروازے پر نہیں گئے اور لاہور بھر کے علماء آپ کے دروازے سے دُور نہیں رہ سکے۔ کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا اور زندگی بھر کسی کا دستِ تمنا خالی نہیں لوٹایا۔ آپ کا دسترخوان دوست، دشمن، فقیر، امیر، مسافر و مقیم سب کے لیے یکساں طور پر کشادہ تھا۔ خطۂ کشمیر کے بیکس و بے بس نو وارد اسی چشمۂ راحت سے سیراب ہوتے۔ آپ دینی کارکنوں، صوفیانہ رسالوں اور اسلامی اخباروں کی مالی خدمت بھی کرتے۔ خود پیر تھے، عالم تھے مگر کسی کو مرید نہ بناتے اس کے باوجود آپ کے عقیدت مندوں کا سلسلہ لاہور، امرتسر، جموں، پونچھ اور کشمیر سے لے کر افغانستان و ایران تک پھیلا ہوا تھا۔

آپ کی تصانیف جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے صلوٰۃ و سلام پر وقف رہیں۔ اس موضوع پر آپ کو دنیا کے کسی خطّے سے بھی صلوٰۃ و سلام کا مجموعہ ملا تو آپ نے حاصل کیا اور محفوظ کر کے طبع کرا لیا اور اسے اشاعتِ عام بخش کر قبولِ عام بنا دیا۔ آپ اپنی قلمی تالیف "خزائن البرکات" محررہ ۱۳۳۸ھ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"للناس شغل ولی شغل فی تصور النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔"

بود در جہاں ہر کسے را خیالے
مرا از ہمہ خوشتر خیالِ محمدؐ

درود و سلام ہی آپ کی غذا و دوا تھی۔ صبح و شام یہی وظیفہ اور یہی معمول تھا

(حاشیہ از صفحہ گزشتہ) قابلیت کا ثبوت دیا ہے کہ اس مبارک تقریب کی روشنیاں، صلوٰۃ و سلام کی بارشیں اور ذکر و فکر کی ضیا پاشیاں سارے ملک میں مثالی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ قادری صاحب نے ہمارے محترم عزیز قاری محمد عطاء اللہ صاحب کے تعاون سے اسی مسجد میں "جامعہ قدوسیہ غوثیہ" کی بنیاد رکھ کر علم دین کے ان سوتوں کو از سرِ نو جاری کر دیا۔ جو ایک مدت سے خاموش ہو گئے تھے۔ قادری صاحب کے بعد مولانا مقصود احمد محکمہ اوقاف کی طرف سے اس مرکزی علمی حیثیت کو برقرار رکھے ہیں۔

بقول ایک صوفی کے " پیر عبدالغفار نے زندگی بھر باتیں کم کیں اور درود و سلام زیادہ پڑھا " یہ بڑی سعادت ہے۔ علامہ اقبالؒ کتنا صحیح کہہ گئے ہے

روزِ محشر اعتبارِ ماست او
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

" خزائن البرکات " آپ کی تالیفات کا ایک قلمی خزینہ ہے جس میں آپ نے درود پاک معہ اسناد و اجازت جمع کیے ہیں۔ یہ مخطوطے چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں اور بڑی تقطیع کے ایک ایک ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کے ایک خادم شیخ عبداللہ صاحب کاتب امرت سری نے چودہ سال کی محنت شاقہ سے لکھے۔ اس کتاب کے علاوہ آپ نے ۵۰ رسالے فضائل درود و سلام پر تالیف کر کے شائع کیے جو اہل ذکر کیلئے غذائے رُوح بنتے گئے۔

اعتقادی طور پر آپ ایک پختہ خیال اور خوش عقیدہ حنفی تھے۔ ایصالِ ثواب، درود وسلام، میلاد و گیارھویں، زیارتِ قبور پر انفرادی اور نجی طور پر ہی کاربند نہیں تھے اِن شعائر کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں جاری وساری دیکھنے کے خواہاں تھے۔ آپ کی ان " بدعات " سے غیروں کی نیندیں حرام تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد پہلے عرس پر آپ کے عزیز انور شاہ کاشمیری (شیخ الحدیث دیوبند وڈھابیل) شریک ہوئے تو تقریر کے لیے اُٹھے۔ چونکہ شاہ صاحب دیو بندی مکتب فکر کے بڑے قریب تھے۔ اور لاہور کے عوام کا خیال تھا کہ آپ " یارسول اللہ " کہنے کے منکر ہیں۔ نعرۂ رسالت بلند کیا۔ شاہ صاحب نے اس نعرہ کا انداز سمجھ کر فرمایا، لاہور والو! میرا عقیدہ نہ پرکھو۔ میں اس سرزمین سے تعلق رکھتا ہوں جہاں کی قبریں بھی یارسول اللہ کہتی ہیں۔ؔ اس تقریر سے " موحدین لاہور " کو بڑی مایوسی ہوئی اور " دیوبند کے نوری وجود " کا یہ خطاب بڑا حیران کن تھا۔ مولوی عبدالواحد (وہابی) خطیب مسجد چینیاں والی لاہور نے

لہ " الاشرف " لاہور صفحہ ۲۲ شمارہ اکتوبر ۱۹۲۳ء

تو یہاں تک کہہ دیا کہ "پیر عبدالغفار کی موت سے جو بدعت ختم ہوگئی تھی، انور شاہ کے طرزِ عمل نے پھر زندہ کردی ہے۔"

آپ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مشہور نعت قصیدہ بانت سعاد کا فارسی نظم میں ترجمہ کر کے اہل سخن سے بڑی داد حاصل کی تھی چنانچہ قصیدہ کے آخر میں فرماتے ہیں:

حبذا ایں ترجمہ کش مثل و ہمتا و نظیر
نیست در کشمیر و ہند و چین و ماچین و تتار
از شعاعش زر بود گردد چو را د الوجود!
لیک مخلص میشود زاں سرخ رو ہمچو کنار[1]

آپ بروز چہار شنبہ مورخہ ۱۷ر جمادی الاخریٰ ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۲ء) نمازِ عشاء ادا کرنے کے لیے وضو فرما رہے تھے۔ وضو مکمل کرنے کے لیے صرف بایاں قدم دھونا باقی تھا کہ آپ کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ احباب نے چارپائی پر لٹا دیا۔ آپ کے مخلص دوست ڈاکٹر محمدالدین صاحب نے معائنہ کیا۔ ایک دوائی تجویز کی مگر پیر صاحب کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ آپ کی موت سے لاہور ایک روحانی رہنما، عاشقِ رسول ﷺ، عابدِ شب زندہ دار اور متقی عالمِ دین سے محروم ہوگیا۔ آپ کے شاگرد رشید سید محمد امین اندرابی ایڈووکیٹ نے باغ بیرون دہلی گیٹ نماز جنازہ پڑھائی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق نمازِ جنازہ میں پچیس ہزار افراد نے شرکت کی۔

ڈاکٹر محمدالدین نے آپ کی تاریخ وفات یوں کہی تھی،

بشنو حالِ وصالِ عبداللہ
پیر عبدالغفار عالی جاہ[2]

---

[1] اوراقِ فتحیہ۔ تکملہ ص ۵۸
[2] نقوش لاہور نمبر

در وضوءِ نمازِ وقتِ عشاء
ناگہاں داد جاں بحکمِ الٰہ
بہر سالِ وصالِ ناظر گفت
پیر عبدالغفار نور الٰہ
۱ ۹ ۵ ۲ ۲

بہر سالِ وصالِ او ناظر
گفت سرمستِ جامِ عشقِ الٰہ

مولانا غلام اللہ قصوری پروفیسر چیف کالج نے تاریخ وفات یُوں کہی :

ہیہات مات پیر عبد غفار
ترک دار الفنا و وصل بدار القرار
لبیک قال للملک نادی الاّ لہٗ من ملک
ایحیٰ وانا اُدخل بخلد سید الابرار
۱۳۴۰ھ

آپ کے جسدِ خاکی کو امانتاً تکیہ سادھواں میں ہی دفنا دیا گیا مگر آپ کے فرزند پیر اشرف آپ کا تابوت ۱۰/ اگست ۱۹۲۵ء کو قبرستان میانی شریف نزد باغ گل بیگم لے گئے جہاں پیر صاحب اپنی آخری آرامگاہ میں سوئے ہُوئے ہیں۔

مولانا عبداللہ کشمیری رعنا داری نے پُردرد مرثیہ کہا اور آپ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہم اس مرثیہ سے چند اشعار بطور تبرک ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں[1] :

حضرتِ غفار صاحب چو زما برداشت گام ۔۔۔ یافت فردوسِ بریں از لُطفِ غفاری مقام
چار شنبہ ہفدہم چوں از جمیدا ثانی است ۔۔۔ کرد مرغِ رُوح او بر شاخِ طوبیٰ خوشخرام
آئینہ سیما ہم از نورِ جبین او مبین ۔۔۔ ناظر ش را از نشانِ بے نشاں دادہ پیام

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ پیر عبدالغفار تکیہ سادھواں لاہور۔ یہ نظم خوشخط الفاظ میں دفتر میں آویزاں ہے۔

خامۂ ختمِ نقشبندی ارجمندی دادہ اش پائیگاہ سربلندی کردہ حاصل آں ہمام
گرچہ ذاتش آفتابِ مشرقِ کشمیر زمیں مغرب لاہور جانش کردہ در دارالسلام
خواجۂ خاوند محمودش ہنوز از خویشتن تربت ہمسائیگی بخشید در لاہور نام
بود چو جاری درود چشمش از سود درود یافت باغ تحتہا الانہار در جنت مقام
بس کتب ہا جمع کردہ از درودِ مصطفےٰ یافت خوشنودی ز مولیٰ حور و غلمانش غلام
گنج بخش کنز رحمت، کانِ غیرت ہمچو او نیست در پنجاب و ہندوستان و کشمیر روم و شام
خوانِ نعمت داشتہ وقفِ فقیران و غنی دادہ ہر کس را صلائے عام از انعام عام
ہر یک از سکانِ کشمیر ہر یک از دیگر بلاد مسلمین تنہا نہ نالند گبر و ترسا ہم مدام

آپ کے شاگرد رشید مولانا محمد نبی بخش حلوائی مولف تفسیر نبوی نے اپنی کتاب "شفاء القلوب" میں ان الفاظ میں ہدیۂ تحسین پیش کیا ہے :

کشمیروں تشریف لیایا وچ لاہور شہر دے اہلسنت نوں خوشیاں ہویاں بنے غلام نظر دے
رستے پاون والا آیا نور کھنڈاون والا !!!! عبد غفار ہے ناواں روشن رب ملان والا
چہرے انور اُپر اُسدے فقردوں نور چمکدا قادریاں دے گلشن اندر سوہنا پھل لٹکدا
عالم علم شریعت کامل شیخ طریقت والا جاری فیض کرے چو طرفے پیر حقیقت والا
طالب پڑھن قرآن حدیثاں، فقہ انہاندے ڈیرے رکھدے درس علم کھلے ہوون دُور ہنیرے
دینی علموں ندیاں وگن جس دن دا ہے آیا شہر لاہور تائیں ہے چڑھیا روپ سوایا
کئی ہزاراں درود سلاموں نت وظیفے کردا دن راتیں وچ شغل عبادت وحدت ندیاں تردا
سن سن شہرہ عالم فاضل خدمت اندر آون پرائے دی خدمت کارن فرق نہ ذرہ پاون
قسما قسم درود و ظائف چھاپے وچ چھپوائے کھلا خرچ ہووے دن راتیں رب دے راہ دکھائے
دل جانوں شاگرد اینہاندا عاجز ہے حلوائی صاحبزادہ اک حضرت دا اوہ بھی صالح بھائی

مولانا غلام اللہ قصوری رحمۃ اللہ علیہ

قصور کے علمی دور کی ایک درخشندہ یادگار

حضرت مولانا غلام اللہ قصوری اپنا تعارف اپنی مشہور تصنیف "تائیدِ اسلام" کے دیباچہ میں ان الفاظ سے کرتے ہیں :

" اضعف العباد اللہ المعروف غلام اللہ ابن مولوی غلام رسول ابن حضرت حافظ داؤد ابن حافظ مرتضیٰ غفر اللہ لہٗ والدٰہ واحسن الیہم والیہ قریشی صدیقی قصوری "

حافظ غلام مرتضیٰ صاحبؒ وہی " مخدوم پنجاب " ہیں جن کی نگاہِ تربیت سے وارث شاہ " اور " بلھے شاہ " ایسے مشہورِ خلائق صوفی شاعر آسمان شہرت تک پہنچے۔ حافظ غلام مرتضیٰؒ مولانا غلام محی الدین قصوری دائم الحضوری کے جدِامجد تھے۔

آپ قریباً ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ چھ برس کے تھے کہ آپ کے والد ماجد مولانا غلام رسول قصوریؒ ثم امرت سری ۱۸۵۸ء (۱۲۷۳ھ) نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور دم رحلت اپنے برادرِ خورد مولانا غلام العلیؒ کو وصیت فرما گئے کہ میرے بچوں (غلام اللہ اور ولی اللہ) کی تعلیم و تربیت تمہارے ذمے ہے۔ ولی اللہ، مولانا غلام اللہ سے دو برس چھوٹے تھے۔

بھائی کی وصیت کے مطابق مولوی غلام علی صاحبؒ ان دونوں ہونہار اور ذہین بچوں کو امرت سر لے گئے اور اپنے پاس رکھ کر نہایت عمدہ طریق سے تعلیم و تربیت کی۔ جب یہ دونوں بھائی جوان ہو گئے تو اپنی والدہ ماجدہ کے پاس قصور چلے آئے اور سکول کی ملازمت اختیار کی۔ پھر کچھ عرصہ بعد رسالہ " نور الہدیٰ "

جاری ہوا جس کے ذریعے آپ کی لیاقت اور قابلیت کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیلنی شروع ہوگئی۔

فریدکوٹ میں ان دنوں مہاراجہ صاحب فریدکوٹ کسی کام کے لیے قصور آئے اور انہوں نے مسٹر سٹیل حاکم قصور کو کہا کہ مجھے ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے کے لیے ایسے دو آدمیوں کی ضرورت ہے جو غایت درجہ کے لائق اور قابل ہوں۔ اگر آپ کی نظر میں ایسے شخص ہوں تو اُن کو مجھ سے ملا دیجئے۔ مسٹر سٹیل نے فوراً ان دونوں بھائیوں، مولانا غلام اللہ اور مولانا ولی اللہ کو بلا کر مہاراجہ صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ مہاراجہ صاحب ان ذہین و فطین نوجوانوں سے بات چیت کرکے بہت خوش ہوئے اور بڑے بھائی کو مشیرِ مال اور چھوٹے کو اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا مگر مولانا غلام اللہ ریاست کے کام کی پیچیدگیوں اور ریشہ دوانیوں سے گھبرا کر بہت جلد مستعفی ہو کر چلے آئے اور دوبارہ تحصیل و تکمیل علوم کا خیال پیدا ہوگیا۔

لاہور میں آمد علم کی پیاس بجھانے کی غرض سے آپ لاہور آئے اور اس وقت کے فاضل یگانہ خلیفہ حمیدالدین مرحوم کی شاگردی اختیار کی اور ان کے علاوہ یہاں کے دیگر فضلاء سے بھی مستفید و مستفیض ہوئے۔ ان میں سے علامہ شبلیؒ کے استاذ مولانا فیض الحسن سہارن پوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا قصوریؒ نے مولانا سہارن پوریؒ سے اورینٹل کالج میں پڑھا۔ یہاں حضرت پیر جماعت علی شاہؒ علی پوری آپ کے ہم سبق تھے مگر مولانا قصوریؒ نے سب سے زیادہ فیض خلیفہ حمیدالدین صاحب ہی سے حاصل کیا اور ان ہی سے مسند اور دستارِ فضیلت حاصل کی۔ اس کے بعد آپ خلیفہ صاحب موصوف کے حسبِ فرمان مسجد محلہ کمان گراں اندرون موچی دروازہ کی امامت کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہ واقعہ قریباً ۱۸۸۲ء کا ہے۔

تاسیس انجمن حمایت اسلام جن چند ہمدردانِ قوم و ملت کی ہمت و کوشش سے انجمن حمایت اسلام لاہور قائم ہوئی تھی ان ہی میں سے مولانا غلام اللہ قصوریؒ ایک بزرگ ہیں۔ مولانا قاضی

خلیفہ حمید الدین مرحوم نے ۱۸۸۴ء میں اپنے چند مخلص دوستوں کے تعاون سے انجمن مذکور کی بنا ڈالی تو مولانا قصوری نے اس سلسلہ میں سب سے بڑھ چڑھ کر خلیفہ صاحب کے ساتھ تعاون کیا۔ اخبار حمایت اسلام لاہور بابت ۴ مارچ ۱۹۴۰ء میں بانیانِ انجمن حمایت اسلام لاہور کے مختصر حالاتِ زندگی شائع ہوئے تھے۔ اس میں مولانا قصوری کے متعلق لکھا ہے:

"مولانا پہلے ریاست فریدکوٹ کے مشیرِ مال تھے اور اب ایک مسجد میں بوریا بچھا کر بیٹھ گئے اور اللہ کے یہ مخلص بندے خوش تھے کہ انہیں خدمتِ قوم کا موقع ملا۔ یہیں سے اُنہوں نے مُسلمانوں کی اصلاح کا کام شروع کیا۔ عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں سے مباحثے کیے، مقالے لکھے اور ان کی ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے استاد اور دُوسرے دوستوں سے مل کر انجمن حمایت اسلام کی بنا ڈالی اور آخر عمر تک ہر طرح سے اس پودے کو سرسبز بنانے میں مصروفِ عمل رہے۔"

مولوی صاحب موصوف خلیق، صاف دل، سادہ مزاج اور بلند ہمت بزرگ تھے۔ انہیں اسلام اور مسلمانوں سے سچی محبت تھی اور ساری عمر اسی محبت کی نذر کر دی۔

مدرسہ حمیدیہ کا اجراء

انجمن حمایت اسلام کے قیام کی غرض وغایت اور مقصدِ وحید تبلیغِ اسلام اور عیسائیوں آریہ سماجیوں کی فتنہ پردازیوں کا سدِ باب تھا۔ اس لیے اس انجمن نے خلیفہ حمید الدین کے نام پر ایک دینی مدرسہ جاری کیا۔ اس مدرسے کے قیام میں مولانا غلام اللہؒ کی کوششوں اور مشوروں کو خصوصی دخل تھا۔ اس مدرسے کے سب سے پہلے اوّل مدرس خلیفہ حمید الدین اور نائب مدرس مولانا غلام اللہ تھے۔ اس مدرسہ حمیدیہ نے مسلک اہلسنت کی بہت زیادہ خدمات انجام دیں اور ملک کے بڑے بڑے لائق اساتذہ نے اس میں بطور مدرس کام کیا جن میں سے مفتی عبداللہ ٹونکی[1]، حکیم غلام مصطفیٰ ایم۔ او۔ ایل،

[1] مفتی عبداللہ ٹونکی اپنے زمانہ کے بڑے نامور عالمِ دین مانے گئے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا محمد ذاکر بگوی اور مولانا اصغر علی رُوحی رحمہم اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مدرسہ ۱۹۱۰ء تک بڑے انتظام و اہتمام سے کام کرتا رہا۔

صدر مدرس مدرسہ رحیمیہ لاہور میں انگریزی دور کی غالباً سب سے پہلی دینی درسگاہ "مدرسہ رحیمیہ" واقع مسجد نیلا گنبد لاہور رہے۔ یہ مسجد قریباً ۱۸۵۲ء میں انگریزوں نے واگذار کی تھی۔ اس کے چند سال بعد شیخ رحیم بخش صاحب سوداگر دہلوی نے اس میں مدرسہ رحیمیہ جاری کر دیا تھا۔ مولانا نور احمد چشتی مرحوم نے ۱۸۶۴ء میں "تحقیقاتِ چشتی" تصنیف کی۔ اس میں چشتی صاحب نے لکھا ہے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۱۸۸۲ء میں اورینٹل کالج کے عربی مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۷ء میں مولانا فیض الحسن کے انتقال کے بعد عربی کے صدر مدرس بنے۔ فقہ اسلامی کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں ان کا فیصلہ حتمی ہوتا تھا۔ دُبلے، پتلے انسان تھے۔ ہر وقت پان چباتے رہتے تھے۔ جب بات کرتے تو منہ پر رومال رکھ کر بات کرتے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے: "اس ناتواں جسم میں علم وفضل کا اتنا ذخیرہ ہے کہ کوزے میں دریا بند ہونے کی مثل ان پر صادق آتی ہے۔" ۴۳ سال تک اورینٹل کالج میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور لاہور جسے وہ اپنا دوسرا وطن کہا کرتے تھے داغِ مفارقت دے گئے۔ شرح محمدیؐ پر چار کتابیں اُردو زبان میں بیش بہا خزانہ ہے۔ کئی مسائل پر ان کے فتاویٰ رسائل کی صورت میں شائع ہوئے اور تشنگانِ رموز و نکات شرع اسلامیہ نے ان سے بڑا فیض پایا۔ لاہور سے جا کر کچھ عرصہ تک دارالعلوم ندوہ میں کام کیا اور پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس بنے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آخر عمر میں آپ نے بعض اسلامی مسائل کی وہ تاویلیں کرنا شروع کر دیں جو علمائے احناف کے نزدیک غلط ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں ۷۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ ان کی وفات سے عربی زبان ایک فاضل اجل اور اسلامی شریعت ایک بے نظیر نکتہ داں سے محروم ہو گئی۔ آپ کے ایک صاحبزادے مفتی انوار الحق بھوپال میں ایک مدت تک ناظم تعلیمات رہے۔ ("لاہور کا چیلسی" صفحہ ۲۴۳ از حکیم احمد شجاع مطبوعہ "نقوش" لاہور)

"اب قریب تیس چالیس لڑکوں کے اس مسجد میں پڑھتے ہیں۔ سن اٹھارہ سو باون (۱۸۵۲ء) سے اس مسجد کے امام مولوی احمد الدین صاحب بگہ والے مقرر ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے مُلّا نور احمد امام مسجد جوائی نائب امام مقرر ہُوئے، جو لاہور کے موتی بازار میں مسجد جوائی کنجری کے امام ہیں اور میاں رحیم بخش سوداگر مولوی احمد الدین کو اپنے پاس سے ماہواری ارسال کرتے ہیں اور تمام خرچ مسجد میاں رحیم بخش سوداگر کرتے ہیں"

(تحقیقات چشتی ص ۱۳۲)

مولانا غلام اللہ قصوریؒ بانی مدرسہ شیخ رحیم بخش صاحب کے فرزند شیخ محمد نقی صاحب مرحوم کے استاد تھے۔ اس لیے شیخ صاحب موصوف مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے ۱۸۸۰ء کے آخری عشرے کا واقعہ ہے کہ اس مدرسے کے صدر مدرس کی اسامی خالی ہُوئی تو شیخ صاحب نے مولانا قصوری کو اس خلاء کے پُر کرنے کے لیے مجبور کیا۔ چنانچہ آپ مدرسہ رحیمیہ کے صدر مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے مگر اپنی تمام توجہات انجمن حمایت اسلام اور مدرسہ حمیدیہ کے انتظامی امور کے ساتھ وابستہ رکھیں۔

مدرسہ رحیمیہ واقع نیلا گنبد اب محکمہ اوقاف کے زیرِ انتظام پہنچ کر حالتِ نزع میں مبتلا ہے۔ محکمہ مذکور نے سیاسی اغراض کی خاطر ایک نوزائیدہ مدرسے کو اس مسجد میں جگہ دے کر اس قدیمی اور تاریخی مدرسے کو ایک نئے مدرسے میں ضم کر دیا ہے مگر ابھی تک فریقین رضامند نہیں ہُوئے۔ محکمہ اوقاف اگر واقفین کے اوقاف اور ان کی خواہشات کو اس طرح مجروح کرتا رہا تو اس محکمے کے محاسبے کے لیے قوم کو ایک اور محکمہ قائم کرنے کے لیے حکومت سے مطالبہ کرنا پڑے گا۔ سُنیوں کی یہ پُرانی درس گاہ بھی اب دیوبندیوں کے قبضے میں جا رہی ہے حالانکہ ابتدائی طور پر اس درس گاہ کے بانی اور اساتذہ سارے ہی سُنّی رہے ہیں۔

امرتسر روانگی مولوی صاحب پوری دلجمعی کے ساتھ لاہور میں دین اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنے میں مصروف تھے کہ انجمن اسلامیہ

امرت سر (قائم شدہ ۱۸۶۲ء) نے ۱۸۸۵ء میں اسلامیہ ہائی سکول جاری کیا ، اور خان محمد شاہ رئیس اعظم امرت سر نے آپ کو لکھا کہ آپ لاہور کو خیرباد کہہ کر فوراً امرت سر چلے آئیں کیونکہ اب آپ کی خدمات کی ضرورت اہلِ امرت سر کو ہے اور یہاں ہم نے جس مدرسہ اسلامیہ کی بنا ڈالی ہے آپ اس کے اوّل مدرس دینیات کی حیثیت سے کام کریں۔ خان محمد شاہ صاحب مرحوم مولانا غلام اللہ قصوری کے دوست اور آپ کے والد ماجد مولانا غلام رسول مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس لیے ان کی فرمائش کو ردّ نہ کر سکے اور امرتسر تشریف لیجا کر اسلامیہ ہائی سکول میں بحیثیت اوّل مدرس کام کرنے لگ گئے۔ اس کے علاوہ خان محمد شاہ مرحوم نے آپ کو اپنی مسجد واقع کٹرہ اہلو والیہ کا امام اور اپنے خاندان کے بچوں کا اتالیق مقرر کیا۔ یہ واقعہ ۱۸۸۵ء کا ہے۔

امرت سر تشریف لے جانے سے پیشتر ہی مولانا اطراف و اکناف بھارت پاک میں شہرت حاصل کر چکے تھے اور اُن کے والد ماجد اور عمِّ محترم مشہور عالمِ دین مولوی غلام علی رح کی تمام زندگی امرت سر میں گزری تھی اور انھوں نے ابتدائی تعلیم و تربیت بھی امرت سر میں حاصل کی تھی اس لیے اہلِ امرت سر کو آپ سے تعارف پہلے ہی سے تھا چنانچہ آپ وہاں پہنچتے ہی نامور علماء کی صفِ اوّل میں شمار ہونے لگے۔ اس عہد کی کتب و رسائل دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا غلام اللہ رح کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔ مرزا صاحب قادیانی کے پیرؤوں کی تحریروں میں امرت سر کے علماء میں سے مولانا غلام رسول صاحب قاسمی رح (رسل بابا) مولوی سید عبدالجبار غزنوی اور مولانا غلام اللہ قصوری رح کے نام ہی سب سے نمایاں نظر آتے ہیں ، کیونکہ امرت سر کے علماء میں سے سب سے پہلے انہی حضرات نے مرزا صاحب کے دعاوی کی تردید کی تھی۔

اعتدال پسندی مولانا کے زمانۂ قیام امرت سر میں سُنّی ، وہابی کا جھگڑا بہت زوروں پر تھا۔ مولانا خود بڑے راسخ العقیدہ سُنّی تھے۔ مگر آپ نے ہمیشہ اس قسم کے مناظروں اور مباحثوں سے احتراز کیا۔ وہ اس قسم کی بحثوں کو جمعیت اسلامیہ کے لیے غیر مفید سمجھتے تھے مگر ردّ نصاریٰ اور مرزائیت

آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔

رسالہ "الواعظ" کا اجراء آپ نے امرت سر سے ایک رسالہ "الواعظ" کے نام سے محرم ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں جاری کیا تھا جس میں اسلامی مسائل و عقائد کو نہایت عمدہ تشریح و توضیح کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا، اور بڑے سلجھے ہوئے انداز میں مسائل حاضرہ پر تبصرہ لکھا جاتا تھا۔ یہ رسالہ بہت مقبول اور کثیر الاشاعت تھا۔

فیروزپور روانگی تقریباً گیارہ سال امرت سر گزارنے کے بعد آپ یکایک یہاں کی سکونت سے دل برداشتہ ہو گئے اور اواخر ۱۸۹۶ء میں فیروزپور ہائی سکول میں بحیثیت اوّل مدرسِ دینیات ملازم ہو گئے اور ۱۹۰۴ء تک وہیں مقیم رہے۔

پروفیسر چیفس کالج اواخر ۱۹۰۴ء میں چیفس کالج لاہور میں بذریعہ انتخاب دینیات و عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے اور تقریباً سترہ سال یہاں باقاعدگی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ جب آپ بہت کمزور ہو گئے تو اپنی جگہ پر اپنے بیٹے مولوی حکیم حاجی محمد حسین صاحب مرحوم (متوفی ۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۴ء) کو مقرر کرا دیا اور خود مورخہ ۳ر جنوری ۱۹۲۲ء کو ریٹائر ہو کر قصور چلے گئے۔

مسلک و مشرب مولوی محمد داؤد صاحب وکیل قصور نے لکھا ہے کہ "مولانا صاحب مذہباً حنفی اور مشرباً نقش بندی مجددی تھے اگرچہ آپ نے حضرت مولوی غلام العلی[1] کے پاس رہ کر تعلیم و تربیت پائی مگر ان کے خیالات سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔"

بیعت مولوی صاحب صاحبِ اجازت بزرگ تھے۔ بعض جگہ آپ کے مرشد کا نامِ نامی اسمِ گرامی "مہر صوبا" بیان کیا گیا ہے جیسا کہ لکھتے ہیں:

---

[1] مولوی غلام علی صاحب بہت بڑے وہابی تھے اور مولانا غلام اللہ کے سگے چچا تھے۔

باں حضرت کہ صوبہؒ با گشت نامش — خدایا دار دائم نیک نامش
طفیلِ آں غلام مرتضیٰؒ شاہ — مرا گرداں بحالِ خویش آگاہ
طفیلِ حضرتِ آں بدرِ کاملؒ — الٰہی کن مرا با خواجہ واصل
طفیلِ حضرتِ عبدالرسولمؒ — مکن ہرگز خداوندا ملولم

حضرت مہر صوباؒ ۹۰ برس کی عمر پاکر ۸ فروری ۱۹۴۵ء میں فوت ہوئے اور قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئے۔ اُن کے مرشد مولانا غلام مرتضیٰ صاحب کا مزار فاروق گنج (لاہور) میں مرجع اہلِ عقیدت ہے۔ اُن کے پیر کا اسمِ گرامی بدرالدین ہے۔ آخری بزرگ حضرت عبدالرسول صاحب اسی خاندان کے ایک فرد اور حضرت مولانا غلام محی الدین قصوری مصنف "تحفہ رسولیہ" کے خلیفہ و فرزند ارجمند تھے۔

مولوی غلام اللہ صاحب "غلامی" تخلص کرتے تھے۔ اس شجرہ کا آخری شعر ہے:

غلامی را دعائے خیر گوید
خلافِ شرع ہرگز راہ نپوید

مولوی صاحب کے نبیرہ مولوی محمود حسین صاحب نے بتایا کہ مولوی صاحب حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری کے مرید تھے اور پیر صاحب سے روحانی فیض پایا تھا آپ اکثر رخصتوں کے دنوں میں پیر صاحب کے پاس جا کر قیام کیا کرتے تھے۔

تصانیف آپ نے اپنے وقت کے ان مسائل پر مختلف کتابیں لکھیں، جو وقتاً فوقتاً درپیش تھے۔ سرسید کے پیروکار حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ کو بے پدر بیٹا ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ لوگ عیسائی اعتقادات سے متاثر تھے۔ مولانا نے ان کے خیالاتِ فاسدہ کی زبردست تردید کی اور قرآنی آیات سے اپنی تصنیف "تحقیق الکلام فی ولادت المسیح علیہ السلام" میں ثابت کیا کہ حضرت مسیحؑ کا کیا مقام تھا۔ اسی طرح عیسائی پادری عماد الدین نے اسلام پر جو اعتراضات کیے تھے آپ نے اپنی کتاب "تائیدِ اسلام" میں جواب دیا۔

"غزواتُ النبیؐ" جو ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی آپ کا بڑا تحقیقی

کارنامہ ہے۔

"حرمتِ سود" پر آپ کا مختصر رسالہ ہے جو اسلامی اقتصادی نظام کو بلاسود چلانے کے لیے ایک عمدہ مطالعہ ہے۔ موجودہ زمانے کے وہ معاشین جو آج سود کے بغیر اقتصادی زندگی کا تصور نہیں کر سکتے، ان کے لیے بہت بڑی چیز ہے۔

مولوی محمد داؤد صاحب وکیل نے لکھا ہے:

"مولانا صاحب علم طب، کیمیا اور تسخیر میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ مگر ان کو ذریعہ معاش نہیں بنایا بلکہ حاجت مندوں میں ادویہ مفت تقسیم کیا کرتے تھے۔ آپ خنازیر کا شافی علاج بذریعہ دَم کیا کرتے تھے۔ ان تمام تجربات پر مشتمل آپ کی ایک بیاض تھی جو محفوظ نہ رہ سکی۔"

(قلمی رجسٹر مرتبہ مولوی داؤد صاحب قصوری)

وفات مولانا صاحب ریٹائر ہو کر قصور گئے ہی تھے کہ بیمار ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد بغرض تبدیلی آب و ہوا اپنے لڑکے کے پاس لاہور حنفیہ کالج میں چلے گئے۔ مگر "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی"۔ بالآخر یہیں فوت ہو گئے۔ میت قصور لے جا کر آبائی قبرستان میں دفن کی گئی، نور اللہ مرقدہٗ۔ مولوی صاحب کی عمر وقتِ رحلت ۷۰ برس تھی اور سالِ انتقال ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء ہے۔ خاص تاریخ و ماہ معلوم نہیں ہو سکا۔

قطعۂ تاریخ جناب مولوی محمد یار صاحب خلیق امام و خطیب سنہری مسجد لاہور (متوفی ۱۹۳۰ء) نے آپ کی وفات پر جو قطعہ تاریخ لکھا تھا، مولوی داؤد صاحب نے درج کرنے کے لیے عطا کیا ہے وھوھٰذا

کُلُّ نفسٍ ذائقۃ الموت آمد حُکمِ حق — لیک خوش آنکس کہ بُردہ در نکونامی سبق

اندریں ایامِ غم فرجامِ آں نیکو خصال — کرد رحلت زیں جہانِ پُر وبالِ و پُر زوال

شُد فلک گرداں ملک حیراں از جنت نشاں — گشت جنس وانس و طیر و وحش کل ماتم کناں

فاضل علامہ بودہ خود غلام اللہؒ بنام — نام فرزندش محمد باحسین حاجی تمام

ہاتفم گفتا بتاریخ وفات آں لئیق
بے حروفِ جہد گوئی باغِ فردوس اے خلیق
۱۲ ۱۴۱ ۱۳

اس قطعہ کے اشعار مولویانہ ہونے کے علاوہ مادہ تاریخ بہت نامناسب ہے اور "حسین" کے نون کو غنہ بنانا بھی قطعاً ناروا ہے[1]

---

[1] مولانا غلام اللہ قصوری کے حالات کے لیے میرے محترم حکیم محمد موسیٰ کا مسودہ "علمائے امرتسر" بڑے گراں قدر معلومات کا ذریعہ ثابت ہوا۔ یہ کتاب عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ناظرین کی خدمت میں پیش ہونے والی ہے۔

سیّد حافظ احمد علی شاہ بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ

پروفیسر اسلامیہ کالج ۔ خطیب شاہی مسجد

علامۂ علومِ کتاب و حدیث و فقہ
فہامۂ فہومِ اصول و فروعِ دین

(مولانا عبدالعلی آسی)

آپ کا لہ افغاناں قصبہ بٹالہ ضلع گورداسپور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔

کتاب الشفا کے ترجمہ پر آپ کا پورا نام یوں درج ہے:

"جناب مولانا مولوی حافظ احمد علی شاہ بٹالوی حنفی نقشبندی چشتی نظامی پروفیسر دینیات و عربی اسلامیہ کالج، لاہور"۔

۱۸۰۲ء میں آپ وارد لاہور ہوئے تو آپ نے ایک مناظرہ میں پادری پورن چند صاحب مدرس مشن اسکول لاہور کو شکستِ فاش دے کر مسلمانانِ لاہور سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ اس پادری کے ہاتھوں سادہ لوح مسلمان تنگ آچکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مولانا نے عیسائی مبلغین کے خلاف معرکۃ الآراء تقاریر کا سلسلہ شروع کر دیا، جس سے آپ لاہور کے مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ لوہاری دروازے کے باہر آپ اکثر تقریر فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے "دعوۃ الحق" کے نام سے ایک سلسلۂ تصنیف شروع کیا جسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اطراف و اکناف کے اہلِ علم بڑے مستفیض ہوئے۔ آپ کو مختلف شہروں ملتان، راولپنڈی، گوجرانوالہ، انبالہ، بٹالہ، امرتسر سے بھی دعوتیں آنے لگیں۔ جہاں پہنچ کر

آپ نے عیسائیت کے خیالاتِ باطلہ کی دھجیاں اُڑا دیں۔

۱۳۲۰ھ میں بٹالے کے قیام کے دوران میں اپنی مشہور کتاب "نصرالمقلدین" لکھ کر علمی و اعتقادی حلقوں میں شہرت حاصل کی۔ یہ کتاب مولوی محی الدین لکھوی صاحب غیر مقلد کی کتاب "الظفر المبین" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں تقلید پر بڑی علمی ابحاث کی گئی ہیں اور جو لوگ تقلید کو ناروا سمجھتے ہیں۔ ان کے دلائل کا مُنہ توڑ جواب دیا گیا۔ اس کتاب نے علمی اور اعتقادی دُنیا میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔

۱۳۱۱ھ میں آپ لاہور تشریف لائے اور اسسٹنٹ پروفیسر عربی اسلامیہ کالج لاہور مقرر ہُوئے۔

ان دنوں آپ نے حافظ مشتاق احمد انبیٹھوی کی کتاب "ضابطہ در تحصیل رابطہ" پر تکملہ لکھ کر "تصورِ شیخ" پر بحث کی ہے۔ تصورِ شیخ کی اس علمی بحث کو آپ کے معاصرین صوفیاً نے اور علمائے تصوف نے جس حیثیت سے سراہا وُہ آپ کے رموزِ تصوف سے واقفیت کی روشن دلیل ہے۔

آپ شاعری میں تخلص علی فرمایا کرتے تھے۔ افسوس کہ آپ کا شعری کلام نہیں مل سکا۔

مولانا عبدالعلی صاحب آسی مدراسی نے آپ کے کمالِ علم کا اعتراف کرتے ہوئے چند اشعار لکھے ہیں جن میں آپ کے علمی مقام کو اپنے معاصرین کی نظر میں دیکھا جا سکتا ہے:

احمد علی چو سیف قلم را علم نمود
دادہ شکستِ فاش ظفر را بہ نصرِ دین

لہ مولوی محی الدین لکھوی کے علاوہ اسی مکتبِ فکر کے علماء نے تقلید کے خلاف بہت سی کتابیں لکھیں۔ جب مولوی نذیر حسین دہلوی نے ایک کتاب "معیار الحق" لکھی تو اس کے ردّ میں مولانا ارشاد حسین رام پوری نے "انتصار الحق" لکھ کر غیر مقلدین کو مسکت جواب دیا تھا۔ اس قسم کی علمی ابحاث میں سید احمد علی شاہ کی متعدد کتابیں اہلِ علم سے دادِ تحسین وصول کرتی رہیں۔

گر دعویٰ مناظرہ دارد باو کسے
ناوک ہمیں نشانہ ہمیں معرکہ ہمیں
تحریر در دلائل و تفسیر در اصُول
عرّیف در اوائل و عطریف در پشین
علامۂ علومِ کتاب و حدیث و فقہ
فہامۂ فہوم اصول و فروعِ دین
نطقش چہ خوش مذاق وخوش الحان خوش بیان
ذہنش چہ بذلہ سنج و سخن فہم نکتہ بیں
بر آسمانِ حکمت وطب شمسِ بازغہ
بر اوجِ علمِ عقلی و نقلی مرجبیں
وہابیاں نمود چوں باوے مناظرہ
عاجز شدہ گریختہ از ہند تا بہ چین[1]

لاہور کے قیام کے دوران آپ کو مسجد شاہی کی خطابت ملی۔ اس فرض کو آپ نے بارہ سال تک بطریق احسن سرانجام دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گنگوی علمائے کرام کے آخری خطیب مولانا محمد شفیق گنگوی اپنے وطنِ مالوف کو جا چکے تھے۔

تصانیف

آپ کی تصانیف میں سے مندرجہ ذیل کتب اہل علم کے لیے مشعلِ راہ بنیں:

۱۔ ترجمہ نفحات الانس از مولانا جامیؒ
۲۔ ترجمہ تحفۃ القلوب و ہدایۃ الارواح مؤلفہ شیخ عثمان جالندھری
۳۔ ترجمہ مشکوٰۃ الانوار از امام غزالیؒ
۴۔ ترجمہ بہجۃ الاسرار (معدن الاسرار) از شیخ نورالدین ابی الحسن بن یوسف شافعی،

---

[1] تقریظ بر تذکرۃ المناظرین مؤلفہ سید احمد علی شاہ ؒ

۵۔ ترجمہ الشفا از قاضی عیاض

۶۔ ترجمہ "سرور الخواطر الفاتر" فی ندائے یا شیخ سید عبدالقادرؒ

۷۔ نور الشمع فی ظہر الجمعہ اردو (یہ کتاب پیر عبدالغفار خطیب تکیہ سادھواں کے ایماء پر لکھی گئی اور انہی کے زیرِ اہتمام چھپی)

۸۔ ترجمہ رسالہ حق نما از دارا شکوہ

۹۔ نصرۃ المقلدین [1]

درس مسلم شریف

آپ قیامِ لاہور کے دوران پیر عبدالغفار شاہ صاحبؒ کے ہم مجلس تھے۔ اکثر اوقات وہاں گزارتے۔ ایک عرصہ تک شام کی نماز کے بعد درس مسلم شریف دیتے رہے جس سے لاہور کے علماء استفادہ کرتے۔ پیر صاحب گیارھویں اور بارھویں چاند کو جو ختم شریف کراتے اس میں آپ کی تقریر ضرور ہوا کرتی تھی۔ ہر سال عید میلاد النبیؐ کی مبارک تقریب پر مولانا سیرت رسول اکرمؐ پر بیان فرماتے اور پیر صاحب آپ کی عزت افزائی کے طور پر ہر سال دستار بندی فرمایا کرتے۔ ان خالص مجالسِ ذکر و عرفان میں آپ کے علاوہ مولانا اصغر علی روحیؒ، مولانا نور بخش توکلیؒ پروفیسر گورنمنٹ کالج ایسے صوفی منش علماء دین بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ درس حدیث کی شہرت کے پیشِ نظر آپ "مدرسہ غوثیہ لاہور" کے شیخ الحدیث کہلائے۔

جمعیۃ الاحناف امرتسر ۱۹۲۳ء میں قائم کی گئی تو اس کی مجلس انتظامیہ میں حضرت مولوی سید احمد علی شاہ رکن کی حیثیت سے لیے گئے اور آپ نے اہل سنت کی اعتقادی تربیت میں بڑا کام کیا۔ [2]

آپ نے غیر عقائد علماء کے کھوکھلے اور مناظرانہ دلائل کا اتنی شدت سے جواب دیا کہ مناظرہ باز علماء آپ کا سامنا کرتے ڈرتے تھے۔

---

[1] نقوش، لاہور نمبر صفحہ ۹۱۶

[2] الفقیہہ امرتسر ۲۰/ اپریل ۱۹۲۳ء / ۱۳۴۱ھ

اولاد مولانا کے صاحبزادہ حافظ بختیار علی صاحب ۱۳۴۱ھ میں فوت ہوئے، جس کی تاریخ وفات الفقیہہ امرتسر میں یوں چھپی تھی:

جب کسی نے کہا بدیدہ تر
چلایا وائے بختیار علی
غایت کرب سے برائے ثواب
لکھ دیا ہائے بختیار علی
۱۳۴۳ +

اس کے علاوہ آپ کی اولاد کے متعلق تحقیق نہیں ہو سکی۔

آپ ۱۹۲۶ء میں راہی ملکِ بقا ہوئے۔ حضرت سید دیدار علی شاہؒ نے نمازِ جنازہ ادا کی اور میانی کے قبرستان لاہور میں مرقد پُر انوار ہے۔

مولانا تاج الدین صاحب قادری رح

مولانا تاج الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ میاں وال رانجھیاں تحصیل پھالیہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ عربی کی ابتدائی کتابیں مقامی مدارس نظامیہ میں پڑھیں۔ ان دنوں "دارالعلوم نعمانیہ لاہور" اہل سنت وجماعت کی شاندار درسگاہ تھی جہاں ملک کے قابل ترین علماء مصروفِ تدریس تھے۔ مولانا تاج الدین صاحب بھی اس مکتب میں داخل ہوئے اور چند سال صرف ونحو، اصول ومعانی اور حدیث وتفاسیر کا مطالعہ کیا۔

اثنائے تعلیم آپ مسجد پڑولیاں میں خطیب رہے۔ بڑے سخت گیر، متدین اور مستعد عالم دین تھے۔ خلافِ شرع بات سُننا گوارا نہیں تھا۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے آپ کو آسیب وجنات پر عمل تسخیر حاصل تھا۔ ان دنوں مسجد وزیر خاں کے شمال مشرقی طرف ایک ویران مسجد تھی جہاں کوئی نمازی یا مسافر رات کو ٹھہرتا تو ایسے دہشتناک مناظر کا سامنا کرنا پڑتا کہ خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ ان واقعات نے مسجد کی ویرانی میں اور اضافہ کر دیا، دن کے وقت بھی لوگ جانے سے ہچکچانے لگے۔ مولانا نے اس مسجد کو ویران دیکھ کر اعلان کیا کہ میں جنات وآسیب سے خانۂ خدا کو خالی کر دوں گا۔ آپ نے اس مسجد کو صاف کیا۔ دن رات قرآن خوانی ہونے لگی۔ لوگوں کے جمگھٹے لگ گئے اور مولانا مستقل خطیب بن گئے۔ آجکل اس مسجد میں مدرسہ انوار القرآن کھل گیا ہے جہاں آپ کے ایک نامور شاگرد قاری حافظ صدر الدین صاحب فنِ قرأت وتجوید کی تعلیم دیتے ہیں۔

نعمانیہ سے دستارِ فضیلت حاصل کرنے کے بعد آپ تلاشِ مردِ حق میں نکلے۔ ان دنوں پیر صاحب مانکی شریف (حضرت اعلیٰ) روحانی تربیت میں مصروف تھے قدم بوس ہوئے اور پورے بارہ سال وہیں ریاضت میں گزار دیئے۔ اپنے مرشد کی نگرانی اور

تربیت نے مولانا تاج الدین کو ذرہ سے آفتاب کر دیا۔

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

سلوک و طریقت کی منازل طے کر چکے تو آپ کو خرقۂ خلافت سے نوازا گیا اور لاہور میں دینی خدمت کے لیے مامور کیا گیا۔

ویران مسجد کی آبادی

لاہور آئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ خواب میں ایک ویرانہ نظر آیا جہاں ایک پرانی شکستہ حال ویران مسجد دکھائی دی اس مسجد میں اذان کی بجائے خاموشی اور انسانوں کی بجائے مویشی بندھے ہوئے دکھائی دیئے۔ آپ علی الصبح اٹھتے ہی تلاش میں نکلے۔ پورا ایک سال آپ مختلف ویرانوں میں دور دور نکل جاتے اور خواب والی مسجد کو ڈھونڈتے۔ آخر کار مغلپورہ ورکشاپ کے عقب میں ایک ویرانے میں پرانی مسجد میں پہنچے جہاں آپ کو خواب کا سارا نقشہ یاد آ گیا۔ یہ مسجد مغلیہ دور میں ۱۰۶۰ھ میں تعمیر کی گئی۔ سکھ حکمرانوں کی چیرہ دستیوں نے اس علاقہ کو ویران کر کے محلہ قصاب ختم کر دیا تھا اور مسجد کو ویران کر دیا تھا۔ کئی سال تک ویران رہنے کی وجہ سے مسجد کے اردگرد دور دور تک سرکنڈے، کریر اور ببول کے درخت اگ آئے تھے۔ لوگوں کے مویشی چرتے چرتے سایہ کی تلاش میں مسجد کی ٹوٹی چھت کے نیچے دوپہر گزارتے۔ مولانا اس مسجد میں پہنچے، ہاتھ میں کدال لی اور مویشیوں کے گوبر سے مسجد کو صاف کیا اور دو تین دنوں میں اس ویرانے میں اذانیں گونجنے لگیں اور لوگ شہر سے ادھر کا رُخ کرنے لگے۔

تاریخی اعتبار سے یہ مسجد قصاب محلہ کی عظیم الشان مسجد تھی جسے لاہور کے متمول قصابوں نے تعمیر کرایا تھا۔ عہد اکبری میں ہندو زعماء کے احتجاج پر گاؤکش مسلمان قصابوں کو لاہور سے باہر ایک بستی آباد کرنے کا حکم دیا گیا جہاں بہت امیر قصاب بھی آباد ہو گئے۔

بقول رائے بہادر کنہیا لال:

"اسلامی حکومت کے زوال پر سکھوں نے سب سے پہلے اسی آبادی کو نشانۂ ستم بنایا۔ سکھ لٹیرے گاؤکشی کا انتقام لینے کے لیے اس محلہ پر

ٹوٹ پڑے۔ دو تین بار تو قصابوں نے خاصا مقابلہ کیا مگر سکھوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے پیشِ نظر اس محلہ کو خالی کر کے اندرونِ شہر آ کر بس گئے۔ اس محلے کی دولت کو سکھوں نے خوب لوٹا اور مسجد کو ویران کر دیا۔

احمد شاہ درّانی کی آمد نے سکھوں کی کمر توڑ دی۔ درّانی تو کابلی مل کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کر کے واپس کابل چلا گیا مگر تھوڑے ہی عرصہ میں سکھ شورشیں از سرِ نو منظم ہو کر لاہور کے قرب و جوار میں دندنانے لگیں۔ ان حملہ آوروں نے کابلی مل کو پیغام بھیجا کہ وہ گاؤ کش قصابوں کو قتل کر دے ورنہ لاہور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ چند روز تو کابلی مل نے سکھوں کو ٹالے رکھا مگر جب وہ رات کے اندھیرے میں دہلی دروازہ توڑنے پر تُل گئے تو اس نے قصابوں کے ناک اور کان کاٹ کر شہر کے باہر بھیج دیئے۔ یہ منظر دیکھ کر سکھ مطمئن ہو کر کچھ عرصہ کے لیے واپس چلے گئے۔[1]

قرآن خوانی اور شبینہ اذکار

مولانا تاج الدین نے اس مسجد کی راتوں کو زندہ رکھنے کے لیے بہترین قرآن خوان، قاریوں اور حافظوں کو دعوت دی۔ ساری ساری رات قرآن خوانی ہوتی۔ جو لوگ رات کے لمحات یادِ الٰہی میں گزارنے کے خواہشمند ہوتے شہر کے مختلف حصوں سے جوق در جوق آتے اور ساری رات وہاں گزارتے۔ دن کے وقت قریباً ایک سو طلباء قرآن پڑھتے۔ ان علمی سرگرمیوں سے یہ جنگل منگل بن گیا اور ویرانے میں بھی قرآنی آیات کی ایمان افروز تلاوت سے دل گداز ہوتے چلے جاتے۔ ~~~

یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

زہد و تقویٰ

آپ کی زندگی سادگی اور تقویٰ کی مثال تھی۔ کسی کا نذرانہ اس وقت تک لنگر کے لیے قبول نہ فرماتے جب تک انہیں یقین نہ ہو جاتا کہ

---

[1] تاریخ لاہور ص ۱۴۳ از کنہیا لال

یہ کسب حلال ہے۔ راتوں جاگتے اور اکثر کام خود کرتے۔ طلباء کی دلجوئی کو مقدم خیال کرتے دنیادار کے مقابلے میں علم دین سیکھنے والے کا زیادہ احترام کرتے خواہ وہ ننگے پاؤں آتا۔ رمضان کی راتوں میں قرآن خوانی کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ لوگ دُور دُور سے وہاں پہنچتے۔ رات بھر وہاں قیام کرتے۔ حافظ اور قاری حضرات کی خدمت و تواضع میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جاتا۔

احباب و رفقاء حاجی فیروز الدین صاحب (جو آپ کی وفات کے بعد مسجد کے متولی بنے)، حافظ غلام محمد صاحب، صوفی شیر محمد، میاں اللہ بخش، صوفی نظام الدین، صوفی محمد اسمٰعیل، صوفی نور الدین، حاجی محمد عبد اللہ، میاں غلام محی الدین اور حافظ قاری صدر الدین صاحب (جنھوں نے آپ کی پرانی مسجد میں مدرسہ انوار القرآن کا اجرا کیا ہے) آپ کے مخلص رفقاء، خادم اور جاں نثار ساتھی تھے۔ علمائے کرام میں سے مولانا غلام قادر بھیرویؒ، مولانا نبی بخش حلوائیؒ، مولانا سید دیدار علی شاہؒ، مولانا غلام احمدؒ وغیرہم ہم مجلس اور ہم مشرب تھے۔

ریلوے اتھارٹی اور مسجد جب امرتسر اور لاہور کے درمیان ریلوے لائن کی از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ مسجد اور مسجد کی ملحقہ زمین بھی لائن کی زد میں آگئی۔ ریلوے اتھارٹی نے اس مسجد کو راستے سے ہٹانے کیلیے قوت کا استعمال کیا مگر مولانا کی راسخ العزمی چٹان بن کر سامنے آئی۔ ریلوے اتھارٹی کا کہنا تھا کہ یہ ساری جگہ انہوں نے خرید لی ہے مگر مولانا کہتے تھے کہ یہ وقف زمین ہے، نہ خریدی جا سکتی ہے نہ بیچی جا سکتی ہے۔ تمہارے ہاتھ جس نے بیچی ہے اس نے دھوکا کیا ہے۔ چنانچہ قوت کا مظاہرہ کیا گیا۔ فوجداری میں مقدمہ چلایا گیا مگر مولانا کے عزم میں فرق نہ آیا۔ دیوانی عدالت میں مقدمہ چلا۔ ہائی کورٹ تک مقدمہ پہنچا۔ وہاں بھی مسجد کو فتح ہوئی۔ آخر ریلوے نے امرتسر سے آنے والی ریلوے لائن کا رُخ بدل دیا۔ مسجد کے قریب سے اب بھی لائن کا رُخ مولانا کی ثابت قدمی اور خلوصِ نیت کی علامت ہے۔

آپ نے اس مسجد کی تعمیرِ نو ۱۳۲۹ھ میں مکمل کی اور اسے قرآن کی درس گاہ میں تبدیل کر دیا جو آپ کی زندگی کے بعد بھی کچھ عرصہ تک قرآنی تعلیم کا گہوارہ بنی رہی۔ پاکستان بننے کے

بعد اس کے انتظام میں خرابی آ جانے سے محکمہ اوقاف نے قبضہ کر لیا اور ملحقہ زمین پر ربوے نے قبضہ جما لیا۔ آپ نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ آپ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی طرح عورت کو فتنۂ عظیم قرار دیتے تھے اور ریاضت و عبادت میں وقت گزارتے۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر انسان کو بغاوتِ نفس کا احتمال نہ ہو تو عورت کے فتنۂ عظیم کو اپنے گھر میں رکھنا دانشمندی نہیں۔ آپ کے اس خیال نے مسجد میں عورتوں کی آمد و رفت کو یکسر ممنوع قرار دے دیا تھا۔

ہم کوشش کے باوجود آپ کی علمی تصانیف کی تلاش میں ناکام رہے ہیں۔ ہماری نظر سے آپ کی کوئی تصنیف نہیں گزری جس سے آپ کے اندازِ تحریر اور اسلوبِ استدلال کا اندازہ لگایا جا سکے۔

علمائے اہل سنت میں یہ جریح عالم دین ۲۵ شعبان المعظم ۱۳۴۴ھ بمطابق ۴ فروری ۱۹۲۹ء بروز بدھ واصل بحق ہوا۔ مسجد کے پہلو میں ہی آپ کی آرام گاہ بنی۔ مرقد کے سرہانے یہ الفاظ آپ کی زندگی کی مختلف اوصاف کی ترجمانی کرتے ہیں:

"العابد الزاہد المرتاض العارف الکامل الفیّاض امام العابدین شمس العارفین ہادی السالکین مرشدنا اتاسکین المولوی الصوفی جناب حضرت محمد تاج الدین نور اللہ مرقدہٗ"

حضرت مولانا ابو محمد سیّد دیدار علی شاہ محدّث الوری رحمۃ اللہ علیہ

سُنّی اعتقادیات کا بیباک مجاھد

آپ کے اسلاف مشہد ایران سے وارد ہند ہوئے۔ سید خلیل شاہ رحمۃ اللہ علیہ (آپ کے پر دادا) پہلے شخص ہیں جن کا نام تاریخی صفحات پر جلوہ گر ہوا۔ آپ ہی مشہد سے "بلگرام" اور وہاں سے فرخ آباد آئے کچھ عرصہ کے بعد فرخ آباد کو خیر باد کہہ کر ریاست الور میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب امام سیّد موسیٰ رضا رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے جس وجہ سے آپ حسنی اور حسینی سید مشہور ہوئے۔[1]

ہمارے ممدوح مولانا سیّد دیدار علی شاہ اپنے عمِ بزرگوار سید نثار علی شاہ کی دعا سے پیدا ہوئے۔ آپ نے آپ کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے ہی آپ کی والدہ کو بشارت دی تھی کہ بیٹے کی پیدائش پر اس کا نام "دیدار علی" رکھنا۔ آپ ابتدائے عمر میں ہی ایسے ماحول میں پرورش پاتے رہے جہاں قال اللہ و قال الرسول کے کلمات جانفزاء آویزۂ گوش بنتے۔ بزرگانِ دین علمائے اہل سنت ملک کے گوشے گوشے سے آتے اور قیام پذیر ہوتے۔ اس روحانی اور علمی ماحول نے آپ کے ذہن و فکر کو علمِ دین کا ذوقِ سلیم بخشا۔ چنانچہ ابتدائی دینی کتابیں آپ نے الور میں ہی پڑھیں۔ علمی تشنہ کامی بڑھی تو دہلی کا رُخ کیا اور مولانا کرامت اللہ خاں مرحوم سے درس نظامی کا کچھ حصہ پڑھا۔ مولانا عبدالولی رام پوری، مولانا ارشاد حسین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔

---

[1] اخبار "جمیعت" لاہور، فروری ۱۹۵۵ء مضمون "تذکرہ" از مولانا عبدالنبی صاحب کوکب ایم۔ اے

اس زمانہ میں سہارن پور میں مولانا احمد علی محدث سہارن پوری تدریسِ حدیث میں بڑے یگانۂ روزگار مانے جاتے تھے۔ مولانا نے آپ کے ہی درسِ حدیث سے دورۂ حدیث پڑھا۔ ان دنوں آپ کے ہم سبق مولانا وصی احمد سورتی، حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی تھے۔ یہ وُہ لوگ ہیں جو آسمانِ علم و شہرت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ دورۂ حدیث سے فارغ ہو کر معقولات کا بڑا وقتِ نظر سے مطالعہ کیا۔

تلاشِ حق ظاہری علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ آپ روحانی تشنگی کا سامان جمع کرنے کی فکر سے غافل نہ ہُوئے۔ آپ ہمیشہ کاملینِ وقت کی تلاش میں رہے اور دل اور رُوح کی دھڑکنیں برملا پکارتیں :

پڑھ لیے میں نے علومِ شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

چنانچہ آپ تلاشِ حق میں انبالہ پہنچے۔ انبالہ ان دنوں حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ کے وجودِ مسعود کی بدولت مہبطِ انوار روحانی بنا ہوا تھا۔ آپ بھی وہاں پہنچے اور دامنِ اُمید دراز کر دیا۔ شاہ صاحب کی نگاہِ کیمیا نے پُورے دو سال میں اس جوہرِ علم کو رُوحانیت کی آبداری سے چمکا دیا۔ خلعت و شال عطا فرماتے ہُوئے فرمایا :

"تم گنج مراد آباد چلے جاؤ، تمہارا حصہ وہاں تمہارے لیے چشم براہ ہے۔"

آپ گنج مراد آباد پہنچے اور حضرت فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے ؎

دانہ می چیدیم ہر جائیکہ خرمن یافتیم !

خلعت خلافت حاصل کی اور صاحبزادہ احمد میاں صاحب کے ہم درس اور ہم تربیت رہنے کا فخر حاصل کرتے رہے۔ آپ اس نسبت روحانی کے ساتھ ساتھ مجدد مائتہ حاضرہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی، سید شاہ ابو احمد المدعو محمد علی حسین اشرفی جیلانی سجادہ نشین رُوح آباد کچھوچھہ شریف سے علم و کمال

حاصل کرتے رہے۔

نگاہِ اعلیٰ حضرتؒ مولانا کے عہد میں مراد آباد سے علم و ادب کے چشمے پھوٹتے تھے صدر الافاضل حضرت مولانا سیّد محمد نعیم الدینؒ مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ اس شہر میں آپ کے علمی اور روحانی ساتھی بنے۔ آپ نے اعتقادی راہنمائی اور پختگی کے لیے اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ کا ذکر کیا اور مولانا کو ملاقات کی ترغیب دی تو آپ نے کہا:

"بھائی! مجھے ان سے کچھ حجاب سا آتا ہے۔ پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور سُنا ہے طبیعت کے درشت ہیں"

اس کے باوجود صدر الافاضل آپ کو بریلی لے گئے اور اعلیٰ حضرتؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ شاہ صاحب نے ازرہِ ادب عرض کی:

"حضرت مزاج کیسے ہیں؟"

اعلیٰ حضرتؒ فرمانے لگے:

"بھائی کیا پُوچھتے ہو، پٹھان ذات ہُوں، مزاج کا درشت ہوں"

یہ بات سُنتے ہی آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور معذرت پیش کر کے سرِ عقیدت جھکا دیا اور پھر اعلیٰ حضرتؒ نے نگاہِ شفقت سے اعتقادی ورشتی کا وہ رنگ بھر دیا کہ ظفر علی کا قلم بھی اس رنگ کو پھیکا نہ کر سکا۔

دینی خدمات کی عملی زندگی آپ اپنے استادِ مکرم مولانا ارشاد حسینؒ کے ارشاد کی تعمیل میں مدرسہ "ارشاد العلوم رام پور" میں مدرسِ اوّل مقرر ہُوئے۔ چند برس بعد ۱۹۰۶ء میں بمبئی روانہ ہُوئے۔ وہاں پُورا ایک سال کام کرنے کے بعد ۱۹۰۷ء میں وطن مالوف الور میں تشریف لائے اور یہاں مسجد

لے صدر الافاضل مولانا سیّد محمد نعیم الدین مراد آبادیؒ مراد آباد کی ان علمی شخصیتوں میں سے تھے جنہوں نے اس دور کی سُنّی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی۔

دائرہ میں "قوت الاسلام" کے نام سے ایک دینی دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ یہ مدرسہ آپ کی علمی زندگی کا سنگِ اوّلین قرار دیا جاتا ہے جو آپ کے علوم و فنونِ دین کی اشاعت کیلئے اپنے ارادے سے قائم کیا۔

لاہور میں آمد آپ ایک شُعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے لاہور، امرتسر اور پنجاب کے دُوسرے شہروں میں دینی جلسوں میں معروف ہو چکے تھے۔ آپ کے بیان اور زورِ کلام نے سامعین کو آپ کے کمال کا معترف بنا لیا تھا اور آپ کی علمی شہرت نے پاک و ہند کے علمی حلقوں کو بڑا متاثر کیا۔ لاہور کی درس گاہ "مدرسہ نعمانیہ" کی انتظامیہ نے آپ کی تدریسی خدمات حاصل کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ ان دنوں اس عظیم دارالعلوم کی نگرانی جناب محرم علی چشتی ایڈوکیٹ، حکیم سلیم اللہ مرحوم، خواجہ نور بخش توکلی رحمہم اللہ جیسے مخلصین زعمائے اہلِ سنّت کے سپرد تھی۔ ان مخلص علم دوست حضرات کی کوششیں مولانا کو پنجاب کھینچ لائیں۔ مگر آپ ۱۹۱۷ء تک اس درس گاہ میں رہ کر ۱۹۱۷ء میں آگرہ تشریف لے گئے جہاں آپ جامع مسجد کے خطیب اعظم اور شہر کے مفتی اعظم قرار پائے۔ ان دنوں ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں شدھی تحریک نے مسلمانوں کے ایمان و اعتقاد کو مسخ کرنے میں طوفان برپا کر رکھا تھا آپ اس شدھی تحریک کے خلاف جہاد کرنے کے لیے قریہ بہ قریہ شہر بہ شہر پہنچے۔

۱۹۲۲ء میں لاہور میں وہابی، نیچری اور مرزائی فرقوں نے بڑی سُرعت سے سر اٹھایا۔ یہ وُہ زمانہ تھا کہ ان تحریکوں کے سرکوب مولانا غلام قادر بھیروی، مولانا غلام دستگیر قصوری وفات پا چکے تھے۔ اور لاہور کسی جواں ہمت اور مستعد عالمِ دین کا شدّت سے منتظر تھا۔ مولانا دیدار علی شاہؒ نے لاہور کے مغموم سُنیوں کی آواز پر لبیک کہا اور آگرہ چھوڑ کر لاہور پہنچے۔ مسجد وزیر خاں کے خطیب مقرر ہُوئے، اور لاہور کے کوچہ و بازار اس شیر کی گرج سے بیدار ہو گئے۔ جامع مسجد وزیر خاں ان دنوں لاہور کی علمی اور دینی سرگرمیوں کا مرکزی نقطہ تھا۔ آپ کی آمد سے اس مسجد کے ویران در و دیوار صلوٰۃ و سلام کی ضیا بار آوازوں سے زندہ ہو گئے اور سُنیوں کیلئے

یہ مرکز مرکزِ خیر بن گیا۔ نہ صرف لاہور بلکہ سارا پنجاب مسجد وزیر خاں کی طرف کھنچا آنے لگا۔

انجمن حزب الاحناف کا قیام

مولانا نے اجتماعی زندگی کو اعتقادی رنگ دینے کے لیے ایک فعّال ادارہ کی ضرورت کے پیشِ نظر انجمن حزب الاحناف کی تشکیل کی۔ یہ انجمن ۱۹۲۴ء میں اہل سنّت والجماعت کے اعتقادی تحفظ کے لیے قائم کی گئی۔ اس انجمن کے زیرِ اہتمام ایک بلند پایہ دارالعلوم ۱۹۲۶ء میں قائم کیا گیا۔ دارالعلوم حزب الاحناف نے تھوڑے ہی عرصہ میں مرکزی علمی حیثیت اختیار کر لی۔ پہلے یہ دارالعلوم مسجد وزیر خاں میں قائم ہوا جس میں مولانا دیدار علی شاہ اور ان کے صاحبزادے علامہ سید ابوالبرکات سید احمد قادری دامت برکاتہم، مولانا عبدالرحمٰن ہزارویؒ، مولانا عبدالواحد ملتانی اعزازی مدرس مقرر ہوئے[1] پھر چیگڑ محلہ کی جامع مسجد میں منتقل ہو گیا۔ اس دارالعلوم نے اپنی علمی کارکردگی سے غیرِ اعتقاد تحریکوں کے سیلاب کے سامنے ایک مضبوط بند کھڑا کر دیا۔ پنجاب میں بلند کردار واعظ، پُراثر خطیب، جیّد مناظر اور قابل مدرّس پیدا کیے۔ ہزاروں طلبائے علم اس چشمۂ فیض سے سیراب ہو کر پنجاب کے ہر شہر میں پھیل گئے اور جہالت کی ظلمتیں انہی لوگوں کی شبانہ روز محنتوں اور کاوشوں سے کافور ہونے لگیں۔ دورِ حاضر کے مشہور خطیب، واعظ، مفتی، مدرس، اور فقیہہ جو مشربِ اہلِ سنّت کی خدمت کر رہے ہیں اکثر اسی گلستان حزب الاحناف کی بہاریں ہیں۔

دورِ ابتلاء

اگر "حزب الاحناف" کے مختلف ادوار کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مولانا سید دیدار علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ظلمت کدۂ لاہور کو سنّیت کی ضیا پاشیوں سے منوّر کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ وہ تدریس کے وقت سیلِ بیکراں، تقریر کے وقت ٹھاٹھیں مارتا سمندر، کام کے وقت بجلی کی سی مستعدی اور معاندین کی سرکوبی کے وقت

---

[1] عشرۂ کاملہ از مولانا ابوالبرکات ۱۲

گرزالبرز شکن تھے۔ جن بداعتقاد لوگوں نے لاہور کو اپنی فکری تحریک کی آماجگاہ بنا رکھا تھا وہ سرگرفتہ ہو کر بیٹھ گئے۔ اس مختصر سے جسم نگر استقلال کے کوہ الوند سنّی عالم نے تمام طوفانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس وقت کے اخبارات اور پھر مولوی ظفر علی خاں کا "زمیندار" محض اعتقادی اختلاف کی بنا پر آپ پر سُوقیانہ نظمیں لکھتا۔ ہجوگوئی مولانا ظفر علی خاں کے صحافی ادب کا ایک بڑا حصہ مانا جاتا ہے۔ اس "صفت" سے زمیندار کے رنگین صفحات میں سے مولانا دیدار علی شاہ کو نوازا جاتا۔ احرار دشنام طرازی کرتے۔ مرزائیت "تباہی کے الہامات" سناتی اور دیوبندیت تیغ پا ہو کر اس کوہِ استقلال سے ٹکراتی۔ مگر اس اللہ کے بندے نے ایک کی نہ چلنے دی۔ مولانا ظفر علی کی ہجو نگاری کا جواب آپ کی قوتِ عمل اور راسخ الاعتقادی میں تھا۔ آپ تصور کریں کہ مولوی ظفر علی خاں کا قلم اس وقت کے زندہ "زمیندار" کے صفحۂ اول پر جس شخص کی ہجو لکھنے پر آمادہ ہوا تھا۔ اس کی گرفت ان لوگوں کی اکڑی ہوئی گردنوں پر کتنی شدید ہوگی۔ اس دورِ ابتلاء سے بھی مولانا دیدار علی شاہ" بڑی پامردی سے گزر گئے۔

قلمی جہاد مولانا نے اہلِ لاہور کو جہاں اپنے وعظ و تقریر سے زندہ کر دیا تھا وہاں وہ اس اہمیت کو ہمیشہ سامنے رکھتے کہ قلمی جہاد کی بھی سخت ضرورت ہے چنانچہ آپ کا علمی مقام متعین کرنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم آپ کی تصانیف کا ایک مختصر سا جائزہ لیں۔ اگرچہ اس کتاب کا تنگ دامن اس بات کا متحمل نہیں کہ ہم تفصیل کے ساتھ ان کارناموں کو پیش کر سکیں جو آپ کے قلمی جہاد کی یادگاریں ہیں، تاہم اختصار کے ساتھ دامن لپیٹنے کی کوشش میں آپ کی تصانیف کا نام درج کر دیا جاتا ہے قارئین میں سے علمی ذوق رکھنے والے خود جائزہ لیں گے کہ آپ نے کتنی بڑی خدمت دین کی ہے۔

لاہور میں آپ نے سورۂ الحمد کا درس شروع کیا تو طبع رسا نے وہ جولانیاں دکھائیں کہ پورا ایک سال صرف ہو گیا۔ آپ نے اس مرحلہ میں تفسیر "میزان الادیان"[1]

[1] آپ کی دوسری علمی یادگاروں کے نام یہ ہیں: (۱) رسول الکلام فی بیان المولود والقیام
(۲) ... [illegible]

تقابل ادیان پر بڑی مبسوط بحث کرکے اہل علم کے لیے ایک علمی یادگار چھوڑی۔ آگرہ کے قیام کے دوران میں آپ نے "ہدایۃ الغوی" لکھی جس پر شیعہ عقاید پر مدلل تنقید کی گئی تھی — "بلوغ المرام" کے نام سے میلاد النبی پر ایک عمدہ رسالہ سپرد قلم کیا۔ جب یہ رسالہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پڑھا گیا تو آپ سنتے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرطِ انبساط میں جھومنے لگے۔

اخلاق و عادات

حضرت مولانا کے اخلاق و عادات کا تذکرہ کرنا اتباعِ سنت اور اطاعتِ رسول کی جیتی جاگتی تصویر کھینچنا ہے۔ اپنے تو پھر اپنے ہیں بیگانے بھی تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکے کہ مولانا ورع و تقویٰ کا سچا نمونہ تھے۔ طبیعت میں خودداری اور بے نیازی کا یہ عالم کہ ۱۹۲۹ء میں مسجد وزیر خاں کے متولی جج مرزا ظفر علی نے آپ کے متعلق چند کلمات ایسے کہے جس سے عزتِ نفس کو گزند پہنچتی تھی تو آپ بلا تکلف وہاں سے قطع تعلق کرکے "اسلام الدین" بلڈنگ میں قیام پذیر ہو گئے اور اس مالدار متولی پر ثابت کر دیا کہ ایک خوددار عالم دین نانِ جویں کھا کر بھی تبلیغ دین میں کوتاہی نہیں کرتا عقیدہ و مسلک کے بارے میں آپ کسی قسم کی مصلحت جوئی اور رو رعایت کی پالیسی اختیار نہیں کرتے تھے۔ جس چیز کو ان کے مسلک نے حق سمجھا۔ اس کا اعلان آگ کے شعلوں کے سامنے بھی کرنے سے گریز نہیں کیا۔ ایک دفعہ مسجد وزیر خاں میں کانگرسی اور احراری علماء نے ایک بہت بڑے سیاسی جلسے کا اہتمام کیا۔ آپ خطیبِ مسجد ہونے کی حیثیت سے مدعو تھے۔ آپ نے اسی اسٹیج پر اس شد و مد سے کانگرس اور احرار کے سیاسی خیالات پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) (۲) المبسوط فی فریضۃ الجمعہ مع شرط (۳) دیوان دیدلہ (اردو) (۴) دیوان دیدار (فارسی) (۵) مقدمہ تفسیر میزان الادیان بہ تفسیر القرآن و تفسیر سورہ فاتحہ (دو جلد) (۶) ہدایۃ الطریق (۷) الاستقامۃ الاولیاء (۸) تحقیق المسائل (۹) مجموعہ رسائل خمسہ (۱۰) سلوک قادریہ (۱۱) فضائل رمضان (۱۲) التحفۃ الصغریٰ للمستغنین عن الاولیاء (۱۳) علامات الوہابیہ بالحدیث النبویہ۔

لہ اخبار "جمعیت" لاہور صفحہ ۳ از مضمون مولانا عبدالنبی کوکب۔

تنقید کی کہ سامعین ہجوم اٹھے اور کانگرسی علماء وہ خیالات اپنے ساتھ ہی لے کر چلے گئے جو لاہور والوں تک پہنچانے کے لیے آئے تھے۔

عوام سے جب ملتے بڑے انکسار سے ملتے۔ علماء و مشائخ کی عزت و تکریم کرتے۔ طلبہ پر بڑی شفقت فرماتے، آپ بحث سے اجتناب کرتے، مناظروں کی حوصلہ شکنی کرتے، گالیوں کے جواب میں خاموش رہتے اور ہجو نگاری کے مقابلہ میں تعمیری اور اثباتی تقریر سے عوام پر چھا جاتے۔ دن اور رات میں لاہور کی چھ چھ مساجد میں درس و وعظ دیتے۔

لباس سادہ، کپڑے کی ٹوپی، ڈھیلے ڈھالا کُرتہ، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ، دیسی ساخت کا جوتا۔ یہ تھے وہ ملبوسات جس میں سُنّی اعتقادیات کے بے باک مجاہد نے ساری زندگی گزار کر اپنی سادہ سیرت اور پختہ اعتقاد کے نقوش قائم کر دیے۔ آج کے جبہ و دستار کی عظمت اس درویش صفت کی سادگی پر رشک کرتی ہے۔

اولاد و اخلاف حضرت مولانا قدس سرہٗ کے تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں جن میں سے ایک صاحبزادی اور دو صاحبزادوں نے بڑی عمر پائی۔ چھوٹے صاحبزادے الحاج سید احمد ابوالبرکات قادری دامت برکاتہٗ سنیوں کے استاذ العلماء کہلائے۔ آپ کے دار العلوم حزب الاحناف کا انتظام و انصرام آپ کے ذمہ ہی ہے اور آپ اپنے والد کی اس علمی یادگار کو اب تک چلا رہے ہیں۔ دوسرے صاحبزادے علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد صاحب قادری خطیب جامع مسجد وزیر خاں اور صدر جمعیت العلمائے پاکستان تھے۔ آپ ملت کے اکابرین میں سے شمار ہوئے۔ سنیوں کی سیاسی اور معاشرتی جدوجہد میں آپ نے بڑا حصہ لیا۔ آپ تحریکِ پاکستان، جہاد کشمیر اور ختمِ نبوت کی مہم کے سچے سپاہی تھے[1]

وفات آپ دینی خدمات کی انجام دہی میں ہی ۲۲ رجب المرجب ۱۳۵۴ ہجری کو

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے اسی کتاب میں مولانا سید محمد احمد ابوالحسنات قادری کا مطالعہ فرمائیں۔

واصلِ بحق ہوئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اندرون دہلی دروازہ دارالعلوم حزب الاحناف میں ہی آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔

علامہ ابوالحسنات نے تاریخ وفات کہی:

حافظ پس سرکوبی اعداء شریعت
"دیدار علی یافتہ دیدارِ علی را"

۴   ۵   ۳   ۱ھ

مولانا مفتی محمد یار خلیق فاروقی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد یار رحمۃ اللہ علیہ موضع جوڑہ کلاں ضلع شاہ پور (سرگودھا) کے زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوئے اور قرآن کریم اپنے گاؤں میں پڑھنے کے بعد تلاش علم دین میں باہر نکلے۔

آپ نے علوم دینیہ کی تحصیل کے لیے دارالعلوم بیر بل شریف میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ یہ دارالعلوم سنیوں کی عظیم الشان درس گاہ تھی جسے نقشبندی سلسلہ کے جلیل القدر عالم و ولی اللہ پیر غلام مرتضیٰ بیربلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جاری کیا۔ مولانا یار محمد اس مکتب فیض سے دولتِ دین لے کر لاہور پہنچے اور تھوڑے ہی عرصہ میں لاہور کی علمی دنیا میں اپنا نام پیدا کر لیا اور چوٹی کے علماء میں شمار ہونے لگے۔

ایک عرصہ تک آپ لاہور کی عظیم درس گاہ نعمانیہ میں مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور دارالعلوم کے دارالاستفتاء کے ناظم رہے۔ نظامت استفتاء کے دوران آپ کو فقہ (اسلامی قوانین) کے عملی اطلاق کا موقعہ ملا۔ حقیقت یہ ہے آپ نے فتویٰ نویسی کے معاملہ میں جس دیانت، قابلیت اور فقاہت کا ثبوت دیا۔ اس سے آپ کو شہرت دوام ملی۔ نعمانیہ کے دارالاستفتاء سے علیحدہ ہونے کے باوجود بھی پنجاب بھر کے دینی مسائل آپ کے فیصلہ سے حل ہوتے۔

لہ تاریخ جلیلہ ص ۱۷۳ از مولانا غلام دستگیر نامی لاہوری

لہ ایضاً

ان دنوں مولانا غلام محمد گھوٹوی شاہی مسجد کے خطیب اعلیٰ تھے۔ آپ شاہی مسجد کے نائب خطیب مقرر ہوئے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد آپ سنہری مسجد کے خطیب مقرر ہوگئے۔ آپ سنہری مسجد میں ۱۹۰۰ء میں خطیب ہوئے اور ۳۱ سال باقاعدہ خطابت کرنے کے بعد انجمن اسلامیہ کی طرف سے ۱۶ ستمبر ۱۹۳۱ء کو پنشن پاکر سبکدوش ہوئے۔

سنہری مسجد لاہور

سنہری مسجد نواب میر سید بھکاری خاں امیر الامراء بہ عہد میر معین عرف میر منو نے ۱۱۶۳ھ میں تعمیر کروائی۔ سکھ عہد میں اس مسجد پر بھی دیگر مساجد لاہور کی طرح ابتلاء آیا۔ رائے بہادر کنہیا لال نے سکھ دور میں مسجد کے ساتھ جو سلوک ہوا یوں بیان کیا ہے:

"مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں جب باؤلی کا مکان مسجد کے متصل بن گیا اور اس میں گرنتھ صاحب رکھا گیا تو باؤلی کے بھائی سکھ اور اکالیہ اس مسجد کے درپے ہوگئے اور مہاراجہ کی خدمت میں عرض کی کہ اس مسجد کا ملّا باآوازِ بلند اذان دیتا ہے تو ہمارے کان پڑتی ہے۔ یہ مسجد بھی باؤلی کے ساتھ شامل ہمارے قبضہ میں رہنی چاہیے یا گرادی جائے کہ مسلمانوں کی ہمسائگی گورو کے سکھوں کے ساتھ نہ چاہیے۔ مہاراجہ نے فی الفور حکم دے دیا کہ مسجد سے مُلا نکال دیا جائے اور گرنتھ رکھا جائے۔ اس حکم کے صادر ہوتے ہی مُلا بیچارہ نکال باہر کر دیا گیا اور مسجد پر اکالیوں نے قبضہ کر لیا اور تمام مسجد میں گوبر کا لیپن دے کر گرنتھ رکھ دیا گیا۔ دکانوں کی آمدنی ضبط کرکے باؤلی کے محال کے شامل کر دی گئی۔ وقوع اس حال سے شہر کے مسلمان نہایت غمگین ہوئے اور سب نے مجمع فقیر عزیز الدین و نورالدین کے مکان پر کیا اور چاہا کہ ان کے ذریعہ سے مہاراجہ کے حضور میں مسجد کی واگزاری کے لیے عرض کی جائے۔ چونکہ اس زمانے میں مہاراجہ کے دربار میں سب سے بڑھ کر توقیر گھلو ماشکی کی تھی اور مہاراجہ کسی بات میں اُس کا کہنا [illegible] فقیر [illegible] نے مسجد کے متعلق

اس کو اپنے ساتھ ملایا اور اس کے ذریعہ مہاراجہ کی خدمت میں عرض کی اور بیان کیا کہ تمام پنجاب کی مسجدوں کے مُلّا کہیں بلند آواز سے بانگ نہیں کہتے چہ جائیکہ باؤلی صاحب کے پاس جہاں گرنتھ صاحب رکھا ہو مُلّا اذان دیوے ۔ یہ بات بالکل خلاف ہے ۔ ہم مُلّا سے لکھائے لیتے ہیں کہ کبھی بانگ نہ دیوے ۔ اس بات پر مہاراجہ راضی ہو گیا اور مسجد مُلّا کے حوالے کر دی ۔"

نعتگو شاعر شاعر کی حیثیت سے آپ بڑے بلند مقام کے مالک تھے ۔ آپ کے اشعار میں شگفتگی ، بلند خیالی اور علمی گہرائی پائی جاتی ہے ۔ شعر لکھتے تو موتی بکھیرتے ۔ فتویٰ لکھتے تو جواہرات بکھیرتے ۔ زبان و قلم میں گوہرباری کا اعجاز تھا ۔ آپ کے لکھے ہوئے فتاویٰ پر نظر پڑی تو خوش نویسی اور بالغ نظری پر خراجِ تحسین پیش کیے بغیر نہ رہا گیا ۔ آج بھی مسجد چوک دال گراں اور مسجد شاہ عالمی گیٹ کی پیشانی آپ کی کہی تاریخ بنیاد پر آپ کی شاعری کا عمدہ نمونہ پیش کر رہی ہے ۔

آپ نے اکثر مسائل پر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن میں ستر الشہادتین (اردو) ، مجموعہ خطب خلیق اور نافع الصلوٰۃ خاص طور پر مشہور ہیں ۔ "فتنہ اہل قرآن" نے جب لاہور میں برگ و بار نکالے تو مولانا نے زبردست تعاقب کیا اور مسجد چینیاں والی کے امام و خطیب مولوی عبداللہ[1] چکڑالوی کے خیالات کا بڑی پامردی سے ردّ کیا ۔ آپ کی ایک کتاب

---

[1] مولوی غلام نبی المعروف عبداللہ چکڑالوی موضع چکڑالہ ضلع کیمبلپور کے رہنے والے تھے ۔ دہلی میں تکمیلِ حدیث کی اور لاہور میں قیام پذیر ہوئے ۔ لاہور ان دنوں اعتقادی کش مکش کا مرکز بن چکا تھا ۔ انگریز کے پھیلائے ہوئے فکری اور نظریاتی فرقے بڑی آزادی سے اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے ۔ عبداللہ چکڑالوی نے بھی اس شہر کی فضا کو اپنے مشن کے موافق پاکر عوام الناس کو معمولی کوتاہیوں پر کافر قرار دینا شروع کر دیا جس سے ان کے خلاف مخالفت کی زبانیں وا ہونے لگیں ۔ لاہور میں مسجد چینیاں میں جب مولوی رحیم بخش وفات پاگئے تو انہیں امامت ملی ۔ کچھ عرصہ تک درس حدیث دے کر اہلِ حدیث کو خوش کیا ۔ (بقیہ برصفحہ آئندہ)

"صلوٰۃ مسعودی" کا ترجمہ بڑا مشہور ہوا۔ آپ نے قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھی جس کے بعض

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مگر کچھ دن "اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری" کی دلیل دے کر "بخاری" کے علاوہ تمام کتبِ احادیث کو مشکوک قرار دے دیا۔ ایک عرصہ تک بخاری شریف کا درس جاری رکھا۔ مگر طبعی اضطراب نے بخاری اور قرآن کا توازن شروع کر دیا۔ بعض احادیث خلافِ آیات اللہ قرار دے کر اعلان کر دیا کہ جب قرآن ایک مکمل ہدایت ہے تو حدیث کی کیا ضرورت ہے۔ قرآن شریف سے احکام کا استنباط ہونے لگا اور ایک تفسیر بھی لکھی جس میں اپنے خیالات کا پر زور پرچار کیا۔ چینیاں والی مسجد کے اہل حدیث مقتدی کچھ عرصہ تک تو برداشت کرتے رہے مگر ایک وقت آیا کہ ایک ہی مسجد میں دو امام مقرر کر لیے گئے۔ دونوں اماموں کے مقتدی روزانہ بحث و جدال میں رہتے۔ ہر نماز دو امام پڑھاتے جب حدیث کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا؛ "میرا اصلی مطلب تو عمل بالقرآن ہی تھا، مدت تک کتوں کو ہڈی ڈالتا رہا ہوں۔" اس پر اہل حدیث بڑے برہم ہوئے اور جناب کو مسجد سے نکال دیا گیا۔

آپ کے ایک متشدد مقتدی محمد بخش عرف چٹو بٹو لی آپ کو سریانوالے بازار اپنے مکان میں لے گئے جہاں ایک احاطے میں اپنی مسجد بنا کر "اہل قرآن" کے مسائل کی تشہیر شروع کر دی۔ چٹو بٹولی نے آپ کا لکھا ہوا قرآن کا پنجابی ترجمہ چھپوایا جو "اہل قرآن" کے لیے بڑا علمی سرمایہ تھا۔ اس مسجد میں ہر حصۂ شہر سے نمازی آتے اور جب مولوی صاحب جماعت کرانے لگتے تو سینکڑوں نمازی اپنی اپنی علیحدہ نماز ادا کرنا شروع کر دیتے جس پر مولوی صاحب نے اکثر نمازیوں کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جس میں آپ کو شکست ہوئی۔

ایک عرصہ کے بعد چٹو بٹولی بھی علیحدہ ہو گیا اور مولوی عبد اللہ ایک نواب صاحب کے پاس ملتان چلے گئے جہاں ایک واقعہ پر لوگوں نے آپ کو سنگسار کیا اور آپ نیم مردہ ہو کر اپنے وطن چکڑالے چلے گئے اور ایک طویل عرصہ تک کبڑے رہ کر مر گئے۔

"اہل قرآن" نے مختلف عنوانات سے صوبے بھر میں اپنے مراکز قائم کر لیے۔ گوجرانوالہ میں "اہلحدیث" کی ایک خاصی تعداد اہل قرآن بن گئی۔ گجرات میں "دستے شاہی" فرقہ صرف "تین نمازیں ادا کرتا اور دو نمازوں کو حدیثی نمازیں کہہ کر ترک کر دیتا۔ امرت سر کے (باقی بر صفحہ آئندہ)

حصے شائع ہوئے۔

اولاد آپ کے چھ لڑکے مولوی عبدالحق صاحب سابق ہیڈ کلرک مدارس لاہور، مولوی عبدالعزیز صاحب، مفتی عبدالحمید صاحب، مفتی عبدالرشید صاحب، مولانا عبدالغنی صاحب بڑے اچھے عہدوں پر فائز رہے۔ یہ سارے صاحبزادے علم کے شیدائی اور علمائے اہل سنت کے قدردان رہے۔

وفات آپ بروز جمعرات ۲۴ جون ۱۹۳۷ء بعمر ۱۱۲ سال اچھرہ لاہور میں واصل بحق ہوئے آپ کا مزار اقدس اچھرہ موڑ کے پاس ہے۔

مولانا غلام دستگیر نامی لاہوری نے آپ کی وفات پر بڑی دلسوزی سے ایک طویل نظم کہی جس کے مقطع سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے:

نامہ پئے تاریخ وصالش بنوشت

پیوست برحمتِ حق آں پاک ولی

۱۳۵۶ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تبلیغ میاں احمد دین کی قیادت میں "اُمتِ مسلمہ" کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھی جو اہل قرآن کے مسلک کی اشاعت کرتی رہی۔ انہی مولوی احمد دین نے "تفسیر بیان للناس" کی اشاعت کے لیے رسالہ "بلاغ" کو ذریعہ بنایا مگر بدقسمتی سے ان خیالات پر ہر شہر کے علماء اہلسنت نے سخت تنقید شروع کر دی۔ فرقہ انکارِ حدیث کا بڑی پامردی اور دلائل سے مقابلہ کیا اور یہ فتنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ عہد حاضر کے مسٹر پرویز کے نظریات اسی مکتب خیال کی مدھم تصویر ہیں مگر ان میں وہ علمی گہرائی اور گرفت نہیں۔ پرویز صاحب اسلامی فلسفہ کی بجائے یورپین فلاسفر کے مرہون احسان ہیں۔

(ماخوذ از الکاویہ علی الغاویہ مؤلفہ مولانا محمد عالم آسی امرتسری)

مولانا فقیر محمد جہلمیؒ

مولانا فقیر محمد جہلمی اہل سنت کے ان علمائے کرام میں شمار کیے جاتے ہیں جو علمی ترقی اور جماعتی تنظیم کے لیے بڑی دلسوزی سے کام کرتے رہے ہیں۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سفارش علی تھا۔ ۱۲۴۷ھ میں موضع چتن ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں میاں قطب الدین مرحوم طالیاں والا سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ صرف و نحو مولانا نور احمد موضع کھائی کوٹلی ضلع جہلم سے حاصل کی۔ مولانا نور احمد حضرت مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی کے نامور تلامذہ میں سے تھے۔ منطق مولانا عبدالکریم شاہ پوری سے، معقولات مولوی محمد حسن فیروزوالا راولپنڈی سے حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۲۶۹ھ میں دہلی کا رخ کیا۔

دہلی میں پہنچ کر ابتدائی طور پر میاں نذیر حسین صاحب کے درس میں رہے مگر میاں نذیر حسین نے آپ کو مولوی محمد شاہ صاحب مصنف مدار الحق کے درس میں شرکت کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد آپ صدر الصدور مفتی محمد صدرالدین آزردہ تلمیذ رشید حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے درس میں شامل ہو گئے۔ اس مدرسہ میں آپ نے ڈیڑھ سال تک تمام درسیات کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ اس طرح تمام علوم جن کو پہلے بھی پڑھ چکے تھے تبرکاً اس مدرسہ سے حاصل کیے۔ آپ ۱۲۷۰ھ میں وطن مالوف آ گئے۔

جہلم پہنچ کر آپ کو علم دین کی لگن نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ تھوڑی مدت کے لیے لاہور پہنچے، جہاں مولوی کرم الٰہی (م ۱۲۸۲ھ) سے علمی استفادہ کیا۔ قیام لاہور کے دوران خوشنویسی میں مہارت حاصل کی اور فکرِ معاش سے آزاد ہو گئے۔ اس سلسلہ میں آپ معاشی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے مطبع آفتاب لاہور میں کتابت کی خدمات سرانجام دینے لگے۔

یہ وہ وقت تھا جب ۱۲۸۴ھ میں پنجاب کے نامور مناظر حافظ ولی اللہ صاحب رح لاہوری نے پادری عمادالدین سے امرت سر میں ایک تحریری بحث کا آغاز کیا تھا۔ مولانا فقیر محمد جہلمی حافظ صاحب کے کاتب تھے اور آپ کی صحبت فیض میں ہی آپ کو عیسائیت کے خلاف مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ آپ نے فارسی کی کتاب "تصدیق المسیح" کا اردو ترجمہ کیا اور اسے حواشی اور تعلیقات کے اضافہ سے شائع کرایا۔ پھر اس مشہور مناظرہ کی مکمل روئیداد کو ترتیب دے کر چھپوا دیا۔

حافظ ولی اللہ صاحب کی مشہور تصانیف "صیانۃ الانسان" اور ابحاث ضروری پر آپ کے حواشی موجود ہیں اور آپ کی علمی گہرائی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ کتابیں اس وقت کے عیسائی پادریوں کا دندان شکن جواب ثابت ہوئیں۔

۱۱ محرم الحرام ۱۲۹۱ھ میں آپ "آفتاب پنجاب" کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے اور ۱۳۰۱ھ تک ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس اخبار کے ذریعہ آپ نے نہ صرف وقت کے سیاسی حالات و کوائف کو سامنے رکھا بلکہ اہل سنت کے مفاد کی ترجمانی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

آپ کو ذوالحجہ ۱۳۰۲ھ میں وطن مالوف لوٹنا پڑا جہاں اپنے لخت جگر مولوی سراج الدین صاحب کے نام پر "سراج المطابع" کے نام سے ایک پرنٹنگ پریس لگوایا اور ساتھ ہی "سراج الاخبار" کے نام پر ایک پرچہ جاری کیا۔ اس پریس نے بڑی علمی اور اعتقادی کتابیں شائع کیں اور "سراج الاخبار" دنیائے صحافت میں بڑا تابندہ ستارے کی حیثیت سے چمکتا رہا۔

آپ کی مشہور تصانیف میں سے "حدائق الحنفیہ"، "زبدۃ الاقاویل فی ترجیح القرآن علی الاناجیل" اور "آفتاب محمدی" وغیرہ بڑی مشہور ہیں۔ "حدائق الحنفیہ" کو تو علمائے اہل سنت کے حالات و سوانح کے لیے بڑا مستند اور قابل قدر ماخذ مانا جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں مولانا نے جس قدر محنت اور کاوش سے کام لیا ہے۔ وہ آپ کی دلسوزی اور اعتقادی جذبات کی بڑی دلیل ہے۔ اس کتاب کو سب سے پہلے مطبع

• سراج المطابع" جہلم نے شائع کیا۔ مگر تیسرا ایڈیشن منشی نولکشور لکھنؤ کے ہاں ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء میں شائع کیا گیا۔

آپ وقت کے علمائے اہلسنت میں بڑی مقبول اور مفید شخصیت کے مالک تھے۔

مولانا محمد الدین فوقی مصنف روضۃ الادباء پروفیسر اورینٹل کالج لاہور تو آپ کے خاص کرم فرماؤں میں سے تھے۔[1]

آپ کا سنِ وفات معلوم نہیں ہو سکا۔ مزار جہلم میں ہے۔

---

[1] حدائق الحنفیہ۔ ص ۵۰۹ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ۔

حضرت مولانا حاکم علی صاحب ؒ

ایک نومسلم پروفیسر جو لاہور کی اعتقادی فضا پر چھا گیا

مولانا حاکم علی سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کالج کی تعلیم میں فنِ ریاضی میں مہارت حاصل کی۔ اسلام کی ضیاء پاشیوں نے آپ کے سینہ کو منور کردیا اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ علمِ دین کی جستجو نے انہیں قرآن و حدیث کے مطالعہ میں ایسا ذوق عطا کیا کہ وُہ رمز شناس امورِ دینیہ بن گئے اور اعتقادی کتب کا مطالعہ اس انہماک سے کیا کہ علمائے اہلِ سنت ان کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ بقول حکیم احمد شجاع آپ انجمن حمایت اسلام لاہور کے بانیوں میں سے تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں وُہ ریاضی کے استاد اور بعد میں پرنسپل بنے۔ مولانا اصغر علی روحیؒ اُن کی راسخ الاعتقادی کے پیشِ نظر اکثر اوقات آپ کے ساتھ رہتے۔

راسخ العقیدہ سُنّی آپ بڑے ہی راسخ العقیدہ سُنّی تھے۔ اعتقادی معاملات میں بڑی شدت سے چھان بین کیا کرتے تھے اور ان معاملات میں کسی کی رعایت نہ فرماتے۔ عوام الناس کو ان لوگوں سے خبردار کرتے تھے۔ جو اہلِ سنت و جماعت کا نام لے کر لوگوں میں دُوسرے مکاتیبِ فکر کا پرچار کیا کرتے تھے۔ آپ یہ شعر عام طور پر پڑھا کرتے تھے اور غالباً ان کے عقیدہ کا تعارف تھا؛

بندہ پروردگارم اُمّت احمدؐ نبی
دوستدار چار یارم تا باولاد علیؓ
مذہب حنفیہ دارم ملت حضرت خلیلؑ
خاکپائے غوثِ اعظمؒ زیرِ سایہ ہر ولی

۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء میں لاہور سے ایک رسالہ "قاطع المرتدین والفجار" کے نام سے جاری کیا جس میں عوام الناس کو غیر مشرب علماء کی "تبلیغی" چالوں سے خبردار کرتے اور انکے خفیہ اعتقادات سے آگاہ کرتے۔ انہوں نے اس رسالہ میں ان تمام خفیہ حرکات کا جائزہ لیا کہ کس طرح یہ لوگ اپنا خفیہ جماعتی پراپیگنڈہ کر کے عوامی اعتقاد کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں:

۱۔ ان مصنفین کو نمایاں کیا جو بزرگانِ دین کی مشہور تصانیف کے تراجم شائع کر کے اپنے عقائد ترجمہ میں بیان کر جاتے تھے۔

۲۔ ایک "خفیہ کمیٹی" کی نشان دہی کی جو عوام الناس کے اعتقاد کے نام بدل کر عقائد خراب کرنے میں سرگرم عمل تھی۔

۳۔ ان کاتبوں سے آگاہ کیا جو سُنّی ناشرین کی کتابیں لکھتے وقت بزرگانِ دین کی کتابوں میں تحریف کر دیا کرتے تھے۔

۴۔ ان علمی اداروں کی نشان دہی کرائی جن کے مہتمم اور منتظم سُنّیوں سے چندہ لے کر سُنّیوں کے اعتقاد کے خلاف ہی کام کیا کرتے تھے۔

ردِ عمل آپ کی ان کوششوں کو ان لوگوں نے بہت بُرا منایا جو اس مہم کو چلا رہے تھے۔ چنانچہ آپ کو ملازمت سے ہٹانے کے منصوبے بنتے۔ آپ کے خلاف غنڈے لگا دیئے جاتے۔ آپ کی تقریر میں شور مچایا جاتا اور آپ کو ہراساں کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جاتا مگر آپ استقلال کی چٹان بن کر سنیت کا پرچار کرتے اور اپنے رسالہ کی پیشانی پر یہ شعر لکھ کر اپنی ثابت قدمی کا اعلان کرتے۔

چرا خود را اسیرِ غم ز فکر بیش و کم داری
کہ نگذارد ترا محتاج ایزد تا کرم داری

مشوبے دست و پا از مفلسی و بیکسی ہرگز
مگر نشنیدۂ بیدل خدا داری چہ غم داری

مگر نشنیدۂ حاکم خدا داری چہ غم داری

محمد مصطفٰے داری تو صدیق صفا داری
عمر عثمان ہم داری علی المرتضیٰ داری

تو غوثِ اعظم و شاہِ بلا گردان ما داری
مجدد الف ثانی و مجدد حاضرہ[1] داری

---

[1] مجدد مائۃ حاضرہ اعلیٰ [illegible]

مگر نشنیدۂ حاکم خدا داری چہ غم داری

آپ اپنے دستخط کے ساتھ ان لفظوں کا اضافہ کیا کرتے:

"خادم الاسلام فقیر حاکم علی غلام مصطفیٰ دلدادہ مرتضیٰ دوستدار چار یار کبار۔"

ترکِ موالات کی تحریک آپ کی ملازمت کے زمانہ میں ہی تحریک ترکِ موالات کا سیلاب پاک و ہند کی تمام سیاسی اور فکری تحریکوں کو بہا رہا تھا۔ گورنمنٹ کے مالی دفاتر۔ انعامات اور دیگر مراعات سے کنارہ کشی کی جا رہی تھی۔ لاہور کی وہ درسگاہیں جو محکمہ تعلیم سے امداد حاصل کیا کرتی تھیں تحریکِ موالات سے متاثر ہو کر امداد سے دست کش ہو گئیں۔ اسلامیہ کالج بھی اس امداد سے دست بردار ہو گیا۔ مولوی حاکم علی صاحب نے انجمن حمایت اسلام کے اس فیصلہ کو نہ صرف غیر دانشمندانہ قرار دیا بلکہ برملا اعلان کیا کہ ترکِ موالات ہندو اور نیشنلسٹ علماء کی شہ سے چلائی جا رہی ہے۔ اس لیے مسلمانوں خاص کر علمی اداروں کے لیے نقصان دہ ہے اور تعلیمی اداروں کو اس میں شرکت نہیں کرنی چاہیے۔

کالج سے معطلی آپ ایک عرصہ اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر رہے مگر آپ کی اعتقادی شدت اور ترکِ موالات سے نا اتفاقی اسلامیہ کالج کے منتظمین کو نہ بھائی اور آپ کو معطل کر دیا گیا۔ آپ کی معطلی کی جو خبر لاہور کے مشہور اخبار "بندے ماترم" اور "سیاست" میں ۱۰ دسمبر ۱۹۲۰ء میں چھپی، وہ من و عن نقل کی جاتی ہے:

"پروفیسر حاکم علی معطل"

"انتظامیہ میں پروفیسر حاکم علی کی لغویات" کا معاملہ پیش ہوا۔ مولوی احمد دین صاحب بی۔ اے وکیل، سید محمد شاہ پلیڈر، ڈاکٹر محمد دین صاحب ناظر نے حاکم علی کے لیکچر خیالات پر جو خوب صورت فتاویٰ انہوں نے شائع کیے تھے اپنی دلی ناراضگی کا اظہار کیا۔ بعض اور اصحاب بھی بولے اور کہا ایسے شخص کو جس کے وجود سے کالج

لہ تازیانہ المرتدین و انفجار مورخہ ۲۵ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ

اور انجمن بدنام ہو رہے ہیں۔ ہماری قومی انسٹی ٹیوشن کو نقصان پہنچ رہا ہے اور پہنچنے کا اندیشہ ہے فوراً موقوف کر دینا چاہیے بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ جب تک حاکم علی کالج میں موجود ہے کالج کا کھلنا اور طلباء کا پڑھنا امرِ محال ہے۔ میاں فضل حسین نے کہا، مجھے ذاتی طور پر حاکم علی کی کارروائی پر افسوس ہے بلکہ میں اس کو کالج کا نادان دوست خیال کرتا ہوں۔ دیکھو ایشیائی طرزِ حکومت کا جبر اس پر استعمال نہ کرو اور کالج کمیٹی میں اس معاملہ کو پیش کرو۔ کالج کمیٹی ان سے جواب طلب کرے گی۔ دیکھو وہ جواب میں کیا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن فیصلہ ہوا کہ سرِدست ان کو معطل کر دیا جائے۔

آغا بیدار بخت[1] ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، ایل ایل۔ بی پرنسپل دار العلوم السنۃ الشرقیہ لاہور مولانا حاکم علی مرحوم کے نامور شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اسلامیہ کالج میں اس زمانہ میں آپ سے تلمذ کیا۔ جب مولانا ریاضی کے پروفیسر تھے آغا صاحب نے آپ کا حلیہ یوں بیان کیا ہے:

"مشرع اور متوازن بدن، سیاہ زلفیں شانوں پر لٹکی رہتیں۔ ریاضی دان

---

[1] آغائے بیدار بخت ایم۔ اے لاہور کی بڑی معتدر علمی شخصیت ہیں۔ لفظ "آغائے بیدار بخت" سے آپ کا سنِ پیدائش نکلتا ہے۔ آپ بہت بڑے ماہر علوم شرقیہ ہیں۔ ایک مدت تک پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور لاہور کارپوریشن کے کونسلر رہے۔ ۱۹۲۰ء میں دار العلوم السنۃ الشرقیہ کی بنیاد رکھی یہ ادارہ علوم شرقیہ کے ان امتحانات سے پوری نصف صدی سے طلبہ کی کامیاب رہنمائی کر رہا ہے جنہیں پنجاب یونیورسٹی نے رائج کیا۔ ہزاروں نہیں لاکھوں طلبائے علم اس ادارے سے فارغ ہو کر معاشی حل تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے۔ چونکہ اس دار العلوم میں شبینہ کلاسیں ہوتی ہیں۔ لہذا ملازمت پیشہ نوجوانوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ آپ عہد پیری میں بھی جواں ہمت ہیں۔ اب تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ وکالت کرتے ہیں اور سیاست کی عملی زندگی میں گامزن ہیں۔

فارسی اساتذہ کا کلام آپ کو ازبر ہے اور مجلسِ احباب میں ہمیشہ صدرِ مجلس دکھائی دیتے ہیں۔

ہوتے ہوئے بھی اسلامی روایات کا بڑی پابندی سے احترام کرتے۔ خود تابع سنّت، دوسروں کو تابع سنّت رہنے کی سختی سے تلقین کرتے۔ عقیدہ کے معاملہ میں کسی کی رو رعایت نہ کرتے۔ ریاضی میں اس قدر ماہر تھے کہ کلاس روم میں بڑے اعتماد سے بغیر کسی کتاب کے گھنٹوں پڑھاتے رہے۔"

۱۹۲۵ء کے بعد آپ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے تو اپنا سارا وقت تبلیغ دین اور صوفیاء کرام کی مجالس میں گزارنے لگے۔ آپ کو حضرت ایشاں[1] سے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ آپ انھیں کے مزار پر اکثر وقت حاضر رہتے اور وعظ کرتے۔ عملاً آپ ہی حضرت ایشاں کے مزار کے سجادہ نشین تھے۔ آپ نے 'قوانینِ قدرت' کے عنوان سے ایک تقریر انجمن نعمانیہ لاہور کے سالانہ جلسہ ۱۳۲۵ھ میں کی۔ اہلِ ذوق نے بہت پسند کی۔ اس تقریر میں قوانینِ قدرت اور سائنسی تحقیقات کا موازنہ کیا گیا تھا۔

اہلِ سنّت سے والہانہ عقیدت آپ جس مجلس میں جاتے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ ان کنتم مسلمون الحنفیون" کہتے۔ اس بات پر بہت سے لوگوں کو اعتراض تھا مگر وہ اپنی دھن کے اتنے پکے تھے کہ اعتراضات کی پروا نہ کرتے۔ یہ نعرہ گویا آپ کی راسخ الاعتقادی کا نشان بن چکا تھا۔

آپ ۱۹۴۴ء میں لاہور میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کا مزار حضرت ایشاںؒ کے مزار کے قدموں میں ہے۔

[1] حضرت خواجہ سید خاوند محمودؒ المعروف بہ حضرت ایشاںؒ بن خواجہ سید شریف الدین ۹۶۵ھ کو بخارا میں پیدا ہوئے۔ خواجہ بہاء الدین نقشبند کے خلیفہ اویسی تھے۔ خواجہ ابو اسحاق سفیدکیؒ سے بیعت ہوئے۔ ابتدائی تعلیمات دینیہ بخارا میں حاصل کی۔ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی۔ دورانِ سفرِ کشمیر جنت نظیر تشریف لائے تو مغل شہنشاہوں نے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ دہلی، لاہور اور آگرہ میں اکبری امراء کو دعوتِ رشد و ہدایت دیتے۔ شیعہ، رافضی آپ سے بڑے ہراساں تھے۔ کشمیر میں مدرس علوم اسلامیہ کا مرکز قائم کیا۔ امراء مغلیہ کی تحریک پر لاہور تشریف لائے اور یہاں تبلیغ و تدریس کا کام شروع کیا۔ ۳ نومبر ۱۶۴۲ء (۱۲ شعبان ۱۰۵۲ھ) بعہد شاہجہان لاہور میں وفات پائی۔ مزار بیگم پورہ لاہور میں ہے۔ (تفصیل کیلئے دیکھئے "تذکرہ حضرت ایشاںؒ" مؤلفہ میاں اخلاق احمد ایم اے لاہور)

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ

ایک عالم دین ، ایک صوفی اور پنجابی زبان کا ایک عظیم مفسرِ قرآن

مولانا محمد نبی بخش حلوائی مولّفِ "تفسیر نبوی" کا شمار اُن علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں پاک و ہند میں اعتقادی نشوو نما میں شبانہ روز جدو جہد کی۔ انگریزی عہد میں نظریاتی کش مکش کی جو فضا پیدا کر دی گئی تھی وہ ہماری تاریخ کا ایک الم ناک باب ہے انگریز کی استبدادی حکمتِ عملی میں ایک بات یہ بھی تھی کہ برِ صغیر کے مسلمانوں کے ذہن و فکر کو اعتقادی طور پر مفلوج کر دیا جائے تاکہ اسلام کی ٹھوس بنیادوں پر کھڑی ہونے والی قوم ذہنی انتشار کا شکار ہو کر رہ جائے۔ انگریز اس مشن میں کس حد تک کامیاب ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اعتقادی فتنے اُٹھے، سینکڑوں نظریاتی طوفان برپا کیے گئے اور ملتِ محمدیہ کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کون سا حربہ تھا جو استعمال نہ کیا گیا ہو۔ ان اعتقادی وباؤں کے اثرات سے علمائے اہلِ سنّت غافل نہ تھے۔ انھوں نے اس دور کے ذہنی فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا انگریز ہر اس فرد کی پیٹھ ٹھونکتا جو اعتقادی انتشار میں مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ علمائے اہلِ سنّت نے اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے پورے برِ صغیر میں اپنے اپنے حلقہ میں کام کیا۔ پنجاب کے عوام میں ایک عرصہ تک عیسائی مشنری اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرتی رہی۔ وہابیت نے اپنے مخصوص نظریات کو پھیلایا۔ پھر مرزائیت نے اپنا رنگ جمانا شروع کیا۔

یہ وہ حالات تھے جن میں ہمارے فاضل مولانا حلوائی خدمتِ دین کے لیے میدانِ عمل میں جلوہ گر ہوئے۔ وہ لاہور میں ۱۸۶۰ء میں ایک ارائیں خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں محمد وارث تھا اور دہلی دروازے کے اندرونی محلے (اکبری منڈی) میں رہائش رکھتے تھے آپ کے والد کھیتی باڑی کرتے۔ نولکھا گاؤں (ان دنوں فیض باغ کی ساری زمین نولکھا گاؤں میں تھی) میں دو کنوئیں اور کچھ زمین لاہور کے شمالی حصے میں تھی، جس میں سبزیاں بوتے اور منڈی

ہیں لاکر بیچتے۔ مولانا کو دس سال کی عمر میں محلے کے ایک حلوائی کی شاگردی میں دے دیا گیا۔ آپ سحر سے رات گئے تک دکان پر کام کرتے۔ نیک دل استاد نے آپ کو قرآن کی تعلیم کے لیے کچھ وقت کی اجازت دینا شروع کر دی اور آپ نزدیک ترین مسجد میں قرآن پڑھتے۔ ذہانت اور محنت نے آپ کو اپنے ہم سبق طلباء میں ممتاز بنا دیا۔

آپ نے قرآن پاک کے معانی از بر کیے اور ساتھ ہی لاہور کے علماء کی مجالس میں شرکت کرنے لگے۔ ان دنوں علمائے کرام نظریاتی مباحث اور مناظرے کے میدان میں اپنے مخالفین کو جواب دیا کرتے تھے۔ مولانا کو ان مباحث نے بڑا متاثر کیا اور آپ اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ باقاعدہ عربی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ان دنوں حافظ فتح محمد اچھروی کا مدرسہ فتحیہ، پیر عبدالغفار کا مدرسہ غوثیہ تکیہ سادھواں لاہور میں علمائے دین کا ایک مرجع تھا۔ مدرسہ نعمانیہ بھاٹی گیٹ (لاہور) بھی اہل علم کے لیے چشمۂ شیریں تھا۔ آپ بھی ان مدارس کے اساتذہ سے استفادہ کرتے علوم دینیہ سے فارغ ہو کر آپ کو تلاش مرشد کی فکر ہوئی تو اس دور کے ایک جید عالم دین، راسخ الاعتقاد، مبلغ سنیت اور مناظر اسلام حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری کی شخصیت نے بڑا متاثر کیا۔ حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری (م ۱۳۱۴) مولانا غلام محی الدین قصوری ثم المصطفوی (م ۱۲۷۰) کے خواہرزادے، شاگرد اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں ان کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے اپنے وقت کے تمام بداعتقاد علماء کو میدان مناظرہ میں للکارا۔ عیسائی پادری، شیعہ، مجتہد اور خود مرزا غلام احمد قادیانی آپ کے زبان و قلم کی نوک پر تھے۔ وہ ہر شہر، ہر ضلع میں ان بداعتقادوں سے مناظرہ کرتے۔ حضرت مولانا نبی بخش حلوائی نے آپ کے آستانہ پر سر جھکایا، بیعت ہوئے اور علوم و سلوک کی منازل طے کرنے لگے۔ استادِ کامل کی نگاہ نے جوہر کامل کو پرکھا اور شاگرد رشید کو محنتی، دانشمند اور راسخ العقیدہ پا کر ایسی تربیت دی کہ عوام الناس کے اعتقادی خرمن کی حفاظت پر مامور کر دیا۔ مولانا نبی بخش حلوائی پنجاب کے ہر شہر میں پہنچے، غریب عوام میں تبلیغ کی۔ پھر ٹھیٹھ پنجابی میں تفاسیر و احادیث کی ضیا پاشیوں سے لوگوں کے سینے منور کرنے لگے۔ فاضل مرشد نے پنجابی میں قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کا حکم دیا اور خود بسم اللہ کا ترجمہ اس شعر سے کر کے آغازِ تفسیر فرمایا: ؎

اسم اللہ دے نال شروع ہے جو بخشش دا سائیں
کامل مہر محبت والا پالے آخر تائیں
آپ نے قرآن پاک کی پندرہ جلدوں میں تفسیر کی جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔

مولانا نبی بخش حلوائی کی زندگی کا ایک پہلو دوسرے علماء سے ممتاز ہے۔ آپ علی الصبح حلوا تیار کر کے دہلی دروازے کے باہر آ بیٹھتے۔ صبح صبح ریلوے میں جانے والے مزدور حلوہ خریدتے اور کھاتے اور آپ حلوہ فروشی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو دین کی میٹھی میٹھی باتیں بھی ذہن نشین کرا دیتے۔ لاہور کا یہ امتیازی حلوائی خاص و عوام کی نظروں کا محبوب ترین حلوہ فروش تھا جو کام و دہن کی حلاوت کا سامان بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ ذہن و فکر میں اُتر جاتا۔

گاہک اپنے دوستوں میں اس حلوائی کے متعلق گفت گو کرتے اور بار بار آتے، حلوہ کھاتے اور دین و ایمان کی دولت سے جھولیاں بھرتے۔ آپ تجارتِ صبحگاہی کے نفع سے مسجد تعمیر کراتے (جو آج بھی کوتوالی کے ساتھ موجود ہے) اور پنجابی میں تفسیر لکھ کر طبع کراتے اور پنجاب کے دور دراز دیہات میں پھیلاتے۔

تفسیر نبوی کو علماء و عوام نے بیک وقت ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس تفسیر قبولیت ملی کر کئی ایڈیشن چھاپنے پڑے۔ علمائے اہل سنت نے بے پناہ خراجِ تحسین پیش کوششوں کو بے حد سراہا۔

آپ نے تفسیر نبوی کے اختتام پر، اس تالیف پر جس قدر وقت صرف ہوا تھا، اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ؎

تیراں سو دس ۱۳۱۰ ہجری وچ سی منزلِ اول مکی
بہت ورھے پھر وقفہ رہیا رہی طبیعت ڈکی
پیا اندھیرا جگ وچ ڈاڈھا دھند و کار چو فیرے
فرقیاں گمراہاں سر چائے کر دے مکر گھنیرے

تیراں سو اکونجہ وچ ہُن ختم ہویا کم یارا
سہو خطا جو ہوئے اوس تھیں خبر کریں ولدارا

حضرت مولانا نے تفسیر نبوی کے علاوہ بہت سی کتابیں لکھیں جن میں شفاء القلوب، رسالۂ جمعہ، رسالۂ اربعہ، اظہار انکار المنکرین من صلوٰۃ الجبین، الامتیاز بین الحقیقت والمجاز (تین ہزار صفحات)، الثار الحامیہ لمن ذم المعاویہؓ، الوار نبوی، جامع الشواہد، اور قصص المحسنین خاص طور پر مشہور ہوئیں۔

آپ کے ہمعصر علمائے اہل سنت آپ کو بے حد احترام کی نظر سے دیکھتے۔ حضرت پیر عبدالغفار شاہؒ، مولانا غلام قادر بھیرویؒ، مولانا معوان حسین خطیب شاہی مسجد، مولانا سید احمد علی شاہ بٹالوی، مولانا اصغر علی روحی، مولانا نظام الدین ملتانی، سید دیدار علی شاہ الوری، مولانا تاج الدین، صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، مولانا مہر الدین، علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری حزب الاحناف، مولانا فتح محمد صاحب اچھرہ تو آپ کے خصوصی احباب میں سے تھے۔

آپ کو حضرت فاضل قصوریؒ سے روحانی تربیت ملی تھی اور سینہ عشق مصطفیٰؐ سے مالا مال تھا۔ ہر وقت درود پاک وردِ زباں رہتا۔ اپنے زیر اثر لوگوں کو کثرت سے درود پاک پڑھنے کو کہتے۔ طلباء کو نمازِ صبح کے بعد ہزاروں بار درود پڑھاتے، ختم خواجگان باقاعدگی سے پڑھاتے گیارھویں کی مجالس ہر ماہ ہوتیں۔ عید میلاد النبیؐ اور معراج شریف پر خصوصیت سے مجالس قائم کرواتے۔

پیرو مرشد کے اتباع کے لیے زندگی وقف تھی۔ جوتے اٹھاتے اور فخر کرتے۔ بایں علم و کمال فاضل قصوری کے مزار پر جاتے تو تمام حفاظ و علماء کی موجودگی میں اپنی سفید داڑھی سے ساری قبر پر جھاڑو دیتے، عرس کرواتے اور بے پناہ خرچ کرتے۔ طلباء کا کھانا کم ہوتا تو کثرت سے درود پاک پڑھاتے، بھوک کا علاج درود سے کرتے۔ پیران کرام امیر

لوگوں کو مرید بنانے کے خواہاں رہتے ہیں مگر مولانا نبی بخش حلوائی ہمیشہ غرباء کو پسند فرماتے۔ جنوں کے دُور دراز علاقوں میں چلے جاتے اور غربت زدہ عوام میں تبلیغ کرتے۔ پہاڑی علاقوں میں آپ کی تبلیغ سے روحانیت کا دور دورہ ہوتا۔ مولانا غلام دستگیر قصوریؒ کے وصال کے بعد حضرت پیر جماعت علی لاثانی علی پوری سے بیعت ہوئے۔

طلباءِ علم دین سے خاص محبت کرتے۔ لوگوں سے کہتے میرے درویشوں کے ہاتھ میں جنت کی کنجیاں ہیں۔ ان کی محبت جنت کے داخلے کی ضامن ہے۔ حاجت مندوں کے لیے توجہ خود دیتے۔ مگر فرماتے: درویشو! ان کے لیے خدا سے دُعا کرو۔ نعتِ رسول پڑھنے والوں کی خاص طور پر خدمت کرتے۔ عزت سے بٹھاتے، جھولیاں بھر دیتے۔ آپ کے نامور شاگردوں میں سے مولانا باغ علی صاحب نسیم (جو آپ کے سچے علمی جانشین ثابت ہوئے)، حافظ محمد عالم صاحب سیالکوٹی، صوفی غلام حسین صاحب گوجروی، ماسٹر برکت علی شہید، اور راقم الحروف انہی کے فیض کی بہار ہیں۔ اہلِ دنیا آتے شاگردوں کی خدمت کرواتے جو ان کی پرواہ نہ کرتا اس کی پرواہ نہ کرتے۔ موسم کا ہر پھل وافر مقدار میں منگوا کر طلباء کو کھلاتے تاکہ حسرت نہ رہے۔ طلباء کے عقیدہ کی تربیت کا خاص خیال رکھتے۔ عقائد باطلہ کا رد کرتے اور اس سلسلہ میں کسی کی رو رعایت نہ کرتے۔

آپ تقریر کی بجائے تحریری تبلیغ پر زور دیتے۔ زبانی گفتگو کم کرتے مگر قلم کی مار سے باطل کے دل میں غار کر دیتے۔ آپ کے سامنے مصر و حجاز کی مطبوعہ تفاسیر اور عقاید کی کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے۔ مطالعہ کرتے، طلباء سے سُنتے اور پھر ان علمی خزینوں کو پنجابی تفسیر میں سمو کر عوام کے دلوں میں انڈیل دیتے۔ عربی اور فارسی پر کامل عبور تھا۔ عربی کے قصاید پڑھتے۔ فارسی میں مثنوی مولانا روم سے والہانہ عشق کا اظہار فرماتے۔ پنجابی میں اشعار کے بحرِ بیکراں ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی اور اردو نعت خوب کہتے۔

آپ کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ تمام شہری جائیداد فروخت کر کے مسجد کی تعمیر پر لگا دی یا تفسیر کی طباعت پر۔ ۱۹۴۴ء میں وصال ہوا۔ جامع مسجد کوتوالی کے پہلو میں آرام گاہ ملی۔ آپ کا جاری کردہ مدرسہ، مکتبہ، اور خانقاہ یادگار ہیں۔ ذاتی کتب خانہ میں نایاب علمی کتابیں ہیں۔ مکتبہ میں خالص اعتقادی کتابوں کی طباعت کا اور خانقاہ میں خصوصی اعمال و وظائف کا اہتمام ہے۔

مولانا نور بخش توکلی ایم۔ اے رحمۃ اللہ علیہ

جن کی تصنیف "سیرتِ رسولِ عربیؐ" توشۂ آخرت بنی

آپ موضع چک۔ قاضیاں ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) میں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد جہانخیلاں شریف کے ارادت مند تھے۔ بدیں وجہ مولانا کو بچپن سے بزرگانِ دین کی ارادت وعقیدت کی دولت ملی۔ اپنے سکول میں اپنی خداداد ذہانت، محنت اور شریف النفسی کی وجہ سے مقبول تھے۔ اساتذہ شفقت فرماتے، ہم سبق احترام کرتے اور قصبہ کے معززین ناصیہ بخت سے آثارِ کمال کی جھلک پاتے تھے۔

مقامی مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم۔ اے عربی کی امتیازی ڈگری حاصل کی۔ آپ ۱۸۹۲ء میں ہندو محمڈن سکول چھاؤنی انبالہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ انبالہ میں ان دنوں حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ روحانیت کی تعلیم کا مرکز تھے۔ مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور اسی نسبت سے آپ توکلی کہلائے۔

حضرت توکل شاہؒ نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ کے والد کس حلقہ طریقت سے وابستہ ہیں۔ آپ نے جب یہ بتایا کہ حضرت جہانخیلاں شریف کے عقیدتمند ہیں تو شاہ صاحب فرمانے لگے: "آجاؤ! پھر تو یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔" اس طرح انوار و فیضان کے دروازے کھل گئے۔[1]

---

[1] تذکرہ مشائخ نقشبندیہ ص ۳۶۲ مطبوعہ برقی پریس لدھیانہ

۱۸۹۱ء میں آپ میونسپل بورڈ کالج امرت سر میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان دنوں اہلسنت کے مشہور فاضل بزرگ مولانا غلام رسول قاسمی کشمیری امرت سری (المتوفی ۱۹۰۲ء) فقہ، حدیث، تفسیر اور معقولات پڑھانے میں مشہور زمانہ ہو چکے تھے۔ آپ نے بھی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور علوم دینیہ کی تکمیل سے فاضل اجل بن کر آسمانِ علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

مولانا نوکی نے حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے سلسلۂ نقشبندیہ سے فیض و خلافت کا شرف حاصل کیا۔ حضرت توکل شاہ کے وصال کے بعد مولانا مولوی مشتاق احمد محدث انبیٹھوی ثم لدھیانوی سے فیوض سلسلہ صابریہ سے بہرہ ور ہوئے۔ حضرت مولانا مشتاق احمد جلیل القدر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے شیخ طریقت بھی تھے۔ آپ کی وجہ سے سلسلہ صابریہ کے علمی و روحانی کمالات مخلوق خدا تک بڑی عمدگی سے پہنچے اور خرقۂ خلافت بھی حاصل ہوا۔

کچھ عرصہ کے بعد آپ لاہور آئے اور ایک عرصہ تک انجمن نعمانیہ کے دارالعلوم کے اعزازی ناظم تعلیم رہے اور ماہوار رسالہ انجمن نعمانیہ کو ایک عرصہ تک ایڈٹ کرتے رہے۔ اسی دوران میں آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران آپ ہمیشہ دینی اور مجلسی زندگی میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ دینی جلسوں میں آپ کی تقاریر ہوتی تھیں۔ آپ نے اپنی دینی تبلیغ سے عوام الناس کے اذہان و فکر کو اسلامی رنگ بخشا۔

آپ ایک عرصہ تک انجمن نعمانیہ کی دینی درس گاہ کے ناظمِ امور تعلیمات رہے۔ یہ ساری خدمات اعزازی تھیں۔ آپ نے دینی تدریس کے ذوق و اہمیت کے پیش نظر اپنے پیر و مرشد کے نام پر ریٹائر ہونے کے بعد چک قاضیاں میں "مدرسہ اسلامیہ توکلیہ" کی بنیاد رکھی جس سے بہت سے طلبہ فیضیاب ہوئے۔[1]

---

[1] تذکرہ مشائخ نقشبندیہ ص ۲۶۲۔

آپ کی دینی خدمات میں یہ نہایت ہی اہم کام ہے کہ آپ نے گورنمنٹ کے گزٹ اور سرکاری کاغذات میں "بارہ وفات" کی غلط العوامی اصطلاح کو "عید میلاد النبیؐ" کے نام سے تبدیل کرانے کی جدوجہد کی اور اس میں یہاں تک کامیاب ہوئے کہ گورنمنٹ سے اس مقدس دِن کو تعطیل عام منظور کروائی۔ آج یہی تعطیل خدا کے فضل سے آزادی کی ایک اہم تقریب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ان لوگوں کی مخلصانہ عقیدت نے جس دن کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے کوششیں کیں۔ وہ دن آج جشن عید میلاد کے نظاروں سے ملک کے مسلمانوں کی مقدس تقریب بن گیا ہے۔

مولانا تصنیف و تالیف کی اہمیت سے بھی خوب واقف تھے۔ چنانچہ آپ کے قلم گوہر بار سے بہت سی تصانیف ہماری علمی دُنیا میں شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ مندرجہ ذیل تصانیف میں سے بعض ہمیں دیکھنے کا اتفاق ہُوا ہے،

۱۔ سیرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ عید میلاد النبی " " "

۳۔ معجزات النبی " " "

۴۔ اعجاز القرآن

۵۔ عقائد اہل سنت

۶۔ شرح قصیدہ بردہ (اردو)

۷۔ شرح قصیدہ بردہ (عربی)

۸۔ تذکرہ مشائخ نقشبند

۹۔ حلیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۱۰۔ غزوات النبی " " "

۱۱۔ سیرت غوث اعظم

۱۲۔ تحفہ شیعہ دو حصے

۱۳۔ رسالۂ نور

۱۴۔ مولود برزنجی کی اُردو شرح

۱۵۔ تذکرہ حضرت غوث الاعظمؒ

۱۶۔ ابو حنیفہ رضؓ

۱۷۔ شرحِ ہدایہ

۱۸۔ اقوال صحیفہ فی جواب الجرح علیٰ ابی حنیفہ

۱۹۔ کتاب البرزخ

۲۰۔ مقدمہ تفسیر القرآن

۲۱۔ تفسیر سورہ فاتحہ و بقرہ

۲۲۔ امام بخاری و شافعی

۲۳۔ ترجمہ تحقیق المرام فی منع القراۃ خلف الامام

۲۴۔ ترجمہ اُردو الرسالۃ الجلیہ

(نوٹ: یہ دونوں کتابیں آپ کے استاد مولانا غلام رسول قاسمی امرتسری کی تصانیف ہیں۔ آپ نے صرف ترجمہ کیا)

۲۵۔ افضل المقال فی ردّ علی الرافضی الضّال۔

آپ کی تصانیف میں سے "سیرت رسولِ عربیؐ" تاج کمپنی لاہور کے اہتمام میں بڑی خوب صورت چھپی ہے اور مقبول خاص و عام ہوئی ہے۔ آپ کے ایک عزیز چوہدری محمد سلیمان ایڈووکیٹ لائل پور نے اپنے ایک مضمون میں یہ روایت نقل کی ہے کہ مولانا الحاج عبدالحمید لدھیانوی نے خواب میں آپ کی وفات کے ایک ماہ بعد آپ کو ایک باغ میں سنہری تخت پر بیٹھے دیکھا تو دریافت کیا کہ اس اعزاز کی کیا وجہ ہے؟ مولانا توکلی صاحب نے جواب دیا:

"میرے اللہ کو میری کتاب "سیرت رسولِ عربیؐ" پسند آگئی اور مجھے یہ انعام ملا ہے۔"

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ آپ کے ... اعتقادی مضامین

انجمن نعمانیہ کے رسالہ میں چھپ کر اہل سنت کی خدمت کرتے رہے۔ آپ کے مضامین اہل علم کی رُوحانی غذا تھے۔ آپ نے اپنی ساری آمدنی انجمن نعمانیہ کے دینی مفادات کے لیے وقف کر دی۔

آپ نے تاریخ گبن کا ترجمہ "سیرت حسن" کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب کے "اہل اسلام، فتوح العجم والمصر والشام" کے حصوں کو ۱۸۹۴ء میں اُردو لباس پہنایا۔ کتاب کے صفحہ ۸۰ پر علامہ شبلی کو "استاذی مخدومی مولانا شبلی نعمانی" لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام دہلی کے دوران آپ نے مولانا شبلی سے بھی علمی استفادہ کیا تھا۔

مولانا نوکلی عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بلند پایہ صوفی اور ولی کامل تھے۔ آپ بیعت بھی کرتے اور صاحبِ کمالات ظاہریہ و باطنیہ ہونے کے باوجود نہایت سادہ مزاج انسان تھے۔ دیکھنے والے یہ معلوم نہ کر سکتے تھے کہ یہ سادہ لباس اتنا بڑا عالم دین، شیخ طریقت اور پروفیسر ہے۔ علماء و مشائخ وقت آپ کا بیحد احترام کرتے۔ آپ خود بھی اہل اللہ اور اہل علم سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ علامہ اصغر رُوحی، مولانا محمد شریف کوٹلی لوہاراں، حضرت پیر عبدالغفار شاہ، حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری، حضرت مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی امرت سری رحمۃ اللہ علیہم سے آپ کے گہرے مراسم تھے اور یہ سارے بزرگان اہلسنت آپ کی قابلیت اور فضیلت کے معترف تھے۔

آپ ایک عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے جہاں آپ نے اپنی علمی اور دینی صلاحیت سے ان اذہان کی تربیت میں بڑا اہم حصہ لیا جو محض مغربی اندازِ فکر کو سرمایۂ حیات خیال کرتے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخ میں آپ کو شاندار خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد آپ لائلپور میں قیام پذیر ہو گئے۔ آپ نے آخری عمر میں سلسلۂ تصنیف کو جاری رکھا اور قرآن پاک کی تفسیر کے تقریباً ۴۰۰ صفحات مکمل کیے۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو آپ اپنے مکان کی سیڑھی سے پھسل کر زخمی ہو گئے اور زخموں کی تاب نہ لا کر واصلِ حق ہو گئے۔

آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو نور شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

چودھری محمد سلیمان بی، اے، ایل ایل، بی لائل پور نے ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کرا کے زائرین کو بڑی سہولت بخش دی ہے۔

ابوالفیض سیّد قلندر علی گیلانی رح

آپ اپنے زمانے کے جید علماء اور مشائخ کبار میں شمار ہوتے تھے۔ آپ موضع کوٹلی لوہاراں کے گیلانی سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت ابوالحسن قاری شاہ بدیع الدین آغا شہید اور حضرت ابوبکر عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کے واسطوں سے محبوب سُبحانی غوث صمدانی حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی البغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ حضرت خواجہ ابوالفیض قلندر علی رحمۃ اللہ علیہ کو علماء و مشائخ کے گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے بچپن ہی میں علمی و مذہبی ماحول میسر ہوا۔ جب آپ کی عمر چار سال کی تھی تو آپ کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے آپ کے والد بزرگوار نے آپ کی رہنمائی کا فرض سرانجام دیا۔ ابھی آپ کی عمر آٹھ برس کی تھی کہ سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا مگر انتہائی نامساعد حالات کے باوجود آپ نے حصولِ علم کا کام جاری رکھا اور علاقہ سیالکوٹ کے مختلف متقدر علماء سے اکتسابِ فیض کر کے کمال حاصل کر لیا۔ بعد ازاں آپ بریلی تشریف لے گئے اور وہاں اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے فقہ، تفسیر، حدیث، کلام اور قانون کی مزید تکمیل کی اور دستارِ فضیلت حاصل کی۔

حضرت امام السالکین ابوالفیض خواجہ قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف کے شاگرد بھی رہے اور حضرت کے فیضانِ صحبت سے وہ باطنی علوم حاصل کیے جو احاطۂ بیان سے باہر ہیں۔ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا شیر محمد نقشبندی شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ کیا۔

آپ خضر صحرائے طریقت حضرت مولانا الحاج میاں غلام محمد سہروردی حیات گڑھی

رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور خلیفہ مجاز تھے۔ آپ کا سلسلہ بیعت اٹھارہ واسطوں سے شیخ الاسلام خواجہ زکریا ملتانی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ حضرت میاں غلام سرورؒ سے خلافت حاصل کی۔ سلسلہ سہروردیہ کے جاری کرنے کا حکم ہوا۔ لاہور میں قیام کے دوران آپ نے جامع مسجد شاہ ابوالمعالی میں درس و تدریس اور خطابت کا سلسلہ کئی سال تک جاری رکھا۔ عوام و خواص کو ظاہری و باطنی علوم سے فیض یاب فرمایا۔ ایک عرصہ تک مسجد چودھریاں قلعہ گوجر سنگھ لاہور میں اپنا فریضۂ تبلیغ ادا فرماتے رہے۔ کئی گھنٹے وعظ فرماتے رہتے۔ آپ کی تقریر کچھ ایسی دلپذیر ہوتی کہ تمام لوگ بلا امتیاز محظوظ ہوتے۔ آپ صاحبِ کرامات بزرگ تھے، اور صاحبِ حال بھی۔

سید ابوالحسن خواجہ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت چوہڑ شاہ بندگی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو والہانہ عقیدت تھی۔ ان باکمال ہستیوں کے مزارات پر حاضر ہو کر مراقب ہوتے اور کسب فیض کرتے۔ آپ کی مجالس صحبت میں اکثر قال اللہ و قال الرسول کی آوازیں بلند ہوتیں۔ سفر و حضر میں تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام کا فریضہ پیشِ نظر رہتا اور جلوت و خلوت میں بندگانِ خدا کی دینی و دنیاوی رہنمائی کا فرض ادا فرماتے۔ آپ کے کاشانۂ اقدس واقع قلعہ گوجر سنگھ زائرین کی بھیڑ لگی رہتی اور زن و مرد یکساں طور پر فیض یاب ہوتے۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیںؔ جن سے آج بھی ہزاروں افراد بہرہ یاب ہوتے ہیں۔

لاہور میں آپ کا قیام محلہ آمریاں قلعہ گوجر سنگھ میں رہا۔ یہیں آپ واصل بحق ہوئے آپ کی تاریخ وصال آخری چہار شنبہ ۲۷ صفر المظفر ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۰ ستمبر ۱۹۵۸ء ہے۔ آپ لاہور سے سات میل دور موضع ہنجروال شریف میں جو ملتان روڈ پر واقع ہے، مدفون ہوئے۔

لہ ۱۔ سیاح لامکاں (۲) اجمال رسولؐ (۳) موعظۃ للمتقین (۴) صحیفہ غوثیہ (۵) دعوت الحنفیہ (۶) پردہ موزی (۷) حلیۃ النبیؐ (۸) لباس التقویٰ (۹) رسالہ علم غیب (۱۰) الفقر فخری (۱۱) قمیص یوسفی (۱۲) تذکرہ سہروردیہ (۱۳) تعارف سہروردیہ۔

مولانا غلام محمد ترنم رحمۃ اللہ علیہ

شعلہ بیان مقرر، پُرخلوص دوست، درویش صفت حکیم
اور بیباک سیاست دان

امرتسر کے ایک غریب کشمیری گھرانے میں تقریباً ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد قالین سازی اور شالوں پر گل کاری (پٹہ گری) کے فن حاصل کیے اور عرصے تک انہی پیشوں کو اپنائے رہے مگر قدرت نے آپ کو کسی اور مقصد کے لیے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ آپ کی فطری صلاحیت نے اس بات پر مجبور کیا کہ علم حاصل کرنا چاہیے۔ آپ اس مقصد کے لیے علامہ عرشی ؒ کے پاس پہنچے جنہوں نے اپنے مشاغل کی کثرت کی وجہ سے اظہارِ معذوری کرتے ہوئے اپنے استاد حکیم علامہ فیروزالدین صاحب فیروز طغرائی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا دیا۔

حضرت طغرائی جیسے لائق استاد سے اس ذہین شاگرد نے بہت جلد ہی منشی فاضل کا کورس پڑھ کر امتحان دے دیا اور کامیابی حاصل کی۔ اگلے ہی سال ادیب فاضل کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ طغرائی مرحوم کے فیض صحبت نے آپ کی طبیعت میں بہت جلا پیدا کر دی اور آپ کا شوقِ علم بہت بڑھ گیا۔ پھر آپ عربی اور دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے حضرت مولانا مفتی عبدالصمد خاں صاحب مرحوم امرائی کے پاس جانے لگے۔

۱؎ علامہ عرشی صاحب ہی نے مولانا کے لیے ترنم تخلص تجویز کیا تھا جس کو طغرائی مرحوم نے بھی پسند فرمایا۔

آپ کو حضرت طغرائی کے فیض نے ترنم بنایا اور مفتی صاحب کے فیض نے مولانا۔ آپ کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے میں ان دو ہی بزرگوں کی صحبت کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ اگرچہ انہوں نے اور بھی کئی لائق استادوں سے پڑھا تھا جن میں سے حضرت علامہ مولانا محمد عالم آسی اور حکیم محبوب عالم مرحوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[1]

چند سالوں ہی میں آپ لاثانی خطیب بن کر عوام کے سامنے آئے اور مقبولیت کا یہ درجہ پایا کہ امرت سر کے کسی بھی علاقے میں جا کر خطبہ دینا شروع کرتے، لوگ وہیں جوق درجوق پہنچنے لگتے۔ شہر امرت سر کی کئی تنگ، بوسیدہ اور غیر آباد مساجد صرف آپ کے ورود سے بڑی بڑی شان دار جامع مسجدوں میں تبدیل ہو گئیں۔ جامع مسجد شریف پورہ، رانی بازار اور جامع مسجد کوچہ قاصداں امرت سر کو آپ ہی کے اثر وعظ کے نتیجہ میں وسعت و رونق ملی۔

جامعہ اسلامیہ آپ نے ہال بازار امرت سر میں ایک ادارہ بنام "جامعہ اسلامیہ" جاری کیا تھا جس میں السنۂ شرقیہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس جامعہ میں آپ خود جا کر تو بہت کم پڑھاتے تھے لیکن مستقل طور پر مدرسین کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں اس جامعہ کی بدولت بے شمار لوگ فیضیاب ہوئے۔

ذریعہ معاش مولانا کے معاش کا ذریعہ یہ تھا کہ امرت سر مسلم ہائی سکول شریف پورہ میں دینیات کے مدرس تھے اور فارغ وقتوں میں مطب بھی کرتے تھے۔ ساری زندگی سادگی میں گزاری۔ تبلیغی کاموں کو فی سبیل اللہ ہی کیا۔ تقسیم ملک کے بعد گوالمنڈی نزد امرت دھارا بلڈنگ لاہور میں سکونت پذیر ہوئے اور یہاں آپ کے تبلیغی مشاغل اور بھی بڑھ گئے جنہیں بڑی ہمت و استقلال سے نبھاتے رہے اور طبابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا جس سے قوت لایموت کا سامان میسر آتا۔

خطیب سول سیکرٹریٹ لاہور آنے کے فوراً بعد آپ سول سیکرٹریٹ لاہور کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ دینے لگے جو رحلت سے

[1] "فیض الاسلام" راولپنڈی شمارہ جنوری ۱۹۶۰ء۔ مضمون از قلم حکیم محمد موسیٰ صاحب چشتی امرت سری

چھ ماہ پہلے تک باقاعدہ جاری رہا۔ مولانا ترنم کی آمد سے پہلے یہ مسجد ایک چھوٹے سے جھونپڑے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہاں بھی آپ کے تعمیرِ مساجد کے ذوق کا یہ اثر ہُوا کہ یہ عظیم الشان مسجد بن گئی۔ سُنیّوں کے تنظیمی فقدان سے یہ عظیم الشان مسجد اور تبلیغی ادارہ اب دیو بندی مکتبِ فکر کے لوگوں کے زیرِ انتظام آگیا ہے۔ پچھلے دنوں ایم۔اے۔او کالج کے ایک پروفیسر علّامہ خالد محمود صاحب خطابت جمعہ فرما کر مولانا ترنم کے رُوح کو "ایصالِ ثواب" سے نوازتے رہے۔ مگر مسجد کے درو دیوار مولانا ترنم کی سحر بیانی اور آقائے دو عالم پر صلوٰۃ و سلام کی پُر نور صداؤں سے محروم ہو چکے ہیں۔

نائب صدر جمعیت العلماء مولانا ترنم جمعیت العلماء مغربی پاکستان کے نائب صدر تھے اور اس سلسلے میں آپ کی خدمات بہت گراں قدر ہیں۔ حقیقت میں جمعیت کا دماغ آپ ہی تھے۔ جمعیت کی طرف سے دستورِ پاکستان پر ایک کتاب کی صورت میں تبصرہ شائع ہوا تھا جو مولانا کے فکرِ سلیم کا نتیجہ تھا۔ اس تبصرے کو قانونی و علمی حلقوں میں بہت سراہا گیا اور مولانا کی قابلیت کا اعتراف کیا گیا۔ کتاب "بطلِ نبوت" پر حواشی لکھے جو آپ کی نکتہ سنج طبیعت کا معترف بنانے کے لیے کافی ہیں۔ جمعیت العلماء کے زیرِ اہتمام جہادِ کشمیر اور تحریک ختم نبوت میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کشمیر کی جنگ میں اگلے مورچوں پر گئے اور غازیانِ صف شکن کے دوش بدوش کھڑے ہو کر پیغامِ جہاد سناتے رہے۔ ختمِ نبوت کی تحریک میں قید و بند کی ساری عظمتیں آپ کے حصہ میں آئیں۔ اور اس ابتلائی دور میں آپ کے پایۂ استقلال میں ذرہ بھی لغزش نہیں آئی تھی۔

فیلو پنجاب یونیورسٹی تقسیم ملک کے بعد سے آپ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو چلے آرہے تھے۔ یونیورسٹی میں آپ اسلامی تعلیم کے لیے جو کوششیں کرتے رہے واقفانِ حال کے دِلوں میں اس کی بڑی وقعت ہے۔ آپ وہاں ڈٹ کر اپنے موقف کو بیان کرتے تھے۔ خواہ کوئی مانے یا نہ مانے، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چند دوستوں کی مجلس میں آپ تشریف لے آئے نصابِ تعلیم پر گفتگو

شروع ہوگئی۔ مولانا چونکہ محرمِ اندرونِ خانہ تھے انہوں نے یونیورسٹی کے بعض فیلوز کی اسلام سے بیزاری اور فواحش کو کورس میں شامل کرنے پر رنج دہ واقعات بتائے۔ دورانِ گفتگو میں مولانا کی آنکھیں اشکبار رہیں۔ آپ کو اس بات کا دُکھ تھا کہ موجودہ نظامِ تعلیم انسانوں کو حیوان بنا رہا ہے۔

بیعت آپ حضرت پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری سے بیعت تھے اور حضرت سید علی حسین شاہ صاحب چشتی نظامی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی رُوحانی استفادہ کیا۔

حضرت مولانا محمد عالم صاحب آسیؔ آپ پر بڑی شفقت فرمایا کرتے جس کا اندازہ مولانا ترنم صاحب کے ایک ذاتی خط سے ہوتا ہے جسے انہوں نے حکیم محمد موسیٰ صاحب امرت سری کے نام قیامِ پاکستان کے بعد لکھا :

"میرے اور حضرت آسی کے تعلقات غلام (ترنم) اور آقا (آسی) کے تھے۔ اور وُہ از راہِ کرم میرے پاس کبھی کبھی تشریف لایا کرتے تھے ایک مرتبہ میں غیر حاضر تھا تو وُہ حضرت گرامی کا یہ شعر لکھ کر رکھ گئے ؎

چو غریب دردمندے بدرت رسیدہ باشد
چہ قدر تپیدہ باشد چو ترا نہ دیدہ باشد!

چند دن بعد دوبارہ تشریف لائے اور میں پھر بھی نہ مل سکا تو وُہ یہ شعر لکھ کر ڈال گئے ؎

طریق ترنم الاشعار صعب
طویل فی طویل فی طویل"

احباب و معاصرین مولانا ابوالحسنات مرحوم، مولانا محمد بخش مسلم، مولانا محمد حسین نعیمی، حافظ خادم حسین صاحب، مولانا مرتضیٰ احمد صاحب میکش مرحوم آپ کے ہم مشرب و ہم فکر تھے۔ ان کی مجالس میں آپ علمی مباحث اور دینی معاملات پر غور فرمایا کرتے تھے۔

آپ شعر بہت کم کہتے تھے اور عرصے سے بالکل ہی ترک کر چکے تھے۔

شعروشاعری ابتدائی دور میں مناجاتیں اور نعتیں لکھی تھیں۔ ذیل میں بطور نمونہ ایک نعت کے تین شعر درج ہیں : ؎

میں نیاز مندِ حضورؐ ہوں میں اسیرِ زلفِ جہاں نہیں
مجھے نامِ پاک سے ہے غرض، کوئی فکرِ سود زیاں نہیں

جو خدا کا خاص حبیب ہو، جو خدا کے عین قریب ہو
کرے وصف اس کے بشر بیاں یہ مجال و تابِ تواں نہیں

جو حریقِ سوزِ رسولؐ ہے وہی ذات حق کو قبول ہے
یہ ہے اک حقیقت مستقل کوئی اس میں وہم و گماں نہیں

مولانا نصراللہ خاں عزیز ایڈیٹر روزنامہ "تسنیم" لاہور نے آپ

جذباتِ عزیز کی رحلت پر "افکار امروز" میں اظہار افسوس کرتے ہوئے چند سطروں میں جامعیت سے آپ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نہایت خوب روشنی ڈالی تھی ذیل میں اسے من وعن نقل کیا جاتا ہے:

"آج مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش کے انتقال کی خبر ملی ہے۔ اس سے قبل مولانا غلام محمد ترنم نے داعیِ اجل کو لبیک کہا تھا۔ یہ دونوں حضرات اہلِ علم تھے اور ملک کی خدمت میں ان کی زندگیاں گزری تھیں۔ ان خادمانِ ملت کا اٹھ جانا ایک افسوسناک سانحہ ہے ؎

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

مولانا غلام محمد ترنم سے پہلی مرتبہ امرتسر میں تعارف ہوا تھا، وہ اسم بامسمیٰ اور اپنے تخلص کا عملی نمونہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی پر انہیں فخر تھا اور بڑے شیوا بیان واعظ تھے۔

پاکستان میں آنے کے بعد بھی ان کے دینی اور ملی مشاغل میں فرق

واقع نہ ہوا۔ دستورِ اسلامی کے حامی تھے اور سیکر ٹریٹ کی مسجد کے خطیب ہونے کے باوجود اسی مسجد کے منبر سے اس وقت حق بات کہتے تھے جب کہ وقت کی حکومتیں اس بات کو پسند نہیں کرتی تھیں۔"

مسلک کے اعتبار سے بریلوی تھے مگر رنجان مرنج اور مسلکی اختلافات کو خوش طبعی اور بذلہ سنجی سے ٹال جاتے تھے۔ قادیانی ایجی ٹیشن میں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند رہے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد بھی ان کے دم خم میں فرق نہیں آیا تھا۔ ہرفن مولا تھے۔ واعظ، مدرس، مبلغ، سیاسی کارکن، خطیب، طبیب، عالم، عامی سب کچھ تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے اسے کشتِ زعفران بنا دیتے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر اور ان کی نیکیوں کا اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔"[۲]

وفات مدت سے آپ کو ذیابیطس کا عارضہ لاحق تھا، بڑھتے بڑھتے بڑھ گیا اور جگر بھی خراب ہوگیا۔ آخر ۱۸ محرم الحرام ۱۳۷۹ھ بروز جمعہ مطابق ۲۴ جولائی ۱۹۵۹ء کو اس دارِ فانی سے راہ گرائے عالمِ جاودانی ہوئے اور بزبانِ حال یہ کہتے گئے ؎

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

آپ کی وفات کی تاریخیں حضرت مولانا پیر غلام دستگیر صاحب نامی مرحوم نے یہ کہیں ؎

غلام محمد ہوئے آہ فوت — وفات اُن کی ہے ایک عالم کی موت
جو تاریخ مطلوب نامی ہے تو — "ہُوا فوت منذبِ البیان ہے" کہو
۹ ۷ ۳ ۱ ھ

ولہٗ

غلامِ محمد کی نامی! وفات — ترنم پہ اک خطِ تنسیخ ہے
غلامِ محمد طبیب اجل — جہاں سے گئے آہ تاریخ ہے
۹

میرے محترم مخلص رفیق حکیم محمد موسیٰ صاحب امرت سری نے "ترنم داخلِ خلد" اور ۱۹۵۹ء
"فاضلِ حکمت" تاریخیں نکالی تھیں۔ ۱۹۵۹

قابلِ رشک جنازہ آپ کی وفات حسرت آیات کی خبر ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے نشر ہوئی۔ نمازِ جمعہ کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ محتاط اندازے کے مطابق بیس ہزار نفوس نے نمازِ جنازہ پڑھی اور بڑے بڑے علماء و فضلاء بلا امتیازِ مسلک شریکِ جنازہ ہوئے۔ حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد صاحب ناظم حزب الاحناف لاہور نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

مدفن آپ کی آخری آرام گاہ گورستان میانی صاحب بہاول پور روڈ۔ لاہور (برسرراہ) بنی۔ نوراللہ مرقدہٗ۔

تعزیتی جلسے آپ کی وفات پر، راگست کو برکت علی ہال میں آل پاکستان یونانی طبی کانفرنس کے زیرِ اہتمام تعزیتی جلسہ ہوا کیوں کہ ترنم صاحب طبی کانفرنس کے بھی رُوحِ رواں تھے۔ جلسے کی کارروائی جناب حکیم غلام نبی صاحب امرت سری حال مقیم راولپنڈی نے نظم پڑھ کر شروع کی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں؂

تمدن کے آداب سکھلانے والا
جہاں میں فقط ہے نظامِ محمدؐ

بنی نوعِ انساں کو امن و اماں سے
بسا دینے والا ہے نامِ محمدؐ

خدا کو پیارے ہوئے ہیں ترنم
خدا کو ہیں پیارے غلامِ محمد

خدائے محمد ترنم کو بخشے
سناتے تھے ہم کو پیامِ محمدؐ

ترنم تھا گلزارِ احمدؐ کا بلبل
کہ گاتا تھا ہر دم کلامِ محمدؐ

ترنم تھا باغِ محمدؐ کا درباں
ترنم تھا دل سے غلامِ محمدؐ

جمعیت العلمائے پاکستان حضرت ترنم کی سی شخصیت کے خلاء کو پورا نہیں کر سکی۔[1] ترنم کی موت ہماری جماعتی زندگی کے لیے ناقابلِ برداشت نقصان تھا۔

---

[1] آپ کے مفصل حالات کے لیے "غلام محمد ترنم" مولفہ حکیم محمد موسیٰ امرت سری ملاحظہ فرمائیں۔

مفتی محمد غلام جان قادری رضوی

اسم گرامی محمد غلام جان بن احمد جی بن محمد عالم، کنیت ابوالمظفر، لقب فقیہہ دوراں تھا۔

آپ کے اسلاف میں سے میر قطب شاہ سلطان محمود غزنوی کے اُن معاونین میں سے تھے جو برصغیر میں پرچم اسلام لہرانے کے لیے پیش پیش تھے۔ محمود غزنوی نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر سرحد میں ایک جاگیر عنایت کی جسے آپ نے اپنی اولاد کے سپرد کیا اور خود دارالسلطنت غزنی میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کی نسبت یہ خاندان قطب شاہی کہلاتا تھا۔

آپ کے والد مولوی احمد جی نے اپنے پانچ بیٹوں (مولانا عزیز الرحمٰن، مولانا خلیل الرحمٰن، محمد غلام جان، مولانا وسیع اللہ اور سید رسول) کو دینی تعلیم سے آراستہ کر کے خدمتِ دین کے لیے وقف کر دیا۔ مفتی محمد غلام جان نے ابتدائی کتابیں اپنے والد مکرم سے پڑھیں۔ صرف و نحو کی تکمیل متوال (ہزارہ)، پنجائن (چکوال) اور کھیوال (کیمبلپور) کے مراکز سے کی۔ گجرات کے موضع انحی سے معقولات و منقولات کی کچھ کتابیں مولوی غلام رسول سے پڑھیں۔ ریاضی اور معقولات کی انتہائی کتابیں علامہ برکات احمد ٹونکی (شاگرد رشید علامہ فضل حق خیرآبادی) سے پڑھیں۔ مولانا سلامت اللہ رام پوری کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ۱۳۲۵ھ میں مدرسہ عالیہ رامپور میں درجۂ تکمیل حاصل کیا۔[1]

تلاشِ حق کے لیے آپ حضرت قاضی محمود اعوان شریف (گجرات) کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے پہلے ظاہری علوم کی تلقین فرمائی۔ آپ برصغیر کے مختلف دینی مراکز سے استفادہ کرتے رہے آخر بریلی شریف کے مدرسہ منظر الاسلام میں اعلیٰ حضرت مجدد مائۃ حاضرہ مولانا احمد رضا خاں

---

[1] تذکرہ علماء و مشائخ سرحد از مولانا محمد امیر شاہ قادری ص ۳۳ و ج ۲

بریلوی رحمہ اللہ کے شاگرد بنے۔ یہاں آپ نے قاضی مبارک، صدرہ، شمس بازغہ، توضیح تلویح اور صحاح ستہ کا مطالعہ کیا اور مولانا ظہور الحسن فاروقی رام پوری سے اسباقِ حدیث پڑھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی دار العلوم میں مدرس مقرر ہُوئے اور ساتھ ہی محلہ جسولی بریلی میں خطیب مقرر ہُوئے۔ آپ کو سندِ علوم اور دستارِ فضیلت ۱۳۳۰ھ کو بعمر ۲۲ سال ملی۔ اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت کے ہاتھ پر بیعت ہُوئے اور خلافت حاصل کی۔[1]

بریلی سے واپسی پر حضرت خواجہ محمود تونسوی کے مدرسہ میں آئے اور کچھ عرصہ تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔ پھر مکھڈ شریف پڑھاتے رہے۔ ضلع ہزارہ کے رئیس شہیلیہ محمد امیر خاں نے آپ کو اپنی ریاست کا قاضی مقرر کیا۔ آپ دار العلوم نعمانیہ لاہور کے منتظمین کی درخواست پر لاہور آئے اور مفتی دار العلوم مقرر ہُوئے۔

آپ کی اولاد میں چار لڑکے (مولانا محمد مظفر اقبال صاحب، محمد اشرف مدرس، غلام صابر، غلام مصطفیٰ) اور ایک لڑکی تھی۔

تصانیف میں سے فتاویٰ غلامیہ (دو جلد)، نور العین فی سفر الحرمین، سیف رحمانی علی راس قادیانی، دیوان غلامیہ، نغمۂ شہادت، القول المحتاط، رسالہ اذان علی القبر علمی یادگار ہیں۔ یہ کتابیں خطی بقلم مصنف آپ کے صاحبزادہ علامہ محمد مظفر اقبال صاحب کے پاس موجود ہیں۔

۱۳۴۵ھ میں آپ حج بیت اللہ سے مشرف ہُوئے، روضۂ اطہر کی زیارت سے فیضیاب ہُوئے۔ واپسی پر دینی خدمات میں مشغول ہو گئے۔ بڑے راسخ العقیدہ سُنّی تھے۔ گستاخانِ رسول کے دشمن اور شاتمانِ رسول سے سخت نفرت کا اظہار کرتے۔ بڑے پاکیزہ سیرت، صاف گو اور باعمل بزرگ تھے۔ دن کو تدریس اور رات کو ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ آپ ان علماء اہل سنت میں سے تھے جنہوں نے آل انڈیا سُنّی کانفرنس (بنارس) میں قرار داد پاکستان پاس کی اور قیامِ پاکستان کے بعد جمعیت العلماء پاکستان کے مشیر رہے۔

---

[1] تذکرہ علماء و مشائخ سرحد ص ۲۴۰

۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۹ھ / یکم اگست ۱۹۵۹ء بروز ہفتہ درود و سلام ادا کرتے ہوئے واصل بحق ہوئے۔ نماز جنازہ فاضل اجل استاذ العلماء علامہ ابوالبرکات سید احمد شاہ قادری نے پڑھائی اور غازی علم الدین شہید کے مزار کے ساتھ قبرستان میانی لاہور میں اپنے بھائی عزیز الرحمٰن کے مزار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ

آزادیِ کشمیر اور تحریکِ ختمِ نبوت کا مرکزی کردار

سید دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اکبر مولانا ابوالحسنات ۱۸۹۶ء میں ریاست الور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤاجداد مشہد کے سادات تھے جہاں سے مغلیہ دورِ حکومت میں بہ سلسلۂ تبلیغ اسلام ہندوستان آئے۔ اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو ہندوستان تشریف لائے وہ سید اسمٰعیل شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ بڑے ہی باکرامت صاحبِ علم اور پابندِ سنّت تھے۔ آپ بلگرام، فرخ آباد سے ہوتے ہوئے الور میں قیام پذیر ہوئے۔ انہی کے پرپوتے سید نثار علی شاہ اپنے زمانے کے مشہور عالم دین اور صاحبِ عرفان بزرگ گزرے ہیں۔

تعلیم و تعلّم مولانا ابوالحسنات کی عمر ابھی پانچ سال کی ہی تھی کہ آپ کو مفتی زین الدین مرحوم کے درس میں داخل کرا دیا گیا جہاں حافظ عبدالحکیم، حافظ عبدالغفور سے حفظِ قرآن کرتے رہے۔ حفظِ قرآن کے ساتھ ساتھ مرزا احمد بیگ مرحوم سے اُردو و فارسی کی کتب مروّجہ کا مطالعہ کرتے رہے۔ فنِ تجوید پر قاری قادر بخش صاحب مرحوم الوری کے اسباق بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہی قاری صاحب کی نگرانی میں مولانا نے قرأت و تجوید میں مہارت حاصل کرلی۔

۱۹۰۸ء میں آپ حفظِ قرآن، اردو و فارسی، انشاء پردازی اور قرأت و تجوید میں خاصی دسترس حاصل کر چکے تو درس نظامیہ کے باقاعدہ طالب علم بنے۔ صرف نحو اور دیگر فنی کتب دینیہ کا مطالعہ اپنے والدِ مکرم سے کیا۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ کی سائنسی ایجادات نے دنیا کو متاثر کیا۔ ہندوستان میں انگریزی حکمرانوں نے یورپ

کی ایجادات سے ہندوستانیوں کو واقف کرنے کے لیے بڑے بڑے ادارے قائم کیے۔ نواب محمد یار خاں صاحب مرحوم مولانا سیّد دیدار علی شاہؒ کے مخلصین میں سے تھے اور ان ایجادات میں خاصی دل چسپی لیتے۔ چنانچہ مولانا ابوالحسناتؒ ایسے ذہین دینی طالب علم نے آپ کی نگرانی میں وقت کی ایجادات میں واقفیت حاصل کرنے میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

اساتذہ

آپ کے والدِ محترم آپ کو جتنی تیزی سے عالم دین دیکھنا چاہتے تھے، اس کا اندازہ ہم اس بات سے لگاتے ہیں کہ مولانا ابوالحسناتؒ نے پندرہ سال کی عمر میں جلالین، تفسیر بیضاوی، کتبِ احادیث، منطق و اصول، فقہ اور ادب عربی میں سبعہ معلقہ تک کی کتب پر عبور حاصل کر لیا۔

فتہی کتب کا مطالعہ حضرت مولانا حافظ محمد نعیم الدین مراد آبادیؒ اور حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلویؒ سے کیا اور اسنادِ فضیلت حاصل کیں۔ علم طب آپ نے نواب حامی الدین احمد خاں صاحب مراد آبادیؒ سے سیکھا اور تکمیلِ قرأت کے لیے رئیس القراء مولانا عین القضاۃؒ سے سند حاصل کی۔

مولانا ابوالحسنات ایک متجس سکالر کی طرح حصولِ تعلیم و تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں ابتدائے عمر میں شہر شہر، قریہ بقریہ اور مکتب بہ مکتب گئے۔ ہر صاحبِ علم کے پاس پہنچے، زانوئے ادب تہ کیا اور دامنِ مراد بھرا۔ طالب علمی کے زمانہ کی ایک ذاتی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بمبئی، اجے پور، آبو، بھیلیرہ، مادھو پور، گنگاپور، بھرت پور، دہلی، آگرہ، متھرا، تجارہ، گوبند پور، کشن گڑھ، اجمیر، نصیر پور، لاہور، ملتان، پشاور، اٹاوہ، قائم گنج، بھن پوری، کونڈلہ، بریلی، رام پور، بدایوں، ریواڑی اور پنیلی بھیت، غرضیکہ برِصغیر کے ہر قصبہ ہر شہر میں علم کی خوشہ چینی کیلئے قیام کیا۔

۵

تمتع ز ہر گوشہ یافتم
ز ہر خرمنے خوشہ یافتم

مسجد ترپولیہ کی شہادت آپ علوم دینیہ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ الور کی مسجد ترپولیہ ہندوؤں نے شہید کر دی۔ اس واقعہ نے مسلمانانِ الور میں رنج و اضطراب کی لہر دوڑا دی۔ جواں سال ابوالحسنات کو مسجد کی ناموس نے پکارا اور ملکی سیاست میں کود پڑے۔ مسجد کی تعمیرِ نو اور بحالی کے لیے جدوجہد کرنے لگے اور زورِ خطابت سے مسلمانوں کے سینوں میں آگ لگا دی۔ سٹی پولیس نے آپ کو گرفتار کر لیا مگر مسلمانوں کی منظم جدوجہد نے مہاراجہ الور کو مجبور کر دیا کہ مسجد کو واگزار کرنے کا حکم دے اور پھر اسے سرکاری خرچ پر از سرِ نو تعمیر کرایا اور ابوالحسنات کو رہا کر دیا گیا۔

یاد رہے کہ اس زمانہ میں ریاستی عوام کی زندگیاں اور مال و دولت والیٔ ریاست کے رحم و کرم پر ہوا کرتی تھیں۔ ان کے کسی حکم یا فیصلہ کے خلاف احتجاج بھی جرم تصور ہوتا تھا۔ چنانچہ اس وقت کے راجاؤں کے ریاستی جور و استبداد کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو ریاستی رعایا کو تو عام انسانی حقوق بھی حاصل نہ تھے۔ ایسے دور میں احتجاج کر کے یا ایک منظم تحریک سے ایک مقصد حاصل کر لینا بڑی بات ہے۔

اولاد و اخلاف آپ ابھی سولہ سال کے ہی تھے کہ آپ کی شادی کر دی گئی۔ یہ شادی آپ کے خاندان کے ایک معزز فارسی مدرس حسین الدین مرحوم کی نواسی سے بمقام تجارہ میں ہوئی۔ آپ کے ہاں چار لڑکے تین لڑکیاں ہوئیں۔ ان میں سے حضرت مولینا امین الحسنات سید خلیل احمد صاحب قادری خطیب مسجد وزیر خاں لاہور آپ کی علمی اور عملی زندگی کی "قابلِ قدر یادگار" ہیں۔ آپ محکمہ اوقاف کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ مشیر معاملات مساجد وزارت رہے زونل خطیب رہے اور اپنے عہدے پر خوش اسلوبی سے کام کرتے رہے۔ آپ بڑے سلجھے انداز میں گفتگو فرماتے ہیں اور بڑے دردمند نوجوان ہیں تحریک ختم نبوت میں جب آپ کو لاہور کے قلعے میں تشدد کی روایات سے دوچار ہونا پڑا تو آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ آپ کو موت کے خوف سے ڈرایا گیا، تختہ دار پر لایا گیا مگر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ثابت قدم رہے۔

تصانیف مولانا ابوالحسنات قلمی تبلیغ کو منظم پیمانے پر رواج دینے کی خواہش

رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسلامی موضوعات پر مختلف کتابیں لکھیں تاکہ ملک کے گوشے گوشے سے اہل علم استفادہ کرسکیں۔ آپ کی تصانیف جو آج تک شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ تفسیر الحسنات (پہلے دو حصّے ۱۰ پارے) ۲۔ اوراق غم

۳۔ صبح نور ۴۔ انا نے

۵۔ طیب الوردہ علی قصیدۃ البردہ (تازہ ایڈیشن مکتبہ نعمانیہ سیالکوٹ نے طبع کرایا ہے)

۶۔ مسدس حافظ الوری ۷۔ مخمس حافظ

۸۔ دیوان حافظ اردو ۹۔ ترجمہ کشف المحجوب (مکتبۃ المعارف لاہور نے طبع کرایا)

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ آپ کے قلم سے متعدد رسالے تصنیف ہوئے جو ہنگامی اور سیاسی تحریکوں پر بڑے کام کے تھے[1]

لاہور میں آمد

۱۹۲۰ء میں آپ الور کو چھوڑ کر آگرہ میں قیام پذیر ہوئے اور ایک مطب جاری کیا۔ مطب گلاب خانہ آگرہ میں تھا جو تھوڑے عرصہ میں خدمت خلق کا ادارہ بن گیا۔ ۱۹۲۲ء میں آپ کے والد سید دیدار علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ آگرہ سے لاہور پہنچے اور مسجد وزیر خاں کے خطیب مقرر ہوئے تو مولانا ابو الحسنات ان دنوں ایک نغز گو قاری، شعلہ بیان خطیب، شاعر اور ماہر طبیب کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ والد مکرم کے استعفاء کے بعد مرزا ظفر علی خاں ریٹائرڈ جج متولی مسجد وزیر خاں کے اصرار پر آپ مسجد وزیر خاں کے خطیب اور مفتی مقرر ہوئے۔

---

[1] احکام الصیام۔ فلسفہ تکبیر و نماز۔ الندا بغیر اللہ۔ معراج المبارکہ۔ لیلۃ البرائۃ استغفار۔ فضائل رمضان۔ عید الفطر۔ اکرام الحق کی کھلی چٹھی کا جواب۔ مرزائیت پر تبصرہ۔ قادیانی مرزاجی کی کہانی۔ فتنہ قادیانی۔ قادیانی کے احکام ہریانی۔ تنویر العینین براس کرشن۔ شمیم رسالت۔ علم غیب لسان۔ قادیانی مذہب کا فوٹو۔ مدنی تاجدار۔ گنجینہ ایمان۔ اسلامی زکوٰۃ۔ اسلام اور پردہ۔ علماء قدسی۔ میلاد مبارک۔ خاکسار کا مذہب اور اسلام۔ مشرقی کا غلط مذہب۔ مشرقی کی انوکھی منطق۔ صادق الفجر۔ منظہر الاسرار۔ بلوغ المرام۔ بزم احیا۔ فرشتہ رحمت۔ آپ بیتی۔ بستان شریعت۔

ان دنوں آپ اپنے خاندان سمیت لنڈے بازار کے ایک مکان میں قیام پذیر ہوئے کچھ عرصہ کے بعد آپ وہاں سے اندرون یکی گیٹ ایک اچھے سے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اسی زمانہ میں دہلی دروازے کے اندر چنگڑ محلہ میں ایک ویران مسجد کی تعمیر و توسیع کا منصوبہ بنایا گیا جس میں آپ کے والد اور برادر محترم علامہ ابوالبرکات[1] دامت برکاتہ، سے مل کر مسجد کی

---

[1] استاذ العلماء اہلسنت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری دامت برکاتہم العالیہ مرکزی انجمن حزب الاحناف پاکستان لاہور کے صدر اور دارالعلوم حزب الاحناف کے شیخ التفسیر والحدیث ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں ریاست الور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ حضرت سید محمد دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ کے نامور فرزند ارجمند ہیں اور سادات الور کی علمی اور دینی وراثت کے امین ہیں۔ بچپن میں ہی اپنے والد مکرم کے دینی دارالعلوم قوت الاسلام کے فاضل اساتذہ کے اسباق کی سماعت سے مستفیض ہوتے۔ اس مدرسہ میں مولانا عبدالکریمؒ، مولانا ظہوراللہؒ اور حضرت مولانا پُردل خانؒ صدر مدرس جامعہ نعمانیہ دہلی پڑھاتے تھے۔ سید موصوف نے ابتدائی کتابیں مولوی عبدالکریمؒ اور حضرت مولانا ظہوراللہؒ (جو آپ کے بہنوئی بھی تھے) سے پڑھیں اور دوسری کتابیں مولانا ارشد علی الوریؒ، مفتی زین الدینؒ اور صوفی عبدالقیومؒ سے پڑھیں۔ پھر صدرالافاضل حضرت مولانا سید محمد نعیم الدینؒ مراد آبادی کے مدرسہ اہلسنت وجماعت مراد آباد میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۰ء تک شمس البازغہ، میبذی صدرہ اور افق المبین پڑھیں۔ مولانا فضل احمد سے شرح عقاید پڑھی اور پھر فقہ تکمیل الفقہ اور دورۂ حدیث کے لیے اپنے والد مکرم کے مدرسہ آگرہ (جو ان دنوں مفتی آگرہ تھے) میں داخل ہوئے اور سندِ تکمیل علوم دینیہ حاصل کی۔

ان دنوں آگرہ علماء دین اور علماء سیاست کا مرکز تھا۔ تحریکِ خلافت زوروں پر تھی۔ ندوہ کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا عبدالماجد بدایونیؒ (مولانا عبدالحامد بدایونی کے بھائی)، مولانا فاخر الٰہ آبادی خلافت کے پلیٹ فارم پر کانگریس کے حق میں تقاریر کرتے مگر مولانا دیدار علیؒ مفتی آگرہ اور سید موصوف ان لوگوں کی مخالفت میں جلسے کرتے جس سے مولانا دیدار علی شاہ کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

(باقی برصفحۂ آیندہ)

تعمیر اور دارالعلوم حزب الاحناف کی تشکیل میں حصہ لیا۔ یہ سنّیوں کا ایک عظیم دینی ادارہ تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

لاہور کی دینی سیاست نے حضرت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے جلسوں میں تقاریر کرنے کی دعوت دی۔ حضرت صاحب نے پنجاب کے دل میں تقاریر کر کے ذہنوں کو ایک نیا ذوق دیا چنانچہ یہاں کے عوام کے اصرار پر آپ آگرہ چھوڑ کر لاہور تشریف لے آئے اور سید موصوف آگرہ کی جامع مسجد کے خطیب ہو گئے۔ اپنے والد گرامی اور استاد مکرم کے ساتھ سید موصوف بریلی شریف حاضر ہوئے۔ امام اہلسنت اعلیٰحضرت احمد رضا خاں بریلوی کی صحبت میں رہے۔ آپ ان دنوں اعلیٰ حضرت کے مدرسہ میں فتویٰ نویسی پر مامور تھے۔ مختلف استفتاء آتے۔ دوسرے علماء سمیت آپ جواب فتویٰ لکھتے اور اعلیٰ حضرت نظر ثانی فرما کر منظور کرتے اور اس طرح سؤل علیہ کو بھیج دیئے جاتے۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے دستِ خاص سے سندِ استفادہ لکھ کر دی۔ ان دنوں اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ رضویہ کی جلد اوّل حسنی پریس بریلی میں طبع ہونی شروع ہوئی تو سید موصوف نگران مقرر ہوئے۔ پھر اہل سنت وجماعت پریس پٹنہ میں باقاعدہ فتاویٰ رضویہ چھپنا شروع ہوا۔ بہار شریعت کے پہلے حصے ابو العلائی پریس آگرہ میں آپ نے ہی طبع کرائے سنیوں کے تاریخی رسالہ سواد اعظم مراد آباد کا پہلا شمارہ آپ کی ادارت میں شائع ہوا۔

لاہور میں والد مکرم نے جامع مسجد داتا گنج بخش رح کی خطابت کے لیے طلب کیا۔ آپ غالباً ۱۹۲۳ء میں لاہور پہنچے۔ داتا گنج بخش رح کی جامع مسجد ان دنوں زیر تعمیر تھی۔ غلام ، ! مرحوم موجودہ عمارت بنوا رہے تھے۔ محرم علی چشتی، سید محمد امین اندرابی اور خلیفہ مولوی تاج الدین کے مشورہ سے آپ کو مسجد وزیر خاں میں تدریس علوم دینیہ پر مامور کر دیا گیا۔ مسجد وزیر خاں میں ان دنوں حضرت مولانا دیدار علی خطابت فرماتے۔ سید صاحب کی محنت کی شہرت نے سارے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ طلباء جوق در جوق لاہور پہنچنے لگے اور مسجد وزیر خاں کے وسیع صحن میں دینی علوم حاصل کرنے والوں کے جمگھٹے لگ گئے۔ مرزا ظفر علی جج ان دنوں مسجد وزیر خاں کے متولی تھے انہیں طالب علموں کے اجتماع سے اختلاف تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا دیدار علی شاہ نے مسجد وزیر خاں سے استعفیٰ دے دیا۔ اسی اثناء میں لاہور کے سنی زعماء

(باقی بر صفحہ آئندہ)

جو نصف صدی تک سُنّیوں کے علوم و فنون کا مرکز رہا۔ یہاں سے بڑے بڑے علماء،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

نے ایک دار العلوم کی ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ چنانچہ قاضی حبیب اللہ، مولوی محمد دین، حاجی شمس الدین (جسے زمیندار علامہ ٹوٹوی اور علامہ بھوسوی کے القابات سے یاد کرتا تھا) اور مولینا محرم علی چشتی نے انجمن حزب الاحناف ہند کی بنیاد رکھی اور ۱۵ مارچ ۱۹۲۶ء کو باقاعدگی سے تعلیم و تدریس کا آغاز ہو گیا۔ ان دنوں اس دار العلوم میں مولانا مہر الدین، قاضی سراج احمد جیسے نامور شاگرد زیر تعلیم تھے۔ اسی سال سے سید صاحب نے لوکوشاپ کے سامنے نماز جمعہ پڑھانے کا آغاز کیا (بحمد اللہ ۴۴ سال گزرنے کے باوجود آپ وہاں ہی نمازِ جمعہ ادا کر رہے ہیں) دار العلوم حزب الاحناف کا ابتدائی دور بڑا بے سرو سامانی کا دور تھا۔ مسجد وزیر خاں سے نکلے تو لنڈا بازار، وہاں سے اُٹھے تو بکی دروازہ، پھر دائی انگہ کی مسجد اور بعد ازاں مائی لاڈو کی مسجد میں تدریس جاری ہوئی۔ آخر کار ۱۵ مارچ ۱۹۲۶ء کو دہلی دروازے کے اندر تین گنبدوں والی مسجد جو شیر شاہ سوری کے زمانہ کی تعمیر شدہ تھی، دار العلوم کے لیے منتخب کی گئی۔ مسجد کی صفائی ہوئی، مرمت ہوئی پیر جماعت علی شاہ علی پوری نے پانچ سو روپیہ مسجد کی صفائی پر خرچ کیا اور نو ماہ میں یہ سُنّی دار العلوم اپنی پوری تابانیوں سے جلوہ گر ہو گیا۔ ابتدائی اساتذہ میں سے حضرت مولانا دیدار علی شاہ کے علاوہ علامہ ابو البرکات، علامہ ابو الحسنات، مولانا عبد القیوم، مولانا عبد الحنان جیسے لوگ شریکِ درس تھے۔ سب سے پہلے جلسے میں پاک و ہند کے نامور سُنّی علماء کا اجتماع ہوا جن میں حضرت صدر الافاضل محمد نعیم الدین مراد آبادی، مولانا حامد رضا، مولانا عبد العزیز خاں، مولوی رحمت الٰہی، مولانا مشتاق احمد کانپوری، مولانا مصطفیٰ رضا، مولوی عبد المجید بانڈے والے، مولینا عبد الحمید بنارسی، صبغۃ اللہ شہید انصاری اور مولانا حشمت علی جیسے ناموران اہلسنت تشریف لائے۔ اس جلسے نے پنجاب بھر میں دار العلوم کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے اور آگے چل کر دار العلوم حزب الاحناف نے اتنے بڑے بڑے فاضلان روزگار پیدا کیے جو آسمانِ شہرت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ مولانا مہر الدین، قاضی سراج احمد۔ مولوی محمد علی۔ ابو النور مولوی محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مولانا حافظ مظہر الدین، مولانا

(باقی بر صفحہ آیندہ)

مفتی، مقرر، خطیب اور ادیب و مناظر نکلے اور دنیائے علم و فضل پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دار العلوم کے شاگرد موجودہ دینی درسگاہوں کے شیخ الحدیث اور شیخ الفقہ کہلا رہے ہیں۔

لاہور کی سیاسی فضا ۱۹۲۶ء سے لے کر قیامِ پاکستان تک لاہور سیاسی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ اہل لاہور نے سیاسی قیادت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

غلام دین، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا تازہ گل کابلی، مولانا نور اللہ بصیر پوری، مولانا عبد اللہ قصوری اور حافظ محمد عالم سیالکوٹی جیسے مایۂ ناز فرزندان اہلسنت تو قابل فخر ہیں۔

آپ حضرت علی حسین کچھوچھوی اشرفی سمنانی کے مرید ہیں۔ اسی نسبت سے اشرفی کہلائے۔ اپنے پیر و مرشد اور استاد مکرم مولانا نعیم الدین مراد آبادی کے ہمرکاب ۱۳۴۰ھ میں حج بیت اللہ کو گئے۔ بعد روحانیت کی دولت سے دامنِ مراد بھر کر لوٹے اور خدمتِ دین میں مستغرق ہو گئے۔ لاہور ان دنوں بداعتقادیوں کے طوفانوں کی زد میں تھا۔ وہابی، دیوبندی، نیچری، مرزائی اور رافضیوں کے علاوہ کئی قسم کے دوسرے فتنے اُٹھتے اور سنیت کے اس کوہِ الوند سے ٹکراتے۔ آپ نے مولوی اشرف علی تھانوی کو لاہور میں مناظرے کے لیے للکارا مگر وہ نہ آئے۔ مولوی احمد علی کا مقابلہ کیا۔ زمیندار کی خرافات کا جواب دیا۔ مشرقی کے غلط مذہب کا پوسٹ مارٹم کیا۔ مرزائیوں سے مناظرے کیے اور چکڑالویوں کو چاروں شانے چت گرایا۔ اس سلسلہ میں آپ کی مشہور ترین تحریریں مناظرہ تلون، دلیس المقلدین، فتح المبین، مناظرہ ترن تارن، ضیاء القنادیل، وہابیوں کی کہانی اور مشرقی کا غلط مذہب کی شکل میں سامنے آئیں۔ اس سلسلہ میں آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا مگر آپ نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس وقت کے علماء اہل سنت میں سے ۹۰ فیصدی علماء آپ کے شاگرد ہیں اور آپکی رائے سُنی مکتب فکر کے تمام علماء پر فائق ہوتی ہے۔ ان دنوں دار العلوم حزب الاحناف داتا گنج بخش کے مزار کے پاس گنج بخش روڈ پر ایک زیر تعمیر عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ آپ ۱۹۲۶ء سے لے کر آج تک طلباء علوم دینیہ کو قرآن و حدیث کی ضیاؤں سے منور فرما رہے ہیں۔

پر ہمیشہ اچھے اثرات مرتب کیے۔ یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں تھی جس تحریک کو اہل لاہور نے قبول کر لیا۔ وہ سارے ہندوستان پر چھا گئی۔ یہ سیاسی تحریکیں اور دینی مباحث انگریز کے پھیلائے ہوئے خیالات اور غلامی کے خلاف ایک احتجاج تھا حضرت مولانا ابوالحسنات ان ایام میں لاہور میں مقیم تھے۔ ہر سیاسی اور دینی تحریک کا جائزہ لیتے اور پھر ان میں اپنا کردار ادا کرتے۔ کشمیر چلو کی مہم، مسجد شہید گنج کی تحریک، خاکسار موومنٹ، احرار کشمکش، مجلس اتحاد، "شہادت علم الدین"، "مولانا ظفر علی خاں کا دم ست قلندر رو دھر رگڑا" اور پھر تحریک آزادی ہند اور قیام پاکستان جیسی تحریکیں ابھرتی رہیں اور مولانا ہمیشہ حق کی آواز پر لبیک کہتے۔ وہ بلا خوف تنقید اپنے خیالات کا اظہار کرتے پاکستان بننے کے بعد قرارداد مقاصد، تحریک آزادی کشمیر اور پھر تحریک ختم نبوت میں مولانا مرکزی کردار کی حیثیت سے آگے بڑھے۔ علماء و مشائخ کے علاوہ عوام الناس نے آپ سے پورا پورا تعاون کیا۔ نظریہ پاکستان کی تائید و حمایت میں لاہور کے وہ پہلے عالم دین ہیں جو بنارس سنی کانفرنس" میں شریک ہوئے اور ایک تاریخی ریزولیوشن پاس کروا کے قائد اعظم کو یقین دلایا کہ برصغیر کی عظیم سنی اکثریت مطالبہ پاکستان میں آپ کے ساتھ ہے۔ آپ نے قیام پاکستان کی حمایت میں بڑی تن دہی سے کام کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دیوبندی مکتب فکر کے علماء جمعیتہ علماء ہند اور کانگریس میں شمولیت کی وجہ سے گاندھی اور نہرو کی حمایت میں فتوے دیتے اور مسلمانوں کو اپنی علمی وجاہت سے مطالبہ پاکستان سے روکتے تھے۔ مولوی شبیر احمد عثمانی کے علاوہ اس دور کا دیو بندی طبقہ مسلمانوں کی اس فکری تحریک سے دور رہا بلکہ مسلمانوں کو دور کرتا رہا۔ مولانا ابوالحسنات اور دوسرے سنی علماء نے ان نام نہاد علماء کا مقابلہ کیا اور عوام پر ثابت کر دیا کہ نیشنلسٹ علماء مقام محمد سے کتنے بے خبر ہیں۔

حج بیت اللہ ۱۹۴۵ء میں آپ پہلی بار حج کو روانہ ہوئے۔ دیار حبیب میں عربی زبان میں تقاریر کیں۔ یہ تقاریر اتنی فصیح و بلیغ تھیں کہ دنیائے اسلام سے آئے ہوئے علماء نے آپ کی کوشش کو سراہا اور خراج تحسین پیش کیا۔ گنبد خضرا کے سامنے کھڑے ہو کر آپ کے دل پر کیفیت طاری ہو گئی۔ آپ قصیدہ بردہ پڑھتے اور بارگاہ رسالت

میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتے۔ واپسی پر انھوں نے قصیدہ بردہ کی اردو میں شرح کی جسے "طیب الوردہ علی قصیدۃ البردہ" کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب اہلِ دل کے لیے سرمایۂ جان وایمان تھی (حال ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوا ہے)۔

مسلم لیگ ایجی ٹیشن آپ نے تحریک قیام پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ علماء و مشائخ کے وفد مرتب کیے۔ پنجاب کے ہر شہر، ہر قصبہ کی طرف نکل پڑے۔ خضر وزارت کی ساری سختیوں کے باوجود اپنی مہم میں مصروف رہے۔ آخر کار گرفتار کر لیے گئے۔ اس ملک کی آزادی اور قیامِ پاکستان کے لیے آپ نے قید و بند کی صعوبتوں کو لبیک کہا۔ یہ آپ کی جدوجہد آزادی کا نتیجہ تھا کہ شیوخ کے لاکھوں مرید اور علماء کے ہزاروں شاگرد مطالبۂ پاکستان کے حامی بن گئے۔ مسلم لیگ نواب زادوں کے محلات سے نکل کر عوام تک جا پہنچی۔ قائدِ اعظم نے مولانا کی کوششوں کو بڑا سراہا اور ایک خط میں مولانا کا شکریہ ادا کیا۔

جمعیۃ العلماءِ ہند اور جمعیۃ العلماء اسلام ہندوستانی علماء کا ایک طبقہ مسلم لیگ کے نعرہ پاکستان کی اس لیے مخالفت کر رہا تھا کہ ان کے راہ نما کانگریس کے اراکین میں سے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اثر علماء دیوبند پر تھا۔ مولوی حسین احمد مدنی کانگریس کے زیر اثر تھے۔ دیوبند مکتبِ فکر کے سارے علماء اپنے ان اماموں کو دیکھ کر مسلم لیگ کے مطالبہ کے خلاف ہو گئے۔ مسلمان چونکہ فطرتاً مذہب پر جان دیتا ہے۔ اس نے علماء کے ایک طبقے کو پاکستان کے خلاف پا کر بڑا ذہنی اضطراب محسوس کیا۔ چنانچہ ان دیوبندی علمائے نے "جمعیۃ العلماء ہند" کے نام سے ایک سیاسی جماعت کو تشکیل دیا اور دو قومی نظریہ کے خلاف محاذ آرائی کرنے لگے۔ اسی جمعیۃ میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو عقیدۃً دیوبندی نہ تھے اور پاکستان کے حامی تھے۔ انھوں نے جمعیۃ العلماء ہند کے خلاف آواز اٹھائی اور جمعیۃ العلماء ہند کے کانگریسی علمائے سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک اور جمعیۃ کی تشکیل کا فیصلہ کیا، چنانچہ نظریہ پاکستان کے حامی دیوبندی اور سُنّی علماء "جمعیۃ العلماء اسلام" کے نام سے ایک نئی سیاسی اور دینی جماعت کے پلیٹ فارم

میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتے۔ واپسی پر انھوں نے قصیدہ بردہ کی اردو میں شرح کی جسے "طیب الوردہ علی قصیدۃ البردہ" کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب اہلِ دل کے لیے سرمایۂ جان وایمان تھی (حال ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوا ہے)۔

مسلم لیگ ایجی ٹیشن آپ نے تحریک قیام پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ علماء و مشائخ کے وفد مرتب کیے۔ پنجاب کے ہر شہر، ہر قصبہ کی طرف نکل پڑے۔ خضر وزارت کی ساری سختیوں کے باوجود اپنی مہم میں مصروف رہے۔ آخر کار گرفتار کر لیے گئے۔ اس ملک کی آزادی اور قیامِ پاکستان کے لیے آپ نے قید و بند کی صعوبتوں کو لبیک کہا۔ یہ آپ کی جدوجہد آزادی کا نتیجہ تھا کہ شیوخ کے لاکھوں مرید اور علماء کے ہزاروں شاگرد مطالبۂ پاکستان کے حامی بن گئے۔ مسلم لیگ نواب زادوں کے محلات سے نکل کر عوام تک جا پہنچی۔ قائدِ اعظمؒ نے مولانا کی کوششوں کو بڑا سراہا اور ایک خط میں مولانا کا شکریہ ادا کیا۔

جمعیۃ العلماءِ ہند اور جمعیۃ العلماء اسلام ہندوستانی علماء کا ایک طبقہ مسلم لیگ کے نعرہ پاکستان کی اس لیے مخالفت کر رہا تھا کہ ان کے راہ نما کانگریس کے اراکین میں سے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اثر علماء دیوبند پر تھا۔ مولوی حسین احمد مدنی کانگریس کے زیر اثر تھے۔ دیوبند مکتب فکر کے سارے علماء اپنے ان اماموں کو دیکھ کر مسلم لیگ کے مطالبہ کے خلاف ہو گئے مسلمان چونکہ فطرتاً مذہب پر جان دیتا ہے۔ اس نے علماء کے ایک طبقے کو پاکستان کے خلاف پاکر بڑا ذہنی اضطراب محسوس کیا۔ چنانچہ ان دیو بندی علماء نے "جمعیۃ العلماء ہند" کے نام سے ایک سیاسی جماعت کو تشکیل دیا اور دو قومی نظریہ کے خلاف محاذ آرائی کرنے لگے۔ اسی جمعیۃ میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو عقیدۃً دیو بندی نہ تھے اور پاکستان کے حامی تھے۔ انہوں نے جمعیۃ العلماء ہند کے خلاف آواز اٹھائی اور جمعیۃ العلماء ہند کے کانگریسی علماء سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک اور جمعیۃ کی تشکیل کا فیصلہ کیا، چنانچہ نظریہ پاکستان کے حامی دیوبندی اور سُنی علماء "جمعیۃ العلماء اسلام" کے نام سے ایک نئی سیاسی اور دینی جماعت کے پلیٹ فارم

پر جمع ہو گئے۔ نظریاتی بنیادوں سے ہٹ کر صرف سیاسی اور پاکستان کے استحکام کیلئے کام کیا جائے۔ چنانچہ جمعیۃ العلماءِ اسلام نے ان لوگوں کو سنبھالا دیا جو علماء دیوبند کے سیاسی کردار سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس جماعت میں علماء اہل سنت کے علمائے دیوبند بھی شریک ہو گئے۔ یہ علماء دیوبند دو قومی نظریہ کے حامی تھے۔ مولوی حسین احمد مدنی، مولوی ابوالکلام آزاد اور مولوی سعید الرحمان اور میاں محمد صاحبان کے احترام کے باوجود مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احتشام الحق تھانوی جیسے بااثر علماء دیوبند جمعیۃ علماء اسلام کے ستون بن گئے اور نظریۂ پاکستان کی تائید کرنے لگے۔ یہ جماعت کچھ عرصہ تک محض ابتدائی مراحل سے گزرتی رہی مگر ۱۹۴۶ء میں اس تحریک نے ہر قصبہ اور ضلع میں شاخیں قائم کر لیں۔

جمعیۃ العلماء اسلام اور جمعیۃ العلماء پاکستان تحریک پاکستان کو علمی اور دینی رنگ دینے کے لیے۔

ملک کے علماء کرام نے جمعیۃ العلماء اسلام کی تشکیل کی تو مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے ہم فکر علمائے سے بددل ہو کر تحریک پاکستان کے زبردست مبلغ بن گئے۔ علماء نے انہیں صدر چن لیا چونکہ اس جمعیۃ میں دیوبندی علماء کی اکثریت تھی جن میں بیشتر حضرات جمعیۃ العلماء ہند اور کانگریس کے نظریات سے بڑے قریب تھے۔ اس لیے وہ علماء اہل سنت کو صحیح معنوں میں کام نہ کرنے دیتے۔ بعض حضرات نے تو یہاں تک تجویز پیش کی کہ جمعیۃ العلماء اسلام کی دو شاخیں بنا دی جائیں۔ ایک میں سُنّی اور دوسری میں دیوبندی جمع ہو کر کام کریں۔ ایک شاخ کی صدارت مولانا ابوالحسنات کے سپرد کر دی جائے۔ اس طرح دیوبندیوں کا کھویا ہوا وقار بحال ہونا شروع ہو گیا۔ چنانچہ قیام پاکستان کے چند ہفتے پیشتر جمعیۃ العلماء اسلام کی ایک عظیم الشان کانفرنس اسلامیہ کالج لاہور کی گراؤنڈ میں ہوئی جس میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے پاکستان کے حق میں زبردست تقریر کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت مولانا ابوالحسنات نے کرنا تھی مگر اہل سنت کے اکابرین نے جن میں حزب الاحناف کے سرکردہ عناصر پیش پیش تھے آپ کو روک دیا اور ان علمائے سے مفاہمت اور تعاون سے منع کر دیا جو ابھی تک پاکستان کے خلاف زہر چکانی کر رہے تھے۔ جمعیۃ العلماء اسلام سُنّی علماء کا تعاون حاصل کرنے میں

ناکام رہی ۔ چنانچہ اس جمعیتہ کی نظامت کچھ عرصہ کے لیے چودھری عبدالکریم لعل خاں صاحب اور علامہ علاء الدین صدیقی کے سپرد کر دی گئی ۔ اسی دوران عثمانی صاحب تو دستور ساز اسمبلی میں چلے گئے اور جمعیتہ العلماء اسلام علمی و سیاسی قوت بننے کی بجائے دیوبندی علماء کا مجمع بن کر رہ گئی ۔

مولانا عثمانی کے بعد جمعیتہ العلماء اسلام کا ایک اجلاس فیض باغ میں ہوا ۔ لاہور کے مولوی مطیع الحق کی یہ کوشش تھی کہ علماء دیوبند پر خلافِ پاکستان جو الزام ہے اس سے کس طرح نجات حاصل کی جائے ۔ اس اجلاس میں متفقہ طور پر مولانا ابوالحسنات کو صدر جمعیتہ چن لیا گیا اور اس طرح سنیوں کا اعتماد حاصل کرنے کی ایک اور کوشش کی گئی مگر چند روز گزرنے کے بعد دیوبندی عقیدے کے انتہا پسند علمائے ایک سنی عالمِ دین کی صدارت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ وہ صدر کے تعاون سے دست کش ہو گئے ۔ بایں ہمہ مولانا ابوالحسنات اس بے روح ڈھانچے میں تازہ زندگی پہنچانے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکام ہو گئے چنانچہ مستعفی ہو کر جمعیتہ کو ان لوگوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا جو اسے اپنے مقاصد کے لیے چلانا چاہتے تھے ۔

۴ ۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو مولانا سید احمد سعید کاظمی ناظم انوار العلوم ملتان (شیخ الحدیث جامعہ پنجاب بہاول پور) نے مولانا ابوالحسنات کو ایک مفصل خط لکھا اور اہل سنت و جماعت کی بے نظم زندگی پر بڑا دردمندانہ اظہار خیال کیا اور حضرت کو آمادہ کیا کہ ہم مل کر کام کریں ۔ اس خط میں سے مندرجہ ذیل اقتباس مولانا کاظمی صاحب کے دَور کی مُنہ بولتی تصویر ہے :

" اب اگر ہم عزت و وقار کے ساتھ قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور صحیح مذہب و مسلک کی بقا کے خواہشمند ہیں تو ہمیں فی الفور ایک مرکز پر جمع ہو کر مستحکم تنظیم کرنا پڑے گی "

اس خط کے بعد ۲۶ ، ۲۷ ، ۲۸ ، مارچ ۱۹۴۸ء کو ملتان میں پاکستان بھر کے سنی علماء کی عظیم کانفرنس بُلائی گئی ۔ اس کانفرنس میں ملک بھر کے سنی علمائے جمعیتہ العلماء پاکستان کی بنیاد رکھی اور مولینا ابوالحسنات کو پہلا صدر منتخب کیا گیا ۔

جمعیۃ المشائخ۔ مولانا نے جمعیۃ کی صدارت سنبھالتے ہی تمام ملک کا زبردست دورہ کیا ہر ضلع میں ناظم مقرر کیے گئے۔ ہر قصبہ میں شاخیں قائم کیں اور سُنیوں کی تنظیم کا کام شروع ہُوا۔ مجلس عاملہ نے محسوس کیا کہ جب تک مشائخ کی امداد اور تعاون حاصل نہ ہوگا اس وقت تک کام صحیح خطوں پر نہیں ہو سکے گا، چنانچہ جمعیۃ المشائخ کی تشکیل کی گئی۔ ۷ر مئی ۱۹۴۸ء کو ملک کے مقتدر مشائخ اور سجادہ نشینان پاکستان کا ایک اجتماع لاہور میں بُلایا گیا۔ اس اجتماع میں نہ صرف مشائخ نے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی بلکہ "یوم شریعت" منا کر حکومت پاکستان کو ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ پر زور دیا گیا اور ساتھ ہی علماء و مشائخ کو یکجا ہو کر کام کرنے کا اعلان کیا۔ حضرت مولانا ابو الحسنات تاحین حیات جمعیۃ العلماء کے صدر رہے۔ اسی دوران آپ نے تحریک آزادی کشمیر میں بڑا کام کیا اور آپ نے اس سلسلہ میں علماء و مشائخ کی مدد سے نظریہ پاکستان اور جہاد کشمیر کے لیے عوام کو جمع کیا۔

اہل سنّت کی بدقسمتی ہے کہ جمعیۃ العلماء بھی چند روز کام کرنے کے بعد سُنّی اکابر کی بے حسی کا شکار ہوتی گئی اور وہ ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔

مولانا کاظمی کی دردمندانہ اپیل نے پاکستان کے سُنّی علماء کو ایک جگہ جمع کیا تھا۔ جمعیۃ العلماء کی یہ ناکامی کن عناصر اور کن حالات کا نتیجہ تھی، یہ ایک علیحدہ موضوع ہے جسے وہ قلم ضرور تحریر میں لائے گا جو جمعیۃ العلماء پاکستان کی تاریخ مرتب کرے گا مگر ایک حقیقت ہمارے سامنے نہایت قابل افسوس ہے کہ جمعیۃ العلماء پاکستان کی اس بدنظمی اور بے عملی سے علماء اہل سنّت کی سیاسی اور دینی گرفت عوام کے ذہن و قلب پر سُست پڑ گئی اور سُنّی عوام مایوسی کا شکار ہو کر ان عناصر سے ملنے لگے جو سنیت کو دیگر عقاید سے ملوث کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے کچھ بد دل ہو کر اعتقادی زندگی کو محض "اختلافی مسئلہ" کہہ کر منقار زیر پر ہو گئے۔ بعض سیاسی مصلحتوں کی بناء پر مہر بہ لب ہو گئے۔ بعض معاشی ناہمواریوں سے بڑی بڑی ملازمتوں کی نذر ہو گئے اور جو لوگ باقی رہ گئے وہ "مرکزیت" اور "صوبائیت" کے چکر میں اُلجھ گئے ہیں۔

منزل راہرواں دور بھی ہے دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے
اٹھو کہ خیبرِ سے ہے یہ معرکۂ دین وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرارؓ بھی ہے

(اقبالؒ)

مولانا ابوالحسنات کی وفات کے بعد جمعیۃ العلماء مغربی پاکستان کی صدارت صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ صاحب کے حوالہ ہوئی۔ آپ سنیوں کے مایہ ناز خطیب، بلند ہمت سیاسی راہ نما اور بڑے دانشمند عالم دین ہیں۔ آپ کی زندگی احراری علماء کے تعاون سے انگریز اور مرزائیت کے خلاف گزری مگر صدر جمعیت العلماء بننے کے بعد آپ صدر ایوب کی حکومت کے دوران حکومت وقت کے بڑے معتمد سمجھے جانے لگے۔ ان کے اس تعاون اور اعتماد کے طریقِ کار کو پہلے تو علمائے اہل سنت نے گوارا کر لیا مگر جب صدر ایوب کی حکومت نے عائلی قوانین جیسے احکامات نافذ کر کے عوام کے دینی جذبات کو ٹھیس پہنچانا شروع کی تو صاحبزادہ صاحب ایک خاموش معاون کی حیثیت سے علماء کی صدارت فرماتے رہے۔ آپ کا یہ کردار ملک کے اکثر علماء کی رائے میں نہ صرف قابل اعتراض تھا بلکہ دینی تقاضوں سے دیدہ و دانستہ اغماض سمجھا جانے لگا۔ گو صاحبزادہ صاحب کی بعض سیاسی اور معاشرتی مجبوریاں آپ کو جرأت مندانہ اقدام سے باز رکھ رہی تھیں۔ مگر علمائے کرام کو یہی غلط فہمی ہوئی کہ صدر کی خاموشی سنیت کی تباہی کا باعث ہے چنانچہ ملک کے جید علماء کا ایک حصہ آپ سے کھلے بندوں سخت پالیسی کا مطالبہ کرنے لگا۔ مگر جب کچھ اثر نہ ہوا تو علمائے اہل سنت کی اکثریت نے جس میں مفتی محمد حسین صاحب نعیمی، صاحبزادہ سید محمود شاہ گجراتی، قاضی عبدالنبی صاحب کوکب، مولانا عبدالغفور ہزاروی اور مولانا عبدالقیوم ہزاروی پیش پیش تھے۔ ۱۹۶۸ء میں ایک متوازی جمعیت قائم کر لی۔ علماء اہل سنت وجماعت کے اس سیاسی اور دینی انتشار نے ابوالحسنات کی جمعیۃ العلماء پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اب ملک کی سب سے بڑی اکثریت بہت بڑی بدنظمی کا

شکار ہو کر عبرت سرائے دہر بن کر رہ گئی ہے۔ ع

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

تحریک آزادیٔ کشمیر قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کشمیری مسلمانوں پر ظلم و ستم کے خونچکاں واقعات نے پاکستان کے مسلمانوں کے دلوں کو زخمی کر دیا۔ یہ سلسلۂ آزادیٔ وطن کے بعد اتنی شدت سے اُبھرا کہ آزادیٔ کشمیر کے بغیر پاکستان کی آزادی ادھوری نظر آنے لگی۔ کشمیر کے مہاراجہ نے بھارتی حکومت سے مل کر کشمیر کے چالیس لاکھ مسلمانوں کا سودا کر دیا اور ریاست کا الحاق ہندوستان سے کر دیا۔ الحاق عالمی ضابطۂ اخلاق اور انصاف کے منافی تھا اور کشمیر کی کثیر آبادی کی خواہشات کے بالکل برعکس تھا۔ کشمیر کا مسلمان اپنی آزادی کے لیے تڑپ رہا تھا پاکستان کی سیاسی اور دینی جماعتوں نے تحریک آزادی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مولانا ابوالحسنات نے صدر جمعیۃ العلماء کی حیثیت سے جہاد کشمیر کا اعلان کیا اور غازیان کشمیر کی اعانت کے لیے ملک میں ایک زبردست تحریک چلائی۔ عوام نے دل کھول کر کشمیر فنڈ جمع کرنے میں حصہ لیا اور غازیٔ کشمیر مولانا ابوالحسنات اپنے ہم مشرب علمائے دین کی جمعیت میں کئی بار محاذِ کشمیر پر گئے۔ مجاہدین کے حوصلے بڑھائے۔ میدانِ جنگ میں پہنچ کر فوجیوں کے کیمپ میں مجاہدانہ رُوح پھونکنے کے لیے تقریریں کیں اور سامانِ جنگ اور دیگر ضروریات جمع کر کے پہنچائیں۔ آپ نے تھوڑے ہی عرصہ میں ۲۱۰۵۱۸ روپے کی مختلف اشیاء محاذِ کشمیر پر پہنچائیں۔ ان میں گرم کپڑے، ادویات اور جیپ کاریں شامل تھیں۔ آزادیٔ کشمیر کے لڑنے والے مجاہدین سپہ سالاروں نے جمعیۃ العلماء کی خدمات کا جس طرح اعتراف کیا ہے اس کی ایک جھلک ان خطوط سے ملتی ہے جو مولانا ابوالحسنات کو موصول ہوئے ہم ان میں سے چند نقل کرتے ہیں:

کرنل خورشید شاہ صاحب

کمانڈنگ آفیسر سیکنڈ فاروقی بٹالین (پونچھ)

کیپٹن عطار اللہ صاحب

مجاہد فاروقی بٹالین۔ پونچھ

۲۴ ستمبر ۱۹۴۸ء

بحضور جناب قبلہ مولانا ابو الحسنات صدر جمعیۃ العلماء پاکستان مسجد وزیر خاں لاہور

آداب و تسلیمات!

نیازمندان کو بذریعہ اخبارات اور احباب کے خطوط سے پتہ چلا ہے کہ جناب مجاہدین محاذ پونچھ کشمیر خصوصاً فاروقی ٹائیگرز کے بارہ میں بہت زیادہ خیال فرما رہے ہیں ہم جناب کی اس غائبانہ شفقت کے معہ اپنے مجاہدین کے تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ جیسے نیک بزرگوں کا سایہ ہم پر ہمیشہ رکھے۔ ہماری التماس ہے کہ ہمارے بہادر ننگے بھوکے مجاہدوں کی جو انشاء اللہ بھوکے شیروں کی طرح کفار پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور توپوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ تشریف لا کر حوصلہ افزائی فرمائیں۔

(۲)

السلام علیکم! میں آزاد کشمیر گورنمنٹ محکمۂ دفاع کی طرف سے آپ کے تحائف و عطیات (جو تین جیپ کاروں، ٹریلرز اور مختلف قسم کے کپڑوں پر مشتمل ہے) کے لیے آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں گے اور جنگ آزادی جیتنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

۱۳۔ دسمبر ۱۹۴۸ء۔ تراڑکھل

کرنل حبیب الرحمٰن

چیف آف سٹاف آزاد فورسز

(۳)

مکرمی صدیقی صاحب

السلام علیکم۔ حاملین رقعہ ہذا علمائے کرام (بہ قیادت مولانا ابو الحسنات لاہور) کچھ سامان برائے مجاہدین لائے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ خود محاذ پر جا کر تقسیم کریں۔ پہلے ہم نے کچھ ملٹری پابندی کا ذکر کیا ہے مگر چونکہ یہ آپ خود تقسیم کرنے کا وعدہ عوام میں کر آئے ہیں۔ اس لیے اگر رضا صاحب سے ملٹری احکام کے ساتھ اجازت دلا دیں تو یہ اپنی جیپ پر سامان لے جائیں گے اور مجاہدین کو کچھ اسلامی وعظ و نصیحت بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے آپ انہیں سہولت پہنچائیں۔

سید احمد علی شاہ وزیر دفاع۔ آزاد کشمیر

(۴)

خورشید ہیڈ کوارٹرز لائن

۱۶۔ اپریل ۱۹۴۹ء

محترم بندہ

السلام علیکم! گزشتہ ماہ مجھے لاہور مدعو کیا گیا وہاں آپ اور دُوسرے رفقا نے جس خلوص اور اسلامی محبت کا ثبوت دیا اس کے لیے میں تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ مَن لا تشکر اناس لو یشکر اللہ ط

آپ کی ذات گرامی قدر سے واثق امید ہے کہ بسلسلہ استصواب رائے کشمیر آپ کی مساعیِ جمیلہ اس وقت تک جاری و ساری رہیں گی جب تک کشمیر اور اس کے ملحقات کا الحاق پاکستان سے ہو کر اسلام کا قرآنی نظام قائم نہ ہو جائے۔

دعا کا طالب

احمد علی شاہ

(وزیرِ دفاع آزاد کشمیر گورنمنٹ)

ان خطوط کی روشنی میں ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا ابوالحسنات محاذِ کشمیر پر کتنی جرأت اور ہمت سے مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔ ان کی قابلِ قدر کوششوں نے مجاہدین میں جس جذبۂ جہاد کی رُوحِ تازہ کی تھی اس کا اعتراف آزادیِ کشمیر کے زعماء بارہا کر چکے ہیں۔ یہ دعویٰ بلند بانگ نہیں ہے کہ علمائے کرام میں سے آزادیِ کشمیر کی خدمت میں مولانا کی خدمات کو کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔

۱۹۴۹ء میں ایک پُرفریب معاہدے کی رُو سے جنگِ آزادیِ کشمیر بند ہو گئی۔ مجاہدین کو ایک مخصوص حد تک واپس آنا پڑا۔ اس حد کو "خطِ متارکہ" دونوں ملکوں کی مسلح افواج کے درمیان عالمی امن کا رشتہ رگِ جاں بن کر رہ گیا ہے جس کے دونوں طرف جذبات کے لاوے پھٹتے رہتے ہیں۔ خون کی یہ نازک سی لکیر پاک و ہند کے درمیان کسی وقت بھی آتش فشاں کی طرح پھٹ سکتی ہے۔

۱۹۶۵ء کے اوائل سے ہی مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پر ضرورت سے زیادہ ظلم و ستم کے دروازے کھل گئے۔ بھارت نے کشمیر کو آئینی طور پر ہندوستان کا ایک حصہ بنا کر کشمیری عوام کی ستوسالہ جدوجہد آزادی پر مہر لگادی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کے دونوں حصوں کے عوام کا پیمانہ صبر چھلک اٹھا اور یہ مجبور مقہور کشمیری مسلح ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مقبوضہ کشمیر کے اندر جو گزری سو گزری مگر بھارت کے حکمرانوں کا یہ خیال تھا کہ یہ سب کچھ پاکستان کی طرف سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ بھارت کی فوجوں نے ۲۷ اگست کو آزاد کشمیر کی بعض اہم چوکیوں پر حملہ کر کے انہیں اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور پاکستان کے علاقوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ ان حالات میں پاکستان خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ کشمیریوں کی پکار پر پاکستان کے جیالے اٹھے اور دو تین دن کے مختصر عرصہ میں ہندوستانی فوجوں کے مضبوط قلعے چھمب اور جوڑیاں کو اڑا کر رکھ دیا۔ اکھنور چند لمحوں کی مار تھا کہ بھارت نے لاہور اور سیالکوٹ پر حملہ کر کے کشمیر کی آگ کو پاک و ہند کی سرحدوں پر پھیلا دیا۔ اس جنگ میں پاکستانی قوم کی مثالی قربانیاں زمانہ میں ضرب المثل بن گئیں مگر روسی وزیر اعظم کی مداخلت نے دونوں قوموں کی قوت کو "معاہدہ تاشقند" کی قبر میں دفنا دیا ہے۔ اب اس قبر پر سے "اٹوٹ انگ" اور "امن کی راہیں مل گئیں" کے وظائف پڑھنے والے مجاوروں کی گونج دونوں قوموں کے لیے "وجہ تسلی" بنتی جا رہی ہے مگر کشمیر کا لاوا پھر اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ؎

توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

تحریک ختم نبوت

"تحریک ختم نبوت" قادیانی فرقہ کی ان تبلیغی سرگرمیوں کا ردِ عمل تھا جو اس جماعت کے سربراہوں نے ملک کی سیاسی حالت اور اپنے چند متبعین کی حکومت کے بلند مناصب پر فائز ہونے کی شہ پر ملک میں شروع کر رکھی تھیں۔ قادیانی فرقہ اعتقادی طور پر اسلام کے ان بنیادی اصولوں کی نفی کرتا ہے جنھیں کسی طرح نہ بدلا جا سکتا ہے اور نہ اس کا بدل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ انگریز کے زمانے میں بقول بانی تحریک قادیانیت انہیں بڑے سکون سے کام کرنے کا موقعہ ملا اور وہ علماء اسلام کی تردید اور عوام اہلسنت کے احتجاج کے باوجود فرنگی دورِ حکومت میں پھلتے پھولتے اور پھولتے چلے آئے مگر ملک آزاد ہونے

کے بعد اس تحریک کے ایک بہت بڑے ستون سر محمد ظفر اللہ خاں کو جب مرکزی وزارت میں خاص اہم عہدہ ملا تو اس فرقہ نے پوری تنظیم کے ساتھ ملک کے اندر اور باہر ایک مہم چلانا شروع کردی اور عیسائی مشنری کی طرح پاکستان کے غریب اور خاص کر دیہاتی عوام کو اپنی بد اعتقادی کا شکار بنانے لگے۔ اہل سنت کی طرف سے علاقائی اور انفرادی احتجاج پر اس لیے غور نہ کیا جاتا کہ حکومت کے بلند ایوانوں میں وہ لوگ مجو بیٹھے تھے جو قادیانیت سے مرعوب بھی تھے اور کچھ مغلوب بھی۔ نفرت اور مایوسی کا یہ لاوا آخر آتش فشاں بن کر پھٹا۔ ہر مکتب فکر کے علماء، زعماء، صوفیاء اور مشائخ نے یک جان ہو کر خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو قادیانی فرقہ کی چیرہ دستیوں کے تدارک کے لیے پکارا۔ سر ظفر اللہ خاں کی علیحدگی اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے پر زور دیا۔ خواجہ مرحوم ان دنوں اپنی فکر سے بہت کم سوچتے تھے وہ سر ظفر اللہ کی زبان بن کر عوام سے بات کرنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ اس تحریک میں اہل سنت، دیوبندی، شیعہ، وہابی، احراری اور جماعت اسلامی، غیر مقلد غرضیکہ ہر مکتب فکر کے علماء نے ابو الحسنات کو اپنا قائد منتخب کرلیا اور حکومت کو نوٹس دیا کہ وہ ایک مقررہ وقت کے اندر اندر ان مطالبات پر غور کرے، جس کے لیے ملک کا ہر فرد بے چین ہے۔ اس سلسلے میں مولانا ابو الحسنات کی قیادت میں ایک وفد کراچی پہنچا تاکہ وزیر اعظم سے بالمشافہ بات کر لی جائے۔ ملاقات کے دوران خواجہ صاحب مرحوم نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور ساتھ ہی اس تحریک کو دبانے کے لیے سب سے پہلی غلطی یہ کی کہ اس وفد کے سب اراکین کو گرفتار کرکے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ اس خبر نے ملک بھر کے مسلمانوں کے اضطراب میں اضافہ کر دیا۔ ہر جگہ احتجاج ہونے لگے۔ جلوس نکلنے لگے۔ مظاہرے ہونے لگے اور گرفتاریوں سے جیل خانے پناہ مانگنے لگے۔ ملک کی ہر جیل اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی، ویرانے آباد ہو گئے۔ زنداں خانے شہروں میں تبدیل ہو گئے۔ علماء، صوفیاء، لیڈر، طلباء، خطباء غرضیکہ ہر کہ "جگر داشت بزنداں خانہ رفت" لاہور میں مولانا محمد حسین صاحب نعیمی، مولانا خلیل احمد قادری، مولانا غلام الدین، مولانا محمد عمر اچھروی، مولانا معین الدین نعیمی، حافظ محمد عالم سیالکوٹی، مولانا ترنم، مولانا عبد الغفور ہزاروی، مولانا مودودی اور ان کے ساتھی، سید محمود گجراتی، مولانا احمد سعید کاظمی، مولانا محمد یوسف سیالکوٹی۔ احرار میں سے مولوی محمد علی،

شیخ حسام الدین، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، ماسٹر تاج دین انصاری۔ "زمیندار" کے مولوی اختر علی، "نوائے پاکستان" کے مولانا غلام مرتضیٰ خاں میکش۔ شیعوں میں سے حافظ کفایت حسین شمسی اور ان کے ساتھی۔ اہل حدیث کے زعماء غرضیکہ صوبہ بھر کے علماء گرفتار کر لیے گئے۔ لاہور کے مایوس مگر مضطرب عوام کو مولانا عبدالستار خاں نیازی نے سنبھالا اور مسجد وزیر خاں میں اس قدر پُرجوش اور زوردار تقریریں کیں کہ تحریک کی مرکزیت قائم ہو گئی۔ حکومت نے عاجز آ کر بہت سے شہروں کو فوج کے حوالے کر دیا۔ لاہور اور دوسرے بڑے شہروں پر مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ دورِ حاضرہ کے علم بردارِ جمہوریت جنرل اعظم خاں ان دنوں مارشل لاء کے چیف ایڈمنسٹریٹر تھے۔ ان کے معصوم اور جمہوریت پسند ہاتھوں سے لاہور اور پنجاب پر کیا گزری۔ یہ ایک خونچکاں داستان ہے۔ اس کے لیے تفصیلی قلم اٹھانے کی شاید ایک صدی بعد کے مورخ کو پوری آزادی اور ہمت ملے مگر ایک بات جو ضرب المثل بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی گوالے کی بھینس ازراہِ تلطف سڑک پر "اڑنگ" دیتی تو اس کے مالک کو کم از کم چودہ سال سزا ہوتی۔ بشرطیکہ بھینس کا "اڑنگنا" نعرۂ تکبیر یا "ختم نبوت" کا ہم آواز ثابت ہو جائے۔ مولانا عبدالستار خاں نیازی کی تقاریر نے سارے پنجاب کی ملتا ہیں کھینچ لیں مگر ایک دو ہفتے میں جنرل کی فاتح فوج نے لاہور فتح کر لیا۔ مولانا کو غالباً قصور کے قریب گرفتار کر لیا گیا گرفتاری کے بعد ان پر کیا گزری یہ اس وقت کے اخبارات کے کالم شہادت دیں گے، مگر نیازی صاحب پیر قلندر شاہ لاہوری کی زبان بن کر کہتے ہوں گے۔

مائیم و کوئے عشق ہزاراں ملامتے
یارب دریں مقام دہی استقامتے

گوریاں سرسرائیں، مقدمے چلے، ٹکٹکیاں لگ گئیں، سزائیں ہوئیں، کوڑے برسے، جائدادیں ضبط ہوئیں اور ان علمائے کرام سے ان کے خدا اور رسول کے علاوہ جو کچھ متاع تھی چھین لی گئی۔ فیض نے اس ابتلاء میں انہی لوگوں کی ترجمانی کی تھی ؎

ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم
بے نیاز گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں!

مولانا ابوالحسنات کو جیل میں یہ خبر دی گئی کہ ان کے اکلوتے جواں سال صاحبزادے خلیل احمد کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا ہے۔ جیل میں بوڑھے باپ پر کیا گزری ہوگی۔ یہ کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی ہم لکھ سکتے ہیں۔ اس کیفیت کو وہ محسوس کر سکتے ہیں جو ان حالات میں کسی اصول کی خاطر برد آزما ہوتے ہیں۔ علامہ مرحوم نے سیدنا یعقوب علیہ السلام کی سنت میں صبر جمیل کا مظاہرہ کر کے اپنے کردار کو ہمارے لیے مشعلِ راہ بنا دیا۔

مولانا نے "ملزم" کی حیثیت سے عدالتِ عالیہ میں جس بے باکی سے اپنے نصب العین کی وضاحت کی اس کیلئے ہائی کورٹ کا مفصل فیصلہ دیکھئے جسے سابق چیف جسٹس محمد منیر صاحب نے لکھا اور منیر رپورٹ کے نام پر سامنے آیا ہے۔ ایک کتابی شکل میں حکومت مغربی پاکستان نے چھپوایا تھا۔ جیل کی بے جا سختیاں، موسم کی شدت میں گرم علاقوں کی سرد اور ناقص غذا کے استعمال کی بے پناہ بلاؤں نے پسِ دیوارِ زنداں ہی آپ کی صحت پر ناگوار اثر ڈالا تھا۔ رہائی کے بعد پوری کوشش کے باوجود آپ کی طبیعت سنبھل نہ سکی اور اس بیماری نے جب طول پکڑا تو موت کو بہانہ مل گیا۔ آج اصولوں کو مصلحتِ وقت کی نذر کرنے والے جب مولانا کی سیاسی اور دینی خدمات پر تنقید کرتے ہیں تو غالب یاد آتا ہے ؎

بیا ورید گر ایں جا بود زبان دانے　　غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

وفات جیل کی پیہم سختیوں نے صحت پر برا اثر ڈالا اور آپ ختمِ نبوت کی تحریک کی قید سے مستقل بیمار بن کر آزاد ہوئے۔ رہائی کو ایک سال ہی گزرا تھا کہ پیک اجل نے آ لیا اور سنیوں کا یہ عظیم زعیم ۲ شعبان المعظم ۱۳۸۰ھ جمعہ ساڑھے بارہ بجے ۱۹۶۱ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ رحلت سے چند لمحات پیشتر یہ شعر زبان پر تھا ؎

"کائناتِ عشق بس اتنی مریضِ غم کی تھی　　ایک ہچکی میں طلسم آرزو باطل ہوا"

آپ کی آخری آرام گاہ حضرت خواجہ علی الہجویری گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ میں ہے۔ یہ آپ کی دینی خدمات اور محبتِ رسول کا صلہ تھا کہ ایسی بزرگ ہستی کے پہلو میں جگہ ملی ؎

آسماں تیری لحد پر نور افشانی کرے!

مولانا مفتی عبدالعزیز قدس سرہٗ

اسم گرامی عبدالعزیز بن فضل دین تھا۔ قریشی النسب تھے۔ ضلع گجرات پنجاب کے قصبہ جلال پور جٹاں کے قریب ایک گاؤں موضع جیا نگا نوالی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی۔ بعد میں ٹھٹھہ موسٰی میں واقعہ درس میں زیرِ تعلیم رہے۔ ابتدائی کتابوں کے مطالعہ کے بعد تشنگیٔ علم لاہور لائی اور یہاں نیلا گنبد میں مدرسہ رحیمیہ میں داخلہ لیا۔ ان دنوں اس مدرسہ میں حضرت مولانا محمد عالم رام پوری کی تدریس کا بڑا شہرہ تھا۔ آپ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور پھر کچھ عرصہ کے لیے حمایت اسلام لاہور کے مدرسہ حمیدیہ میں زیرِ تعلیم رہے۔ مدرسہ حمیدیہ میں مولوی کریم بخش[1] مرحوم پڑھاتے تھے۔ آپ نے ان کے درس میں شرکت کرکے بڑی بڑی کتابیں پڑھیں اور پھر آپ کے صاحبزادے فضل میراں مرحوم سے اکتسابِ علم کیا۔

اسی دوران آپ نے مزنگ لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کو کتب بینی اور کتب فہمی میں بڑا کمال تھا۔ دینی نادر کتب خریدتے اور اپنے ہاتھوں بہترین جلدیں تیار کرتے اور مطالعہ کے لیے رکھتے۔ آپ مزنگ کی جامع مسجد چاہ جنڈی والی میں امام مقرر ہوئے۔ خطابت فرمانے لگے اور پھر ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ آپ لاہور کے ائمہ مساجد اور منتہی طلباء کو درس قرآن اور حدیث دیتے۔ آپ کی ان کوششوں کا سن کر حضرت پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ ایک جلسہ کیا اور اپنے مریدوں کو درس گاہ اور

---

[1] مولوی کریم بخش وہی بزرگ ہیں جن کے ایک نامور صاحبزادے مولانا فضل میراں اسلامیہ کالج کے پروفیسر رہے۔ اور کئی تصانیف بطور یادگار چھوڑیں۔

مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے یہ مسجد ایک عمدہ عمارت بن گئی۔

آپ نے مرنگ کی ایک اور مسجد قلعہ مادھو میں درسِ قرآن جاری کیا۔ تاحیات اسی مسجد کو اپنی علمی مساعی کا مرکز بنائے رکھا۔ آپ نے دینی کتابوں پر حواشی، بعض کتابوں کے تراجم اور پھر دیباچے لکھے جس سے آپ کی علمی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ مولوی اشرف علی تھانوی کے ترجمہ قرآن پر اتنے زوردار حواشی لکھے کہ دیوبندی حضرات سٹپٹا اٹھے۔ مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ کیا جو ایک مدت سے لوگوں کے مطالعہ میں ہے آپ کی اپنی تصانیف میں سے سوانح سرکار دو عالم، نسب نامہ رسول مقبولؐ، مسائل زکوٰۃ، احکام قربانی، مسائل نماز جنازہ اور اربعین عزیزی تو خاص طور پر مشہور ہیں۔ آپ دینی رسائل میں مضامین لکھتے اور اہل علم سے داد حاصل کرتے۔ علمائے اہل سنت وجماعت آپ کی علمی کوششوں کو نہایت قدر کی نظر سے دیکھتے۔ شرقپور شریف کی ایک مسجد کی پیشانی سے جب غیر مقلدوں نے یا شیخ عبد القادر جیلانی کے الفاظ مٹا دیئے تو مقدمہ کی پیروی کرنے کے لیے حضرت مولانا نے بڑا حصہ لیا۔ حضرت مولانا غلام قادر بھیرویؒ کی کتابیں (اسلام کی گیارہ کتابیں) آپ کی نگرانی میں ایک عرصہ تک چھپتی رہیں۔

آپ دینی خدمات کا صلہ نہ لیتے اور قناعت پر بسر اوقات کرتے، البتہ کتابوں کی طباعت، پروف ریڈنگ اور حواشی کے طور پر ناشرین کا کام کرتے تو جو کچھ مل جاتا غنیمت سمجھتے۔ حج بیت اللہ کو گئے تو اہل علم اور اہل سلوک سے فیوض روحانی حاصل کیے۔ بچوں کو تعلیم کی ترغیب دیتے تو مٹھائی سے ان کی تواضع فرماتے۔

چار چرکھڑیوں والا کنواں مرنگ میں ایک دفعہ مرزائیوں کے ساتھ زبردست مناظرہ ہوا۔ آپ کے معاون صرف ایک سُنّی عالم دین مولوی عبد الغنی تھے آپ نے مرزائی مناظر کو لاجواب کر دیا۔ حصولِ پاکستان کی تحریک میں علمائے حق اہل سنت کا ساتھ دیا اور پھر تحریک ختم نبوت میں علماءِ اہل سنت کے ساتھ ساتھ رہے۔ جمعیت العلماء پاکستان کے ساتھ تعاون کرتے۔ آپ مقامی علماء کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کے ذاتی معاملات میں معاونت فرماتے اور ان کی مشکلات کا حل اپنی زندگی کا مقصد وحید جانتے تھے۔ آپ نے

اپنے محلہ مزنگ میں انجمن اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ سارے ملک میں اسی انجمن کے اراکین کے ساتھ تبلیغ کا سلسلہ جاری کیا۔ لاہور سنٹرل جیل میں قیدیوں کی اخلاقی اصلاح کے لیے ہفت روزہ درس دیتے۔ آپ کے حسنِ تبلیغ سے کئی سکھ اور ہندو قیدی بھی مسلمان ہوگئے۔ آپ کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے مولوی عبدالرشید صاحب بڑے عالم فاضل اور معلم بزرگ ابھی تک مزنگ میں قیام فرما ہیں۔ ۳۰ رجب المرجب ۱۳۸۴ھ ہجری کو واصلِ بحق ہوئے اور میانی کے قبرستان میں آرام فرما ہوئے۔ نمازِ جنازہ مولانا غلام رسول[1]

---

[1] ابوالجیب حضرت مولانا غلام رسول مدظلہ العالی جامعہ رضویہ لائلپور کے شیخ الحدیث ہیں۔ امرتسر کے ایک گاؤں میں ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی پیر نبی بخش تھا۔ پیشہ زمینداری تھا۔ اپنے بیٹے کو ایک جیّد عالم دین کی حیثیت سے دیکھنے کے متمنی تھے۔ مڈل پاس کرنے کے بعد اچھرہ لاہور کے دینی مدرسہ میں داخل ہوئے۔ حمداللہ تک یہاں تعلیم حاصل کی۔ بریلی کے دیوبندی دارالعلوم میں داخلہ لیا اور تکمیل علوم دینیہ کی۔ دیوبندی علماء کی شاگردی نے آپ کو اعتقادی طور پر دیوبندی نظریات کا حامی بنا دیا تھا۔ مگر بریلی میں ہی اعلحضرت امام اہل سنت کے صاحبزادے حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا کی علمی مجلس نے آپ کو متاثر کیا۔ مولانا سردار احمد شیخ الحدیث لائلپوری (جو ان دنوں منظر الاسلام بریلی کے صدر مدرس تھے) کی صحبت میں بیٹھے۔ دیوبندی عقائد سے تائب ہوئے۔ دوبارہ دورۂ حدیث کیا۔ اسباق کے دوران اپنے علمی استفسارات سے استاد کو اپنی ذہانت کا معترف کرایا۔ مفتی اعظم ہند کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ کچھ عرصہ اجمیر شریف قیام کیا۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں آئے۔ ہارون آباد قیام کیا۔ آپ نے یکے بعد دیگرے دو نکاح کیے، ایک مرزائی عورت سے اور دوسرا شیعہ عورت سے۔ دونوں نے اپنی اعتقادی پستی سے طلاق حاصل کر لی۔ ۱۹۵۰ء میں حضرت شیخ الحدیث نے لائلپور میں اپنی بیٹی آپ کے نکاح میں دی۔ چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں (صاحبزادہ محمد فضل حق فارغ علوم دینیہ۔ فضل الرحمان اور فضل امام بڑے لائق فرزند ہیں) ۱۹۵۱ء میں حزب الاحناف میں مدرس ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم فریدیہ بصیرپور میں صدر مدرس ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں شرقپور شریف میں درس حضرت میاں صاحب کیے (باقی اگلے صفحہ پر)

(باقی اگلے صفحہ پر)

صدر مہتمم۔ جامعہ نظامیہ لاہور نے پڑھائی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صدر مدرس بنے اور تدریس میں نام پیدا کیا۔ حضرت شیخ الحدیث کے حکم سے
لاہور میں جامعہ نظامیہ کی بنیاد رکھی اور اس کے مہتمم اور بانی قرار دیئے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں حضرت
شیخ الحدیثؒ کے وصال کے بعد لاہور سے لائلپور پہنچے اور آپ کے دار العلوم ۔ جامعہ رضویہ میں
شیخ الحدیث مقرر ہوئے تا ہنوز اسی دار العلوم میں دینی علوم کی تدریس میں مشغول ہیں۔
حضرت علامہ نبہانیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف جواہر البحار، جامع الکرامات اولیاء کا ترجمہ کیا
...سلم الثبوت کا حاشیہ لکھا۔ آپ کے قابل فخر شاگردوں میں سے حافظ احسان الحق، مفتی محمد امین،
...لانا عبد القیوم، مولانا عبد القادر بانی جامعہ قادریہ لائل پور، مولانا محمد معین الدین مہتمم جامعہ
...دریہ، سید مزمل شاہ، مولانا انوار

صدر مہتمم جامعہ نظامیہ لاہور نے پڑھائی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صدر مدرس بنے اور تدریس میں نام پیدا کیا حضرت شیخ الحدیث کے حکم سے لاہور میں جامعہ نظامیہ کی بنیاد رکھی اور اس کے مہتمم اور بانی قرار دیئے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں حضرت شیخ الحدیثؒ کے وصال کے بعد لاہور سے لائلپور پہنچے اور آپ کے دار العلوم۔ جامعہ رضویہ میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے تا ہنوز اسی دار العلوم میں دینی علوم کی تدریس میں مشغول ہیں۔

حضرت علامہ نبہانیؒ کی شہرہ آفاق تصنیف جواہر البحار، جامع الکرامات اولیاء کا ترجمہ کیا لم الثبوت کا حاشیہ لکھا۔ آپ کے قابل فخر شاگردوں میں سے حافظ احسان الحق، مفتی محمد امین، لانا عبدالقیوم، مولانا عبدالقادر بانی جامعہ قادریہ لائل پور، مولانا محمد معین الدین مہتمم جامعہ دریہ، سید مزمل شاہ، مولانا انوار الاسلام جیسے معروف علماء شامل ہیں۔

ہم اگر داستاں لکھیں اپنی
آپ عنوانِ داستاں ہوں گے

بشنو از من چوں حکایت می کنم

ان صفحات پر ان احباب، علماء، صوفیاء اور شعراء کا تذکرہ ہے جو مصنف کے حلقۂ تعارف میں آئے اور اپنی علمی قابلیت سے مصنف کو متاثر کرتے رہے۔ یہ صفحات مجلس احباب کی یادوں کا وہ خزینہ ہے جسے مستقبل کا تذکرہ نویس اپنے لیے چراغِ دامن صحرا پائے گا اور علماء کے حالات لکھتے وقت اپنے سامنے رکھے گا۔ جن معاصرین کے دامنِ حالات تک میرا دستِ تحریر نہیں پہنچ سکا وہ میری حسرت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

فہرست

★

شہر گجرات پنجاب سے شمال کی طرف چودہ میل دُور ایک چھوٹا سا گاؤں شہابدیوال (شہاب الدین والا) ہے، جس میں راقم الحروف ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوا۔ والد کا اسم گرامی مولانا انور پیر فاروقی بن مولانا محمد عبداللہ فاروقی بن مولانا الشیخ عبدالرحیم فاروقی رحمۃ اللہ علیہم تھا گاؤں میں مسجد کی امامت و خطابت کے ساتھ ساتھ ایک مدرسہ تھا جس میں درس دیتے۔ ہوش آیا تو اپنے گھر میں علماء و صوفیاء کی آمدورفت کی وجہ سے بعض علمی شخصیتوں کے نقوش ذہن پر مرتسم ہوتے گئے۔ قرآن پڑھا اور سکول کا رُخ کر لیا۔ گاؤں کے قریب ہی ایک گاؤں گھوڑی (دنا سنگھ) میں پرائمری پاس کیا اور پھر ایک قریبی قصبے دولت نگر میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ قرآن پاک کے الفاظ کی صحت اور صحیح تلفظ کی ادائیگی اپنے تایا مولانا نور پیر فاروقیؒ (جو سرگودھا میں امامت و خطابت کرتے تھے) سے کی۔ میرے دادا مرحوم کے ایک فاضل شاگرد سید محمد فاضل شاہ مرحوم (موضع بانیاں) فارسی کے بڑے ماہر مدرس تھے۔ میں نے فارسی کی سب سے پہلی کتاب کریما سعدی انہی سے پڑھنا شروع کی۔ وہ پنجابی میں ترجمہ کراتے اور فرمایا کرتے، تمہارا دادا کی امانت بلفظہٖ لوٹا رہا ہوں بڑی محنت سے پڑھاتے۔ ان کی ٹھیٹ پنجابی کے الفاظ آج تک نقش بر لوحِ دماغ ہیں۔

میرے والد مکرم اپنے گاؤں میں جلسے کرواتے اور علماء کو بلاتے۔ مجھے اس طرح پیر ظہور شاہ[1] بخاری (جو رشتہ میں میرے چچا تھے) جلال پوری مرحوم (مولف ظہور ہدایت، نور ہدایت وغیرہ) مولوی باری والے، بہت سے شیعہ اور وہابی علماء اور کئی نعت خواں حضرات (جن کے اسماءِ گرامی

[1] پیر سیّد ظہور شاہ بخاری جلالپوریؒ: سید ظہور شاہ بن میر محمد شاہ قادری بن میر عبدالرحمٰن شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہم جلال پور جٹاں ضلع گجرات میں ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حافظ محمد نورالدین جلال پوری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ قرآن پاک حفظ کیا۔ ابتدائی فارسی اور عربی کتابیں انہی سے پڑھیں۔ بعد میں پشاور کے محلہ یکہ توت کے مدرسہ اسلامیہ میں صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ بیعت اپنے والد مکرم سے تھے۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

حافظے سے محو ہو گئے ہیں) کی زیارت اپنے گاؤں میں ہوئی۔ میں ان عظیم الشان جلسوں کا منظر آج تک چشمِ تصور میں زندہ رکھتا ہوں جن میں دس دس میل سے لوگ چل کر جمع ہوتے تھے۔ یہ زمانہ شیعہ سُنّی مناظروں کا تھا اور علماء کرام ان موضوعات پر تقاریر کرتے۔ میرے والد بزرگوار ان دنوں لاہور کے ایک عالمِ دین حضرت مولانا نبی بخش حلوائی کی تفسیر نبوی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کی اعتقادی خدمات اور صحیح العقیدہ نگارشات کو بڑی عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ آپ نے مجھے ساتھ لیا اور ۱۹۳۷ء میں وارد لاہور ہوئے اور حضرت مولانا نبی بخش صاحب حلوائی[2] کے درس میں داخلہ لے دیا۔ میرے ذہن میں حضرت مولانا حلوائی کی جو شخصیت تھی وہ کتابی تھی۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ اپنی مسجد واقعہ کوتوالی بیرون دہلی دروازہ لاہور میں نمازِ جمعہ کے بعد بعض احباب کے پاس بیٹھے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور روحانی فیضان قادریہ سلسلہ سے حاصل کیا۔ آپ کے شہر میں سیف علی اور ذوالفقار علی شاہ بڑے غالی شیعہ تھے۔ اس لیے پیر صاحب کو شیعہ عقاید سے واقف ہو کر ایک مناظر کی حیثیت سے سامنے آنا پڑا۔ وہ کامیاب مناظرِ اسلام اور خوش بیان واعظِ اسلام ثابت ہوئے۔ آپ کے ہزاروں مرید جہلم، خوشاب، ٹپیالہ، جون میں پھیلے ہوئے تھے۔ خوش گفتار، خوش آواز، خوش شکل اور خوش لباس تھے۔ جو بھی دیکھتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ آپ نے وہابی، شیعہ اور مرزائیوں کے خلاف بہت سی کتابیں لکھیں۔ آپ کئی بار مناظرانہ میدانوں میں فتح یاب ہوئے بعض اوقات معاندین کی شکایت پر کئی ضلعوں میں آپ کا داخلہ ممنوع قرار دیا جاتا رہا۔ ظہورِ ہدایت، نورِ ہدایت، مرغوب الواعظین، قہریزدانی بر ردِ دجال کادیانی، ظہورِ حقیقت آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ آپ نے پُر اثر اور آسان زبان میں نعتیں لکھیں جو ہر مسلمان کے وردِ زبان تھیں، اس میں ذکرِ کلمہ شریف تو بہت مشہور رہا۔ آپ ایک عامل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر طبیب بھی تھے۔
وفات سے چند سال قبل منارہ ضلع جہلم میں منتقل ہو گئے تھے اور وہاں ہی ۱۹۵۴ء میں واصل بحق ہوئے آپ کے تین صاحبزادے سید قمر الزماں، سید حافظ فخر الزماں، سید حافظ محبوب الزماں (فاضل جامعہ جماسیہ) دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ سید حافظ فخر الزماں آپ کے سجادہ نشین ہیں اور حضرت سید میر احمد شاہ صاحب بخاری مالک مظہر فیض رضا، برج منڈی لائلپور آپ کے برادرِ نسبتی ہیں۔

[2] تفصیلی حالات کے لیے "تذکرہ علماء اہلسنت لاہور" کے اوراق دیکھیں۔

ململ کا کھلا کرتہ ، سُرخ رنگ کا لاچا (چادر) اور سر پہ سفید لٹھے کی ٹوپی ، سُرخ داڑھی ، مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھے ہیں اور احباب اور شاگرد مسائل دینیہ پر استفسارات کر رہے ہیں ۔ مجھے دیکھا تو اجازت داخلہ عطا فرما دی ۔ میں ان دنوں نعت بھی سنایا کرتا ۔ آتے ہی جو ہدیہ پیش کر سکا وہ انہی کی ایک نعت تھی جو دیہاتی طرز پر سُنائی ۔ بہت خوش ہُوئے ۔ مجھے قرآن پڑھنے پر لگا دیا اور ساتھ ساتھ فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے لگا ۔ کریما ، نام حق ، بدائع منظوم اور تحفہ نصائح پندنامہ پڑھتا گیا ۔ اور پھر گلستان کا دیباچہ شروع کر دیا ۔ اس مدرسہ میں تقریباً بیس طلبہ تھے ۔ ابھی میں نے دیباچہ شروع ہی کیا تھا کہ ایک طالب علم غلام حسین اپنے والد صوفی محمد دین صاحب کے ساتھ رمداس ضلع گورداسپور سے حضرت لاثانی صاحب علی پوری کی سفارش سے داخل ہوئے (یہ وہی غلام حسین تھے جو بعد میں صوفی غلام حسین گوجروی کے نام سے ایک شہرت یافتہ مقرر ہُوئے) حضرت

حضرت مولانا صوفی غلام حسین گوجروی مدظلہ العالی صوفی محمد دین رمداسی

۱؎ صُوفی غلام حسین گوجروی کے لائق و نامور فرزند ہیں ۔ رمداس میں ۱۹۲۴ء میں پیدا ہُوئے ۔ آپ کے والد حضرت پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی کے مُرید تھے ۔ علماء کی مجلس میں بیٹھتے تھے ۔ بیٹے کو ایک عالم دین بنانا چاہتے تھے ۔ صوفی غلام حسین نے ابتدائی تعلیم رمداس ضلع گورداسپور میں حاصل کی ، ہائی سکول فتح گڑھ چوڑیاں میں داخلہ لیا ۔ نعت خوانِ رسول محمد علی پڑٹی سے نعت خوانی سیکھی ۔ ڈیرہ بابا نانک گورداسپور میں مولانا محمد اشرف چشتی سے ابتدائی کتابیں پڑھیں ۔ ۱۹۳۷ء میں مولانا محمد نبی بخش حلوائی لاہوری کے مدرسہ میں داخل ہُوئے ۔ ابتدائی کتابیں حضرت علامہ مولانا مہر الدین سے پڑھیں ۔ فارسی ادب میں بڑا گہرا مطالعہ کیا ۔ عربی کی فنی کتابیں حزب الاحناف لاہور میں پڑھیں ۔ مولانا غلام نبی صاحب سے خصوصی مطالعہ کیا اور ایک عالم دین بن کر نکلے ۔ ۱۹۴۵ء میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد رمداس میں مدرسہ جاری کیا جس میں اپنے استاد مولانا غلام نبی کو صدر مدرس بنایا ۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آئے ۔ گوجرہ کو اپنا مسکن بنا کر ایک دار العلوم قائم کیا ۔ دار العلوم چراغیہ گوجرہ میں انتظامِ تدریس کرتے رہے ۔ پاکستان میں ایک شعلہ بیان خطیب ، ایک معروف مقرر اور ایک زور دار سُنی عالم دین کی حیثیت سے چمکے ۔ وہ حضرت ثانی علی پوری کے مرید ہیں ۔ سُنیوں کے زبردست خطیب ہیں ۔ انہیں جلسہ گاہ میں سامعین پر پُورا کنٹرول ہوتا ہے اور اپنے زورِ بیان سے حاضرین سے داد پاتے ہیں ۔

مولانا حلوائی نے اس طالب علم سے سابقہ تعلیم کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا، نعتِ رسول پڑھتا ہوں۔ چنانچہ اسی وقت راقب قصوری کی ایک پنجابی نعت سنانا شروع کر دی اور اس مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ صوفی غلام حسین عمر میں مجھ سے چند سال بڑے تھے۔ ابتدائی فارسی کتابیں پڑھ چکے تھے، گلستان شروع کی اور میرے ہم سبق بن گئے۔ وہ ذہین کم تھے مگر بلا کے محنتی۔ گلستان بوستان کے کئی کئی صفحات ازبر کر ڈالے، جملوں کے جملے نوکِ زبان پر۔ میں نے پاکستان بننے کے بعد جب ان کی زوردار تقریریں سُنیں تو مجھے حسرت ہوئی کاش! میں بھی گلستان بوستان حفظ کر لیتا۔ وہ مجمع عام میں پُرشکوہ الفاظ کی بارش برساتے اور اہلِ ذوق سے دادِ تحسین پاتے۔

اسی دوران وہاں وقت کے ایک جیّد عالمِ دین بحرالعلوم ورسیہ مولانا محمد مہرالدین[1] مسجد میں تعلیم

---

[1] حضرت مولانا محمد مہرالدین صاحب استاذ العلماء، امام الادب والفنون حضرت مولانا محمد مہرالدین ولد چودھری روشن دین ۱۹۰۱ء میں موضع خاصہ ضلع امرتسر میں ایک زمیندار راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ صغرسنی میں والدہ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ مسجد کی تعلیم کے بعد پرائمری سکول میں پڑھنے لگے۔ آٹھ سال کی عمر میں والد مکرم کا سایہ اٹھ گیا۔ ناظرہ قرآن پڑھنے کے بعد آپ کو ترجمہ پڑھنے اور قرآن سمجھنے کا خیال پیدا ہوا۔ آپ اجمیر شریف پہنچے۔ دربارِ دُربار خواجہ اجمیری رح پر دعا کی۔ واپس لاہور آکر حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار پر اپنی دلی خواہش کے لیے دامن پھیلایا تو حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ موضع موچھل امرتسر کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ انہوں نے بڑی محنت اور شفقت سے دولتِ علم سے حصہ دینا شروع کیا۔ آپ دوران تعلیم اپنے استاد مکرم کے ساتھ سرہند شریف، بسی شریف، انبالہ، لائل پور، ہوشیار پور، کوٹلہ کے مزارات اور عرسوں پر جاتے یہاں آپ نے قرآن پاک کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ سیرت و کردار کی تربیت میں بڑا فیض پایا۔ کتابیں پڑھنے کی لگن سے آپ کو گوجرانوالہ میں مولوی عبدالعزیز صاحب اور مولوی محمد ابراہیم صاحب کے درس میں داخلہ لینے کا موقعہ ملا۔ ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد آپ لاہور میں دارالعلوم فتحیہ اچھرہ میں داخل ہوئے، مگر یہاں بڑی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں تو آپ جالندھر کے مدرسہ کریمیہ میں پہنچے جہاں حکیم محمد عبداللہ، مولوی احمد بخش مرحوم سے قدوری، ہدایۃ النحو تک کتابیں پڑھیں۔ ایک سال بعد آپ واپس لاہور (باقی برصفحہ آئندہ)

دینے کے لیے تشریف لاتے۔ ہم سارے طلباء ان سے پڑھتے۔ جب ہم لوگ صرف و نحو کی ابتدائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مدرسہ فتحیہ میں داخل ہوئے اور مولانا محمد چراغ صاحب، مولانا محمد ابراہیم صاحب اور سید حبیب اللہ سے فقہ اور منطق کا مطالعہ کیا۔ اس مدرسہ میں نظریاتی مباحث کھڑے ہوجانے سے نظام درہم برہم ہوگیا تو آپ نے حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی سے معقولات، معانی اور فقہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ آپ چھ سال کے عرصہ میں وہ تمام کتابیں پڑھ گئے جو ایک عالم دین کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہیں۔ لاہور میں ان دنوں انجمن حزب الاحناف نے دارالعلوم قائم کیا تو آپ اولین شاگردوں میں تھے۔ مولانا دیدار علی شاہ الوریؒ اور پھر حضرت علامہ ابوالبرکات کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور اس طرح آپ نے ۱۹۲۹ء میں فارغ التحصیل ہوکر دستارِ فضیلت حاصل کی۔ پھر اسی دارالعلوم میں معلّم کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد مدرسہ نعمانیہ میں مدرس رہے۔ پھر احمد آباد یو۔پی میں دو سال پڑھاتے رہے۔ لائلپور کے موضع ہرسہ کوٹ، گجرات میں پیر ولایت شاہ کے مدرسہ، شیخوپورہ میں جامع مسجد کے درس، اور پھر مدرسہ غوثیہ شیخوپورہ میں پڑھاتے رہے۔ آپ نے لاہور آکر مولانا محمد نبی بخش حلوائی کی مسجد میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مسجد شاہ ابوالمعالی، مسجد راجپوتاں قلعہ گوجر سنگھ میں بھی تعلیم دیتے رہے۔ نیویں مسجد چوک متی میں جامعہ غوثیہ لاثانیہ کی بنیاد رکھی۔ موچی دروازہ کے باہر مدرسہ لاثانیہ جاری کیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک مولانا نبی بخش حلوائیؒ کے مدرسہ میں طلباء کو پڑھاتے رہے۔ پنجاب کے اکثر علماء آپ کے شاگرد ہیں اور راقم بھی آپ کے دسترخوانِ علم سے صرف و نحو کے چند ٹکڑے اٹھانے کی سعادت حاصل کرچکا ہے۔

آپ تدریس میں یگانۂ روزگار ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں چاہ میراں میں ایک دارالعلوم جامعہ امینیہ کی بنیاد رکھی۔ آپ نے فیصلہ شرعیہ بر حرمت تعزیہ، تسہیل المبانی شرح اردو مختصر المعانی، شرح اردو قطبی، مفہوم بدعت، شفاعت کی حقیقت اور دیگر بے شمار کتابیں لکھیں۔ آپ ان دنوں دارالعلوم نعمانیہ کے صدر مدرس ہیں۔ نہایت سادہ طبیعت، مخلص اور خلیق انسان ہیں اور علوم و فنون میں استاذ العلماء ہیں۔ منطق و معقولات میں امام فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حلیم الطبع اور منکسر المزاج ہیں۔

کتابوں میں تھے اور علم الصیغہ پڑھتے تھے تو دو اور طالب علموں (حافظ محمد عالم اور صاحبزادہ محمد اسلم علی پوری (یہ وہی حافظ محمد عالم صاحب ہیں جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد سیالکوٹ

لے **حافظ محمد عالم سیالکوٹی** والد کا نام حاجی مولوی شاہ محمد۔ مقام پیدائش موضع رانجن تحصیل وضلع جموں (مقبوضہ کشمیر) میں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے قرآن پاک اپنے پھوپھا حافظ احمد دین محلہ بجلی گھر سیالکوٹ سے حفظ کیا۔ ۱۹۲۸ء میں حضرت مولینا محمد نبی بخش حلوائی کے درس میں داخلہ لیا۔ ابتدائی کتابیں حضرت مولانا مہر الدین سے پڑھیں اور دار العلوم مرکزی حزب الاحناف میں داخل ہوئے، یہاں سے ہی ۱۹۴۵ء میں دستارِ فضیلت حاصل کی۔ بڑے ذہین اور محنتی تھے۔ اکبری منڈی کے اندر لال حویلی کی مسجد کی امامت کی اور مولانا سلطان محمود کی وفات کے بعد جامع مسجد شاہ محمد غوث لاہور میں خطیب مقرر ہوئے۔ مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور میں عربی مدرس رہے اور جب جامعہ نعیمیہ چوک دالگراں کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تو آپ ان اوّلین مدرسین میں سے تھے جنھوں نے اعزازی طور پر پڑھانا شروع کیا۔ ۱۹۵۲ء میں تحریکِ ختمِ نبوّت میں بھرپور حصہ لیا اور مارشل لاء کے حکام نے آپ کو گرفتار کر کے فوجی عدالت میں پیش کیا۔ کچھ عرصہ قلعہ لاہور میں زیرِ عقوبت رہے اور تحریک کے خاتمے پر رہا کر دیے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں آپ سیالکوٹ پہنچے پھر مدرسہ کو دو دروازہ کی مسجد میں جامعہ حنفیہ کے نام سے جاری رکھا۔ مولانا محمد یوسف کے تعاون سے مسجد مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی مسجد میں جامعہ عبدالحکیم قائم کیا اور علمِ دین کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ آپ کے درس کی شہرت نے طلباء علمِ دین کو جوق در جوق داخلہ لینے پر آمادہ کیا۔ اس دار العلوم نے سیالکوٹ کی علمی دنیا میں اپنا مقام پیدا کیا۔ اور سینکڑوں شاگرد علمِ دین سے آراستہ ہو کر دین کی خدمت میں زندگیاں وقف کیے ہوئے ہیں۔ اُن شاگردوں میں سے پیر ارشاد حسین چوراہی، مولانا الٰہی بخش لاہوری، قاری غلام رسول زینت القراء، حافظ محمد اشرف مجددی مالک مکتبہ نعمانیہ سیالکوٹ، مولانا ضیاء اللہ قادری، مولانا عطاء المصطفیٰ جمیل (گولڈ میڈلسٹ)، صاحبزادہ غلام حیدر شاہ (برادر پیر محمد شفیع صاحب)، مولانا عبدالسلام قدسی کوٹلی بہرام (مؤلف علم خیر الانام)، مولانا غلام مصطفیٰ (مفتی آزاد کشمیر)، مولانا الطاف محی الدین (جامعہ اسلامیہ)، حافظ غلام حیدر صاحب، حافظ محمد یونس صاحب، (باقی برصفحہ آئندہ)

میں جامعہ حنفیہ مسجد دو دروازہ کے بانی، مہتمم اور ڈسٹرکٹ خطیب کہلائے ؎ کا اضافہ ہوا۔
۱۹۲۹ء میں مجھے ضلع بہاول نگر کے ایک مدرسہ تعلیم الاسلام واقعہ چک ۳۷/۳-R کی شہرت
نے بڑا متاثر کیا۔ وہاں میرے تایازاد بھائی محمد اصغر فاروقی اور حکیم محمد اعظم فاروقی زیرِ تعلیم تھے۔
میں وہاں پہنچا۔ اس درس کی تعلیم نے مجھے سب کچھ بھلا کر تعلیم حاصل کرنے میں لگا دیا۔ یہ درس
نوآبادی میں واقعہ تھا جو ہارون آباد اور چشتیاں کے درمیان ایک لق و دق علاقہ میں واقع تھی۔
اس کے بانی استاذی علّامہ حضرت الحافظ غلام حسین صاحب بڑے باہمت عالمِ دین تھے
انھوں نے اس نوآباد علاقہ میں علمِ دین کی اشاعت کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ نہر کے کنارے
پر بڑی عظیم الشان عمارت بنائی۔ قابل سے قابل اساتذہ کو معقول تنخواہ پر مقرر کیا۔ ان دنوں
پانی پت کے قاری، ہندوستان کے مدارس کے قابل ترین مدرس اور معلم اس مدرسہ میں
تعلیم کے لیے قیام کرتے اور اپنی تمام شرائط کو منظور کروا لیتے۔ حافظ صاحب اپنے طلباء کو زیورِ تعلیم
سے آراستہ کرنے کے جذبہ میں قابلِ قدر اساتذہ کو مُنہ مانگی سہولتیں دیتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک
عالمِ دین نے مُنہ مانگی تنخواہ کے علاوہ یہ شرط رکھی کہ میں ہر روز ایک مرغی اور حلوہ کھایا کروں گا۔ حافظ صاحب
نے بلا تامّل یہ بات بھی قبول کر لی۔ اس مدرسہ میں ملک کے مایہ ناز خطیب سالانہ جلسہ پر آتے
اور مدرسہ کے وسیع میدان میں علاقہ کے مسلمانوں کے بے پناہ ہجوم میں خطاب کرتے۔ مجھے اسی مدرسہ
میں صاحبزادہ سیّد فیض الحسن آلومہاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۸) صاحبزادہ محمد معصوم موہری شریف کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔
۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے جمعیۃ العلماء کے ٹکٹ پر کھڑے ہُوئے۔
ان دنوں محکمہ اوقاف کے ڈسٹرکٹ خطیب ہیں۔ خواص و عوام میں بڑی عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔
علمی خدمات کے لیے معروف ہیں۔ راقم الحروف کے ہم سبق تھے۔ مخلص دوست ہیں اور ایک شفیق
رفیق کار، مکتبہ نبویہ کے خصوصی معاون اور خانقاہ حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے مخلص ارادت مندوں میں
سے ہیں۔ پہلے حضرت مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہُوئے۔ آپ کے وصال کے بعد
حضرت پیر فیض محمد [illegible] ہُوئے۔ جمعیۃ العلماء پاکستان کے ضلعی صدر ہیں۔

۵۔ ابو البیان علامہ غلام علی اشرفی مدظلہ

آپ موضع بہانیاں نزد لالہ موسیٰ ضلع گجرات کے ایک علم دوست دینی شعور رکھنے والے گوجر گھرانے میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جوڑا کرنانہ کے سکول میں حاصل کی۔ دینی تعلیم کے لیے قریبی گاؤں کے عزچک کے یگانۂ روزگار فاضل مولانا سلام اللہ کے درس میں شامل ہوئے۔ آپ نے فارسی ادب کو اسی درس سے حاصل کیا۔ عربی کتابوں کی تعلیم کے لیے آپ جالندھر کے دارالعلوم عربیہ کریمیہ حنفیہ میں داخل ہوئے۔ اس دارالعلوم میں ان دنوں استاذ العلماء مولانا محمد عبد الجلیل صدر مدرس تھے۔ آپ صدر مدرس کی خصوصی توجہ کی بناء پر علمی منازل طے کرتے گئے۔ اس مدرسہ میں ان دنوں مولانا عبد القادر کاشمیری، حافظ عبد المجید گورداسپوری بھی پڑھاتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں فارغ التحصیل ہو کر جامع مسجد ہوشیار پور میں خطیب مقرر ہوئے ان دنوں صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی کے ایک لائق شاگرد حکیم غلام یسین دہلوی ہوشیار پور میں تشریف لائے۔ آپ نے اس جوہر قابل کو دیکھا تو فارسی ادب کی کتابوں کو از سرِ نو پڑھایا، ساتھ ہی دارالعلوم جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آپ ۱۹۴۰ء میں امامت وخطابت کی ساری بلندیاں چھوڑ کر جامعہ نعیمیہ مراد آباد کے تلامذہ کی صف میں جا بیٹھے اور علوم دینیہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ان دنوں اس شہرہ آفاق سنی دارالعلوم میں مفتی احمد یار خان نعیمی، مولانا محمد امین الدین اور مولانا محمد عمر نعیمی کے تدریسی عملہ میں شامل تھے۔ چنانچہ آپ نے ان قابل قدر ہستیوں سے معقولات و منقولات حاصل کیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ مراد آباد میں ہی حضرت محدث کچھوچھوی کی زیارت سے بہرہ ور ہوئے۔ حضرت محدث کچھوچھوی نے اس نوجوان عالم دین کے جذبۂ تعلیم وتدریس کو دیکھ کر مشورہ دیا کہ وہ گجرات جا کر علم دین کی خدمت کریں۔ مولانا غلام علی صاحب لالہ موسیٰ گجرات میں تشریف لائے۔ ان دنوں اس شہر میں مولانا غلام قادر اشرفی اور حافظ محمد دین صاحب تدریسی کام میں مشغول تھے۔ آپ نے ان دونوں بزرگوں کے بھرپور تعاون سے پڑھانا شروع کر دیا مگر ایک سال بعد آپ گوہر تحصیل پھالیہ میں چلے گئے جہاں آپ نے ایک دینی درسگاہ کی بنیاد رکھ کر سلسلۂ تدریس جاری کر دیا۔ ۱۹۵۰ء تک آپ نے یہاں تبلیغ و تدریس میں وقت گزارا۔ جالندھر اور ہوشیار پور کے وہ عقیدت مند جو زمانۂ طالب علمی میں آپ کی تقاریر سُن چکے تھے تقسیم ملک کے بعد اوکاڑہ میں آباد ہو گئے۔

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

مولوی امیرالدین جلال آبادی کی شعلہ بیانیاں سُننے کا موقعہ ملا۔ مہتمم مدرسہ کی یہ دلی خواہش تھی کہ اُن کے طلباء ان مشاہیر کا رنگ لے کر میدانِ تبلیغ میں نکلیں۔ اس مدرسہ کی خدمات نے سارے علاقہ کو متاثر کیا۔ ایک سو طالب علم و حافظانِ قرآن زیرِ تعلیم تھے۔ رات کو لوگ اپنے کھیتوں میں نہر کا پانی لگاتے تو حمد و نعت کے ترانے سناتے۔ نمازِ تہجد کا اتنا اہتمام ہوتا کہ سحری کے وقت قریب کے دیہات سے عبادت گزار حضرات دارالعلوم میں نمازِ تہجد ادا کرتے اور صبح کی نماز با جماعت ادا کرتے۔ درس سننے کے بعد کاروبار میں مصروف ہو جاتے۔ علاقہ کے مسلمانوں کے اندر اتنا جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ علمِ دین کی خاطر ہر قربانی اور ایثار کے لیے تیار رہتے۔ ان کے بچے دولتِ علم سے آراستہ ہونے لگے۔ سینکڑوں حافظانِ قرآن بنے اور ہزاروں علمِ دین سے مالا مال ہوئے۔

اسی مدرسہ میں میرے چند ہم درس تھے جن میں حافظ محمد اقبال، حافظ محمد صدیق، حافظ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۰)

وہ آپ کے پاس دوڑے دوڑے آئے اور آپ کو اوکاڑہ میں لے گئے۔ آپ ۱۹۵۱ء میں اوکاڑہ پہنچے۔ جامع مسجد کے خطیب اور برلا ہائی سکول کے شعبۂ اسلامیات کے مدرس مقرر ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے اہلسنت و جماعت کے اس عظیم الشان دارالعلوم کی بنیاد رکھی جو ان دنوں اشرف المدارس کے نام سے ہزاروں طلبہ کو دولتِ علمِ دین سے مالا مال کر چکا ہے۔ آپ نے اس دارالعلوم کی ترقی و توسیع کے لیے دن رات کام کیا۔ شبانہ روز محنت سے ایک عظیم عمارت، ایک معیاری درسگاہ اور ایک بے مثال تبلیغی مرکز قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آج اس درسگاہ کے فارغ التحصیل علماء ملک کے ممتاز مقامات پر خدمتِ دین میں مصروف ہیں۔ آپ نے مدرس، مقرر، خطیب اور ادیب ہر قسم کے افراد پیدا کیے۔ جماعتی تنظیم میں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ نظامی مدارس میں حیات تازہ کے لیے آپ نے پاکستان بھر کا دورہ کر کے تمام مدارس کے مہتمم حضرات کو جمع کیا۔ آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد عبدالقیوم سے مل کر قادیانیوں کے خلاف بل پاس کروایا اور پھر اسلامی قانون کی دفعات کی تدوین میں مدد کی۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختمِ نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بھی قومی اسمبلی کے لیے جمعیۃ العلماء کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے۔ جمعیۃ العلماء کی احیاء کے لیے رات دن سفر کیا۔ پھر جماعت اہلسنت قائم کی اور خالص اعتقادی اور نظریاتی بنیادوں پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۴ء کی تحریک میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ میرے مخلص اور علمی کرم فرماؤں میں ہیں۔

محمد شفیع ، مولانا محمد اصغر فاروقی ، حافظ غلام غوث نے بڑا نام پایا۔ ہزاروں طلباء نے دولتِ علم سے دامنِ مراد بھرا۔ چونکہ میں اُن دِنوں نعت نوائی اور نعت خوانی میں سارے ضلع میں شہرت یافتہ تھا۔ بدیں وجہ مجھے مدرسہ تعلیم الاسلام کا ایک ہونہار طالب علم تصوّر کیا جانے لگا۔ میں تحصیلِ علم کے جنون میں صبح و شام مصروفِ مطالعہ رہتا۔ مجالس میں نعت پڑھتا ، جلسوں میں تقاریر کرتا اور انتظامی امور میں ہاتھ بٹاتا۔ اس مدرسہ میں مجھے گلستانِ سعدی سے لے کر سکندر نامہ نظامی تک کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ عربی علوم پر مختلف اساتذہ سے استفادہ کرتا گیا۔ منشی فاضل کے امتحان کے لیے لاہور آیا۔ سب سے بڑھ کر مجھے ذوقِ تعلیم کا جو جذبہ ملا وہ میری زندگی کی تمام کامرانیوں کی بنیاد تھا۔ ضلع بہاول نگر میں مدرسہ تعلیم الاسلام کی شہرت کے ساتھ ساتھ حافظ محمد اقبال اور میری شہرت بھی پھیلتی گئی اور ہم دونوں دینی جلسوں کی جان ہوتے۔ لوگ نعت سُننے کے لیے دُور دُور سے آتے اور نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کے نام پر دیدہ و دل فرشِ راہ کرتے۔

اسی اثناء میں آقائے بیدار بخت کے شبینہ مدرسہ دارالعلوم السنۃ الشرقیہ عقب مزارِ شاہ محمد غوث میں نصابی کتابوں کا مطالعہ کیا — ۱۹۴۴ء میں فاضلِ فارسی کا امتحان پاس کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مولانا نبی بخش حلوائی کے ایک نامور شاگرد ، مرید اور جانشین حضرت مولانا باغ علی نسیم

---

[1] مفصل حالات سابقہ صفحات میں مولانا حاکم علی کے حالات کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

[2] **الحاج مولانا باغ علی نسیم صاحب** آپ حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ، شاگرد اور سچے جانشین ہیں۔ آپ اپنے پیرو مرشد کے مدرسہ میں پڑھے اب آپ ہی کے مدرسہ ، مکتبہ اور کتب خانہ کے مہتمم و منتظم ہیں۔ آپ ۱۹۲۵ء میں جموں کے ضلع ریاسی کے ایک گاؤں پدمی میں ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد چودھری لہب الدین مرحوم مولانا نبی بخش حلوائی کے مرید خاص تھے ، مولانا ریاست میں جاتے تو آپ کے ہاں قیام فرماتے۔ مولانا باغ علی صاحب نے مڈل پاس کیا تو ۱۹۳۸ء میں علم دین کی تحصیل میں لاہور پہنچے۔ مولانا کے مدرسہ میں داخلہ لیا۔ حضرت نے آپ کو فارسی درسیات خود پڑھائیں۔ مثنوی مولانا روم سبقاً سبقاً پڑھی (مثنوی رومی میں وہ مرتبِ تذکرہ کے ہم سبق تھے) انھی دنوں حضرت مولانا مہر الدین صاحب نے مسجد میں تمام طلباء کو پڑھانا

(باقی بر صفحہ ۳۵۳)

مدرسہ اور مسجد کے انتظامات کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور تعلیم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

شروع کیا تو مولانا باغ علی صاحب ان اوّلین شاگردوں میں سے تھے جنہوں نے زانوئے ادب تہہ کیا۔ صرف و نحو کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۴۰ء میں دار العلوم حزب الاحناف میں داخل ہوئے۔ مولانا منور الدین مرحوم سے صرف و نحو، مولانا محمد دین سے منطق، حافظ عطا محمد صاحب بندیالوی اور مفتی محمد حسین صاحب نعیمی سے فقہ، مولانا غلام نبی گورداسپوری سے بعض دیگر کتب کا مطالعہ کیا۔ استاذ العلماء ابو البرکات سید احمد قادری صاحب سے حدیث پڑھی اور ۱۹۴۶ء میں دستارِ فضیلت حاصل کی۔ مولانا محمود احمد رضوی، مولانا محمد شریف ساہیوال اور مولانا شمس الضحیٰ نے آپ کے ساتھ ہی دستارِ فضیلت باندھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مولانا حلوائی کے مدرسہ میں پڑھانے لگے۔ مولانا آپ کو اپنی تالیفات کی املاء دیتے۔ چنانچہ الامتیاز بین الحقیقت والمجاز (تین ہزار صفحات) پنجابی ترجمہ قرآن پاک، انوارِ نبوی، میلاد النبی اور مجموعہ نعت کے مسودات آپ نے املا کیے۔ اظہار انکار المنکرین کا پہلا ایڈیشن آپ کے اہتمام میں چھپا۔ آپ کے ہم سبق حافظ محمد عالم سیالکوٹی، صوفی غلام حسین گوجروی، غلام حسین نوری، مولوی عبد النبی مفتی جموں، حافظ محمد نواز نقشبندی اور راقم خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت مولانا نبی بخش حلوائی کے وصال (۱۹۴۴ء) کے بعد مسجد، مدرسہ اور کتب خانہ کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ بڑے متوکّل، خدا ترس، کم گو اور محنتی عالمِ دین ہیں۔ علماء کی قدر کرتے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں فاضل فارسی اور ۱۹۵۳ء میں عربی فاضل پاس کیا۔ ۱۹۶۴ء میں مکتبۂ نبویہ کی بنیاد رکھی۔ پہلی کتاب الامتیاز (علمِ غیب، تصرفِ اولیاء اور استمداد) طبع کی۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کا ترجمہ قرآن پاک طبع کرایا اور پھر اپنے دادا پیر حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل کو بڑے خوب صورت انداز میں طبع کرایا۔ اس کتاب نے علماء سے دادِ تحسین وصول کی اور مکتبہ کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ مولانا ۱۹۶۸ء میں مکتبہ نبویہ کو باقاعدہ جاری کرنے کے لیے گنج بخش روڈ پر چلے آئے۔ دوسرے علماء کو دعوتِ اشاعتِ کتبِ اعتقادیات دی۔ چنانچہ مولانا محمد شریف نوری نے مکتبہ اسلامیہ اور مولانا انوار الاسلام نے مکتبہ حامدیہ آپ کی ترغیب پر جاری کیے۔ ان تینوں مکتبوں کے قیام سے دنیائے سنّیت میں اشاعتی کام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مکتبہ نبویہ نے آپ کے زیرِ انتظام بڑی بڑی اہم

(باقی ص ۳۵۴)

جاری رکھنے میں بڑا زبردست تعاون کیا۔ فاضل فارسی کے امتحان میں کامیابی کے بعد مجھے امتحانات پاس کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا۔ دو سال بعد ایف اے اور پھر ۱۹۵۲ء میں بی اے کر لیا۔ ان امتحانات کے دوران مجھے ایک عالمِ دین نے اپنی مسجد میں صبح کی امامت کے لیے مقرر کیا۔ میں خوش آواز تھا، قاری حضرات کی مجالس میں بیٹھ کر آواز درست کی ہوئی تھی۔ شوق و ذوق کی دولت تھی۔ بڑے پُرسوز انداز میں قرآن کریم پڑھتا۔ نمازیوں نے اصرار کیا کہ صبح کی نماز میں ہی پڑھایا کروں۔ مجھے کئی کئی رکوع خوش آوازی سے سنانے کا موقعہ ملتا۔ اہلِ ذوق نمازی اذان کے ساتھ مسجد میں آجاتے اور ساری مسجد بھر جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصہ تک یکی دروازے کے باہر ایک مسجد میں ان لوگوں کو قرآن پاک سناتا جو علی الصباح سیر کے لیے آتے۔ میرا یہ حلقہ روز بروز بڑھتا گیا اور لوگوں کے تعریفی جملے میری حوصلہ افزائی کرتے۔ یہ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ لاہور کے سیاسی اور مذہبی جلسوں میں برصغیر کے شعلہ بیان مقررین آتے اور حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے مجمع کے سامنے تقاریر کرتے۔ ان کے اس اعزاز اور کامیابی پر مجھے بڑا رشک آتا۔ میں دُعا کرتا کاش! مجھے بھی یہ قوتِ گویائی ملے اور میں بھی خدمتِ دین کر سکوں۔ انجمن مرکزی حزب الاحناف کے سالانہ جلسے جو مسجد وزیر خاں میں ہوتے، علماء اہلسنّت کے خطابات سے زندہ ہو جاتے۔ مسجد کا صحن لبا لب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۲)

کتابوں کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ فتاوٰی رضویہ، تکمیل الایمان، مرج البحرین، اولیاء چشت، اولیاء سہروردیہ اور پھر شواہد النبوۃ کے علاوہ بہت سی بلند پایہ علمی کتابیں طبع کرائیں۔ ۱۹۷۰ء میں حج کیا۔ مولانا محمد ضیاء الدین مدنی اور علماء حرمین الشریفین نے آپ کی نظریاتی خدمات کو بڑے اچھے انداز میں سراہا۔ آپ انتھک کام کرنے والے، خاموش خادمِ دین اور مخلص ناشر کی حیثیت سے سُنّی ادب کو خوبصورت انداز میں پھیلانے میں کوشاں ہیں اور اس سلسلہ میں دوسرے سُنّی مطابع کو اچھی کتاب شائع کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اُن کی اس کوشش نے سُنّی مطابع کو اچھی کتابیں چھاپنے اور سُنّی قارئین کو دیدہ زیب کتابوں کے انتخاب کرنے کا ذوق بخشا ہے۔

بھرا ہوتا۔ صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی، شیخ الحدیث مولانا سردار احمد لائلپوری،

لہ صدر الافاضل سید نعیم الدین مراد آبادی آپ اعلیٰحضرت کے نامور شاگردوں جناب علی حسین اشرفی کچھوچھوی کے معروف خلفاء اور علماء اہلسنت کے ممتاز علماء کرام میں شمار ہوتے ہیں۔ اعلیٰحضرت بریلوی کے ترجمہ قرآن کنزالایمان پر آپ کا تفسیری حاشیہ بنام خزائن العرفان بڑا مشہور ہوا۔ برصغیر کی آبادی میں دو قومی نظریہ پر آل انڈیا سُنّی کانفرنس بنارس کا انعقاد اور مراد آباد میں جامعہ نعیمیہ کی بنیاد آپ کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ اسم گرامی محمد نعیم الدین، تخلص نعیم، تاریخی نام غلام مصطفیٰ، لقب صدر الافاضل تھا۔ والد مکرم مولانا محمد معین الدین نزہت اپنے وقت کے معروف عالم دین اور شاعر تھے۔ ۲۱ صفر المظفر ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن پاک حفظ کیا۔ ملاحسن تک درس نظامی کی کتابیں مولانا شاہ فضل احمد سے پڑھیں۔ سید شاہ گل محمد قدس سرہ سے ۱۳۱۰ھ میں افتاء نویسی کی سند لی۔ طب مولانا شاہ فضل احمد امروہوی سے پڑھی۔ ۱۳۲۰ھ میں دستار بندی ہوئی۔ والد مکرم نے قطعۂ تاریخ کہا: ؎

ہے مرے پسر کو طلبہ پر وہ فضیلت — سیاروں میں رکھتا ہے مریخ فضیلت
نزہت نعیم الدین کو یہ کہہ کے سنا دے — دستار فضیلت کی ہے تاریخ فضیلت
۱۳۲۰ھ

اعلیٰحضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے علمی خلافت حاصل کی۔ متعدد مواقع پر آپ کے وکیل رہے۔ تدریس کا خاص انداز تھا۔ صدر الافاضل کا لقب اعلیٰحضرت بریلوی نے ہی عطا کیا تھا۔ ایک وقت تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے البلاغ اور الہلال میں زوردار مضامین لکھے۔ ۱۳۲۰ھ میں الکلمۃ العلیاء لکھی جو علمی اور نظریاتی دنیا میں بڑی مشہور ہوئی۔ سارے ہندوستان میں غیر مقلدین، دیوبندی علماء اور آریہ سماجیوں سے مناظرے کیے۔ منشی برکت رام پوری، سید حبیب ایڈیٹر سیاست لاہور کو لے کر مولوی خلیل احمد انبیٹھوی سے مناظرہ کرنے کے لیے مظاہر العلوم سہارنپور پہنچے اور ساکت کر دیا۔ بڑے صائب الرائے، مدبّر اور ملت کا درد رکھنے والے تھے۔ آپ کے نامور شاگردوں میں سے مولانا سید غلام جیلانی میرٹھی، حضرت مولانا محمد عمر نعیمی، مولانا محمد حسین نعیمی بانی جامعہ نعیمیہ لاہور، استاذ العلماء ابوالبرکات سید احمد قادری مدظلہ العالی، مولانا محمد معین الدین نعیمی (سواد اعظم)، مولانا مفتی احمد یار گجراتی، مولانا نور اللہ صاحب بصیرپوری، مولانا ابوالحسنات پیر محمد کرم شاہ صاحب بھیروی ... کتاب بن کر چھپ چکے۔

حضرت محدّث کچھوچھویؒ، مولانا قطب الدین جھنگوی، مولانا پیر ولایت شاہ گجراتی، حضرت سید جماعت علی شاہ، مولانا عبدالغفور ہزاروی مرحوم، مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آپ کی تصانیف میں تفسیر قرآن، اطیب البیان، الکلمۃ العلیا، سوانح کربلا، کتاب العقائد، دیوان ریاض نعیم خاص طور پر مشہور ہیں اور ہر ایک کے کئی کئی ایڈیشن چھپے۔ وفات ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۸ء مطابق ۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ کو ہوئی۔ (مفصل حالات کے لیے دیکھیے حیات صدر الافاضل — غلام معین الدین نعیمی۔ تذکرہ علماء اہلسنت — مولانا شاہ محمود احمد قادری)

لے **حضرت محدّث کچھوچھوی** نام سید محمد ابن مولانا نذر اشرف۔ القاب محدث اعظم، شمس الافاضل، مقام پیدائش جائیس ضلع بریلی، تاریخ پیدائش ۱۵ر ذیقعدہ بروز چہارشنبہ ۱۳۱۱ھ ہے۔ اپنے نانا کے زیر تربیت رہے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے اور درسگاہ کے اساتذہ سے حاصل کی۔ مدرسہ نظامیہ فرنگی محل سے مولانا عبدالباری سے عربی درس نظامی پڑھی۔ علی گڑھ میں حضرت لطف اللہ سے شرح تجرید اور افق المبین پڑھی۔ سند فراغ کے وقت آپ کو علامہ کا لقب دیا گیا۔ حضرت مولانا شاہ مطیع الرسول عبدالمقتدر بدایونی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ دہلی میں مدرسۃ الحدیث کی بنیاد رکھی اور درس حدیث شروع کیا۔ اپنے نانا حضرت قطب عالم شاہ علی حسین اشرفی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر اپنے ماموں مولانا شاہ احمد اشرف رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوئے۔ آپ نے میدانِ خطابت میں قدم رکھا تو فصاحت و بلاغت آپ کے ہمرکاب ہوگئی۔ دنیائے تبلیغ میں نکلے تو شہرت و عزت نے قدم لیے۔ لاکھوں مسلم دوست بیعت سے سرفراز ہوئے اور پانچ ہزار غیر مسلم دولتِ ایمان سے مالامال ہوئے۔ تقریر کرتے تو مجمع پر سکوت چھا جاتا۔ قرآن پڑھتے تو دل دُھلتے جاتے۔ نگاہ اٹھا کر دیکھتے تو لوگ بے تاب ہو جاتے۔ چار بار حج کیا۔ نظم میں مجموعہ کلام "فرش پر عرش" شائع ہوا۔ قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ اعلیٰحضرت نے دیکھا تو سلاست و روانی کو دیکھ کر فرمایا: "شاہزادے! اردو میں قرآن لکھ رہے ہو۔" وہ پاک و ہند کے سُنّی مسلمانوں کے عظیم راہنما اور باکمال عالمِ دین تھے۔ ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سُنّی کانفرنس کی صدارت کی۔ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کے سرپرست اعلیٰ تھے۔ ۱۶ر رجب المرجب ۱۳۸۳ھ بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ مدفن کچھوچھہ شریف میں ہے۔ (مفصل حالات کے لیے دیکھیں تحائف اشرفی، فرش پر عرش، محدث اعظم نمبر، پاسبان الٰہ آباد اور تذکرہ

مولانا حشمت علی مرحوم، مولانا محمد یوسف سیالکوٹی مرحوم، مولانا محمد بشیر سیالکوٹی، مولانا غلام الدین مرحوم، مولوی حافظ محمد مظہر الدین، صدر الشریعۃ مولانا حامد رضا خاں بریلوی اور دوسرے زعماء تقریریں کرتے۔ مسجد وزیر خاں کے جلسے دیدنی اور تقاریر شنیدنی ہوتی تھیں۔ علماء کا جلسہ گاہ میں داخل ہونا ایک ایمان افروز منظر ہوتا تھا۔ پھر وسیع سٹیج جس پر کم و بیش تین سو علماء تشریف فرما ہوتے۔ علماءِ دین کی عظمت کی بڑی حوصلہ افزا تصویر ہوتی۔ بیگم شاہی مسجد میں سال کے بعد مولانا محمد یار[1] صاحب فریدی بہاولپوری اپنے مخصوص انداز میں تقریر کرتے۔ رومی کے

---

[1] **مولانا محمد یار بہاولپوری** عبدالنبی المختار خواجہ محمد یار صاحب گڑھی اختیار خاں رحیم یار خاں ریاست بہاولپور میں ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مولانا عبدالکریم تھا۔ قرآن مجید اور فارسی کی کتابیں جلال پور کے درس میں پڑھیں۔ بعض کتابیں علامہ محمد حیات رحمۃ اللہ علیہ سے پھر حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ چاچڑاں شریف میں حضرت مولانا تاج محمود سے آخرین کتابوں کا مطالعہ کیا۔ آپ نے اسی مدرسہ سے دورۂ حدیث کی ۱۹ سال کی عمر میں ۱۳۱۹ھ میں سندِ فضیلت لے کر فارغ ہوئے۔ حضرت خواجہ غلام فرید صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ پیرو مرشد کی وفات کے بعد دس سال تک آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد بخش نازک کے ساتھ رہ کر دار العلوم سے استفادہ کیا اور معرفت الٰہیہ حاصل کی۔ آپ ۱۳۲۲ھ میں حج بیت اللہ شریف گئے۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے آپ کا نعتیہ اور عارفانہ کلام دیوان فریدی کے نام سے چھپا ہے۔ آپ کے کلام میں متقدمین کی سی پختگی، تخیل کی بلندی اور سوز و مستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ آپ نے بہاول پوری، سرائیکی، اردو، فارسی اور عربی میں نعتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہی اور خوب کہی۔ فلسفہ وحدت الوجود کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اپنے دور میں اس کے ترجمان تھے۔ حضرت علامہ غلام مہر علی گولڑوی اپنی کتاب الیواقیت المہریہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے آپ کی تقریر حضرت میاں میر لاہوری کے عرس کے موقع پر سنی۔ "ورأیت السامعین لبیانہ المبارک کانھم استغرقوا فی بحر العشق المحمدی ویصیحون کانما ارواحھم تنزع عن ابدانھم"۔

آپ کا وصال ۱۴ رجب المرجب ۱۳۶۷ھ میں لاہور میں ہوا اور آپ کے جسد کو ایک تابوت میں رکھ کر میاں میر کے قبرستان میں امانتاً دفنا دیا گیا۔ ۹ ماہ بعد آپ کے تابوت کو لاہور سے گڑھی اختیار خاں بہاولپور لے جا کر دفن کر دیا گیا۔ (الیواقیت المہریہ)

اشعار کی شرح کرتے اور اسں وجد آفرینی سے خطاب کرتے کہ حاضرین پر جادو کر دیتے ۔ مجھے ان کی تقاریر نے خاص طور پر تقریر کرنے کا ولولہ دیا ۔ دینی جلسوں سے ہٹ کر سیاسی پنڈالوں میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ، شیخ حسام الدین ، مولوی محمد علی جالندھری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی (م ۱۹۶۳ء) ، مولانا مظہر علی اظہر، صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب[1]

---

[1] صاحبزادہ سید فیض الحسن آلومہاروی آپ سیدنا علی النقی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ والد کا اسم گرامی سید محمد حسین رح (م ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۲ء) تھا۔ آپ ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۱ء میں آلومہار ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ۔ قرآن کریم مولانا لطف اللہ اکرتپوری سے پڑھا۔ فارسی اور عربی کی کتابیں مولانا حبیب اللہ سنبھلی سے پڑھیں۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج مرے سیالکوٹ میں داخلہ لیا اور پھر اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ روحانی تربیت اور بیعت اپنے والد مکرم کے ہاتھ پر ہوئی۔ والد کی وفات کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھے۔ اپنے زورِ خطابت اور خوش بیانی پر سارے پنجاب سے دادِ تحسین حاصل کی۔ خانقاہ سے نکل کر میدانِ سیاست میں کود ے تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے پنجاب کے گدی نشین سید زادے کو صاحبزادے کے نام سے اپنی سٹیج کا شعلہ بیان مقرر بنا لیا۔ انگریز کے خلاف تقریروں نے پنجاب سے نکل کر سارے ہندوستان کو اپنی شہرت کی لپیٹ میں لے لیا۔ احرار کے جلسوں کی پر رونق ، سٹیجوں پر صاحبزادہ فیض الحسن کی خوش بیانی شنیدنی اور قادر الکلامی دیدنی ہوتی تھی۔ وہ اپنی جواں سالی ، سرو قدی اور خوش لباسی سے ناظرین کو متاثر کرتے اور زبان کی روانی اور بیان کی حلاوت سے حاضرین کو مسحور کر لیتے ۔ وہ پنجاب کے شہروں میں شیر کی گرج بن جاتے مگر ہندوستان کے جلسوں میں کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی زبان استعمال کرتے ان کی تقریر میں جاہ و جلال بھی ہوتا اور فصاحت و بلاغت کا کمال بھی قائم رہتا۔ وہ زورِ بیانی سے سامعین کے جذبات کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے مگر جب نکتہ آفرینی پر آتے تو سامعین کے دل و دماغ پر ادبی جملوں کے گلدستے بنا کر پھینکتے ہیں۔ حکومتِ برطانیہ نے انھیں بارہا گرفتار کیا اور پسِ دیوارِ زنداں کے ظلمت کدوں میں رکھا۔ انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کو ہمیشہ للکارا۔ ۱۹۳۰ء میں گرفتار ہوئے۔ پھر ۱۹۴۰ء میں فلسطین پر یہودیوں کی آمد پر سراپا احتجاج بن گئے تو پھر قید ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں تحریک ختم النبوت میں

(باقی صفحہ ۳۵۹ پر)

آغا شورش کاشمیری کی تقاریر نے میرے اس ذہن پر خاص اثر ڈالا جو تقریر و خطاب کے ابتدائی دور سے گزر رہا تھا۔ میں نے علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی تقاریر سنیں۔ مجھے مولانا ابوالکلام آزاد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مجلس عمل کے ممتاز رکن تھے اور مارشل لاء کے حکام نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ ۱۹۴۰ء تک آلو مہار رہے پھر گوجرانوالہ میں سکونت اختیار کر لی۔ مولانا غلام مہر علی گولڑوی نے آپ کو عربی زبان کے ان الفاظ میں ہدیۂ تحسین پیش کیا ہے:

"ما رأیت علی ظہر الارض فی ہٰذا العصر عدیلہ فی البیان المعجب والخطاب المدھش قد رزقہ اللہ صورۃ و جاھت کانہ بدر بہت لاً من السماء الحسینی وحسناً و جمالاً کانہٗ شمس یضیٔ من الفلک العلوی و خطابتہ و فصاحتہ وغزارہ وبلاغتہ وسجعاً کانہٗ وابل یمطر من سحب انوار المحمدی۔"

قیام پاکستان کے بعد آپ نے مجلس احرار اسلام سے علیحدگی اختیار کر لی اور علماء اہلسنت سے عملی طور پر آملے۔ عقیدت مند عوام اور خواص میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیا۔ ملکی سیاست میں حصہ لیتے ہوئے جمعیۃ العلماء پاکستان کے مقتدر اراکین میں شمار ہونے لگے۔ مولانا ابوالحسنات قادری کی وفات کے بعد آپ جمعیۃ کے صدر منتخب ہوئے

کی تقاریر سننے کا موقعہ ملا۔ مجھے مولوی حسین احمد مدنی اور مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے انداز پر سوچنے کا پورا پورا وقت ملا۔ پاکستان کی تشکیل کے کچھ عرصہ پیشتر مجھے حضرت قائد اعظم محمد علی جناح، مولانا شبیر احمد عثمانی، خان لیاقت علی خاں، عبد الرب نشتر اور مسلم لیگ کے دوسرے زعماء کی تقاریر نے بے حد متاثر کیا۔

ان دنوں مجھے ذوقِ مطالعۂ کتب نے تو تباہ کر دیا۔ میں عشاء کی نماز پڑھ کر بیٹھتا تو مختلف کتابوں کے مطالعہ میں غرق ہوتا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ صبح کا مؤذن اذان دیتا تو مجھے دھوکا ہوتا کہ کسی نے غلطی سے دوبارہ عشاء کی اذان دے دی ہے۔ اس عرصہ میں مجھے بہت سی کتابوں کے اوراق سے گزرنے کا موقعہ ملا۔ شبلی نعمانی کی سیرت النبی سے لے کر داستانِ امیر حمزہ اور فسانۂ آزاد تک پڑھ گیا۔ یکی روٹی سے لے کر پیراں دتہ کی سب توں وڈی تے باتصویر ہیر پڑھتا گیا روزنامے، ہفت روزے اور ماہ نامے رسالے میرے مطالعہ کی زد میں ہوتے۔ اس سلسلہ میں ترقی پسند ادب ہو یا میراعن دہلوی کا اردو، میری نظر سے بچ کر نہ جاتا ہے

نگاہ کے تیر سے گر بچ گیا شکار کوئی
تو بڑھ کے زلف نے اس کو اسیرِ دام کیا

کسبِ علم کے جنون نے اب مطالعہ سے ہٹا کر مجھے کتابت سیکھنے پر آمادہ کیا۔ اس وقت کے مایۂ ناز خطاط مولانا عبد الرشید عادل گڑھی جو قرآن پاک کی کتابت کیا کرتے تھے کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ مولانا ان دنوں فیروز سنز کا قرآن پاک عکسی جلی قلم سے لکھ رہے تھے۔ وہ لکھتے لکھتے تھک جاتے تو بڑے ترنم سے اساتذہ کے فارسی اور عربی اشعار پڑھتے۔ میں مشق حروف کرتے کرتے وہ شعر یاد کر لیتا یا لکھ لیتا۔ مجھے اس طرح اساتذہ کے اشعار کا ایک ذخیرہ ازبر ہو گیا۔ مجالس میں گفتگو کرتے وقت یا تقاریر کے دوران یہ اشعار کام آتے۔ مولانا عبد الرشید عادل گڑھی خود بھی شعر کہتے اور خوب کہتے۔ ایک بار سخت بیمار ہو گئے، علاج کارگر نہ ہوئے۔ ان دنوں مستی دروازے کے باہر حکیم نیر واسطی پنجاب بھر کے بیماروں کی آخری اُمید تھے۔ مولانا نے حکیم صاحب کے پاس کئی بار پیغام بھیجے مگر وہ عدیم الفرصت تھے نہ آئے۔ ایک دن فارسی میں ایک مرقع قصیدہ کہا، اور اپنے ایک شاگرد سے خوشخط لکھوا کر مجھے کہا کہ حکیم نیر واسطی کی خدمت میں جاؤں۔ میں حاضر ہوا۔

حکیم صاحب کے اردگرد بیماروں کا جمگھٹا تھا، میں نے خوش آوازی سے ابھی قصیدے کا مطلع ہی پڑھا تھا کہ حکیم صاحب کے شعری ذوق نے انھیں تڑپا دیا۔ وُہ اٹھے اور فرمانے لگے، چلو! مریض کو دیکھ آئیں۔ مطلع مجھے ابھی تک یاد ہے۔ ؎

"آفتابی ماہتابی یا کہ نیّر واسطی
بہرِ بیمارانِ خود دستِ مسیحا یافتی"

مجھے کتابت کی ابتدائی مشقیں کرنے کے بعد استادِ محترم نے سپارۂ قرآن لکھنے پر تیار کر لیا اور میرا قلم کتابت کی منزلوں سے گزرتا گیا۔ میں دن رات کتابت کرتا، خوب پیسے کماتا، آخر تھک گیا اور کتابت چھوڑ دی ؎

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے

فاضل فارسی اور عربی کی کتابوں کے مطالعہ نے مجھے ان طلباء میں امتیازی مقام دے دیا تھا، جو فاضل فارسی، فاضل اردو اور فاضل عربی کے امتحانات کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میں نے ان طلباء کے اصرار پر نیلا گنبد میں ایک مکتب میں فاضل فارسی کی تدریس کا اہتمام کیا اور دوسرے اساتذہ سے مل کر شبینہ کلاسوں کا آغاز کیا۔ اس درس گاہ میں دُور دُور سے طلباء آتے، مجھے ایک شفیق اُستاد پا کر فارسی و عربی پڑھتے۔ مجھے ان دو تین سالوں کی تدریس کا یہ فائدہ ہُوا کہ ایک طرف تو نصابی کتابیں ازبر ہو گئیں دوسری طرف لاہور کے بہت سے حلقوں میں میرے شاگرد پھیل گئے۔

یہ زمانہ لاہور کی سیاسی زندگی کا عروج دور تھا۔ ہر طرف جلسے اور معرکہ آرا اجتماعات ہوتے۔ ہندوستان بھر کے شعلہ بار خطیب اور مایۂ ناز سیاست دان آتے اور لاہور کی سیاسی فضا کو ہموار کرتے۔ مجھے ان جلسوں میں جانے کا اتنا چسکا تھا کہ کئی کئی میل تک سفر کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ مسلم لیگ اور کانگریس آہستہ آہستہ مسلمان و ہندو پلیٹ فارم میں تقسیم ہوتی جا رہی تھیں۔ کانگریس کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں دیو بندی علماء کو قابو کرنے کا موقعہ مل گیا۔ انھوں نے ان علماء کی صلاحیتوں سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ مسلمانوں کو مسلم لیگ سے متنفر کرنے کے لیے احرار، جمیعۃ العلماء ہند اور دیو بندی علماءِ دین کے علم اور بیان نے کانگریس کے لیے بڑا

کام کیا۔ اس عرصہ میں علماء اہلسنت اور مشائخ نے خانقاہوں سے نکل کر مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی پرزور حمایت کی۔ وہ اپنے شاگردوں اور مریدوں کے حلقوں میں پہنچے اور احرار اور جمعیۃ العلماء ہند کی ہندو نوازی کے دام کو پارہ پارہ کر دیا۔ ان حضرات میں سے پیر سیّد حافظ جماعت علی شاہ علی پوری، پیر آف مانکی شریف، پیر صاحب زکوڑی شریف، تونسہ اور سیال شریف کے روحانی خانوادے، گولڑہ شریف اور چورہ شریف کی بارگاہیں، شرقپور شریف اور بیربل شریف کے صاحبزادے میدانِ عمل میں نکل آئے۔ دیوبندی علماء اور احراری لیڈروں کے پاؤں پھسلنے لگے۔ اگرچہ وہ بڑے طلاق اللسان تھے۔ مگر علماء اہلسنت کے سامنے اور مشائخ کرام کے ہوتے ہوئے وہ کانگریس کی حمایت میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ ان دنوں علماء کرام میں سے مولانا عبدالغفور[۱] ہزاروی، مولانا محمد یوسف سیالکوٹی، علامہ ابوالحسنات[۲]

---

[۱] **شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی** فخرِ اہلسنت، فاضل محقق، علامۂ مدقق، استاذ المعقولین و منقولین، شیخ القرآن، ابو حقایق مولانا محمد عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ دورِ حاضرہ کے قادر الکلام خطیب، شعلہ بار مقرر اور معروف مفسرِ قرآن تھے۔ وہ اپنی تقریر سے سامعین پر جادو کر دیتے۔ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے عوام آپ کی پُرزور خطابت کے سامنے ایک خاموش سمندر نظر آتے۔ معاندین پر تنقید کرتے تو انہیں مبہوت کر دیتے۔ مزاح و تمسخر پر آتے تو سامعین کو لوٹ پوٹ کر دیتے۔ قرآن کے معانی بیان کرتے تو اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کرتے۔ تقریر کے دوران شعر کو بڑے مخصوص ترنم سے پڑھتے اور اسی شعر کو تقریر کا نکتۂ پرکار بنا لیتے اور خوب داد پاتے۔

آپ جامعہ نظامیہ کے شیخ القرآن اور وزیر آباد کی جامع مسجد کے تاحیات خطیب رہے۔ آپ کے والد کا اسمِ گرامی عبدالحمید ابن محمد عالم تھا۔ ضلع ہزارہ تحصیل ہری پور کے ایک گاؤں چنبہ میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں کافیہ تک اپنے والد سے پڑھیں۔ ہدایہ قاضی مبارک، حمد اللہ مطول، وقت کے شہرۂ آفاق استاد علامہ احمد دین اور ان کے صاحبزادے مولانا محب النبی کیمبل پور کے موضع بھوئی میں پڑھیں۔ ریاضی حضرت مولانا یار محمد بندیالوی سے قصبہ بندیال سرگودھا میں پڑھی۔

(باقی بر صفحہ آیندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) باقی علوم مولانا قطب الدین غورغشتی سے حاصل کیے۔ آپ علوم حدیث کی تحصیل کے لیے دہلی کے دارالعلوم فتحپوری میں داخل ہوئے۔ وہاں تسلی نہ ہوئی تو بریلی شریف کے مدرسہ منظرِ اسلام میں پہنچے اور صحاح ستہ حضرت حجۃ الاسلام مولانا شاہ حامد رضا رحمۃ اللہ علیہ ابن امام اہلسنّت اعلیٰحضرت بریلوی سے پڑھیں۔ آپ سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد بریلی کے مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے اور ایک سال تدریس کے بعد پنجاب چلے آئے۔ گجرات کے خدام الصوفیہ میں تین سال تک پڑھاتے رہے۔ ۱۹۳۶ء میں وزیرآباد کی جامع مسجد نزد ریلوے اسٹیشن کے خطیب مقرر ہوئے اور وہاں آپ نے جامعہ نظامیہ کی بنیاد رکھی۔

آپ خطیب اور مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست مناظر بھی تھے۔ ایک منطقی اور معقولی ہونے کی وجہ سے میدانِ مناظرہ میں اپنے مدِ مقابل پر حاوی رہتے۔ مولوی غلام خاں صاحب راولپنڈی کو تو میدانِ مناظرہ سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیتے۔ اپنے استاد مولانا احمد دین کے ساتھ حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ آپ تاحیات حضرت گولڑوی کے عرس کی مجالس پر تقاریر فرماتے اور حضرت صاحبزادہ سید غلام محی الدین گولڑوی (م ۱۹۷۴ء) کی نوازشات سے مالامال ہوتے۔ آپ نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پنجاب بھر میں احراری مولویوں کے مقابلہ میں زبردست تقریریں کیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے آپ کے زورِ خطابت کا سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے موازنہ کرتے ہوئے کہا تھا ؎

چشمہ اُبل رہا ہے محمد کے نُور کا
میں آج سے مرید ہُوں عبدالغفور کا
بند اس کے سامنے ہے بخاری کا ناطقہ
کیا اس سے ہو مقابلہ اس بے شعور کا

قیامِ پاکستان کے بعد جمعیۃ العلماء پاکستان کے نائب صدر رہے۔ تحریک ختم نبوت میں مجلس عمل کے ممتاز رکن تھے۔ ۱۹۵۳ء میں مارشل لاء میں گرفتار کر لیے گئے اور ایک عرصہ تک قید رہے۔ لیاقت علی خاں

(باقی بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۳) سے قرارداد مقاصد منظور کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایوبی دور میں جمیعۃ العلماء پاکستان کی تطہیر کے لیے زبردست تحریک چلائی۔ علماء کو جمع کیا اور صاحبزادہ سید فیض الحسن (اس وقت کے صدر جمیعۃ العلماء پاکستان) کو صدارت سے علیحدہ کر کے خود صدر منتخب ہوئے۔ محکمۂ اوقاف کی بدعنوانیوں پر سخت تنقید کرتے۔ ۸ر شعبان ۱۳۹۰ھ / ۱۰ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کی صبح کو نماز کے بعد درسِ قرآن دے کر سیر کو نکلے تھے کہ ایک تیز رفتار ٹرک کی زد میں آ گئے اور یوں شہادت کی آغوش میں جا پہنچے۔ (الثورۃ الهندیہ، شیخ القرآن حصہ اول، تذکرہ علماء اہلسنت)

لے **مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں** پنجاب کے مایۂ ناز خطیب، علماء اہلسنت کے قابلِ صد افتخار واعظ، مقبولِ عام سُنّی مصنّف الحاج مولانا محمد بشیر دامت برکاتہٗ کوٹلی لوہاراں کے علمی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ والد گرامی مشہور عالم سنی عالم دین مولانا محمد شریف محدث اپنے وقت کے جید فاضل تھے۔ آپ کی تربیت خصوصی طور پر علمی ماحول میں ہُوئی۔ ابتدائی علوم والد محترم سے حاصل کیے۔ ۱۹۲۵ء میں دارالعلوم حزب الاحناف لاہور میں داخل ہُوئے اور علامہ ابوالبرکات کے نامور شاگردوں میں شمار ہونے لگے۔ تقریر و خطابت میں ابھرتے ہُوئے آفتاب بن کر سندِ فضیلت حاصل کی اور گکھڑ کی جامع مسجد میں خطیب مقرر ہُوئے۔ آپ نے تھوڑے ہی عرصہ میں پاک و ہند میں اپنی شیریں خطابی اور فاضلانہ تقریر سے اپنی شہرت کا لوہا منوایا۔ عام علماء سے بلند ہو کر آپ انتخابِ شعر اور شعر خوانی میں ممتاز و منفرد ہیں۔ خود شعر کہتے ہیں۔ آسان کہنے میں سہل ممتنع ہیں مگر مزاح کے انداز میں قندِ پارسی کی حلاوت بن جاتے ہیں۔ شاعری میں کس سے تلمذ کیا، معلوم نہیں، مگر شعر می گوید بہ از قند و نبات۔ گکھڑ میں خطابت سے ہٹ کر اپنے گاؤں کوٹلی لوہاراں میں خطیب ہوئے۔ سُنّیوں کے صرف خطیب ہی نہیں بلکہ خطباء کو خطابت کا اندازِ نو بخشنے والے ہیں۔ اس موضوع پر آپ کی تصانیف واعظ، خطبات، خطیب، عورتوں کی حکایات، شیطان کی حکایات، حکایات الحیوان، سرورِ دو عالم، مثنوی کی حکایات، آجکل، حاجی لق لق، سچی حکایات کی کئی کئی جلدیں اور کئی کئی ایڈیشن چھپ کر مقبولِ عوام و خواص ہُوئے۔ ماہنامہ ماہِ طیبہ مدتوں خطباء اور مقررین کی علمی تربیت کرتا رہا۔ آپ کے نامور فرزند مجتبیٰ عطاءُ المصطفیٰ جمیل نے ایم اے عربی میں پنجاب یونیورسٹی سے طلائی تمغہ حاصل کر کے پنجاب بھر میں اولیت حاصل کی۔ آپ سُنّیوں کے محبوب نظر عالم دین ہیں۔

(ان دنوں مسجد شاہ چراغ ہائی کورٹ کے خطیب تھے)، مولانا غلام دین صاحب کے علاوہ بے شمار علماء اہلسنت نے نظریۂ پاکستان کی ترجمانی میں کام کیا۔ لاہور میں سب سے بڑا مرکز لوہاری دروازے کے باہر باغ میں ایک چھوٹی سی مسجد تھا (ان دنوں یہاں مسلم مسجد کی پرشکوہ عمارت ہے) جہاں مولانا محمد بخش مسلم بی اے پاکستان کے قیام کے لیے تقاریر کرتے۔ آپ کی تقاریر میں ادبی چاشنی، انگریزی کے برجستہ فقرے اور بھرپور سیاسیاتِ حاضرہ پر دلچسپ تبصرہ ہوتا اس لیے نوجوان طبقہ اور خصوصاً کالج کے طلباء بڑی تعداد میں پہنچتے۔ باغ بھر جاتا۔ آپ کی خوش الحانی سے راہ جاتے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ ان علماء اہلسنت کے علاوہ برصغیر کے دوسرے علماء اہلسنت نے بھی تحریکِ پاکستان میں بڑا حصہ لیا۔ وُہ ہر قصبہ اور ہر گاؤں پہنچتے اور کانگرسی علماء اور احراری مقررین کے اثرات کو زائل کر دیتے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہُوا تو میں لاہور میں تھا۔ لاہور خالی ہوتے بھی دیکھا، جلتے بھی، اور گلی کوچوں میں تڑپتے لاشے بھی دیکھے۔ ان دنوں میرا قیام اکثر اوقات قاری حافظ صدرالدین صاحب کی مسجد تاج دین مرحوم

ؔ **حضرت مولانا غلام دینؒ** مولانا غلام دین ان علماء اہلسنت میں سے ہیں جنھوں نے اپنے زورِ خطابت سے نام پیدا کیا ہے۔ وہ گجرات کے ایک چھوٹے سے گاؤں چکوڑہ میں پیدا ہُوئے۔ کنجاہ کے ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا محمد عبداللہ سلیمانی کنجاہی کے شاگرد خاص تھے فارسی و عربی کا ذوق لے کر لاہور پہنچے۔ دارالعلوم حزب الاحناف میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں سندِ فضیلت حاصل کی۔ مولانا حافظ مظہرالدین، مولانا محمد بشیر کوٹلہ لوہاراں کے ہم سبق تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر لال کھوہ موچی دروازہ میں ایک مسجد کی خطابت ملی۔ دو سال بعد انجن شیڈ کے پاس ایک خس پوش مسجد میں خطبۂ جمعہ دینے لگے۔ آواز میں رس تھا سینے میں جوش تھا۔ میاں محمد کے پُرسوز اشعار از بر تھے دیکھتے دیکھتے دُور دُور تک حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا مجمع آپ کے خطاب کے لیے جمع ہوتا۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ کا خطبۂ جمعہ لاہور کا تبلیغی مرکز تھا۔ تعمیرِ مسجد کی طرف توجہ کی تو ایک ویران جگہ میں عالیشان جامع مسجد بنا ڈالی۔ علامہ ابوالبرکات کے نامور اور قابل شاگردوں میں سے تھے ملک کے دینی جلسوں میں پہنچ کر خطابت کی داد پاتے۔ آپ واعظ خوش بیان، سراپا اخلاص، استقلال کا کوہِ گراں اور وضعداری کی تصویر تھے۔ جہادِ کشمیر اور تحریکِ ختمِ نبوت ۱۹۵۳ء میں ملک بھر کے دورے کیے۔ آپ کے صاحبزادے محمد رفیق ان کی علمی یادگار ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں نمازِ ظہر ادا کرنے اُٹھے واصلِ بحق ہُوئے۔ مدفن مسجد کے ساتھ بنا۔

(نزد مسجد وزیر خاں) میں ہوتا۔ حافظ صدر الدین صاحب نابینا ہیں مگر بڑے ذہین اور محنتی۔ وہ قرآن کے علاوہ طلباء کو انگریزی، فارسی اور دیگر نصابی کتابیں پڑھاتے۔ بجلی کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے۔ ریڈیو (ٹرانسسٹر) خود تیار کرتے۔ خودداری اور صبر و تحمل سے وقت گزارتے۔ وہ اپنی معذوری کے باوجود دوستوں سے مروت سے پیش آتے۔ شاگردوں سے شفقت اور محنت کرتے اور مخلصین کا بڑا احترام کرتے۔ لاہور میں سینکڑوں طلباء ان کے درس سے حافظ اور قاری ہو کر نکلے۔

قیامِ پاکستان کے بعد لاہور کی علمی دنیا میں زبردست انقلاب رُونما ہُوا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے علماء کرام، شعراء، ادیب اور قاری پاکستان میں آ گئے۔ بعض نے لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا اور اس طرح میرے حلقۂ احباب میں ان اہلِ علم کا بھی اضافہ ہو گیا جن کی مجھے صرف

لہ **قاری حافظ صدر الدین صاحب** آپ ضلع ریاست پٹیالہ بھارت کے ایک گاؤں میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہُوئے۔ آپ گوجر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑے ذہین اور ہونہار تھے۔ چیچک کی منحوس بیماری نے آ لیا اور بینائی چھین لی۔ ۱۹۳۴ء میں لاہور آئے۔ مولانا تاج الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں شرکت کی۔ یہ درس ان دنوں مسجد وزیر خاں کے شمال و مشرق کی طرف ایک چھوٹی سی مسجد میں تھا (ان دنوں یہ مسجد مولوی تاج الدین مرحوم کہلاتی ہے) مولانا تاج الدین قادری نے آپ کو نہایت محنت سے پڑھایا پھر وہ گڑھی شاہو، لاہور ریلوے لائن کے پاس ایک مسجد میں گئے تو حافظ صدر الدین کو اپنا جانشین امامت بنا کر گئے۔ حافظ صاحب نے اسی مسجد میں قرآن تدریس کا مدرسہ قائم کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد میٹرک اور ایف۔ اے تک طلبا کو انگریزی اور دوسرے مضامین میں بھی امداد دینے لگے۔ موتی بازار لاہور میں جب مدرسہ تجوید القرآن کے قاری فضل کریم مرحوم نے قرأت و تجوید کی تدریس شروع کی تو قاری صدر الدین صاحب نے باقاعدہ فنِ قرأت حاصل کیا۔ پھر اسی مدرسہ میں مدرس بنے اور کچھ عرصہ بعد آپ نے اپنی مسجد میں قرأت اور حفظِ قرآن کا ادارہ قائم کیا۔ آپ کے اس ادارے نے بڑے بڑے نامور شاگرد پیدا کیے۔ آج کے بہت سے قاری اور حافظانِ قرآن آپ کے مدرسہ سے فیض یاب ہیں۔ قاری صاحب کے ایک بھائی چوہدری نور دین صاحب ایم۔ اے سرگودھا میں پروفیسر رہے اور پھر اے ڈی آئی سکولز بھی ہُوئے آپ کے بڑے قدردان تھے۔ آپ ابھی تک اسی مسجد میں سرگرمِ عمل ہیں۔

نام سے ہی واقفیت تھی۔ بعض نے مساجد میں نئے انداز سے خطبے دینا شروع کیے اور بعض نے مدارس قائم کیے۔ ان دنوں حضرت مفتی محمد اعجاز ولی خاں رضوی نے حضرت داتا گنج بخش کے دربار میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کا نام جامعہ گنج بخش رکھا۔ اس میں ابتدائی طلباء داخل ہوتے۔ اس مدرسہ کے قیام میں حضرت پیر سید محمد معصوم شاہ[1] مالک نوری کتب خانہ نے دل کھول کر امداد دی۔

---

[1] پیر محمد معصوم شاہ نوری رح آپ کے والد مکرم حضرت سید فضل شاہ چک سادہ ضلع گجرات کے سجادہ نشین تھے۔ آپ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا امام الدین سے حاصل کی۔ ترجمۂ قرآن پاک پڑھا۔ بیعت بابا فضل نور رحمۃ اللہ علیہ مؤذن دربارِ حضرت داتا گنج بخش کے ہاتھ پر کی۔ اسی وجہ سے نوری کہلاتے تھے گجرات سے نقلِ مکانی کر کے حضرت داتا گنج بخش کے مزار کے زیرِ سایہ مقیم ہوئے۔ حضرت داتا گنج بخش سے عقیدت تھی۔ کئی کئی راتیں مزار پر گزار دیتے۔ ہفت روزہ درسِ کشف المحجوب دیتے اور اہل اللہ اور علماء کی صحبت اور مجالس سے مستفیض ہوتے۔ ۱۹۴۵ء میں نوری کتب خانہ کی بنیاد رکھی۔ آپ نے اس کتب خانہ کو امام اہلسنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات اور تصانیف کی اشاعت کا مرکز بنا دیا۔ اعلیٰحضرت کے سینکڑوں نایاب رسالے زیورِ طبع سے آراستہ کر کے سُنیوں تک پہنچائے۔ مفتی احمد یار خاں گجراتی نے آپ کے کہنے پر اعلیٰ حضرت کے ترجمۂ قرآن کنز الایمان پر تفسیری حاشیہ بنام نور العرفان لکھا اور نوری کتب خانہ نے شائع کیا۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے ایماء پر ہی مشکوٰۃ کی شرح مراۃ لکھنا شروع کی اور پہلی جلد آپ کے اہتمام میں چھپی۔ آپ راسخ العقیدہ سُنّی عالمِ دین، مستعد ناشر، عابد شب زندہ دار، اور زہد و تقویٰ کا نمونہ تھے۔ علماء اہلسنت کی تبلیغی سرگرمیوں کے معاون ہونے کے ساتھ ساتھ مساجد کی تعمیر کا بڑا اہتمام کرتے۔ چنانچہ آپ نے لاہور میں تقریباً بیس مساجد شاندار طریقہ سے تعمیر کروائیں۔ ریلوے اسٹیشن لاہور کے سامنے نوری مسجد کی تعمیر آپ کی زندگی کا عظیم کارنامہ ہے اور اعلیٰ حضرت بریلوی کے عقائد کا ایک مرکز قرار پا گئی۔ آپ کے مریدوں کا سلسلہ سارے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ کی اپنی تصانیف میں گلدستہ ہدایت، گلدستہ شریعت، سحری رونی پنجابی (فقہ)، مواعظ القرآن والحدیث، ہدایت نامہ بے نمازاں، معصوم ہدایت اور خطبۂ نوری بہت مشہور ہوئیں۔ آپ کے صاحبزادہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

حضرت مفتی اعجاز ولی خاںؒ رضوی رحمۃ اللہ علیہ صبح کو داتا صاحب کی مسجد میں درسِ قرآن دیتے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۳۶۷) سید محمد حسین آپ کے روحانی جانشین بنے اور صاحبزادہ سید محمد حسن شاہ نوری علمی جانشین نوری کتب خانہ کے مالک ہیں۔ آپ ۱۰ر جنوری ۱۹۶۹ء بروز شنبہ بوقت نماز عشاء واصل بحق ہوئے اور چک سادہ ضلع گجرات میں مدفون ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (تذکرہ علماء اہلسنت، مولانا محمود احمد قادری)

لے **مولانا مفتی محمد اعجاز ولی خاں رضوی قدس سرہٗ** وقت کے نامور فقیہہ، راسخ العقیدہ سُنّی عالمِ دین، اور پاکستان میں رضویت کے علمبردار تھے۔ ۲۴ر مارچ ۱۹۱۴ء بروز منگل بریلی شریف میں پیدا ہوئے۔ تقریب عقیقہ پر نام محمد تھا۔ عرف اعجاز ولی خاں تھا۔ ۲۵ر شعبان ۱۳۳۹ھ کو اعلیٰ حضرت بریلوی نے بسم اللہ شروع کرائی۔ قرآن پاک حافظ عبدالکریم بریلوی سے پڑھا۔ ابتدائی کتابیں اپنے بھائی تقدس علی خان سے پڑھیں۔ ۱۹۳۳ء میں منظر الاسلام بریلی سے سندِ فضیلت حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء میں مفتیِ اعظم ہند مولینا شاہ محمد مصطفیٰ رضا خاں سے سندِ حدیث حاصل کی۔ عملی زندگی کا آغاز بریلی کے این بی ہائی سکول میں مدرس کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں دار العلوم منظر الاسلام بریلی میں معقولات کی تدریس پر مقرر ہوئے دار الافتاء رضویہ بریلی میں فتاوٰی نویسی کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا تقدس علی خاں کے علاوہ علامہ مختار احمد سلطان پوری، حضرت مولانا محمد حسنین رضا خاں، مفتیِ اعظم ہند شاہ مصطفیٰ رضا خاں، مولانا سردار علی خاں، شاہ حامد رضا خاں اور صدر الشریعۃ مولانا امجد علی خاں کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔ سلسلۂ قادریہ میں مفتیِ ہند کی بیعت کی۔

۲۰ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو تقسیم ملک کے بعد پاکستان پہنچے۔ جامعہ محمدی جھنگ اور دار العلوم اہلسنت و الجماعت جہلم میں قیام کیا۔ جون ۱۹۵۴ء میں جامعہ نعیمیہ لاہور میں فقہ کے مدرس مقرر ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں دار العلوم نعمانیہ لاہور میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ تاحینِ حیات (۱۹۷۳ء تک) وہاں ہی علمی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ وفات سے کچھ دن پیشتر نعمانیہ کی انتظامیہ نے آپ کی جمعیۃ العلماء پاکستان سے وابستگی پر اعتراض کیا تو آپ مستعفی ہو گئے پھر کرشن نگر کی جامع مسجد میں خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

دن کو طلباء کو پڑھاتے۔ اس مدرسہ نے آہستہ آہستہ اپنا نام پیدا کر لیا۔ آپ نے یہاں سے ایک ماہنامہ رسالہ گنج بخش جاری کیا جو کچھ عرصہ چل کر دم توڑ گیا۔ ان دنوں مجھے تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ فکرِ معاش نے آ دبوچا۔ میں ایک طرف تو اپنے مستقبل کو علم کی ضیاء سے روشن کرنے کا آرزومند تھا، دوسری طرف اپنے معاشی حالات کی بہتری کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ چنانچہ مجھے ملازمت کے لیے مختلف دفاتر میں درخواستیں دینا پڑیں۔ لطف کی بات ہے کہ جس دفتر میں بھی انٹرویو کے لیے جاتا چند دن بعد منظوری کے کاغذات آجاتے۔ اب میں مختلف دفاتر کی ملازمتوں کی منظوریاں سامنے رکھ کر دوستوں سے مشورے کرتا کہ کون سا محکمہ ملازمت کے لیے اختیار کروں۔ مجھے ان دنوں سرکاری محکموں کی اہمیت کا علم نہ تھا تاہم احباب کے کہنے پر ایک محکمہ کو اپنا لیا اور کام کرنے لگا۔ تنخواہ ملتی، گزر اوقات کر لیتا۔ شہر کی گنجان آبادی سے نکل کر مجھے شادباغ میں اپنا مکان مل گیا اور میں بڑے سکون کے ساتھ رہنے لگا۔ صبح دفتر جاتا، شام تک اہلِ علم کے پاس بیٹھتا۔ شام سے دس بجے تک شبینہ کالجوں میں پڑھاتا اور رات گئے تک مطالعہ کتب میں غرق رہتا۔

قیامِ پاکستان کے بعد سُنّی علماءِ کرام کا ایک طبقہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد میں مصروف ہوگیا۔ دیوبندی علماء، احرار کے مقررین اور کانگرس نواز علماء تو قیامِ پاکستان کے خلاف کام کرتے رہے تھے۔ وہ کچھ عرصہ تک دینی قیادت سے یکسر محروم ہو چکے تھے۔ وہ جہاں کہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ملکی سیاسیات میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کی حمایت میں تقریریں شروع کیں۔ ۱۹۴۲ء میں قیامِ پاکستان کی قرارداد پر بریلی سے فتویٰ جاری کیا اور تمام مسلمانوں پر پاکستان کی حقیقت واضح کی۔ پنجاب کے اکثر اضلاع کا دورہ کیا اور مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ آپ کی تصانیف میں سے تسہیل الواضح، قانونِ میراث، تنویر القرآن (تفسیر قرآن)، رسائل شیخ محدث دہلوی اور ترجمہ کشف الاسرار (داتا گنج بخش) قابلِ ذکر ہیں۔ آپ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے رشتہ دار ہیں۔ آپ کے والد سردار ولی خاں، دادا ہادی علی خاں، پردادا نقی علی خاں تھے۔ نقی علی خاں اعلیٰحضرت کے والدِ مکرم تھے۔ وفات ۱۹ دسمبر ۱۹۷۳ء کو لاہور میں ہوئی اور میانی صاحب کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

بھی آباد ہوئے بڑی ندامت کے ساتھ وقت گزارتے۔ بعض تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیاست سے علیحدہ ہو گئے۔ بعض خاموش ہو گئے، بعض نے ہمت کر کے پاکستان کے حق میں تقاریر کرنا شروع کر دیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی پاکستان کے بدترین مخالفوں میں سے تھے، لاہور میں آئے تو مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی مسجد شیرانوالہ میں مقیم ہوئے مگر کچھ عرصہ بعد واپس ہندوستان چلے گئے۔ سنی علمائے نے قرارداد مقاصد کے لیے خان لیاقت علی خاں وزیر اعظم کو آمادہ کیا۔ ادھر کشمیر کی جنگ چھڑنے سے بہت سے علماء جہاد کشمیر میں شریک ہونے لگے۔ انہوں نے جمعیتہ العلماء پاکستان کی تنظیم کی اور غازیِ کشمیر مولانا ابوالحسنات کی قیادت میں کام کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں مولانا غلام محمد ترنم، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا غلام دین، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، حافظ خادم حسین نقشبندی اور مولانا اکرام حسین مجددی جہاد پر تقریریں کرتے۔ غازیانِ کشمیر کے لیے چندہ جمع کرتے اور خود محاذ پر جا کر تقسیم کرتے۔ مجھے ان دنوں شریعت کانفرنس کی تیاری میں پہلی بار علماء اہلسنت سے مل کر کام کرنا پڑتا۔ ہم دن رات کام کرتے۔ قراردادیں، جلسے اور پھر کتابچے چھپوانے میں مصروف رہتے۔

ان دنوں مجھے تقریر کرنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ میں اکثر علماء کی سٹیج پر کھڑا چند منٹ کے لیے حاضرین کو مخاطب کرتا اور پھر حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی کی مسجد ٹبی کوتوالی میں جمعہ کی نماز سے پہلے خطبہ دینے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے جمعہ پر میرے مخاطبین کی تعداد صرف بیس تھی، مگر اس تعداد میں ہر جمعہ اضافہ ہوتا گیا۔ بعض نوجوان میری تقریر کو پسند کرتے بعض افراد حوصلہ افزائی کرتے۔ اگر میں بددل ہو کر غیر حاضر ہوتا تو مجھے بعض احباب پکڑ کر تقریر کراتے۔ سامعین کی تعداد میں اضافہ ہوتے دیکھ کر میرے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ لوگ میری تقریر پسند کرتے ہیں لہٰذا مجھے تقریر کرنا چاہیے۔ میں علی الصباح دریائے راوی کے کنارے پر چلا جاتا اور دل کھول کر تقریر کرتا، شعر پڑھتا اور موضوعات پر غور کرتا۔ جس موضوع پر تقریر کرنا ہوتی اس پر کئی کئی کتابیں دیکھتا۔ آواز کے اتار چڑھاؤ میں ان مقررین کے اسلوبِ بیان کو ذہن میں رکھتا جن کی تقاریر نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میں اپنے اس شوق پر بڑھتا چلا گیا حتیٰ کہ مسجد بھری جانے لگی۔ میں تقریر میں زور پکڑتا گیا۔ کچھ عرصہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے تقریر ہوئی۔ اب مسجد میں لاؤڈ اسپیکر نصب ہو گیا۔

جب میں دورانِ تقریر مثنوی مولانا روم کے اشعار ایک للکار سے سناتا تو سڑک پر لوگوں کے چلتے چلتے رُک جاتے اور وہ کئی کئی لمحے میری تقریر سنتے رہتے۔ سامعین کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا تو مسجد کی چھت، مسجد کے سامنے کا میدان اور پھر کوتوالی کا باغ بھرا جانے لگا۔ لوگ دُوسری مساجد سے نمازِ جمعہ پڑھ کر آتے تو میری تقریر سُننے کے لیے فُٹ پاتھ پر کھڑے ہوجاتے۔ دینی مدارس کے طلباء میری تقریر سے نوٹ لینے لگے۔ علماء مجھے تعریفی کلمات سے نوازنے لگے۔ میں دفتروں میں جاتا تو میرے سامعین دوڑ کر ملتے۔ مارکیٹ میں جاتا تو دکاندار بڑھ کر احترام کرتے۔ سفر کرتا تو لوگ احترام میں کھڑے ہوجاتے۔ ذالک فضل اللہ۔

انہی ایام میں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی[1] دامت برکاتہ، سے تعارف ہُوا۔ آپ غالباً ان دنوں

---

[1] **مفتی محمد حسین نعیمی مدظلہ العالی** جامعہ نعیمیہ لاہور کے بانی شیخ الحدیث اور مہتمم اور ممتاز سُنّی عالمِ دین ہیں۔ وہ دینی علوم کی اشاعت کی عملی قوت کے ساتھ ساتھ سیاسیاتِ حاضرہ پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں سنبھل ضلع مراد آباد انڈیا میں پیدا ہُوئے۔ والد مکرم ملّا تفضل حسین مرحوم سنبھل کے ایک ممتاز تاجر تھے جنہیں دین اور شعائرِ اسلام سے دلی محبت تھی۔ وُہ اپنے بیٹے کو عالمِ دین اور مبلغِ اسلام دیکھنے کے خواہاں تھے۔ ۱۹۳۳ء میں حضرت مولانا نعیمی جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں داخل ہُوئے۔ دُو سال میں فارسی کی کتابیں اور سات سال میں درسِ نظامی پر عبور حاصل کیا۔ جامعہ نعیمیہ میں ان دنوں آپ کے بہنوئی مولانا محمد یونس صاحب (جو حضرت صدر الافاضل کے وصال کے بعد جامعہ کے مہتمم اعلیٰ بنے) تدریس پر مقرر تھے۔ ان دنوں حضرت صدرالافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے چند طلباء پر خصوصی توجہ دینے کے لیے چند ذہین طلباء کی ایک علیٰحدہ جماعت بنائی جس میں حضرت مفتی محمد حسین نعیمی کے علاوہ مولانا حافظ نذیر الاکرم (مبلغ اسلام افریقہ ویورپ)، مفتی حبیب اللہ صاحب، مولانا ریاض الحسن صاحب اور مخدوم معین الدین نعیمی (مدیر سوادِ اعظم لاہور) شامل تھے۔ صدرالافاضل کی زندگی کا یہ آخرین خصوصی حلقہ طلبا تھا۔ مفتی صاحب ۱۹۴۲ء میں سندِ فراغت لے کر میدانِ عمل میں نکلے۔ تعلیم کے دوران جن اساتذہ سے مفتی صاحب نے استفادہ کیا ان میں سے مولانا وصی احمد سہسرامی، مولانا شمس الدین بہاری، مولانا محمد عمر نعیمی (مدفن کراچی) اور (باقی برصفحہ ۳۷۲)

مدرسہ نعمانیہ میں پڑھایا کرتے تھے۔ وُہ بڑے محنتی اور مستعد نوجوان عالمِ دین تھے۔ مجھے حوصلہ افزا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۱) مولانا محمد یونس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری نے صدر الافاضل کو دارالعلوم حزب الاحناف لاہور کے لیے ایک مدرس بھیجنے کا لکھا تو صدر الافاضل نے مفتی محمد حسین صاحب کو ۱۹۴۲ء میں لاہور بھیجا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک حزب الاحناف میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک دارالعلوم نعمانیہ میں مدرس رہے۔

تحریکِ ختمِ نبوّت زوروں پر تھی۔ مفتی صاحب نے سید محمود احمد رضوی کے ساتھ مل کر حزب الاحناف اندرون دہلی دروازہ میں ایک مرکز قائم کیا، جہاں پولیس اور فوج کے نوجوانوں کو تحریک ختم نبوت کی اہمیت پر ذاتی مشین پر پمفلٹ چھپوا کر تقسیم کرتے۔ مارشل لاء کے دوران گرفتار کر لیے گئے۔ فوجی عدالت نے بری کر دیا مگر دُوسرے مقدمہ کی سماعت جاری تھی کہ مارشل لاء کا زور ٹوٹ گیا اور آپ بری ہو گئے۔ مفتی صاحب جیل سے رہا ہو کر آئے تو نعمانیہ سے استعفا دے دیا اور اپنی مسجد چوک دالگراں میں ایک دینی دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ اس دارالعلوم میں پہلی بار جن اساتذہ نے مفتی صاحب کے ساتھ علمی وستِ تعاون بڑھایا ان میں حافظ محمد عالم صاحب سیالکوٹی، مولانا عبدالمصطفیٰ ازہری (ایم این اے جمعیۃ العلماء پاکستان)، مولانا عبدالغفور صاحب لاہوری، مولانا عبدالحئی صاحب کے اسماء گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جامعہ نعیمیہ کی بڑھتی ہُوئی شہرت نے طلباء کی ایک خاصی تعداد جمع کر لی۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں مسجد میں جگہ کی کمی کی وجہ سے دارالعلوم کو چوک دالگراں سے عیدگاہ گڑھی شاہو میں منتقل کر دیا گیا اور اس ویران مسجد اور عیدگاہ پر طلبہ کے لیے رہائش اور تدریس کا کام ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ یہاں ایک عظیم الشان مسجد اور دارالعلوم کی قابلِ رشک عمارت کی تعمیر شروع ہو گئی۔ مفتی صاحب کی شبانہ روز محنت اور خلوص نے لوگوں کے اندر بے پناہ جذبۂ تعمیر و تدریس پیدا کیا چنانچہ یہاں ۸ لاکھ روپے کی لاگت سے شاندار دارالعلوم قائم ہوتا گیا۔

ان دنوں اس دارالعلوم میں جناب مولانا غلام رسول صاحب سعیدی، مولانا غلام رسول قادری، مولانا احمد حسن نوری اور دیگر نامور علماء کرام مصروفِ تدریس ہیں۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

کلمات سے نوازتے ۔ ہم لوگ اکثر مولانا ابوالحسنات کا ہفت روزہ درس سُننے چوک دالگراں جاتے وہاں بہت سے احباب اور اہل علم سے ملاقات ہُوئی۔ چوک دالگراں کے پاس ہی مقبول عام پریس میں مولانا ابوالحسنات بیٹھتے ۔ پریس کے مالک میاں محمد شریف، میاں حاجی احمد دین مرحوم بڑے نیک لوگ تھے ۔ علماء کا احترام کرتے ، خاطر و مدارات کرتے اور کارِ خیر میں بڑا حصّہ لیتے ۔ مولانا مفتی نعیمی صاحب کے ساتھ مجھے بھی وہاں چند لمحے بیٹھنے کا موقعہ ملتا اور میں اس حلقے میں متعارف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۲) مفتی صاحب کے نامور شاگردوں میں سے مولانا الٰہی بخش ، مولانا باغ علی نسیم صاحب مولانا ارشد پناہوی ۔ محمد اشرف کاظمی (مفتی کشمیر) ، حافظ محمد عالم صاحب سیالکوٹی ، قاری غلام رسول صاحب ، مولانا غلام رسول صاحب سعیدی ، مولانا فیض الحسن تنویر ، مولانا عبدالحکیم صاحب شرف ، مولانا محمد سعید نقشبندی (خطیب داتا گنج بخش) ، صاحبزادہ حبیب اللہ خطیب سرائے عالمگیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

۱۹۶۷ء میں جمعیۃ العلماء پاکستان کی تطہیر کے لیے مفتی صاحب نے ایک زبردست مہم چلائی ۔ وہ جمعیۃ العلماء کو ایک فعال جماعت بنانا چاہتے تھے ۔ حکومت کے وظیفہ خوار اور حاشیہ بردار درباری علماء سے اسے علیحدہ کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ آپ کی کوششوں سے ملک بھر کے سُنّی علماء ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور جمعیۃ العلماء کی قیادت شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی کے ہاتھ آ گئی ۔ چوک دالگراں کی جامع مسجد کو محکمہ اوقاف نے اپنے قبضہ میں لے لیا ۔ صدر ایوب کے دور میں جب تمام علماء کو حکومت کی مرضی پر عید پڑھانے کو کہا گیا تو مفتی صاحب نے سخت احتجاج کیا ۔ چنانچہ آپ کو دوسرے علماء کے ساتھ گرفتار کر کے مچھ جیل بلوچستان میں قید کر دیا گیا ۔

آپ بڑے باہمت ، مخلص اور باشعور علماء میں شمار ہوتے ۔ آپ کی ہمت اور محنت کی ترجمانی دارالعلوم کی عظیم عمارت اور خوش انتظامی کرتی ہے ۔ وہ دوستوں کی بڑی قدر کرتے ہیں اور اپنی سیاسی بصیرت کی وجہ سے عالمِ اسلام کی نامور شخصیتوں کو دعوت دے کر جامعہ کی مختلف تقاریب میں جمع کرتے ہیں ۔ محکمہ اوقاف کی پے در پے سختیوں کے باوجود وہ اپنا کام کرتے جاتے ہیں اور علمِ دین کی اشاعت میں دن رات مشغول رہتے ہیں ۔ انہوں نے مجلہ عرفات کو جاری رکھا ہوا ہے ۔ قاضی عیاض کی الشفاء ، مولانا ابوالحسنات کی اوراقِ غم اور الخیرات الحسان کی اس وقت طباعت کرائی جب کوئی ناشران کی اشاعت کے لیے تیار نہ ہوتا تھا ۔

ہوتا گیا۔ ان دنوں مقبول عام پریس میں قرآن کی طباعت کے ساتھ ساتھ روزنامہ نوائے پاکستان چھپا کرتا تھا۔ میاں شریف صاحب اس کے ناشر ہی نہ تھے مالک بھی تھے۔ ان دنوں اخبار کو جناب مجاہد الحسینی اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش ایڈٹ کرتے۔ حاجی عطا محمد چشتی المعروف حاجی لق لق مطائبات لکھتے۔ احرار کے لیڈر مکالمے لکھتے۔ میں اگرچہ نظریاتی طور پر احراری لیڈروں اور دیوبندی علماء کے ساتھ نہ چل سکتا تھا مگر ایک دوست ہونے کی حیثیت سے میاں محمد شریف کی مجلس میں مولانا احمد علی لاہوری۔ مولانا محمد علی جالندھری۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی (داماد مولانا احمد علی لاہوری)۔ ماسٹر تاج الدین انصاری اور دُوسرے دیوبندی حضرات سے تعارف کا مجھے موقعہ ملا۔ میاں شریف صاحب بڑے سادہ لوح آدمی تھے۔ میں دیکھتا کہ احراری بزرگوں نے جب مُرغ کھانے ہوتے تو علیحدگی میں چند لمحے سرگوشیاں کرتے اور پھر میاں صاحب کے کمرے میں جاکر اخبار کی پہلی سُرخی کی تعریف کرتے۔ دُوسرے صاحب سُرخی لکھنے والے کے کمال کی داد دیتے اور تیسرے صاحب سُرخی کے پاکستان بھر میں اثرات پر زور دار بیان دیتے۔ اس تمہید کا چونکہ مجھے پہلے ہی علم ہوتا تھا اس لیے کچھ تعجب نہ ہوتا ایک اور صاحب بڑھتے میاں صاحب کی تعریف یُوں کرتے کہ یہ سارا کریڈٹ تو مالکِ اخبار کو جاتا ہے کیوں نہ اس سُرخی پر مُرغا اُڑے۔ چنانچہ ایک مُرغا کیا دسترخوان پر درجنوں مُرغے بے بال و پر نظر آتے۔ ان حالات میں اخبار تو کیا اخبار والے کا بھی دیوالیہ نکل گیا۔ میاں شریف لاکھوں روپے سے ہاتھ دھو کر اخبار کے بل اور دیگر لوازمات کے بوجھ کے نیچے دب گئے۔ مقبول عام پریس سے نوائے پاکستان کی بندش کے ساتھ ساتھ علماء احرار و دیوبند کا آنا جانا کم ہوتا گیا اب سُنّی علماء پریس میں آتے۔ یہاں مولانا محمد بخش مسلم[1] بی۔ اے سے تعارف ہُوا۔ وُہ ایک عرصہ تک لاہور میں خطابت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ میں

---

[1] مولانا محمد بخش مسلم بی اے۔ آپ وضعدار اور مرنجاں مرنج علماء کرام کی یادگار ہیں۔ اپنی خوش بیانی اور قادر الکلامی کی وجہ سے برصغیر میں معروف ہیں۔ مسلم مسجد لاہور آپ کی خطابت کا ثمرہ ہے۔ خوش آواز ہیں اور حاضرین کو اچھا تاثر دیتے ہیں۔ آپ کی بے پناہ سیاسی اور دینی خدمات کی وجہ سے موجودہ حکومت نے اسلامک کونسل کا رکن منتخب کیا ہے۔

ان کی سیاسی اور علمی بصیرت کا بڑا معترف تھا۔ وہ نظریہ پاکستان پر بڑی زور دار تقاریر کرتے کالجوں اور بیرونی مہمانوں کی آمد پر سرکاری تقاریب میں برجستہ تقاریر کرتے۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ، نواب ممدوٹ، سردار شوکت حیات خاں اور راجہ غضنفر علی انہیں اپنے پاس بلاتے اور تحریکِ پاکستان کا ایک خوش بیان خطیب ہونے کی وجہ سے بڑا احترام کرتے۔ میں نے ان مجالس میں ان سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ ایک دن بیان کر رہے تھے کہ دہلی دروازے کے باہر ایک مسجد میں جمعہ کے روز ایک نوجوان طالب علم تقریر کرتا ہے لوگ اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ وہ اندازِ نو میں سوچتا ہے جا کر سنو، کون ہے! جب انہیں پتہ چلا کہ وہ میں ہی ہوں تو بڑے خوش ہوئے۔ بڑی حوصلہ افزائی کی اور بڑے مفید مشورے دیے۔

اسی مجلس میں صاحبزادہ میاں جمیل احمد[1] شرقپوری سے واقفیت ہی نہیں دوستی ہوئی۔ اگرچہ

حضرت صاحبزادہ پیر میاں جمیل احمد

[1] **صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری** صاحب شرقپوری مدظلہ العالی

بارگاہِ نقشبندیہ شرقپور شریف کے سجادہ نشین، مشائخِ پاکستان میں ممتاز اور علماء اہلسنت کے قدر دان بزرگ ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت میاں غلام اللہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں شیر محمد صاحب قطب ربانی کے بھائی تھے۔ میاں جمیل احمد صاحب کی ابتدائی تعلیم اسی روحانی خانوادہ میں ہوئی۔ دربار کے علماءِ دین نے دینی علوم کی تعلیم دی۔ شرقپور ہائی سکول سے میٹرک کیا۔

فاضل فارسی کیا۔ پھر اسلامیہ کالج لاہور سے ایف اے تک پڑھا۔ والد مکرم کی وفات کے بعد خلفائے دربارِ شرقپور نے دونوں بھائیوں (میاں غلام احمد صاحب اور میاں جمیل احمد صاحب) کی سجادگی اور خلافت کو تسلیم کیا۔ میاں جمیل احمد صاحب نے اس سلسلہ میں سخت محنت سے کام لے کر ملک بھر کا دورہ کیا۔ عقیدتمندوں کو روحانی سلسلہ سے مربوط کیا۔ علماء و مشائخ سے رابطہ پیدا کر کے نقشبندی سلوک کو عام کرنے میں جدوجہد کی۔ لاہور میں ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک مقبول عام پریس میں قیام فرماتے۔ ہر جمعرات کو مجلسِ ذکر و مراقبہ ہوتی ۱۹۶۴ء میں بیرون لوہاری دروازہ ایک مکان میں جہاں علماء، فضلاء اور مشائخ کا جمگھٹا رہتا، طلباء اور عقیدت مند بھاری تعداد میں آتے۔ میاں صاحب کا دسترخوان وسیع، زبان شیریں، نگاہ میں احترام، وضعداری میں عالی نسبی کے اوصاف تھے، ہر دلعزیز ہو گئے۔ رسالہ نور الاسلام کئی سال تک نکالتے رہے اور ملک بھر

(باقی بر صفحہ ۳۷۶)

ہیں دونوں صاحبزادگان (میاں غلام احمد صاحب اور میاں جمیل احمد صاحب) کو طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا مگر میاں جمیل احمد ایک نوخیز پیر کی حیثیت سے شرقپور کی سجادگی پہ جلوہ افروز ہُوئے۔ لوگ آکر مرید ہوتے اور یہ مجلس احراری لیڈروں کے برعکس ایک مجلس تصوّف میں بدلتی رہی جہاں علماء اہلسنت آتے، ذکر و نعت ہوتی۔ بزرگانِ دین کے واقعات بیان کیے جاتے اور ہر طرف خاموشی ہوتی تو سلسلۂ نقشبندیہ کے عقیدت مند مراقبے میں نظر آتے۔ میاں جمیل احمد صاحب بڑے دریا دل صاحبزادے تھے۔ ہاتھ کھلا، مہمان نوازی، دوست نوازی اور پھر مرید نوازی کے سارے مراحل سے گزرتے اور بڑی خُوبی سے گزرتے۔ انہی مجالس میں مولانا خلیل احمد قادری، مولانا غلام دین، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا ابوالحسنات قادری رحمتہ اللہ علیہ۔ حافظ خادم حسین نقشبندی تشریف لاتے اور علمی گفتگو ہوتی۔

تحریک ختم نبوت کے آغاز تک مجھے علماء اہلسنّت کے حلقے میں ایک مقام حاصل ہوچکا تھا میں اہلسنّت کی انتظامی مجالس میں شرکت کرتا اور میری رائے کو وزن دیا جاتا۔ میں ان دنوں اس تحریک کے ان خفیہ رہنماؤں سے رابطہ رکھتا جو زیرِ زمیں کام کر رہے تھے۔ تحریک کے لیڈروں کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵)
میں مشہور ہُوئے۔ مسلک مجددیہ پر بہت سی کتابیں لکھوا کر ملک میں تقسیم کیں۔ پاکستان بھر کے شہروں میں دینی اجتماعات کرا کر علماء کی تقاریر اور مواعظ کا بندوبست کیا۔

اشاعت علوم اسلامیہ میں بھرپور حصّہ لیا۔ وہ مشائخ اور علماء میں یکساں طور مقبول و محبوب ہیں۔ عبادت گزار اور شب بیدار ہیں۔ کئی بار حج کیا بلکہ ہوش سنبھلنے پر ہر سال حج کیا۔ اسلامی ممالک کے اکثر دورے کیے۔ بزرگانِ دین کے مزارات پر گئے اور مختلف ممالک کے مشائخ سلسلہ سے ملے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں قصور سے قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصّہ لیا اور بے پناہ ووٹ حاصل کیے۔ شرقپور میں دارالعلوم دارالمبلغین آپ کی نگرانی میں چلتا ہے۔ آپ کے عقیدت مندوں میں علماء، خطباء، صحافی، امراء و فقراء کی بہت بڑی تعداد شامل ہے۔ نورِ اسلام کا امام اعظم نمبر نکلا تو علمی حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کی۔ وہ میرے مخلص احباب میں سے ہیں اور میں ان کے نیاز مندوں میں ان کی محبت، شفقت اور تعاون میرے لیے باعثِ صد افتخار رہا اور میرا خلوص، نیاز مندانہ تعلق اور سراپا احترام میاں صاحب کے لیے سامان راحت ولی بیار ہے۔

گرفتاری کے بعد پرجوش عوام پنجاب بھر کے شہروں سے لاہور جمع ہونے لگے۔ ان کے ساتھ مختلف علماء بھی آنے لگے اور جلسہ گاہوں میں تقریریں کرتے۔ مولانا محمد یوسف سیالکوٹی مرحوم ان دنوں سیالکوٹ سے چل کر میرے پاس رہے اور بعض مقامات پر پُرجوش تقاریر کرنے کے بعد روپوش رہے پولیس کی تلاش کی وجہ سے وہ زیرِ زمین کام کرتے رہے۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد لاہور کو چھوڑ کر پیدل دریا عبور کر کے ویران آباد دیہات کی طرف نکل گئے۔ پولیس اور فوج ان کی تلاش میں ماری ماری پھرتی۔ ان دنوں مولانا عبدالستار خاںؒ صاحب نیازی ایم۔ پی۔ اے مسجد وزیر خاں میں تحریک کے

ؒ **مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی** سُنّیوں کے مایۂ ناز خطیب اور بے باک عالمِ دین مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی صدر جمعیۃ العلماء پاکستان میانوالی کے موضع پنیالہ اٹک میں نیازی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں عیسیٰ خیل کے ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ لاہور پہنچے۔ ۱۹۳۹ء میں اشاعت اسلام کالج میں داخلہ لیا اور پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر کی حیثیت سے 'خلافت پاکستان' کی تحریک کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۴۰ء میں حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور میں ایک عظیم الشان خلافت کانفرنس منعقد کی۔ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی قرارداد پیش کی۔ تحریک پاکستان میں بڑا زبردست کام کیا۔ "پاکستان کیا ہے؟" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں پاکستان کے آئین کی وضاحت کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد خلافتِ پاکستان گروپ قائم کیا۔ ۱۹۴۸ء میں "خلافت پاکستان" اخبار جاری کیا۔ ۱۹۵۲ء میں قراردادِ مقاصد کے لیے "آئینِ خلافتِ پاکستان" پیش کیا۔ "تحریک تحفظ ختم نبوت" میں ایک پُرجوش قائد کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور مسجد وزیر خاں لاہور کو مرکز بنا کر سارے پنجاب میں تحریک کو چلایا۔ مارشل لاء کے نفاذ پر ۱۹۵۳ء میں گرفتار کر لیے گئے۔ سزائے موت کا حکم ملا جو بعد میں عمر قید میں تبدیل ہو گئی۔ آپ کے رفقاء کار میں علماء دین کے علاوہ مولانا محمد ابراہیم علی چشتی، حکیم محمد انور بابری، میاں محمد شفیع (م۔ش) اور محمد عمر خاں نیازی پیش پیش تھے۔ ۱۹۵۵ء میں جیل سے رہا ہوئے تو ملک میں زبردست تقریریں کیں لیکن حکومتِ وقت نے آپ کو باغیانہ تقریر کے الزام میں بنگال ریگولیشن کے ماتحت جیل میں ڈال دیا۔ ایوبی دور میں بین الاقوامی اسلامی سیمینار (مذاکرہ) لاہور میں منعقد ہوا تو (باقی صفحہ ۳۰۸ پر)

سربراہ بنے۔ بہت سے علماء گرفتار کرلیے گئے۔ بعض زیرِ زمین چلے گئے مگر نیازی صاحب شہریوں اور لاہور پہنچنے والے پُرجوش وفود کو مربُوط کرنے کے لیے مسجد وزیر خاں کے مرکز میں آ پہنچے ——

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۷) چودھری ظفر اللہ خاں کو صدارت سے علیحدہ کرنے کے لیے آگے بڑھے اور انھیں اس صدارت سے علیحدہ کرا دیا۔ ۱۹۵۹ء میں صدر ایوب کی آمریت پُورے شباب پر تھی۔ کسی کو مجال نہ تھی کہ حرفِ مدعا زباں پر لائے۔ مولانا نے پبلک جلسے کرکے عوام سے خوف و ہراس دُور کیا۔ بغاوت کے ۱۴ مقدمات قائم ہُوئے مگر یہ مردِ درویش تمام مقدمات سے بری ہو گیا۔ ۱۹۶۲ء میں کراچی سے گرفتار کرلیے گئے۔ نواب آف کالا باغ نے کئی بار گرفتار کیا، مقدمے قائم کیے اور قاتلانہ حملے کرائے مگر نیازی صاحب ہر بار تازہ جوش لے کر اُبھرے۔ ۱۹۶۸ء میں ایوبی گورنمنٹ کے آخری ایام میں ایبٹ آباد تقریر کی۔ گرفتار کرلیے گئے مگر پشاور ہائی کورٹ نے رہا کر دیا۔ نواب آف کالا باغ کے دورِ اقتدار میں قومی اسمبلی کے انتخابات میں ان کے لڑکے سے مقابلہ کیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سوشلزم کی سخت مخالفت کی۔ جمعیۃ العلماء کے ٹکٹ پر میاں والی سے قومی اسمبلی کے لیے کھڑے ہوئے۔ وہ پاکستان کے آئین کو خراب کرنیوالے ۰ اینگلو محمڈن نوابوں "کے خلاف ہمیشہ برد آزما رہے۔ سر سکندر حیات سے لے کر موجودہ دور کے اینگلو محمڈن طبقہ سے ٹکر لی۔ ۱۹۷۰ء میں جمعیۃ العلماء پاکستان کی صدارت آپ کو ملی تو آپ نے جمعیۃ کو تازہ زندگی بخشنے کے لیے ملک بھر کا دورہ کیا۔ علماء کو بیدار کیا اور جمعیۃ کو ایک فعّال جماعت بنایا۔ نیازی صاحب کی قیادت اور شبانہ روز ہمت کا ثمرہ ہے کہ علماءِ اہلسنت نے حالیہ تحریکِ ختمِ نبوت میں بڑا فعّال کردار ادا کیا اور حکومتِ وقت کو مجبور کر دیا کہ وہ آئین میں یہ بات طے کرے کہ قادیانی غیر مسلم اقلیت ہیں۔ مولانا نیازی ذاتی طور پر ایک عالمِ دین، ایک نڈر مجاہد، ایک بے لوث لیڈر اور ایک شعلہ بیان خطیب ہیں۔ وہ دین و ملت کے لیے ہر خطرہ کو لبیک کہتے ہیں۔ انہوں نے سیاست کی بدلتی ہُوئی چالوں کے سامنے کبھی ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ وہ تاج و تخت کے مقابلہ میں دین اور دینی حمیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ عوام ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ علماء انہیں اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں۔ نوجوان ان کے کردار کی قسم کھاتے ہیں۔ وہ جُرأت کا پیکر اور استغناء کی تصویر ہیں۔

(آئین خلافت پاکستان۔ رضائے حبیب گجرات۔ فروری ۱۹۷۱ء)

نیازی صاحب نے ان دنوں ایسی ولولہ انگیز اور شعلہ بار تقریریں کیں کہ میں ساری زندگی نہ بُھول سکا۔ انہوں نے پولیس کے ظلم وستم سے نڈھال لوگوں کو اپنی پُرجوش تقریروں سے نئی زندگی بخشی۔ اندرونِ شہر سے پولیس کی حکومت کو ختم کر دیا۔ مسجد وزیر خان تک پولیس کا پہنچنا مشکل ہوگیا۔ شہر کے باہر پولیس گولی چلانے کے نفرت آمیز کردار سے بڑی بدنام ہو چکی تھی۔ چنانچہ شہر کے اندر جو سپاہی بھی دکھائی دیتا لوگ اس کی وردی پھاڑ دیتے۔ مختلف علماء کی گرفتاری اور جلوسوں پر گولیاں چلانے کے بعد جب فردوس شاہ ڈی ایس پی سٹی مولانا نیازی صاحب کی گرفتاری کے لیے مسجد وزیر خاں کی طرف بڑھے تو ایک پُرجوش ہجوم نے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ میں اس منظر کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب فردوس کی بے گوروکفن لاش کوتوالی کے نل کے پاس پڑی ہوئی تھی اور ماشکی اس پر پانی ڈال رہا تھا۔ اس کے تھانے کے اپنے سپاہی بھی اس لیے نزدیک نہ جاتے تھے کہ یہ ختم نبوت کا مخالف ہے۔

مولانا نیازی سے مسجد وزیر خاں میں میری ملاقاتیں زیادہ ہونے لگیں۔ میں نوجوانوں کے وفود لے کر جاتا۔ شہر کے حالات پر تبصرہ کرتا اور نیازی صاحب سے ہدایات لے کر علماء تک پہنچاتا۔ نیازی صاحب ان دنوں جان ہتھیلی پر رکھے دن رات کام کرتے۔ کچھ دنوں بعد شہر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ جنرل اعظم خاں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء کو لاہور پر مسلط ہو گئے۔ انہوں نے لاہور کے گلی کوچوں کو ختم نبوت کے پروانوں کو جس بے دردی سے قتل کروایا وہ ان کی فوجی زندگی کا بدترین کارنامہ ہے۔ وہ سیاست میں آئے تو اس "کارنامے" نے انہیں کبھی اُبھرنے نہ دیا۔ ان کی فوجی عدالتوں نے علماء، طلباء، فقراء اور مشائخ کو تختۂ دار ورسن کی ساری مصیبتوں سے گزرنے پر مجبور کیا اور ان کے فوجی دیوانوں اور مجذوبوں کو بھی اللہ اکبر کہنے پر چودہ چودہ سال کی سزا دیتے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک رات ایک بے پناہ ہجوم ریلوے اسٹیشن سے بڑھتا ہوا وزیر خاں کی مسجد میں جانے کے لیے آگے بڑھا۔ یہ سارے لوگ دیہات سے آئے تھے اور تحریک کے مرکز تک پہنچنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ آدھی رات کے وقت دہلی دروازے کے چوک کے باہر ان پر اس قدر گولیاں برسائی گئیں کہ شاید ۱۹۴۷ء کے فسادات میں بھی نہ برسی ہوں گی۔ میں کوتوالی کے پاس ہی رہتا تھا۔ نماز کے بعد اس چوک میں پہنچا۔ سنسان

اور ویران، کارپوریشن اور ملٹری کی موٹریں سڑکیں دھونے میں مصروف تھیں لیکن بایں ہمہ اردگرد کے بازاروں کی دیواروں پر شہداء کے گوشت کے چیتھڑے نظر آتے تھے۔ یہ سیاہ رات اپنے دامن میں شہداء کی نعشوں کے انبار لے کر گزر گئی مگر مارشل لاء کی شدت کے نقوش جس رنگینی سے ثبت ہوئے اس کا نکھار ۱۹۷۴ء میں آ کر ظاہر ہوا۔ اس تحریک کے لیے علماء اہلسنت نے لگاتار جد و جہد کی تھی۔ آخر مرزائیت اقلیت قرار دے دی گئی۔

تحریک ختم نبوت میں مجھے ایک جلسہ گاہ میں قابل اعتراض تقریر کرنے پر گرفتار کرنا چاہا مگر میں محکمہ دفاع کا مستقل ملازم تھا۔ پنجاب پولیس نے جنرل ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ بھیجی مجھے ایک کمیٹی کے سامنے پیش ہونا پڑا اور اراکین کمیٹی کو علم تھا کہ میں کتنا خطرناک ہوں۔ وہ میری خدمات اور خلوص کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بایں ہمہ میرے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے کسی ایسے علاقہ میں تبدیل کر دیا جائے جہاں میری تقریر کو سمجھنے والے کم ہوں۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں مجھے کوئٹہ تبدیل کر دیا گیا۔ کوئٹہ واقعی میرے لیے ایک اجنبی شہر تھا۔ میں وہاں پہنچا تو میری نگرانی پولیٹیکل ایجنٹ کے ذمہ تھی۔ میرے رفقاء کار میں سے مولوی حافظ خوشی محمد صاحب اور محمد افضل کوٹلوی ایم اے[1] (جو ان دنوں جامعہ قادریہ

---

[1] **مولانا محمد افضل کوٹلوی ایم۔اے** آپ ۱۹۲۵ء میں کوٹلی لوہاراں مغربی ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ فقیہہ اعظم مولانا محمد شریف صاحب محدث کوٹلوی، حافظ امام الدین اور پیر حضرت مولانا ابو النور محمد بشیر صاحب کی صحبت میں تربیت پائی۔ سیالکوٹ میں ایف اے کیا اور کوئٹہ چلے آئے۔ کوئٹہ پہنچ کر ۱۹۵۶ء میں ایم۔ای۔ایس کی ورکشاپ میں ملازمت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد محکمہ صحت میں ملازم ہو گئے۔ سرکاری ملازمت کے باوجود آپ دینی تعلیم حاصل کرتے رہے (کوئٹہ کے قیام میں آپ راقم سے متعارف ہوئے) کوئٹہ میں انجمن خدام المسلمین میں چھ سال تک سیکرٹری رہے۔ شعر کہنا شروع کیا اور شعروں میں اساتذہ کا رنگ بھرا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی تو آپ کو مجلس عاملہ کا رکن بنا دیا گیا۔ وادیٔ بولان کے نام سے بلوچستان کے شعر و ادب پر کتاب لکھی۔ دھنک کے نام سے بلوچستان کے شعراء کا تعارف نامہ شائع کیا۔ ۱۹۵۸ء میں لائلپور آئے تو حضرت محدث لائل پوری کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ (باقی بر صفحہ ۳۸۱)

لائل پور میں مدرس ہیں) پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ایک جلسہ عام منعقد کرانے کا بندوبست کیا اور زبردست اعلان کے ساتھ ساتھ صوبہ بدر مقرر کے خطاب سے لوگوں کو جلسہ میں جمع کیا۔ مجھے یاد ہے کہ بے پناہ لوگ آئے۔ میں نے تین گھنٹے تقریر کی۔ تقریر میں بغاوت کی بجائے مجاہدین اسلام کے زرّیں کارنامے تھے۔ اس تقریر نے مجھے کوئٹہ میں اجنبی نہیں اپنا بنا دیا اور مجھے ہر حلقہ میں پذیرائی ہونے لگی۔ اس وقت ملٹری سٹاف کالج کے ایک کرنل تھے جنہوں نے مجھے بلایا اور ایک پروگرام دیا کہ میں صبح پریڈ کے وقت مختلف یونٹوں میں پہنچ کر فوجیوں کے سامنے جہاد پر تقریر کروں۔ مجھے ایک جیپ مل گئی اور میں اکثر مقامات پر جہاد پر تقریر کرتا۔

لاہور میں میرے ایک محسن اور مربی رانا محمد حسن نون بار ایٹ لاً تھے۔ میں کسی زمانہ میں انکی بیٹی کا اتالیق رہ چکا تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ کوئٹہ کی بجائے لاہور رہ کر کام کروں۔ انہوں نے مجھے پنجاب گورنمنٹ کے ایک دفتر میں اتنی تنخواہ پر ملازمت لے دی جو میں سابقہ محکمہ میں پا رہا تھا۔ میں مستعفی ہو کر لاہور آ گیا اور بی۔ اے کرنے کے بعد ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لے لیا اور اورنٹیل کالج میں زیرتعلیم رہا۔ اورنٹیل کالج میں ان دنوں ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ ڈی لِٹ پرنسپل تھے، اور وقت کے ممتاز فارسی داں اساتذہ مصروفِ تدریس تھے۔ ڈاکٹر محمد باقر صاحب، سید وزیرالحسن عابدی، جناب میاں شکور احسن صاحب (جو ان دنوں ڈین ہیں) میرے قابل قدر اساتذہ میں سے تھے۔ میرے ہم سبق بڑے بڑے عہدوں اور زندگی کی بلندیوں پر پہنچے جن کے اسماء

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۰)

جامعہ رضویہ میں داخل ہوئے۔ دینی علوم پر عبور حاصل کیا۔ جامعہ قادریہ کے قیام کے بعد سندِ فراغت حاصل کی اور پھر اسی دارالعلوم میں نائب ناظم مقرر ہوئے اور اب تک اس خدمت کو سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ نغزگو شاعر، خاص طرز کے ادیب اور بڑے خوش گفتار دوست ہیں۔ صبا متھرادی کے رنگ میں شعر کہتے ہیں اور ان کے شاگرد بھی ہیں۔

دینی علوم میں مولانا عبدالقادرؒ، مولانا یٰسین، حافظ احسان الحق، غلام مصطفیٰ الازہری سے استفادہ کیا۔ میرے خاص احباب میں ہیں۔ فیض رضا کی ادارت کرتے ہیں۔

زینتِ طاقِ نسیاں ہو چکے ہیں۔ مگر میں صوفی محمد افضل[1] ایم۔اے، پروفیسر سید ریاض حسین بخاری اور سید اصغر علی شاہ جعفری[2] ایڈوکیٹ کے دامنِ رفاقت ابھی تک اپنے لیے کشادہ پاتا ہوں۔

---

[1] **صوفی محمد افضل ایم۔اے** (المتخلص بہ فقیر) آپ ۱۰ر جون ۱۹۳۶ء کو مضافات لاہور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ لاہور سے میٹرک پاس کیا، اور امتیازی حیثیت سے وظیفہ لیا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۷ء تک اسلامیہ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم رہے — قرآن پاک حفظ کیا۔ ایف اے میں پنجاب بھر میں اوّل آئے۔ ایم۔اے فارسی میں گولڈ میڈلسٹ بنے۔ گورنمنٹ کالج کے لیکچرار منتخب ہُوئے۔ شیخوپورہ، گوجرہ اور ڈیرہ غازی خاں کے کالجوں میں تدریس میں مشغول رہے۔ ذہانت اور طبع رسا کے مالک تھے۔ خود شعر کہتے اور اساتذہ کے کلام کو سناتے چلے جاتے۔ رومی، جامی، حافظ اور غنیمت کا کلام صفحوں کے صفحے یاد تھا۔ ایم۔اے کے دوران راقم کے ہم سبق تھے پانچ سال کی ملازمت کے بعد اچانک جذبِ فقر نے کھینچا۔ علم و تعلّم چھوڑ کر بادیہ نشین ہو گئے۔ علم کا عَلَم پھینک کر دلقِ فقر میں سکونِ قلب تلاش کرتے رہے۔ اسلامی ممالک کی سیاحت کو نکلے اور عرب و عجم کے بزرگانِ دین اور صوفیہ اسلام کے مزارات کی آستان بوسی کی اور روحانی دولت سے دامنِ مراد بھرتے رہے۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گنبدِ خضرا کی زیارت کے بعد بغداد، بیت المقدس اور دوسرے مقدس مقامات پر پہنچے۔ آپ نے ۱۹۵۱ء سے شاعری کا آغاز کیا۔ فارسی اور عربی ادب میں وُہ مولانا عبید اللہ صاحب کے شاگرد ہیں۔ آپ نے فارسی، عربی اور اُردو میں قصائد اور مناقب لکھے۔ سرکارِ دوعالم کی بارگاہ میں مرقع قصیدے لکھے۔ وُہ نغز گو شاعر، خوش گفتار دوست اور باعمل صُوفی ہیں اور راقم کے ساتھ کالج سے لے کر آج تک قلبی مراسم رکھتے ہیں۔

[2] **سید اصغر علی شاہ جعفری ایم۔اے، ایل ایل بی** سید اصغر علی میرے مخلص اور فاضل دوستوں میں سے ہیں۔ وہ اگرچہ شیعہ ہیں مگر میرے خیال میں قلباً عقاید اہلسنّت کے بڑے قریب۔ وُہ مجلس میں بیٹھتے ہیں تو اپنے اظہارِ خیال میں اتنے خلیق اور معتدل بیان ہوتے ہیں کہ اہل مجلس پر چھا جاتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کی اکثر شامیں میرے ساتھ علمی موضوعات پر گفتگو کرتے گزاری ہیں۔ (باقی برصفحہ آئندہ)

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے صفحات پر میں ایک ایسے شخص کا ذکر کر چکا ہوں جو مجھے زندگی کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آپ بٹالہ ضلع گورداسپور میں ۱۲ر جولائی ۱۹۳۲ء کو سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ سید اکبر علی شاہ کی اولاد میں سے ہیں جن کے بزرگ عہد ہمایوں میں خراسان سے وارد ہند ہوئے آپ کے والد میر فاضل شاہ بن سید اکبر علی شاہ بن سید حسین علی شاہ بن سید اصغر علی شاہ ہیں۔ ایم۔ بی ہائی سکول بٹالہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور آگئے۔ ۱۹۴۹ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۵۳ء میں فاضل فارسی اور ۱۹۵۵ء میں بی۔ اے میں کامیاب ہوئے۔ وہ اپنی شبانہ روز محنت سے ۱۹۵۷ء میں اورنٹیل کالج لاہور سے فارسی میں ایم۔ اے میں کامیاب ہوئے۔ آپ اس کالج میں میرے ہم سبق تھے اور ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر علم الدین سالک مرحوم، سید وزیر الحسن عابدی صاحب، آقا بیدار بخت صاحب، میاں عبدالشکور احسن اور ڈاکٹر محمد باقر آپ کے اساتذہ میں ہیں ۱۹۵۹ء میں آپ نے لاء کالج لاہور سے ایل۔ ایل۔ بی کر لیا۔ ۱۹۵۰ء میں آپ کو آقا بیدار بخت صاحب نے اپنے مشہور دار العلوم السنۃ الشرقیہ کی شبینہ کلاسوں میں مدرس کی حیثیت سے لے لیا۔ آپ اس کالج میں ۱۹۶۸ء تک پڑھاتے رہے۔ آپ کے ہم پیشہ اساتذہ میں سے مفتی محمود عالم ہاشمی مرحوم (م ۱۹۷۲ء)، مخدوم غلام جیلانی صاحب، بشیر احمد صدیقی صاحب اور عاشق محمد غوری صاحب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں حصولِ معاش کے لیے آپ ۱۹۵۲ء میں محکمہ ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۶۴ء میں اسی محکمہ میں مقدمات کے انسپکٹر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۶ء میں ویلفیئر انسپکٹر مقرر ہوئے۔

آپ نے اپنی گراں قدر تالیفات کی وجہ سے علمی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ ایم اے اردو، ایم اے فارسی اور سیاسیات کے طلبہ کے لیے بڑی مفید کتابیں لکھیں جو تعلیمی درس گاہوں میں ایک عرصہ تک پڑھی جاتی رہیں۔ ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن چھپے۔ آپ کی سب سے پہلی تصنیف خواجہ حافظ شیرازی کی غزلیات کا ترجمہ جامِ حافظ کے نام سے چھپا۔ ۱۹۶۴ء میں پنجاب میں اردو کی تلخیص اور پھر تاریخِ ایران لکھی۔ اس کتاب کی اشاعت سے شہرت نے آپ کے قدم چومے۔ پھر آپ کی ایم۔ اے اردو کی کتابیں ایم اے کے طلباء کے لیے مشعلِ راہ بنتی گئیں اور نثر پر تنقیدی نظر، نظم پر تنقیدی نظر، اردو ادب اور ہماری ثقافت، جدید اردو نثر، ادب اور تنقید، اقبال باکمال، انشاد کے الماس پارے، مقالاتِ اسلامیات، مشرق و مغرب کے سیاسی افکار، تاریخِ پنجاب، پاکستان اور اس کے ادارے، عوام جماعتیں اور مؤثر گروہ اور

(باقی بر صفحہ ۳۸۴)

سہولتیں بہم پہنچانے میں دلی طور پر خواہاں تھا، اور وُہ تھے جناب رانا محمد حسین نُون بار ایٹ لاء۔ آپ بیرسٹر ہونے کے ساتھ ساتھ شجاع آباد ملتان کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ وہ اکثر یورپ کے مختلف ممالک میں رہتے۔ اپنے ملک میں بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے ساتھ نشست و برخاست رکھتے۔ ذاتی طور پر بڑے نیک دل، خدا ترس، سادہ اور مخلص انسان ہیں انہوں نے مجھے ہمیشہ احترام اور محبت سے دیکھا۔ میں ان کی بیٹی کا اتالیق تھا۔ بدیں وجہ وُہ میرے دلی خیر خواہ بن گئے۔ انہوں نے مجھے ہر مقام پر اچھے لوگوں سے متعارف کرایا۔ جب ان کی بیٹی کی شادی اپنے چچازاد رانا گل محمد عبد العزیز صاحب نون ایم پی اے سے ہوئی تو مجھے اس خاندان کے ایک اور فرد نے دستِ شفقت بڑھا کر زندگی کے شب و روز خوشگوار بنا دیے۔ رانا عبد العزیز صاحب نون اپنے حلقہ کے صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے۔ پکے مسلم لیگی۔ دوستانہ کے قریبی دوست، بڑے فیاض اور وسیع القلب زمیندار ہیں۔ وہ انگلینڈ سے پڑھ کر آئے تھے۔ ان کا دستر خوان احباب کے لیے ہر وقت وسیع تھا۔ دوستوں پر جان چھڑکتے اور ان کے کام آتے۔ میں ان کی بیگم کا استاد تھا۔ جب بھی مجھے کام پڑا انہوں نے لبیک کہا اور وسعتِ قلبی کا ثبوت دیا۔ ان کی وساطت سے مجھے وقت کے بعض سیاست دانوں سے تعارف کا موقعہ ملا۔ میں اس مختصر سے خاندان میں اتنا رچ بس گیا تھا کہ انہوں نے مجھے کبھی احساس نہ ہونے دیا کہ میں ان کے گھر کا ایک فرد ہوں یا عامی۔ رانا صاحب کی وساطت سے مجھے سیاسی دنیا میں ایک ایسے دانشور سے شناسائی ہُوئی جس نے مجھے زندگی بھر اپنے احباب کے حلقہ سے باہر نہ جانے دیا۔ یہ دانشور جناب میر علی احمد خاں تالپور تھے جو ان دنوں وزیر خوراک بن کر لاہور میں قیام پذیر تھے۔ میر صاحب بڑے علم دوست، سخن شناس اور فیاض انسان ہیں۔ انھوں نے مجھے سخن شناس دیکھا تو

(بقیہ صفحہ ۳۸۳) ترقی یافتہ دساتیر تو بہت مشہور ہوئیں۔ آپ کے تراجم میں سے ترجمہ شعر ایران، ترجمہ دربارِ ملّی، ترجمہ مکتوبات امام ربانی اور شعرائے معاصر ایران اور تحریک پاکستان اور اس کا پس منظر، زبان جدید فارسی، فارسی نظم کا تاریخی مطالعہ، شعرائی کلاسیک، شعور تنقید نے اہل علم سے داد تحسین حاصل کی۔ آپ علمی دنیا میں بہت معروف، احباب میں بڑے مقبول اور مصنفین میں شہرۂ آفاق ہیں۔

اپنے پاس بلایا۔ پھر اتنا تعلق خاطر پیدا کیا کہ صبح و شام مجلس رہتی۔ وہ لاہور چھوڑنے کے باوجود میرے دل کا گوشہ نہ چھوڑ سکے۔ میں ان کے بچوں کا اتالیق رہا، ان کی مجلس کا رفیق بنا۔ ان کے انتخابِ شعر کا قدردان بنا اور پھر ان کی یادوں کا امین بنا۔ ان کی علمی اور ادبی شفقتیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ ان کے پاس ہزاروں دوست آئے اور حاشیہ خیال سے محو ہوتے گئے۔ مگر سالہا سال گزرنے کے باوجود ان کی خاندانی عظمت اور علمی وابستگی نے مجھے اپنے سے دُور نہ ہونے دیا۔ اگر مَیں زندگی کی مصروفیتوں میں انھیں بُھول جانے کی تیاریاں کرتا ہُوں تو اُن کی یادیں مجھے آدبوچتی ہیں۔ اگر یادوں سے جان بچاتا ہُوں تو اُن کا فون یا خط اس تعلق خاطر کو استوار کرتا جاتا ہے ؎

وُہ نہیں بھُولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں! کہاں جاؤں!!

میر علی احمد خاں صاحب تالپور ایک جراُت مند سیاستدان ہیں۔ وہ پاکستان کی سیاست میں ہمیشہ زندہ شخصیت کی طرح کام کرتے رہے۔ وُہ حالات کی ناہمواریوں سے کبھی مایوس نہیں ہوئے بایں ہمہ انہوں نے حالات کو سازگار بنانے کے لیے وقت کی مصلحتوں سے کبھی آشنائی پیدا نہیں کی صدر ایوب آئے تو اُن سے اختلاف رہا اور صدر ایوب کے سخت گیر گورنر نواب آف کالاباغ کی سیاست کے سامنے شکست تسلیم نہ کرسکے۔ جناب بھٹو کی مہم کے ساتھ اُٹھے اور بھٹو صاحب کے دست و بازو بن گئے مگر کامیابی کے بعد انہیں قائدِ عوام تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہے اور وزارت کی بجائے کلمۂ حق کہنے کو ترجیح دیتے رہے۔ وہ مطالعہ کے شوقین، کتابوں کو اولاد سے عزیز جاننے والے، خوب صورت خط لکھنے والے اور دیدہ زیب کتاب کو حرزِ جاں بنانیوالے ہیں وُہ شعر کے انتخاب کے معاملہ میں غالب کی اصطلاح "رسوا" کے حامل ہیں۔

میری تقریروں کی شہرت نے اہلِ ذوق کو جلسے کروانے پر آمادہ کیا۔ میں ان جلسوں میں جاتا اور خُوب بولتا۔ لاہور میں چند دوستوں نے ایک مجلس قائم کی جس کا نام "انجمن اصلاح المسلمین" رکھا گیا۔ اس انجمن کو اندرونِ شہر کے نوجوانوں کے جذبۂ اسلام نے ایک زندہ تحریک بنا دیا تھا ادھر ہم نوجوان مقررین انجمن کے جلسوں میں تقریریں کرتے اور نوجوانوں کو گھنٹوں جلسہ گاہ میں

میں مصروفِ سماعت رکھتے۔ میرے علاوہ قاری غلام رسول صاحب، مولانا الٰہی بخش صاحب، مولانا محمد یوسف صاحب خالد (حال پرنسپل ملت کالج لاہور)، مولانا محمد یوسف جوشیلا اور حافظ محمد عالم صاحب وغیرہم اعزازی طور پر تقاریر کرتے اور مجمع میں آگ لگا دیتے۔ نوجوان ہمارے جلسوں کے لیے قدِ آدم اشتہارات چھاپتے، پنڈال سجاتے اور حاضرین کا بے پناہ ہجوم ہماری تقاریر کی نذر کرکے خود رضاکارانہ کھڑے رہتے۔ ہماری اس تبلیغی مہم نے شہر کے علماء کا جمود توڑ دیا اور وہ بھی ان جلسوں میں روایتی تکلفات کو ترک کر کے تشریف لانے لگے۔ مجھے لاہور کے علاوہ مختلف شہروں میں جلسوں میں جانا پڑتا اور اس طرح اسلام کے لیے مخلصانہ کام کرنے والوں سے تعارف حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور کے بعض خانوادے تو بڑی ان خدمات کو اتنی قدر کی نگاہ سے دیکھتے کہ جب تک میں ان کی نجی تقریبات میں شریک نہ ہوتا اس وقت تک وہ آغازِ تقریب نہ کرتے۔

ان دنوں مناظرِ اسلام مولانا محمد عمر اچھروی[1] نے ایک جماعت جمعیۃ المسلمین کے نام سے

سنیوں کے مایۂ ناز

[1] مناظر اسلام مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ عالمِ دین، مناظر اور عوامی خطیب مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ شیر گڑھ نزد قصور ضلع لاہور میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے مولانا کے والد مولوی محمد امین بن عبد المالک قریشی حضرت مولانا غلام محی الدین قصوری کے خاندان میں سے تھے۔ قرآن پاک والد مکرم سے پڑھا۔ فارسی کتابیں مولانا صلاح الدین موضع چانوٹ پاک پتن سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے سے پڑھیں۔ صرف ونحو اور اصول لکھو کے فیروز پور میں مولانا محمد حسین اور عطاء اللہ لکھوی سے پڑھی۔ منطق و معقولات قصور کے مدرسہ فریدیہ میں پڑھی اور پھر بعض کتابیں مولانا محمد عالم سنبھلی سے مدرسہ رحیمیہ نیلا گنبد لاہور سے پڑھتے رہے۔ کتبِ حدیث کے لیے آپ دہلی کے مدرسہ رحمانیہ میں داخل ہوئے۔ مولوی محمد عبد اللہ امرت سری ثم روپڑی (وہابی) سے سند حاصل کی۔ مکرراً مولینا احمد علی میرٹھی جو محدث احمد علی سہارن پوری کے شاگرد تھے۔ صحاح ستہ کا مطالعہ کیا آپ ۱۹۱۸ء میں فارغ التحصیل ہو کر قصور آئے۔ آپ نے ٹھیٹھ پنجابی زبان میں (باقی صفحہ ۳۸۰ پر)

قائم کی۔ اس جماعت کا ہیڈکوارٹر دار المقیاس اچھرہ تھا۔ مولانا نے ایک ماہنامہ "المقیاس" جاری کیا۔ ایک وقت آیا کہ اس جماعت کو پیر آف دیول شریف (الحاج پیر عبد المجید آف دیول)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تقریروں کا آغاز کیا۔ قرآن پاک خاص سادہ انداز میں پڑھتے اور مناظرانہ انداز بیان سے دیہاتی عوام کے محبوب واعظ بن گئے۔ وہابی دیوبندی آپ سے ٹکر لیتے مگر منہ کی کھا کر میدانِ مناظرہ سے بھاگ جاتے۔ آپ ۱۹۳۴ء میں لاہور قیام پذیر ہوئے تو آپ کی شہرت پنجاب میں پھیل گئی۔ آپ کے موضوعات دیوبندی، وہابی، شیعہ اور مرزائی عقائد پر برق بار تنقید تھے۔ اس فن میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ معاندین کی کتابوں کے حوالے آپ کو ازبر تھے اور نادر کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ آپ کے پاس رہتا۔ آپ بڑی جرأت سے میدانِ مناظرہ میں پہنچتے اور مخالف فریق کو للکارتے آپ کی تصانیف میں سے مقیاسِ حنفیت، مقیاس مناظرہ، مقیاسِ خلافت، مقیاسِ نور، مقیاس الصلوٰۃ کے کئی ایڈیشن چھپے۔ مقیاس وہابیت آپ کی وفات کے بعد چھپی اور مقیاسِ توحید، مقیاسِ میلاد، مقیاسِ حیات، مقیاسِ اسلام ابھی تک مسودات کی شکل میں ہیں۔ آپ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور آپ کی دعا سے ہر میدان میں فتح یاب ہوتے ؎

بے باک مردِ حق تھا مجاہد دلیر تھا
وہ شرقپور کے شیرِ محمد کا شیر تھا

آپ نے ۱۵۰ مناظرے جیتے اور اپنے عقاید کی فتح کے سکے بٹھا دیئے۔ اچھرہ لاہور میں دار المقیاس تعمیر کیا۔ ماہنامہ "المقیاس" جاری کیا۔ جمعیۃ المسلمین قائم کی۔ المقیاس پریس لگایا۔ حضرت داتا گنج بخش کی مسجد میں سولہ سال تک خطابت فرمائی اور اپنے خطاب سے پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے سُنّی عوام کو زندہ کر دیا۔

آپ بڑے جری، بہادر اور فاضل مناظر تھے۔ آپ کے صاحبزادوں میں سے مولانا عبد الوہاب صاحب صدیقی مبلغ انگلینڈ، مولانا عبد التواب صاحب، مولانا سلطان باہو، مولانا فقیر محمد اور محمد ظفر آپ کے علمی جانشین ہیں۔ آپ ۹ ذیقعد ۱۳۹۱ھ میں فوت ہوئے۔ مدفن اچھرہ لاہور میں ہے۔

نے اپنی سرپرستی میں لیا اور مالی تعاون سے نوازنے لگے۔ مولانا محمد عمر اچھروی نے ایک طوفانی دورہ کرکے ملک کے سارے علماء اور سنّی زعماء کو جماعت کا رُکن بنانا شروع کیا۔ وہ اس سلسلہ میں بہت کامیاب رہے۔ علماء دار المقیاس میں جمع ہوتے۔ مسائل ضروریہ پر گفتگو کرتے اور معاندین کے حملوں کے دفاع کی تدابیر سوچتے۔ جمعیۃ المسلمین کے قانونی مشیر مولانا محمد بخش مسلم تھے اور سیاسی معاون میں تھا اور پراپیگنڈہ سیکرٹری مولانا محمد شریف نوری[۱]

---

[۱] **مولانا محمد شریف نوری مرحوم** مولانا محمد شریف نوری قصوری بڑے خوش بیان واعظ اور خلیب تھے۔ ۱۳۴۵ھ میں چکوڑی ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی مولوی محمد دین صاحب مولانا غلام دین شیخ لاہور کے بھائی ہیں۔ ۱۳۶۷ھ میں کنجاہ سے میٹرک پاس کیا۔ مولوی محمد عبداللہ کنجاہی سے تلمذ کیا۔ دینی علوم کے لیے جامعہ فریدیہ بصیرپور میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا نوراللہ بصیرپوری کے خاص شاگردوں میں شمار ہونے لگے۔ نوری لقب استاد کی نسبت سے لیا۔ ۱۳۷۲ھ میں اُردو فاضل کیا۔ ۱۳۷۹ھ میں فاضل عربی پاس کیا۔ ۱۳۷۳ھ سے ۱۳۸۰ھ تک قصور کی جامع مسجد میں خطابت کی اور اپنی شیریں بیانی سے نہ صرف اہلِ قصور کو متاثر کیا بلکہ اہلِ پنجاب کو بھی متوجہ کر لیا۔ ایک رسالہ نور و ظہور جاری کیا۔ کلارک آباد کے دو ہزار عیسائی آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ ۱۳۸۱ھ میں لاہور آ گئے۔ شاہ عالم گیٹ کے باہر ایک مختصر سی مسجد میں خطابت کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد سرائے رتن چند میں خطیب بنے اور اہلِ لاہور میں جمعے کی نماز کا بہت بڑا مجمع آپ کے پاس ہوتا۔ ۱۳۸۱ھ میں رسالہ "الحبیب" جاری کیا جو سُنّیوں کے ہاں بڑا مقبول ہوا۔ پیدل حج کیا۔ ایران و خراسان کے مقدس مقامات کی زیارت کی۔ جمعیۃ العلماء پاکستان، پاک سُنّی تنظیم اور جمعیۃ المسلمین کے ناظم رہے۔ آفتابِ سنّت، بارہ تقریریں، نشری تقریریں آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ عمر کے آخرین حصّہ میں رتن چند سرائے چھوڑ کر جامع محمدیہ رلوی روڈ پر چلے گئے اور ایک عظیم الشان مسجد بنوائی، مدرسہ قائم کیا اور اپنی شیریں خطابی سے لاہور اور پاکستان بھر کے مسلمانوں کو گرویدہ کر لیا۔ گنج بخش روڈ پر مکتبہ اسلامیہ قائم کیا اور بہت سی کتابیں شائع کیں۔ ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں جناب حنیف رامے کے مقابلے میں صوبائی الیکشن ۱۹۷۲ء میں عمرہ کرنے گئے واپسی پر بیمار ہو گئے کچھ عرصہ زیر علاج رہے ۱۹۷۲ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

مرحوم تھے۔ نوری صاحب ایک عرصہ تک مولانا کے ساتھ کام کرتے رہے اور اس معاملہ میں وہ اتنے کامیاب ہوئے کہ مولانا اچھروی کے بعد ان کی شخصیت ابھرتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ مولانا محمد عمر اچھروی کو بڑا فقیر کہتے اور اپنے آپ کو چھوٹا فقیر کہہ کر تعارف کراتے۔ اور قلندرانہ کہا کرتے تھے کہ سنیت ان دونوں فقیروں کے دامنِ بیان میں ہے۔ سنیوں کی بدقسمتی ہے کہ یہ تنظیم آگے چل کر اپنی سیاسی موت کے ہم آغوش ہوگئی۔ ماہنامہ مقیاس بند ہوگیا اور پیر صاحب ذیول وشکش ہوگئے۔

میں ان دنوں اپنی تبلیغی خدمات کے ساتھ ساتھ اخبارات میں مضامین لکھتا۔ گورنمنٹ کی ملازمت کی بعض پابندیوں کی وجہ سے مختلف قلمی ناموں سے میرے مضامین اخباروں و رسالوں میں چھپتے، جن پر مدتوں بحث چلتی۔ اور میں اس بحث میں اپنے مخالفین کا مقابلہ کرتا رہتا۔ قاری غلام رسول صاحب نے انجمن فروغِ قرأت و تجوید کی بنیاد رکھی تو مجھے نائب صدر بنایا گیا۔ حضرت مفتی محمد حسین نعیمی صاحب نے رسالہ "عرفات" جاری کیا تو مجھے نائب مدیر اعزازی مقرر کیا گیا۔ "انجمن اصلاح المسلمین" نے مجھے اپنا صدر چنا۔ بعض انجمنوں کا سرپرست اور بعض کا معاون بنا۔ یہ ساری عظمتیں میری ان بے لوث خدمات کی بنا پر تھیں جو میں دین کی خاطر بجالا رہا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ ہم اجتماعی طور پر کوئی اہم مقصد لے کر اٹھیں مگر دفتری مصروفیت اور سرکاری ملازمت نے مجھے ہمیشہ بزدل بنائے رکھا اور فکرِ معاش میں ہمیشہ پابجولاں رہا۔

انہی ایام میں (۱۹۶۶ء) مجھے گزیٹڈ آفیسر بنا کر لائل پور تبدیل کر دیا گیا۔ میں پہلی بار تین ضلعوں کا آفیسر بن کر سرکاری ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دب گیا تاہم میرا سرکاری امور میں تجربہ ان دشواریوں کو آسان کرتا گیا۔ لاہور میں میری بے پناہ مصروفیت کم ہوئی تو میں لائلپور کے چند صاحبِ علم سے رابطہ پیدا کیا وہاں مکتبہ علویہ رضویہ کے مالک حافظ محمد اسلم صاحب علوی تھے حافظ صاحب اعلیٰ حضرتؒ کی کتابوں کی اشاعت کے لیے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین کا ترجمہ کرنے کے لیے کہا۔ میں فارغ تھا ترجمہ کیا اور اپنی نگرانی میں کتابت، طباعت اور ٹائیٹل تیار کرایا۔ حافظ صاحب کے مکتبہ کی یہ پہلی کتاب تھی جو میرے ترجمے سے آئی اور ایک خوب صورت انداز لے کر آئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے مکتبہ علویہ رضویہ کا تمام سنیوں میں اچھا تاثر قائم ہوگیا۔ ادھر ترجمہ اور

میرے فاضل دوست محمد ایوب صاحب قادری ایم۔ اے کا زور دار مقدمہ حبِ اہلسنت وجماعت کے مقتدر علماء کے مطالعہ میں آیا تو وہ مجھ سے متعارف ہو گئے۔ ان کے بے پناہ تعریفی خطوط موصول ہونے لگے جس سے میری اور حوصلہ افزائی ہوئی۔ میں نے مکتبہ علویہ کے مشورہ سے ایک اور کتاب کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف نزہۃ الخواطر جو حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کے حالات پر تھی۔ میں نے کتاب کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ مقدمہ میں جناب مصنف العلآم کے حالاتِ زندگی اور اس کے علمی کارنامے بڑی تفصیل سے سپردِ قلم کیے اس کتاب کو اہلِ تصوّف نے بڑا پسند کیا۔ لائل پور کے قیام میں مجھے جناب حبیب احمد چودھری سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ چودھری صاحب کی ایک ضخیم کتاب تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء لاہور کے جناب حنیف رامے (وزیرِ اعلیٰ پنجاب) کے مکتبہ البیان میں چھپ کر آئی تو میں اس کے مطالعہ سے بڑا متاثر ہوا۔ چودھری صاحب لائل پور کے قیام کے دوران اکثر میرے پاس آتے اور رات گئے تک سیاسیاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتے۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ تحریکِ پاکستان کے ہمنوا علماء پر بھی ایک کتاب لکھیں مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ البتہ کچھ سال بعد انہوں نے نظریۂ پاکستان پر کتاب لکھی جو اتنی مقبول نہ ہو سکی جتنی ان کی تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء مقبول تھی۔ چودھری صاحب ایک طرف توصحیح العقیدہ سُنّی تھے، بجواڑہ ضلع ہوشیار پور کے پیروں کے عقیدت مند تھے دوسری طرف مسلم لیگ کے پکے کارکن اور نظریۂ پاکستان کے پکے حامی ہی نہ تھے ترجمان بھی تھے۔ انہوں نے اپنا دفتر نظریۂ پاکستان بنایا اور ایک اخبار بھی اس نام سے جاری کیا جو غالباً تا ہنوز چل رہا ہے۔ وہ علامہ اقبال کے شیدائی اور دو قومی نظریہ رکھنے والوں کے بے حد مدّاح تھے مگر بایں ہمہ وہ غلام احمد پرویز سے اتنے متاثر تھے کہ لوگ انہیں پرویزی سمجھتے۔ وہ پرویز صاحب کی طرزِ نگارش اور فکر کے بے حد مدّاح تھے۔ ان کی کتاب نظریۂ پاکستان پرویز صاحب کا رنگ لے کر آئی تو علمی حلقوں میں اپنا مقام حاصل نہ کر سکی۔ پرویزی حلقے میں وہ اس لیے مقبول نہ ہوئی کہ وہ لوگ پرویز کی تحریروں کے ساتھ کسی دُوسرے کی تحریر کا "شرک" برداشت نہیں کرتے۔ چودھری صاحب کانگریس، جمعیۃ العلماء ہند اور احرار کے بدترین مخالف تھے اور جماعت اسلامی کے بدترین دشمن۔ وہ اپنے احباب کے لیے مخلص اور وضعداری میں اپنی

مثال آپ ہیں۔ راقم کے ساتھ جب سے تعلقات ہوئے نبھاتے جا رہے ہیں اور اپنی دیرینہ روایات کے پیشِ نظر لاہور تشریف لائیں تو ملاقات ضرور کرتے ہیں۔

میں نے ۱۹۶۰ء میں اپنے مخلص رفیقِ کار جناب مولانا باغ علی نسیم صاحب سے مل کر مکتبۂ نبویہ کی توسیع کا کام کیا۔ اعتقادی کتابوں کو نئے انداز سے طبع کرانا شروع کیا اور سُنّی ناشرین اور تاجرانِ کتب کو اچھے انداز میں کتاب لانے کی جدّوجہد میں مصروف رہا۔ مکتبۂ نبویہ کے قیام سے علماء اہلسنت کا ایک خاصا طبقہ میرے حلقۂ تعارف میں آگیا۔ وہ مکتبہ کی کتابوں کو بنظرِ تحسین دیکھتے، حوصلہ افزائی کرتے اور مفید مشورے دیتے۔ حضرت پیر کرم شاہ الازہری مدظلہٗ

۱؎ حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری بھیروی آپ سلطان العارفین پیر محمد شاہ ہاشمی بھیروی کے قابلِ فخر فرزند ارجمند ہیں۔ ۲۱ رمضان ۱۹۱۸ء کو بھیرہ ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد قاسم بالاکوٹی سے حاصل کی فلسفہ، منطق کی فنی کتابیں حضرت مولانا محمد دین موضع بدھو ضلع کیمبل پور سے پڑھیں۔ مولانا غلام محمود پپلاں میانوالی سے ادب، فقہ اور ریاضی کا مطالعہ کیا۔ مولانا غلام محمود ان دنوں بھیرہ کے جامعہ محمدیہ غوثیہ میں پڑھاتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں سندِ حدیث جامعہ نعیمیہ مراد آباد سے صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی سے حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۵۱ء میں جامعہ ازہر مصر میں داخلہ لیا۔ تین سال تک مصر کی اس قدیم الشان یونیورسٹی میں امتیازی حیثیت سے کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں درجۂ تخصیص میں سند حاصل کر کے وطن لوٹے اور اپنے مدرسہ میں سلسلۂ تعلیم و تدریس جاری کیا۔ خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ خلافت و اجازت حاصل کی پھر خواجہ قمر الدین سیالوی سے اجازت و خلافت حاصل کی آپ نے تفسیر ضیاء القرآن لکھ کر دنیائے علم میں اپنی شہرت کا سکہ جما لیا۔ سنتِ خیرالانام نے اپنی مقبولیت پر خراجِ تحسین حاصل کیا۔ ضیائے حرم (ماہنامہ) اعلیٰ معیار پر نکال کر دنیائے صحافت میں ایک معیار قائم کیا۔ اس ماہنامے نے جہاں اپنے بلند پایہ مضامین سے قارئین کو متاثر کیا وہاں آپکے اداریے نوٹ سرِ دلبراں نے اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ آپ عالم باعمل، باکمال مدرس اور صائب الرائے سیاستداں ہیں دنیائے سنیت کو آپ پر ناز ہے۔ راقم آپ کی نگاہِ لطف و کرم کا مرہونِ منت رہا ہے۔

سجادہ نشین بھیرہ شریف اسی مکتبہ کی اشاعتی کوششوں سے متاثر ہو کر مجھے ملے اور حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ یہ میری حقیر کوششوں کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنا مشہور رسالہ ضیائے حرم گنج بخش روڈ لاہور سے نکالنا شروع کیا اور مجھے مضامین لکھنے کی سعادت سے بھی نوازا۔ یہ رسالہ سُنّیوں کے لیے باعثِ صد افتخار بن کر آج بھی زیورِ اشاعت سے مزین ہو رہا ہے۔ پیر صاحب کا اداریہ سترِ دلبراں جانِ رسالہ ہوتا ہے اور میں رسالہ صرف سترِ دلبراں کے لیے پڑھتا ہوں۔

میری علمی اور ذوقی جدوجہد میں میرے رفقائے مجلس جناب محمد عالم مختار حق[1]،

---

[1] جناب محمد عالم مختار حق آپ ۱۴ شوال ۱۳۴۹ھ کو جھگیاں شہاب الدین لاہور میں پیدا ہوئے۔ والدین نے محمد عالم نام رکھا مگر پیر غلام دستگیر نامی مرحوم نے تاریخی نام مختار حق (۱۳۴۹) رکھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا الحاج محمد حسین بن کرم الٰہی بن حسن محمد بن برہان الدین سے حاصل کی۔ میٹرک پاس کیا تو چودھری جلال الدین اکبر ہیڈ ماسٹر کی صحبت میسر آئی جو فارسی، اردو کے شاعر، ادیب اور صوفی کامل تھے (جلال الدین صاحب اکبر کو سلیمان ندوی پنجاب کا حسرت موہانی کہہ کر یاد فرماتے) علمی ذوق اور فارسی ادب سے لگاؤ پیدا ہوا۔ فاضل فارسی کیا۔ علمی کتابوں کا مطالعہ آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ اچھی کتاب دیکھتے تو نہ صرف پڑھتے بلکہ اپنے کتب خانہ میں محفوظ کر لیتے۔ یہ ذوقِ کتب بینی تھا کہ آپ لاہور کے مشہور مورخ مولانا غلام رسول مہر کے کتب خانہ تک پہنچے۔ نادر کتابوں کو دیکھا تو مولانا مہر کے رفیقِ مجلس اور معاونِ قلم بن گئے اور عمر بھر ان کے علمی ذخیرہ سے اپنے ذوقِ علم کی تسکین کرتے رہے۔ مولانا مہر کو آپ کی محنت، کتاب فہمی اور ذوقِ مطالعہ پر بڑا ناز تھا۔ متعدد نادر کتابیں اپنے دستخطوں سے عطا کیں۔ ہزاروں ادبی خطوط آپ کے نام لکھے جو آپ کا سرمایۂ حیات ہیں۔ آپ نے آج تک چار ہزار نادر کتابیں ذاتی کتب خانہ میں جمع کیں۔ راقم اکثر آپ سے علمی تعاون لیتا ہے اور جب کبھی کتاب کا ترجمہ کرنا ہوتا ہے تو آپ کے ذخیرۂ کتب سے استفادہ کرتا ہے۔ اہلِ ذوق آپ کو مزاج شناسِ مہر کہتے ہیں۔ بایں ہمہ وہ ایک صوفی منش، بزرگانِ دین کے عقیدت مند اور اہلِ علم کے قدر دان دوست ہیں۔ رسالہ "سیارہ ڈائجسٹ" کے قرآن نمبر کے آپ خصوصی معاون تھے۔ آپ کا اردو پنجابی تراجم پر پُر مغز اور مفصل مقالہ چھپا، جس سے آپ کو علمی حلقوں میں شہرت ملی۔ "نقوش" کے سیرت نمبر کے لیے ایک انڈیکس تیار کیا، جس میں سیرت النبی پر اردو ادب میں جتنا کام ہوا ہے اس پر معلومات جمع کر دی ہیں۔ (باقی بر صفحہ ۲۹۳)

جناب بشیر حسینؔ[1] ناظم ایم۔ اے زندگی کے طویل مراحل میں میرے ساتھ رہے ہے۔ یہ دونوں دوست

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۲) آپ خوش خط، خلیق اور درویش صفت رفیق ہیں۔ اچھی کتاب کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اچھی کتاب رکھنے والے کے دوست بنتے ہیں۔ مولوی محمد شمس الدین سے محبت صرف ان کی کتاب شناسی کی وجہ سے تھی۔ راقم کے ساتھ خصوصی مراسم ہیں اور علمی رفاقت ہے۔

[1] **جناب بشیر حسین ناظم ایم۔ اے** میرے فاضل محب و مخلص دوست جناب بشیر حسین ناظم ایم۔ اے اپنی خوش آوازی، نعت خوانی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے حلقۂ اہل علم میں بہت معروف ہیں۔ وہ نعت خوانی کے لیے مجمع عام میں کھڑے ہوتے ہیں تو اہلِ دل پر چھا جاتے ہیں۔ مجلس میں آغازِ گفتگو کرتے ہیں تو مجلس کو کشتِ زعفران بنا دیتے ہیں۔ ناقدانہ انداز میں بحث کرتے ہیں تو بڑوں بڑوں کے علم و فضل کے بخیے اور قبے اتار دیتے ہیں۔ وہ سراپا اخلاص بھی ہیں اور ہر تن محبت بھی۔ دوستوں پر جان چھڑکتے ہیں اور اہل سخن کو دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ اور علم و مباحث کے کئی معرکوں میں میرے رفیق و شریک رہے آپ ۲۰ ر اکتوبر ۱۹۳۲ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ والد میاں غلام حسین بن میاں اللہ بخش وقت کے متمول ترین صراف تھے۔ آپ کے والد اپنے وقت کے خوش آواز نعت خواں تھے اور شیخ نور الدین ناظم عم شیخ دین محمد سابق گورنر سندھ مرحوم کے شاگردِ نعت تھے۔ جناب بشیر حسین ناظم ۱۹۳۸ء میں شرقپور آ گئے۔ ۱۹۵۲ء میں میٹرک پاس کیا۔ حاجی فضل الٰہی مونگا نے آپ کو حضرت میاں غلام اللہ ثانی صاحب برادر حضرت اعلیٰ میاں شیر محمد شرقپوری سے سلسلۂ روحانیت میں منسلک کیا جنھوں نے اس گوہرِ نوخیز کو ذرہ سے آفتاب بنا دیا۔ نعت خوان کی حیثیت سے آپ کی معیت میں اجمیر شریف اور حضرت مجدد الف ثانی کے مزارات کی زیارت کی۔ ۱۹۵۲ء میں لاہور کارپوریشن کی ملازمت اختیار کی اور مولوی لطیف زار، مولوی محمد بشیر قریشی اور میاں محمد دین کلیم صاحب (مولفِ کتب کثیرہ بزرگانِ لاہور) کی صحبت میں نعت و ذکر کا شوق پیدا کیا۔ آپ کے آباؤ اجداد سونے میں نگینے جڑتے رہے مگر آپ اہلِ ذوق کے دل و دماغ پر شعر و سخن کے نگینے جڑتے ہیں۔ چھٹی جماعت میں نعت لکھنی شروع کی۔ نعت کو خوش آوازی کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے۔ پنجابی، اردو اور فارسی میں بے شمار نعتیں لکھیں۔ فارسی ماہیا ایجاد کیا۔ ۱۹۵۸ء میں بی۔ اے کیا۔ آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس میں ملازمت کرنے لگے۔ ۱۹۶۲ء میں پی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۸ء میں (باقی بر صفحہ ۳۹۴)

مولوی محمد شمس الدین مرحوم کی اس دکان میں میرے ساتھ ہوتے جس میں علماء و فضلاء کا جمگھٹا رہتا۔ مولوی صاحب کی دُکان ایک علمی مرکز تھا۔ نادر کتابوں کا گھوارہ تھا وُہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ مولوی شمس الدین مرحوم ایک درویش منش بزرگ تھے جن سے تعارف ہُوا تو پھر دامنِ دل اُن کی یادوں سے علیحدہ نہ ہوسکا۔ انھیں موت نے آ لیا تو ہم ان کے آخری سفر میں جنازہ بر دوش چلے۔ زندگی میں ان کے حلقے میں مخلص دوست کی حیثیت سے اُٹھتے بیٹھتے اور مرنے کے بعد ان کی علمی اور کتابی یادوں کے زخم سینے کے صفحات میں لیے رہے۔ ان کی دُکان پر ملک بھر کے اہلِ علم آتے۔ وُہ ان بزرگوں کو حسبِ موضوع نادر کتابوں پر معلومات بہم پہنچاتے۔ وہ ہر قسم، ہر مکتب اور ہر نقطۂ نظر کے اہلِ علم اور کتابوں کے شوقین حضرات کی پذیرائی کرتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لاء کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۹ء میں فارسی اور ۱۹۷۲ء میں پنجابی میں ایم اے کیا۔ آپ کی پہلی تصنیف اولیاءِ ملتان ہے۔ پنجابی میں ابدی آوازاں، کلاسیکی ادب، پنجابی واراں، رسولِ عربی اور پھر شواہد النبوت کا اُردو ترجمہ کیا۔ حکایاتِ گنج بخش ترتیب دی۔ ہمعات کا ترجمہ کیا۔ خوش آوازی سے دل و دماغ میں گھر پیدا کر لیتے ہیں۔ پاکستان میں اہلِ علم کا وسیع حلقہ آپ کی قدر کرتا ہے۔ میرے جگری دوست اور قلبی محب ہیں۔

لہ **مولوی محمد شمس الدین مرحوم** آپ ۱۹۱۶ء میں ریاست پونچھ موضع کھوڑ تحصیل حویلی میں صوفی احمد علی راجپوت چوہان کے پیدا ہُوئے۔ چار سال کی عمر میں یتیم اور چھ سال کی عمر میں لاوارث ہو گئے۔ رشتہ داروں کی جھڑکیوں سے تنگ آکر ۱۹۲۷ء میں وزیر آباد گئے اور مولوی قمر الدین سے ناظرہ حق اور کریما پڑھیں۔ ۱۹۳۰ء میں لاہور آ گئے اور مسجد موراں (پاپڑ منڈی) کے متولی حافظ عزیز الدین اور خلیفہ حافظ نصیر الدین کی منظوری سے مسجد کی صفائی اپنے ذمّہ لے لی۔ حافظ صاحب سے پند نامہ اور زلیخا پڑھیں۔ اسی دوران چھوٹی کتب، قصص کی تجارت کرتے رہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور گلدستہ نظام الدین توکلی شائع کیں۔ ان کی کتابت حافظ محمد یوسف صاحب سدیدی نے کی۔ مولوی صاحب نے اپنے ذوق کی کتابوں کی اشاعت کے لیے مکتبہ قیومیہ قائم کیا۔ ۱۹۵۰ء میں مسلم مسجد چوک انارکلی لاہور کے نیچے ایک دکان تجارت کتب کے سلسلہ میں کرایہ پر مل گئی۔ مرحوم اپنی وفات (۱۱ر جنوری ۱۹۶۸ء) تک یہیں اپنا ذوق پورا کرتے رہے۔ پروفیسر محمد اقبال مجددی نے مولوی صاحب مرحوم کے حالات اور کمالات پر ایک کتابچہ "یادگار مولوی شمس الدین" ترتیب دیا ہے جو زیرِ طبع ہے۔

بلند رتبہ فضلاء کے علاوہ ان کی دکان پر بعض ایسے کردار بھی چلے آتے جو بحث و تمحیص کے علاوہ مولانا کی تواضع اور نفیس چائے پر نظر رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض اپنے ادبی ناموں سے ایک وقت تک یاد رہے اور بعض اپنے مخصوص ناموں کی وجہ سے احباب کے لیے تفننِ طبع کا سامان بنتے۔ مولوی کچیچی، مسٹر پٹپٹی پاڑ، مولوی کلہاڑا، مولوی چھُرا، بابا بارہ من، مولوی رُوح کچھ، بے چین رُوح، مولوی ملک الموت، سائیں تاجا، میاں جیدا، پیر بھسوڑی، مولوی مُرغ و ماہی وغیرہ کرداری نام آنے والوں کی عادات و اخلاق پر روشنی ڈالتے تھے۔

اس مجلس میں علامہ غلام قادر[1] صاحب لاہوری، عبداللطیف ملک مرحوم، چودھری بشیر احمد،

---

[1] **علامہ غلام قادر لاہوری** علامہ غلام قادر (بن میاں احمد دین بن حسن محمد) المعروف مرزا صاحب گوجرانوالہ (مرالی والا) کے ایک زمیندار (جٹ) خاندان کے فرد ہیں۔ آپ کے والد گوجرانوالہ سے لاہور آگئے۔ مرزا صاحب ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک شیرانوالہ ہائی سکول میں پڑھا۔ ۱۹۴۰ء میں منشی فاضل اور اورینٹل کالج سے کیا۔ فارسی ادب میں آپ نے ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا نورالحق علوی مرحوم اور مولانا یٰسین سے استفادہ کیا۔ مولانا یٰسین فیض باغ لاہور میں رہتے تھے۔ بات فلسفہ اور منطق میں کرتے۔ مرزا صاحب کو ان کے اندازِ گفتگو میں دلچسپی ہوئی تو استاد سے پوچھا کہ آپ ایسی باتیں کس طرح بنا لیتے ہیں۔ آپ نے بتایا یہ منطق کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ آپ نے مولوی یٰسین صاحب سے منطق کی کتابیں پڑھیں۔ منطق کے ساتھ ساتھ جب فلسفہ آیا تو استاد نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ذوق پیدا ہو چکا تھا۔ آپ ایک افغانی عالمِ دین کی مجلس میں جانے لگے جو فلسفہ علم الکلام اور منطق و معانی کا امام تھا۔ آپ نے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا۔ آپ کو فلسفۂ وحدت الوجود سے خاص دلچسپی ہوئی۔ ابن عربی کی ساری کتابیں پڑھ لیں۔ حکمت اشراقی کا بدقتِ نظر مطالعہ کیا۔ پھر یورپین فلاسفر کی کتابیں پڑھیں۔ فصوص الحکم اس کی شروعات اور مکتوبات مجدد الف ثانی کا بیک وقت مطالعہ کر کے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا امتیاز حاصل کیا۔ نادر کتابوں کی تلاش میں مولوی محمد شمس الدین مرحوم سے واقفیت ہوئی تو کتابیں جمع کرتے گئے۔ ذاتی لائبریری میں دس ہزار کتابیں جمع کیں۔ بڑے باکمال آدمی ہیں۔ صائب الرائے و الفکر ہیں۔ مجھے بسا اوقات اپنے علمی مشوروں سے نوازتے ہیں۔ اچھی کتاب کو دیکھ کر اظہارِ مسرت کرتے

شیخ بشیر احمد المعروف بہ لیڈر، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، مولوی محمد دین صاحب رضوانی جیسے حضرات میرے حلقۂ تعارف میں آئے۔ مولوی شمس الدین کی وفات نے اس مجلس کو ویران کر دیا۔ چند ماہ احباب نے اس مرحوم کا ماتم کیا، یادیں زندہ کیں، جلسے کیے۔ آخرکار یہ حلقہ ٹوٹ گیا اور یہ بساط اُلٹ گئی اور اب ؎

ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لُوٹ لیا

انہی ایام میں رام گلی لاہور میں مجھے حکیم محمد موسیٰ[1] صاحب امرتسری کے پاس نشست و برخاست

---

[1] **حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری** ۲۷ راگست ۱۹۲۷ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ والد مکرم فقیر محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۸۱ھ مدفون بجوار حضرت میاں میر لاہور) وقت کے ماہر طبیب تھے۔ امرتسر میں ان کا مطلب پنجاب بھر میں مشہور تھا۔ وہ صوفی منش انسان تھے اور اپنے رشتہ کے چچا حکیم مولوی فتح دین رہیوی سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے۔ ان کے ایماء پر حضرت میاں محمد علی لسبی شریف والوں سے روحانی فیض حاصل کیا۔

حکیم محمد موسیٰ صاحب نے قرآن پاک کی تعلیم قاری کریم بخش اور حافظ خدا بخش سے حاصل کی۔ مدرسہ نعمانیہ امرتسر میں مفتی عبدالرحمان سے فارسی ادب کا مطالعہ کیا۔ سکندر نامہ تک درسی کتابیں پڑھیں۔ صرف و نحو میں دسترس حاصل کی اور حضرت مولانا محمد عالم آسی (م ۱۳۹۲ھ) سے بعض علوم پڑھے۔ طب کی تمام و کمال کتابیں اپنے والد مرحوم سے پڑھیں اور بہی کھاتے کا حساب محمد شفیع پانڈے سے سیکھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آئے۔ والد کے ساتھ لوہاری دروازہ کے باہر مطلب شروع کیا۔ ۱۹۴۹ء میں رام گلی میں علیحدہ مطلب جاری کیا۔ مریضوں کے علاوہ اہلِ علم کا حلقہ پیدا کیا۔ پروفیسر شجاع الدین مرحوم، پیر غلام دستگیر نامی مرحوم، مولوی شمس الدین مرحوم، مفتی محمد حسین نعیمی، سید محمد امیر شاہ صاحب پشاور والے، سید شریف احمد شرافت نوشاہی، پروفیسر محمد ایوب قادری، پروفیسر علم الدین سالک، مولانا سید امیر اجمیری (مدفون چھپڑ شریف) اور راقم آپ کے حلقۂ احباب میں شامل ہوئے۔ آپ ان احباب کے ساتھ علمی موضوعات پر گفتگو کرتے اور مفید مشورے دیتے۔ آپ اپنے احباب کے لیے نہایت مخلص، اہلِ علم کے لیے بڑے خدمت گار اور ملنے والوں کے لیے نہایت خلیق ہیں۔ (باقی ص۳۹۷ پر)

کا موقعہ ملتا۔ یہ جواں سال طبیب صرف حکمت و طب کی خدمت ہی میں مصروف نہ تھے بلکہ اہلِ علم و فضل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آپ کی تصانیف میں سے تذکرہ علمائے امرتسر (غیر مطبوعہ)، مولانا غلام محمد ترنم، ذکرِ مغفور (تذکرہ سید مغفور القادری)، اذکارِ جمیل (تذکرہ سید برکت علی شاہ ظلیبیانوی) بہت مشہور ہوئیں۔ علمی کتابوں پر زوردار دیباچے لکھے۔ مقدمہ کشف المحجوب، مقدمہ مکتوباتِ مجدد الف ثانی اور مقدمہ عباد الرحمٰن تو اہلِ علم کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

آپ کا سب سے بڑا علمی اور اعتقادی کارنامہ مرکزی مجلس رضا کے قیام اور پھر اسے شہرت دوام بخشنا ہے۔ اس مجلس کا قیام ۱۹۶۸ء میں مولوی محمد شفیع رضوی (مالک مقبول عام پریس اور ہجویری پبلشرز)، محمد عارف ضیائی، مولانا باغ علی نسیم اور راقم کے تعاون سے عمل میں آیا مگر مجلس رضا کو علمی رنگ دینے کے لیے آپ نے صبح و شام کام کیا۔ اعلیٰحضرت کی شخصیت کو مقبول و متعارف کرانے کے لیے جلسے، جلوس، ترتیب دیئے، مقالات اور مضامین کے علاوہ کئی کتابیں لکھوائیں اور خوب صورت انداز میں طبع کرا کے تقسیم کروائیں۔ آپ نے مجلسِ رضا کا مرکزی دفتر نوری مسجد بالمقابل ریلوے اسٹیشن میں قائم کیا۔ یہ مسجد صرف اعلیٰ حضرت کے مسلک کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے وقف کی تھی۔ یومِ رضا اسی مسجد میں ہر سال بڑی آب و تاب سے مناتے اور علماء اہلسنت کے مقتدر علماء کی تقاریر کراتے اور اعلیٰحضرت کی ذات گرامی کے پہلو سامنے لاتے۔ ۱۹۷۴ء میں حج کیا۔ روحانی طور پر مولانا ضیاء الدین مدنی سے دلائل الخیرات اور قصیدہ بردہ شریف کی اجازت حاصل کی۔ شیخ محمد ہاشم شقرون مدنی، شیخ محمد حسین رمدی یمنی آفندی کی مجلس ذکر و وظائف میں شرکت کی اور اجازتِ خاص حاصل کی۔ آپ کی کوششوں سے اعلیٰ حضرت بریلوی کی ذات گرامی پر بارہ کتابیں لکھی گئیں اور علماء میں مفت تقسیم ہوئیں۔ فتاویٰ رضویہ کی جلد پنجم (جسے بعد میں مکتبۂ نبویہ نے خوب صورت انداز میں طبع کرایا تھا) آپ کی کوششوں سے چھپی۔ آپ راقم کے خاص احباب میں سے ہیں اور ہر لحظہ اپنے مشوروں اور علمی گفتگو سے نوازتے رہتے ہیں۔ ان کی ذات اہل علم کیلئے ایک انجمن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان دنوں ۵۵ ریلوے روڈ لاہور میں بہت بڑا مطب چلا رہے ہیں۔ مگر علم الابدان کی بجائے علم الادیان سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ کی مجلس علماء، ادباء، صوفیاء، شعراء اور مؤلفین و مصنفین سے بھری رہتی ہے۔ چشتی ہیں مگر نقشبندی سلسلۂ تصوف کے ترجمان ہیں۔ نظامی ہیں مگر مجددی تعلیمات کی اشاعت کرتے ہیں۔ طبیب ہیں مگر اعتقادی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔

کے لیے بھی ایک انجمن تھے۔ وہ طبعی طور پر تذکرہ نویسی اور تاریخ گوئی میں بڑی دلچسپی لیتے۔ اگرچہ اُن کے حلقہ میں ہر فکر و نظر کے لوگ آتے مگر وہ اعتقادی طور پر بڑے راسخ العقیدہ سُنی اور چشتی نظامی سلسلہ کے صوفی تھے۔ اکثر اہلِ علم ان کے پاس آتے اور باہر کے مولفین و مصنفین ان سے خط و کتابت کے ذریعہ معلومات حاصل کرتے۔ مجھے انھوں نے علماءِ اہلسنت کا تذکرہ لکھنے کا مشورہ دیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے تذکرہ علماء امرت سر کے بعض مضامین دکھائے۔ میں نے کچھ عرصہ کام کیا مگر یہ اتنا طویل اور مشکل کام تھا کہ مجھے ان بزرگوں کے حالات اکٹھا کرنے کے لیے بہت عرصہ درکار تھا۔ مولوی شمس الدین مرحوم کے کتب خانہ سے جہاں مجھے بعض نادر کتابوں سے واقفیت ہوتی وہاں حکیم صاحب کی مجلس سے بعض شخصیتوں سے تعارف ہوتا۔ انہی دنوں مکتبہ نبویہ کے مالک میرے مخلص رفیق مولانا باغ علی نسیم صاحب نے تقدیس الوکیل طبع کرانے کا پروگرام بنایا۔ میں نے کتاب کو ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ ایک مفصل مقدمہ لکھا جس میں مؤلف کے حالات کے ساتھ سُنّی دیوبندی نظریاتی کشمکش کی پوری تاریخ مرتب کر دی گئی۔ کتاب چھپ گئی تو اس کے مقدمے کی چند کاپیاں ملک کے علماء میں تقسیم کی گئیں اس طرح کتاب کا تعارف از سرِ نو ہو گیا۔ علماء نے اس کتاب کو بڑی دلچسپی سے پڑھا جس سے میرے حوصلے بلند ہو گئے اور میں اس ضمن میں زیادہ جذبے سے کام کرنے لگا۔

مکتبۂ نبویہ کی بنیاد یوں تو حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں رکھی جا چکی تھی اور بعض کتابوں کی اشاعت و تقسیم کا کام بھی شروع ہو چکا تھا مگر اسے باقاعدہ نظم و نسق دینے کے لیے ہمیں ایک مرکز کی ضرورت تھی۔ ان دنوں دارالعلوم حزب الاحناف کی نئی عمارت میلہ رام روڈ لال کوٹھی کی زمین پر بن رہی تھی۔ مولانا غلام علی صاحب اوکاڑوی ہمارے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہیں انہوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ اس سُنی ادارے کے ساتھ ایک دینی مکتبہ کا ہونا بڑا ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ محمود احمد رضوی صاحب سے مسجد کے ساتھ ایک دُکان لے کر علماء کو دعوتِ کتب بینی دی گئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میلہ رام روڈ کا نام سب سے پہلے ہم نے اپنی کتابوں، فہرستوں اور خط و کتابت میں بدل کر گنج بخش روڈ رکھ دیا۔ یہ نام کچھ عرصہ بعد مقبول عام و خواص ہو گیا۔

میں سرکاری کام سے فارغ ہو کر مکتبہ میں آجاتا، علماء کا جمگھٹا رہتا۔ صوفیہ داتا صاحب کے مزار سے فارغ ہو کر چند لمحے آ بیٹھتے۔ طلباء کتابوں کی تلاش میں رُکتے اور پروفیسر حضرات دینی مطالعہ کے لیے مشورے کرتے۔ اس طرح یہ دُکان مرکزِ علم و ادب بن گئی۔ مولوی محمد شریف نوری اردو بازار کی ایک بلند و بالا عمارت سے "الحبیب" نکالتے تھے۔ انہیں وہاں سے اتار کر گنج بخش روڈ پر مکتبہ اسلامیہ کے نام سے کام کرنے پر آمادہ کیا۔ مولانا انوار الاسلام[1] ان دنوں

---

[1] **مولانا انوار الاسلام** مکتبہ حامدیہ کے مالک حضرت مولانا انوار الاسلام ۱۹۳۶ء میں شمس آباد ضلع کیمبلپور میں پیدا ہوئے۔ والد مکرم مولوی نصیر احمد بن مولوی برہان الدین مرحوم زمیندارہ کرتے تھے۔ مولانا انوار الاسلام نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی لیکن دس سال کی عمر میں اپنے بھائی حافظ محمد احسان الحق صاحب اور مولوی محمد حنیف صاحب کے ساتھ شر قپور میں حضرت میاں صاحب کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور فارسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان دنوں وہاں مولانا شیخ الحدیث غلام رسول صاحب لائلپوری پڑھایا کرتے تھے۔ جب مولانا غلام رسول صاحب شر قپور سے ہارون آباد گئے اور وہاں سے بُورے والا اور پھر وہاں سے لاہور کے دارالعلوم حزب الاحناف میں آئے تو مولانا انوار الاسلام آپ کی رفاقت میں رہے۔ یہاں مولانا نے تمام علوم منقولات اور معقولات کی تکمیل کی۔ حضرت مولانا سردار احمد لائلپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ منظر الاسلام رضویہ لائل پور میں دورۂ حدیث پڑھا اور دستارِ فضیلت ۱۹۵۶ء میں حاصل کی اور پھر لاہور آ کر مولوی جان محمد کی مسجد چھاؤنی لاہور میں خطیب مقرر ہُوئے۔ ایک سال آپ نواب شاہ سندھ میں خطیب اور مدرس مقرر ہُوئے مگر لاہور کی کشش نے پھر کھینچا اور مسجد رام گڑھ میں خطیب رہے۔ شیخ الحدیث مولانا غلام رسول صاحب لائل پور منتقل ہُوئے تو آپ مدرسہ نظامیہ رضویہ میں مدرس اور ناظم مقرر ہُوئے۔ ۱۹۶۷ء میں مولانا اعجاز ولی خاں مرحوم کے مشورہ پر مکتبہ حامدیہ قائم کیا اور راقم کے اصرار پر گنج بخش روڈ پر چلے آئے۔ مکتبہ کی مصروفیت سے آپ نے جامعہ نظامیہ سے استعفا دے دیا اور ہمہ تن اشاعتِ کتب میں مصروف ہو گئے۔ اب تک وُہ خُون کے آنسو، جواہر البیان، مسلک امام ربانی اور مسلم الثبوت جیسی کتابیں طبع کرا چکے ہیں۔ (باقی بر صفحہ آیندہ)

جامعہ نظامیہ لوہاری دروازے کے منتظم اور صدر مدرس تھے۔ انہیں مکتبہ حامدیہ کا جھنڈا لہرانے پر آمادہ کر لیا گیا۔ حضرت پیر کرم شاہ بھیروی الازہری نے ضیائے حرم کا دفتر قائم کر دیا۔ اس طرح یہ بازار گنج بخشِ علم و دانش بنتا گیا۔ دیو بندی ناشرین نے جمود زدہ سُنیوں کو پر پُرزے نکالتا دیکھا تو تعجب سے کہنے لگے یہ بریلی بازار کہاں سے نکل آیا۔ بہر حال ان چار اداروں نے سُنیوں کی کتابوں کی اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ علمی کتابیں لانے لگے۔ تراجم ہونے لگے۔ نادر کتابیں پہنچنے لگیں۔ مکتبہ اسلامیہ کی جگہ جب حاجی محمد ارشد صاحب قریشی کی نگرانی میں المعارف نے کام شروع کیا تو تصوّف کی نایاب کتابیں خوب صُورت انداز میں چھپنے لگیں اور مختلف علماء کی لائبریریوں کی وُہ کتابیں جو ان کے مطالعہ سے فارغ ہوتیں۔ ان اداروں سے دُوسرے علماء کے کتب خانوں میں منتقل ہونے لگیں۔ کراچی کے سارے مطابع دیو بندی ناشرین کی نگرانی میں چل رہے تھے۔ وُہ ترجمے بھی کرتے تو دیو بندی رنگ میں۔ تذکرہ چھاپتے تو علماء اہلسنّت کے کارناموں کو دیدہ دانستہ نظر انداز کر جاتے۔ جناب غوث الاعظم رضی اللہ عنہ سے چڑ کھانے والے اپنے چھوٹے موٹے کھدر پوش مولوی کو قطب عالم اور قبلۂ جہاں لکھتے۔ ان ناشرین میں صرف مدینہ پبلشنگ کمپنی کے مالک محمد تقی اشرفی ایسے تھے جو سُنّی تھے مگر وُہ دیو بندی علماء کی کتابوں کی اشاعت سے آگے سوچ نہ سکتے تھے۔ بہشتی زیور، مواعظ اشرفیہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جواہر البحار فی فضائل نبی المختار تصنیف علامہ امام یوسف نبہانی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں حج کیا۔ مکتبہ کے ساتھ ساتھ جامعہ شیرازیہ میں اعزازی مدرس ہیں۔

؎ مفتی محمد عبد القیوم ہزاروی جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور کے مہتمم اور تنظیم المدارس اہلسنّت پاکستان کے ناظم اعلیٰ ہیں آپ ۲۹ر شعبان ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء کو موضع میراہ علاقہ اپر تناول تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی مولانا حمید اللہ تھے۔ ابتدائی کتب فارسی اپنے عم مکرم مولانا محبوب الرحمٰن سے پڑھیں۔ دار العلوم حزب الاحناف لاہور میں داخل ہُوئے۔ دار العلوم منظر الاسلام ہارون آباد اور مدرسہ احیائے علوم بُورے والا میں تعلیم پاتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں دورۂ حدیث کے لیے دار العلوم حزب الاحناف لاہور آگئے۔ ۱۹۵۶ء میں سندِ فراغت کے لیے آپ جامعہ رضویہ لائلپور میں رہے۔ محدث اعظم مولانا سردار احمد، علامہ ابو البرکات، شیخ الحدیث مولانا غلام رسول اور مولانا سید محمد انور شاہ آپ کے نامور اساتذہ میں سے ہیں۔ سندِ حدیث مولانا سردار احمد مرحوم اور علامہ ابو البرکات دونوں سے حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں حضرت شیخ الحدیث لائلپور سے بیعت ہُوئے۔ پھر لاہور میں دار العلوم جامعہ نظامیہ میں بحیثیت مدرس مقرر ہُوئے۔ ۱۹۶۲ء میں جامعہ نظامیہ کے بانی مولانا غلام رسول محدث پاکستان کی وفات پر جامعہ رضویہ لائلپور چلے گئے تو آپ کو دار العلوم نظامیہ کے سارے انتظامات سنبھالنے پڑے۔ ۱۹۷۲ء میں آپ نے پاکستان بھر سے [illegible]

بدر عالم میرٹھی اور مولوی الیاس صاحب کی کتابیں، مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین غرضیکہ دیوبندی لٹریچر ان پر چھایا ہوا تھا۔ وہ لاہور آتے تو رات حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر گزارتے اور ہمارے مکتبہ پر بھی تشریف لاتے۔ وہ ملک التجار تھے۔ ایک اعلیٰ پریس کے مالک تھے۔ پکے سُنی العقیدہ بزرگ تھے اور معاملہ فہمی میں کمال رکھتے تھے۔ میرے کام کو سراہتے اور دعا دیتے۔ میں نے حکیم صاحب کو سُنی علماء کی کتابیں طبع کرانے پر نہ صرف آمادہ کیا بلکہ یقین دلایا کہ آپ سُنی کتابیں شائع کریں تو تجارتی طور پر سارے پنجاب میں ہمیں مستعد پائیں گے۔

حکیم صاحب نے غور کیا تو بات دل میں جا پہنچی۔ توجہ دی تو خوب صورت انداز میں کتابیں آنا شروع ہوئیں۔ پہلے تو دیوبندی ناشرین نے مدینہ پبلشنگ کمپنی کی کتابوں کو بدعتی کتابیں کہہ کر نظر انداز کیا مگر حکیم تقی صاحب کے تدبر اور نفاست طباعت کے سامنے وہ گھٹنے ٹیکنے لگے حکیم صاحب جو کتاب لاتے اعلیٰ معیار پر ہوتی اور قیمت موزوں، حدائق بخشش، اطیب البیان، ذوقِ نعت، پھر ذکرِ جمیل، ذکر الحسین سے آگے بڑھ کر جب مدارج النبوت اور مکتوبات امام ربانی کی ضخیم جلدیں بازار میں آئیں تو دیوبندی ناشرین دم بخود ہو گئے۔ ملک کے سُنی دکانداروں نے ہزاروں جلدیں منگوا کر مدینہ پبلشنگ کمپنی کے حوصلے بلند کر دیئے۔ حکیم صاحب میرے ساتھ اکثر مشورہ کرتے اور مجھے مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ فتاوٰی رضویہ کی اشاعت پر نہ صرف مجھے مبارک باد دی بلکہ ایک پُر تکلف دعوت دے کر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔ شواہد النبوت کی نفاستِ طباعت پر دل کھول کر دعائیں دیں۔

علماء و مشائخ کے حالات و سوانح ترتیب دینے کی اہمیت تو اکثر اہلِ علم کے سامنے ہے مگر اس سلسلہ میں میرے احباب میں سے جن بزرگوں نے کامیاب بلکہ شاندار کوششیں کیں ان میں مفتی محمود عالم صاحب ہاشمی، میاں محمد دین صاحب کلیم، سید شریف احمد شرافت[1]

۱؎ **سیّد شریف احمد شرافت نوشاہی** نام شریف احمد، لقب و تخلص شرافت، کنیت ابو المظفر مولد ساہن پال بھالیہ ضلع گجرات، تاریخ پیدائش ۱۹ شعبان ۱۳۲۵ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۹۰۷ء ہے۔ والد گرامی سید غلام مصطفیٰ نوشاہی تھے جو خاندانِ سادات علوی نوشاہی کے جیّد عالمِ دین تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

نوشاہی، پروفیسر محمد ایوب[1] قادری ایم۔ اے اردو کالج کراچی اور سید محمد امیر[2] شاہ صاحب قادری سجادہ نشین شاہ محمد غوث خصوصیت سے قابلِ ستائش ہیں۔ سید شرافت نوشاہی نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور پنجابی، فارسی کے معروف شاعر اور مصنف تھے (م ۱۴۰۴ھ)۔ سید شرافت صاحب نے چار سال چار ماہ اور چار دن کی عمر میں ۲۳ ذوالحجہ ۱۳۲۹ھ کو اپنے دادا سے بسم اللہ پڑھی۔ پھر قرآن مجید اور فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ والد سے عربی کتابیں پڑھیں۔ فنِ کتابت کے لیے مولانا محمد حسین مبارک رقم عادل گڑھی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ سلسلہ قادریہ نوشاہیہ میں اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور خلافت و اجازت حاصل کی۔ شمس الفقراء کا خطاب پایا۔ صوفیاء کی تعلیمات و تالیفات سے بڑے متاثر تھے۔ اسی لیے بزرگانِ دین کے حالات لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ کم و بیش دو سو کتابیں لکھیں۔ تفسیر (۲) حدیث (۱) فقہ (۶) مناظرہ (۵) تصوف (۱۵) تاریخ (۸) تذکرہ (۲۲) فضائل و مناقب (۸) نسب نامے (۴) مکاتیب (۸) روزنامچے (۵) سفرنامے (۴) اوراد (۱۴) ادب (۵) تنقید (۲) طب (۱) متفرقات (۱۸) پر تالیف کیں۔ بڑے محنتی، خلیق اور متقی انسان ہیں۔ وہ بحرالعلوم والفنون ہیں راقم کے ساتھ خاص شفقت رکھتے ہیں۔ (احوال و آثار سید شرافت نوشاہی)

[1] پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے ملک کے مایہ ناز مصنف و مؤلف، مؤرخ اور تذکرہ نویس ہیں۔ اپنے تحقیقی مضامین، تصنیفات اور تالیفات کی وجہ سے پاک و ہند کی علمی دنیا میں منفرد ہیں۔ خیبر سے لے کر کراچی تک علمی دنیا میں ہر کام کرنیوالا قادری صاحب کے حلقۂ شناسائی میں آتا ہے۔ بڑے مخلص، محنتی اور قابل اہلِ قلم ہیں۔ اردو کالج کراچی میں ہوں تو استاد، لائبریری میں ہوں تو ریسرچ سکالر، علمی مجلس میں بیٹھے ہوں تو معلومات کا خزینہ، قدیم کتابوں کی دکان میں ہوں تو ہمہ تن تجسس، علماء کے پاس جائیں تو شاگرد رشید، احباب میں بیٹھیں تو خلوص و محبت کا پیکر۔ آپ نے سینکڑوں تحقیقی مضامین لکھے۔ تذکرہ علماء ہند اور مآثر الامراء کا ترجمہ اور حاشیہ لکھ کر علمی دنیا میں نام پیدا کیا۔ محمد احسن نانوتوی، بہاء الدین زکریا ملتانی، تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ جیسی مستقل تالیفات زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ راقم کے حلقۂ احباب کے مسند نشین ہیں۔ مگر التجائے بسیار کے باوجود حالاتِ زندگی بتلانے سے گریزاں۔ اگرچند صدیاں پہلے ہوتے تو ہم ان کی اس اخفاءِ احوال کی کرامت سے معمول کرتے۔ میرے مخلص، علمی معاون اور حوصلہ افزاد بزرگ ہیں۔

[2] سید محمد امیر شاہ صاحب قادری دامت برکاتہم پشاور میں سادات خاندان کے علمی اور روحانی گھرانے (حضرت شاہ محمد غوث لاہوریؒ) کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کی اور (باقی بر صفحہ ۴۰۳)

صوفیاء و مشائخ کی روحانی تاریخ میں زبردست تحقیقی کام کیا۔ خصوصیت سے انہوں نے اپنے خاندان نوشاہی کے عالی قدر بزرگانِ دین کے سوانح و حالات لکھ کر علمی دنیا میں نام پیدا کیا۔ وہ فنِ تاریخ گوئی، تذکرہ نویسی، تاریخی حقائق کی جستجو میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ انہوں نے شریف التواریخ لکھ کر علمی دنیا میں ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ جناب محمد ایوب ایم۔ اے پروفیسر ہیں اور علمی مطالعہ کا ایک بحرِ بیکراں ہیں۔ انہوں نے مولوی رحمان علی کے تذکرہ علماء ہند کا اردو ترجمہ اور اس پر مفصل حواشی لکھ کر دنیاءِ علم میں اپنی شہرت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ دنیائے تاریخ و علم نے آپ کو جی بھر کر خراجِ تحسین پیش کیا ان کی ماثر الامراء کی ضخیم جلدیں آئیں تو وہ اس موضوع کے معروف مؤلف تسلیم کیے گئے۔ وہ ہر صاحب علم سے تاریخی مواد جمع کرتے ہیں اور ایسے لوگوں سے مخلصانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ میرے ساتھ ان کے روابط دوستانہ بھی ہیں اور برادرانہ بھی۔ اپنے مشوروں سے نوازتے ہیں اور کوششوں کی قدر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مولوی شیر محمد صاحب سے فارسی پڑھی۔ پھر پشاور کے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا۔ علامہ عبدالرحیم پوپلزئی، شیخ التفسیر والحدیث حافظ علی احمد جان، الحاج حافظ گل فقیر احمد صاحب، فقیہِ عصر مولانا عبدالعلیم صاحب، حضرت مولوی عبدالمنان صاحب ہزاروی، مولانا محمد ایوب شاہ جعفری صاحب سے فنی اور درسی کتابیں پڑھیں۔ مدرسہ رفیع الاسلام پشاور میں بھی کچھ عرصہ پڑھتے رہے۔ مولوی فضل الرحمان سے نحو پڑھی۔ سندِ حدیث حافظ گل فقیر احمد سے لی۔ فارغ ہونے کے بعد اپنے بزرگانِ خاندان کے سجادۂ ارشاد پر بیٹھے۔ دینی اور روحانی اصلاح کا کام کرنے لگے۔ جامع مسجد مہربانیہ میں خطابت کرتے ہیں۔ علم و فضل کی شمع ہیں۔ آپ کے اردگرد احباب ذوق دکھائی دیتے ہیں۔ تذکرہ حفاظِ پشاور، تذکرہ علماء و مشائخ سرحد دو جلدیں، نماز متبول اور دوسری کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ماہنامہ "الحسن" پشاور کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔

قادری سلسلۂ روحانیت میں ۱۹۴۸ء میں اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت کر کے ابوالبرکات سید حسن رحمۃ اللہ علیہ اور سارے خاندان کے خصوصی احوال و مقامات کی اجازت کلی حاصل کی۔ کئی بار سعادتِ حج سے مشرف ہوئے زیارتِ روضۂ غوث الاعظم سے فیض یاب ہوئے۔ نہایت متقی، علم دوست، عالم نواز اور فیاض انسان ہیں دل کی وسعت اور احباب سے اخلاص سے خاندانی روایات جھلکتی ہیں۔ راقم سے خصوصی مراسم اور قلبی شفقت رکھتے ہیں۔ صاحبزادگان میں سے غلام سیدین، جمال الحسنین، محمد حسنین، محمد سبطین، نور الحسنین اور محی الدین علوم پڑھ رہے ہیں۔

کرتے ہیں۔ پیر سید محمد امیر شاہ صاحب قادری گیلانی ایک عالی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ وہ اپنی سخاوت، خلق اور محبت کے پیش نظر ہر علم دوست کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں۔ لاہور میں ہوں تو مجھے یاد فرماتے ہیں اور اگر پشاور میں ہوں تو میں ان کی یادوں کا سہارا لیتا ہوں۔ انھوں نے تذکرہ علماء و مشائخ سرحد دو جلدوں میں طبع کرایا اور بڑی محنت سے ان علماء کا تذکرہ کیا جن کے حالات ابھی تک دوسری کتابوں میں نہیں تھے۔ تذکرہ حفاظِ پشاور، تذکرہ مشائخ قادریہ حسنیہ بڑے خوبصورت انداز میں طبع کرائیں۔ ان دنوں رسالہ "الحسن" جاری کیا جس میں علمی مضامین ہوتے ہیں۔ آپ عالمِ دین، پابندِ شریعت، صوفی اور پیر ہیں جن کی مجالس لاہور اور پشاور کے اہلِ ذوق کے لیے سامانِ سکون بخشتی ہیں۔ مولوی محمد دین کلیم صاحب لاہور کی معروف شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنی

لـه **مولوی محمد دین کلیم صاحب لاہوری** بڑے محنتی، بسیار نویس اور لاہور کی تاریخ کے ہر شعبہ پر بے پناہ معلومات بہم پہنچانے والے بزرگ جناب محمد دین کلیم دنیائے علم و ادب میں شہرت تامہ رکھتے ہیں۔ ان کی سَو سے زیادہ تصانیف میں سے نقشبندی اولیاء کی سرگرمیاں، اولیائے چشت لاہور، اولیائے سہروردیہ لاہور اور سلسلۂ قادریہ لاہور اہلِ علم سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ آپ اگست ۱۹۱۱ء میں دیپال پور کے قاضی خاندان کے علمی وارث کی حیثیت سے دنیا پر تشریف لائے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک لاہور میونسپل کارپوریشن میں اکاؤنٹس آفیسر رہے۔ بی اے، ایل ایس جی ڈی پنجاب اور ادب میں فاضل اردو پاس کیا۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے خاندان کا عظیم کتب خانہ چھوڑ کر لاہور قیام پذیر ہوئے۔ خاکِ لاہور سے اتنا عشق ہوا کہ اس مقدس شہر کے گوشہ گوشہ میں ہر قسم کے تاریخی آثار کو کتابی صفحات پر پھیلاتے جا رہے ہیں۔ کلکتہ، پٹنہ، بانکی پور، گیا، پھلواری شریف، آگرہ، دہلی، لکھنؤ، کراچی، ملتان کی لائبریریوں سے لاہور کی تہذیبی زندگی کے آثار کو تلاش کیا اور صفحۂ قرطاس پر لائے۔ ۱۲۰ کتابیں صرف لاہور پر لکھیں۔ ان دنوں متعدد مسودات زیرِ تکمیل ہیں۔ میرے علمی مشوروں کو اکثر عملی جامہ پہناتے ہیں۔ ایک عرصہ سے عرفات، امروز اور مساوات میں بھی لاہور کے بزرگانِ دین پر مضامین لکھ رہے ہیں۔

قلم اور تحریر کا محور مدینۃ الاولیاء، لاہور کو بنا رکھا ہے۔ وہ لاہور کے ہر شعبۂ زندگی پر لکھتے ہیں۔ اخبارات، رسالے، کتابیں، کتابچے، پمفلٹ اور اشتہارات ان کی لاہوری تحریروں سے مالا مال ہیں۔ انہوں نے لاہور میں اولیائے نقشبند کی سرگرمیاں، اولیائے چشت لاہور، اولیائے سہروردلاہور اور سلسلہ قادریہ لاہور جیسی معروف کتابیں لکھ کر نام پیدا کیا ہے۔ وہ میرے کرم فرما علم دوست احباب میں سے ہیں اور ایک عرصے سے ملاقات رکھتے ہیں۔ مفتی محمود عالم صاحب ہاشمی[ل] میرے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ وہ مفتی غلام سرور لاہوری کے نواسے تھے۔ بڑے علم دوست انسان تھے۔ خزینۃ الاصفیاء کے ترجمہ کے وقت وہ میرے معاون رہے۔ سلسلہ قادریہ اور سلسلہ

ل **مفتی محمود عالم ہاشمی** میرے علمی رفیق کار، خلیق بزرگ اور جلیس مجلس بروز چہار شنبہ ۱۸ر ستمبر ۱۹۰۹ء بمقام فیروزپور پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مفتی محمد چراغ روشن تھا۔ والدہ مفتی غلام سرور لاہوری کی بیٹی تھیں۔ اس طرح آپ مفتی غلام سرور لاہوری مصنف خزینۃ الاصفیاء و دیگر کتب کبیرہ کے نواسے تھے۔ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ لاہور سے کیا۔ ایم سی اے کالج سے جونیر انگلش کیا۔ ۱۹۲۳ء میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۲۹ء میں ڈرافٹ مین کی حیثیت سے ریلوے ہیڈکوارٹر میں لیے گئے اور آخر عمر تک وہاں ہی رہے۔ خاندانی ماحول علمی تھا۔ علم و ادب سے تعلق پیدا ہو گیا اور فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ آغا بیدار بخت کے کالج دارالعلوم السنۃ الشرقیہ لاہور میں شبینہ جماعتوں میں فاضل اردو اور فاضل فارسی کے اعزازی معلم تھے اور سالہا سال پڑھاتے رہے۔ آپ نے بہت سے مقالے مختلف ادبی رسائل میں لکھے۔ آپ حلقہ ارباب علم لاہور کے رکن تھے اور تنقیدی مجالس میں شرکت کرتے۔ آپ نے راقم کے ساتھ خزینۃ الاصفیاء کا ترجمہ کیا اور خزینۃ الاصفیاء کی اردو میں علیحدہ تلخیص کی جو ابھی تک طبع نہیں ہو سکی۔ ذکر جمیل میں اپنے خاندان کے بزرگوں کے حالات لکھ کر چھپوائے۔ بڑے حلیم، خلیق اور علم دوست بزرگ تھے۔ دفتری مصروفیات سے فارغ ہو کر راقم کے پاس بیٹھتے اور علمی گفتگو سے نوازتے۔ مفتی غلام سرور لاہوری کی تصانیف کو انہی کی تحریک نے زندہ کیا۔ افسوس وہ خزینۃ الاصفیاء کا ترجمہ مکمل نہ کر سکے تھے کہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ ۱۴ر جون ۱۹۷۲ء یوم وصال ہے۔

(ذکر جمیل)

سہروردیہ کا ترجمہ انھوں نے ہی کیا اور رکن اوّل سلسلہ نقشبندیہ کے تراجم میں نے کیے۔ یہ کتاب المعارف نے چھاپی۔ مفتی صاحب نے اپنے خاندان کے بزرگوں کے حالات ذکرِ جمیل کے نام سے طبع کرائے۔

۱۹۶۵ء کے اوائل میں ہندوستان سے جو علماء پاکستان آئے ان میں حضرت سید غلام جیلانی صاحب مہتمم مدرسہ عربی اندرکوٹ میرٹھ اور مولانا ریحان میاں بریلی شریف بھی تھے۔ حضرت سید صاحب نے میری خدمات کو بڑا پسند کیا۔ اپنی کتاب لبشیرالقاری شرح صحیح بخاری کی پہلی جلد اور بشیرالکامل عنایت فرمائی۔ ہندوستان میں مکتبہ نبویہ کی مطبوعات منگوانا شروع کیں۔ خود اعلیٰ حضرت کی کئی کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ کیں۔ ان کی محنت، تدبّر اور علمیت اور اخلاق نے مجھے بڑا متاثر کیا اور وہ میرے رشتۂ مودّت میں آج تک موجود ہیں۔ سید غلام جیلانی صاحب سنّی علماءِ ہند ہیں۔

لے حضرت مولانا غلام جیلانی مدظلہ العالی سید الاساتذہ فخر علماء اہلسنت مولینا غلام جیلانی ۱۹۰۰ء میں ریاست دادون علی گڑھ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام الحاج غلام فخرالدین ابن مولانا حکیم سخاوت حسین فخری سلیمانی ہے۔ آپ کے چچا برِصغیر کے معروف عالمِ دین مولانا قطب الدین برہمچاری (م ۱۳۲۹ھ) نے جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں داخل کرا دیا۔ ابتدائی کتابیں مولانا عبدالعزیز فتحپوری سے پڑھیں۔ گلستان، قدوری، قال اقول تک حضرت صدر الافاضل محمد نعیم الدین مراد آبادی سے پڑھیں۔ شرح ملا جامی اجمیر شریف کے مدرسہ میں پڑھی۔ ان دنوں نحو کے امام مولانا امتیاز احمد امیٹھوی اسی دارالعلوم میں پڑھاتے تھے۔ ملا حسن کے تحریری امتحان میں امتیازی حیثیت اختیار کی۔ آپ کے اساتذہ میں سید عبدالمجید، مولانا عبدالحیٔ افغانی، مولانا عبداللہ افغانی، سید امیر احمد پنجابی اور حضرت مولانا امجد علی اعظمی (مؤلف بہارِ شریعت) کے اسماءِ گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت صدر الشریعۃ نے ہی آپ کو بریلی کے دارالعلوم منظر الاسلام میں داخل کرایا اور فوقانی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۵۲ھ میں صدر الشریعۃ کے ہاتھوں دستارِ فضیلت اور سندِ تکمیل حاصل کی۔ بریلی میں آپ کے ہم درس شاہ عبدالعزیز شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ، مولانا حبیب الرحمٰن مدظلہ، مولانا سردار احمد شیخ الحدیث لائلپوری، مولانا رفاقت حسین (والد ماجد مولینا

(باقی اگلے صفحہ پر)

منفرد مقام کے مالک ہیں اور خدمتِ دین میں مستعد ہیں۔ وہ ایک قابل مدرس اور بلند پایہ مصنف ہیں۔ انہوں نے چند سال پیشتر مجھے مولانا مشتاق احمد نظامی ایڈیٹر پاسبان الہ آباد کی ایک شاندار کتاب "خون کے آنسو" بھیجی جسے مکتبہ نبویہ سے چھپوا کر تقسیم کیا گیا۔ خون کے آنسو کے بعد آپ نے جناب ارشد القادری کی کتاب جماعت اسلامی بھیجی جسے مکتبہ حامدیہ نے طبع کرایا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے پہلے مولانا ارشد القادری مجھے جامِ نور کی بیش کا پیاں ہر ماہ بھیج دیتے۔ یہ رسالہ علامہ ارشد القادری کے قلم کا شاہکار تھا اور ناقدانہ انداز کا ایک عمدہ نمونہ ہوتا تھا۔ جمشید پور بہار سے نکلتا اور خالص سنیت کی ترجمانی کرتا۔ مولانا ارشد القادری نے اپنی مشہور کتاب "تبلیغی جماعت حقائق کے اجالے میں" بھیجی اور یہ خواہش کی کہ اسے پاکستان میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شاہ محمود احمد قادری مولف تذکرہ علماء اہلسنت) تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد دار العلوم محمدیہ جائس میں تدریس شروع کی۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے مشورہ پر کرنال کے دار العلوم میں صدر مدرس بنے پھر کانپور کے احسن المدارس میں صدر مدرس بنے۔ شوال ۱۳۲۵ھ ۱۹۲۵ء میں میرٹھ کی اس اسلامی درس گاہ میں صدر مدرس ہوئے جو خان بہادر الحاج حبیب بشیر الدین نے اندر کوٹ میں قائم کیا تھا۔ اس درس گاہ میں دیو بندی علماء کا تسلط تھا۔ وہ علماء اہلسنت کے متعلق یہ تاثر قائم کرتے تھے کہ ان کے ہاں علم نہیں ہے۔ مولانا غلام جیلانی نے نہ صرف ان کے چیلنج کو قبول کیا بلکہ بدر عالم میرٹھی کے پیرو مرشد قاری اسحاق کو تدریس و مناظرہ میں شکست دی۔ مولوی بدر عالم میرٹھی کی فیض الباری شرح صحیح بخاری کی علمی اور فنی غلطیاں واضح کیں اور بشیر القاری کے نام پر صحیح بخاری کی جامع اور مستند شرح لکھی۔

آپ فاضل یگانہ، بلند پایہ مدرس، راسخ العقیدہ عالم دین اور ممتاز مولف و مصنف ہیں۔ بشیر القاری شرح بخاری کے علاوہ آپ نے بشیر الکامل لکھی۔ اعلیٰحضرت امام اہلسنت کی تصانیف فتاویٰ رضویہ، ملفوظات اعلیٰحضرت وغیرہ آپ کے اہتمام میں چھپی ہیں۔ ۱۳۷۷ھ میں پاکستان کا دورہ کیا۔ بہت سے علماء اہلسنت کے باہمی اختلافات کو دور کیا۔ ۱۳۷۹ھ میں حج بیت اللہ کیا۔ راقم الحروف سے انہیں خصوصی شفقت ہے۔ (تذکرہ علماء اہلسنت مولفہ شاہ محمود احمد قادری)

شائع کیا جائے۔ مکتبہ نبویہ اپنی دوسری مطبوعات کے پیشِ نظر اسے شائع نہ کر سکا مگر میرے محترم گرامی سید میر احمد شاہ صاحب[1] بخاری نے زرِ کثیر خرچ کر کے اپنے مکتبہ مظہر فیض رضا برج منڈی لائلپور سے بڑی آب و تاب سے شائع کیا۔ پاکستان میں تبلیغی جماعت کی نظریاتی اور اعتقادی تصویر سب سے پہلے اسی کتاب میں کھینچی گئی تھی۔ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ نکلی اور طوفان بن کر قارئین کے دل و دماغ پر چھا گئی اور جناب ارشد القادری کے زورِ تحریر نے اپنا لوہا پاکستان میں بھی منوا لیا۔ غالباً ۱۹۷۳ء میں جب میرے فاضل دوست جناب محمد منشا صاحب تابش قصوری

---

[1] **سید میر احمد شاہ صاحب بخاری** آپ ۱۳۱۰ھ یکم ذوالحجہ بمقام جلال پور جٹاں (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ حضرت کے والد کا اسم گرامی میر محمد امیر اللہ چشتی بن سید میر احمد قادری بن سید عبد الرحمان بن سید میر محمد رمضان رحمۃ اللہ علیہم تھا۔ سید میر محمد رمضان پہلے بزرگ تھے جو وادیِ کشمیر سے جلال پور آ کر مقیم ہوئے سلسلۂ ارشاد جاری ہوا سید میر احمد شاہ صاحب نے ابتدائی تعلیم حضرت حافظ محمد نور الدین جلال پوری سے حاصل کی۔ مڈل تک سکول پڑھے۔ فارسی اور عربی کی درسیات پڑھنے کے بعد عام مطالعہ کرتے رہے۔ جوانی میں بمبئی میں قیام پذیر ہوئے۔ محکمہ تعلیم میں ملازمت کی۔ آپ وہاں مختلف علماء و صوفیاء سے فیضیاب ہوتے رہے۔ اپنے وقت کے خوش بیان مقرر اور خطیب رہے۔ حضرت الحاج خواجہ محمد سید شاہ صاحب سجادہ نشین چورہ شریف کے دستِ حق پرست پر ۱۹۲۷ء میں بیعت ہوئے۔ حضرت کچھوچھوی (ابو محمد علی حسین شاہ) سے چشتیہ فیض لیا۔ محدث پاکستان حضرت مولانا سردار احمد لائلپوری سے سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ غیرتِ اسلام، سچا پیر وغیرہ آپ کی مقبول تصانیف ہیں۔ مکتبہ فیض رضا ۱۹۶۵ء میں قائم کیا لیکن ۱۹۷۲ء میں زلزلہ اور تبلیغی جماعت کی اشاعت سے علمی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں حج بیت اللہ شریف اور زیارتِ مدینہ منورہ سے بہرہ ور ہوئے۔ بڑے دردمند، جفاکش اور مخلص بزرگ ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں عقیدت مند اور مریدِ ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور سادات بخارا کی علمی یادگار ہیں۔ برج منڈی ضلع لائلپور میں روحانی اور علمی کام میں مصروف ہیں۔

[2] **مولانا محمد منشاء تابش قصوری** نام محمد منشاء ابن میاں الہ دین صاحب تخلص تابش (قصوری، سیالوی)

(باقی برصفحہ آئندہ)

حج پر گئے تو جناب علامہ ارشد القادری سے حرمین الشریفین میں ملے۔ آپ نے ان کی ایک تازہ کتاب زلزلہ دیکھی۔ یہ علم غیب رسول سے انکار کرنے والوں پر زبردست تنقید تھی اور علامہ ارشد القادری کے قلم کا زور لیے ہوئے تھی۔ مولانا نے اسے نقل کیا اور پاکستان میں لاکر مجھے ارمغانِ حجاز کے طور پر دیا۔ مجھے مولانا کی اس کاوش میں خلوص اور محبت کا جوجذبہ نظر آیا اس کے پیشِ نظر میں نے شاہ صاحب کو پھر گزارش کی کہ وہ اسے بھی زیورِ طبع سے آراستہ کر کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۸)

مولد ہری ہر قصور خطیب جامع مسجد فردوس ٹیز یز مرید کے ۴ ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ قرآن کریم گھر میں پڑھا۔ مڈل پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ہائی سکول گنڈا سنگھ والا میں داخلہ لیا اور میٹرک کیا۔ مولانا محمد عمر اچھروی اور مولانا محمد شریف نوری کی تقریروں سے دینی تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔ میٹرک کے بعد دارالعلوم حنفیہ فریدیہ بصیر پور میں داخل ہوئے۔ ۱۳۷۷ھ سے ۱۳۸۵ھ تک علوم دینیہ میں دسترس حاصل کی۔ سندِ فضیلت حاصل کی۔ فقیہِ اعظم الحاج مولانا محمد نور اللہ صاحب نعیمی مدظلہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ مولانا ضیاء القادری بدایونی نے سندِ فراغت کے موقعہ پر مرصع نظم کہی۔ مقطع ملاحظہ ہو ؎

منشائے محمد کو منشائے خدا سمجھا

تاریخ ضیا کہیے ابرار شریعت آ

۱۳۸۵ھ

۱۹۷۴ء میں حج پر گئے تو مسجد نبوی میں بیٹھ کر دورۂ حدیث دوبارہ کیا۔ گنبد خضریٰ کے سامنے دستارِ فضیلت دوبارہ حاصل کی۔ مرکزی انجمن حزب الرحمٰن بصیر پور کے نائب ناظم رہے۔ آپ نے حضرت مولانا محمد نور اللہ صاحب نعیمی کے علاوہ مولانا محمد باقر صاحب ضیاء، صاحبزادہ نصر اللہ صاحب نوری سے علمی استفادہ کیا۔ شاعری میں مولانا ضیاء القادری کی شاگردی کی۔ آپ نے ملکی رسائل و جرائد میں بڑے زوردار مضامین لکھے۔ محمد نور، تذکرۃ الصدیق، راہِ عمل، انوار الصیام، گنج شکر، اظہارِ حقیقت کے علاوہ کم و بیش بائیس کتابیں لکھیں۔ ۱۹۷۱ء میں خواجہ قمر الدین صاحب سیالوی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نوجوان علماء میں بڑے مخلص، مستعد، باعمل اور روشن دماغ عالم دین ہیں۔ مکتبہ نبویہ کے معاون اور راقم کے مخلص دوست ہیں۔ آپ نے مولانا عبدالحکیم شرف سے مل کر باغی ہندوستان کو بڑی آب و تاب سے شائع کیا۔ زلزلہ اور کربلا کا مسافر آپ کی کوششوں سے پاکستان میں چھپا۔

قارئین تک لائیں۔ شاہ صاحب نے زلزلہ چھاپا تو دنیائے دیوبندیت میں زلزلہ برپا کر دیا۔ کئی ایڈیشن چھپے اور علماء نے بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ مکتبہ نبویہ نے ان کتابوں کو اپنے حلقہ میں پھیلانے میں بڑا حصہ لیا۔ مجھے حضرت شیخ عبدالحق دہلوی کی کتابوں کے تراجم کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ الدرثمین کے ترجمہ کے بعد میرے سامنے تکمیل الایمان تھی۔ میں نے نہ صرف اس کتاب کا ترجمہ کیا بلکہ اس پر اعلیٰحضرت احمد رضا خاں بریلوی کے حواشی مرتب کر کے خوب صورت انداز میں چھپوائی۔ مرج البحرین ایک عرصہ سے نایاب تھی۔ اس کا ایک نسخہ نکال کر اس کا ترجمہ کیا اور چھاپ دیا۔ اس طرح یہ کتاب ایک بار پھر زندہ ہوگئی۔ مفتی غلام سرور لاہوری کی مشہور فارسی کتاب خزینۃ الاصفیا کا ترجمہ کیا کتابت کروائی مگر المعارف کے حاجی محمد ارشد صاحب نے اس کتاب کو اپنے مکتبہ سے چھپوایا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ زبدۃ الآثار کا ترجمہ کیا۔ کشف المحجوب تصنیف مخدوم علی الہجویری کا خلاصہ کر کے فاضل فارسی کے طلبہ کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ داتا گنج بخش کی کتاب کشف الاسرار کا ایک زمانہ میں ترجمہ کر کے مفت تقسیم کی۔ اعلیٰحضرت کی کتاب ختم النبوۃ کو ترتیب دے کر عنوانات قائم کیے اور خوب صورت انداز میں چھاپا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتاب تحریکِ ختمِ نبوت کے دوران نکل گئی۔ اعلیٰحضرت کے اور کئی رسالے زیورِ طبع سے آراستہ کیے اعلیٰحضرت کے رسائل کو خوب صورت اور صحت کے ساتھ شائع کرنے کا سہرا میرے فاضل دوست مولانا عبدالحکیم شرف[1] کے سر پر ہے۔ وہ دارالعلوم اسلامیہ ہری پور ہزارہ میں مدرس تھے

---

[1] **مولانا عبدالحکیم شرف** آپ ۱۲؍ اگست ۱۹۴۴ء کو مرزاپور ضلع ہوشیارپور میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور آ گئے۔ والد گرامی مولوی اللہ دتہ صاحب علماء کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے۔ بیٹے کو دینی تعلیم کے لیے وقف کر دیا۔ چنانچہ جامعہ رضویہ لائلپور میں داخل ہوئے اور ابتدائی دینی علوم کا مطالعہ کیا۔ اس وقت کے اساتذہ مولانا منصور شاہ، مفتی محمد امین، حافظ احسان الحق اور حاجی محمد حنیف سے استفادہ کیا۔ ۱۹۵۷ء میں جامعہ نظامیہ میں داخل ہوئے۔ صرف و نحو کی ابتدائی کتابوں سے لے کر ملا جلال تک مطالعہ کیا۔ مولانا مفتی عبدالقیوم، مولانا غلام رسول شیخ الحدیث اور مولانا شمس الزماں سے پڑھتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں بندیال کے مدرسہ امدادیہ مظہریہ میں حسامی، قاضی مبارک خیالی اور صحاح ستہ کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۶۳ء میں سندِ فضیلت لی۔ ۱۹۶۵ء میں جامعہ نعیمیہ لاہور میں مدرس ہو گئے۔ ۶۶-۶۷ء جامعہ نظامیہ لاہور میں مدرس رہے۔ ۷۰-۱۹۶۷ء دارالعلوم رحمانیہ ہری پور اور ۷۱-۷۲ء مدرسہ اشاعت العلوم چکوال میں صدر مدرس رہے۔ اِن دنوں نظامیہ لاہور کے صدر مدرس اور استاذ الحدیث ہیں۔ مفتی اعجاز ولی خان مرحوم کے جانشینِ خطابت ہیں۔ اعلیٰحضرتؒ کے رسائل کو بڑی نفاست سے چھپوایا۔ مکتبہ قادریہ، مکتبہ رضویہ قائم کیے۔ حاشیہ نام حق، کریما، مرقات آپ کی درسی تالیفات ہیں۔ تذکرہ اکابر اہلسنت ترتیب دے رہے ہیں۔

تو انہوں نے اعلیٰ حضرت کے بعض رسائل اچھے انداز میں چھپوا کر ایک معیار قائم کر دیا۔ وُہ اس ضمن میں میرے پاس آتے، مشورے لیتے اور پھر اپنی ہمت سے یہ رسالے چھپوا کر تقسیم کرتے۔ میں مولانا کی بے سروسامانی کے باوجود اتنا عظیم کام کرنے سے بڑا متاثر ہُوا۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ میرے علمی احباب کی صفِ اوّل میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا کے رفیق کار جناب غلام رسول سعیدی صاحب

۵۰۔ مولانا غلام رسول سعیدی

آپ جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو میں صدر مدرس ہیں اور بڑے محققانہ انداز میں درس و تدریس دیتے ہیں۔ آپ کے قلم میں تحقیق و ثقاہت کی قوت موجود ہے۔ ۱۹۳۸ء میں دہلی میں پیدا ہُوئے۔ دہلی میں پرائمری پاس کیا تو ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند نے پاکستان پہنچا دیا۔ خاندان کے ساتھ کراچی میں قیام پذیر ہُوئے۔ میٹرک کرکے ایک پریس میں ملازمت اختیار کرلی۔ آپ کے والد اور بڑے بھائی کا مسلک اہل حدیث ہے لیکن بایں ہمہ مولانا سعیدی صاحب صلاۃ و سلام کی جان آفرین آواز سن کر مؤدب کھڑے ہو جاتے۔ یہ بات اہل خاندان کے لیے نرالی تھی۔ پریس کی ملازمت کے دوران آرام باغ کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرتے وہاں دُرود و سلام، عظمتِ رسول اور احترامِ اولیاء کی دولت ملتی۔ ایک دن مولانا محمد عمر اچھروی کی تقریر سُنی تو ذہن بیدار اور قلب زندہ ہو گیا۔ ترجمۂ قرآن پر غور کرنا شروع کیا تو جہاں عظمتِ رسول کا مقام آتا دیوبندی تراجم بخل سے کام لیتے دکھائی دیتے۔ آپ کے ذہن نے اب انہی خطوط پر کام کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ذوقِ علم بیدار ہُوا۔ انہی دنوں جامعہ محمدیہ رضویہ رحیم یار خاں نے طلباءِ علم کے داخلے کا اشتہار دیا تو مولانا کراچی چھوڑ رحیم یار خاں جا پہنچے اور جامعہ محمدیہ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں آپ کو درسِ نظامی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حضرت بریلوی کی تصانیف کے مُطالعہ کا موقعہ ملا۔ اہلسنّت کے پاکیزہ نظریات کو بنظرِ غائر سمجھنے لگے۔ جامعہ محمدیہ میں حافظ عبدالمجید صاحب کے پاس ایک سال چھ ماہ تک پڑھتے رہے پھر حضرت غزالیِ دوراں علامہ احمد سعید کاظمی صاحب سے ملاقات ہُوئی تو ان کے استدلال سے بڑے متاثر ہُوئے، بیعت ہُوئے۔ لاہور آکر جامعہ نعیمیہ میں داخلہ لیا۔ قطبی، شرح جامی اور جلالین اسی دار العلوم میں پڑھیں۔ تلخیص المفتاح کے چند اسباق مفتی عزیز احمد صاحب بدایونی سے پڑھے۔ ذوقِ علم آپ کو لاہور سے کشاں کشاں بندیال لے گیا جہاں حضرت علامہ عطا محمد صاحب بندیالوی شیخ الحدیث دار العلوم امدادیہ بندیال سے معقول و منقول کی کتابیں قاضی مبارک حمد اللہ، شمس بازغہ صدرا، خیالی، اور فقہ میں ہدایہ آخرین، حدیث میں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

میرے حلقۂ تعارف میں آئے تو جامعہ نعیمیہ کے مدرس اور توضیح البیان کے مصنف تھے۔ وہ محنتی، ملنسار اور مخلص نوجوان عالمِ دین ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں مجھے کچھ عرصہ کے لیے لائلپور قیام کرنے کا موقع ملا۔ میں ملازمت کی خشک وادی اور صبح و شام بے کیف کام سے اکتا جاتا تو مجھے اہلِ علم کی تلاش ہوتی اگرچہ وہاں کے علماء سے میرے پرانے تعلقات تھے مگر اس دفعہ میں ان علماء کی صلاحیتوں سے قریب ہو کر فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں پیپلز کالونی میں قیام پذیر تھا۔ شہر کی گہما گہمی سے بہت دور تھا۔ ایک دن محمد افضل صاحب کوٹلوی سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے مجھے شہر میں آنے اور کارخانہ بازار میں رہائش کرنے کا مشورہ دیا۔ میں تنہا رہتا تھا، میں نے سوچا چلو اہلِ سخن حضرات کی قربت ہو جائیگی اس مکان میں آگیا جہاں کسی زمانے میں مولانا عبدالقادر شہید درس دیتے تھے اور اسی مکان میں شہید ہو گئے تھے۔ میرے لیے یہ تاریخی یادگار اہلِ علم کا دربار معلوم ہوئی۔ میں قیام پذیر ہوا تو علماء نے اپنی رفاقت اور مجالس سے نوازا۔ حضرت ناظم جامعہ قادریہ مولانا معین الدین صاحب شافعیؒ اور مولانا محمد افضل صاحب کوٹلوی جمعہ کے بعد تشریف لاتے اور گھنٹوں بیٹھتے۔ یہ مرکز ان کی شہری نشست و برخاست کی موزوں جگہ تھی مگر ان کے آنے سے مجھے ایک علمی ماحول میسر آجاتا۔ اس مکان کے ایک کمرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۱)

مشکوٰۃ شریف اور ترمذی شریف کو بالالتزام پڑھا۔ تکمیلِ علوم کے بعد ۱۹۶۶ء میں جامعہ نعیمیہ لاہور میں مدرس مقرر ہوئے۔ مولانا سعیدی نے اپنی تحقیقی تصنیف "توضیح البیان لخزائن العرفان" لکھ کر دنیائے علم میں شہرت حاصل کی۔ یہ کتاب دیوبندی مولوی سرفراز صاحب کی کتاب "تنقید متین" کا ایک بلیغ رد ہے۔ دو رسالے ذکر بالجہر اور اعلیٰحضرت کا فقہی مقام لکھے جو علماء نے بہت پسند کیے۔ آپ بڑے محنتی اور مخلص عالمِ دین ہیں۔ جامعہ نعیمیہ کی علمی رونق آپ کے وجود سے قائم دائم ہے۔

شیخ الحدیث لائلپوری کے نامور شاگرد

لہ **مولانا معین الدین صاحب شافعی قادری** مولانا عبدالقادر شہید کے سچے جانشین

اور جامعہ قادریہ لائلپور کے ناظم اعلیٰ ابوالمعالی مولانا معین الدین قادری عالمِ متبحر، فقیہہِ وقت اور راقم کے مشفق احباب میں سے ہیں۔ آپ ۱۹۲۹ء میں بھمبڑی بمبئی میں ایک تجارت پیشہ صاحبِ ثروت خاندان میں پیدا ہوئے۔ ہائی سکول بمبئی میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ عربی کی ابتدائی تعلیم بھی یہیں سے حاصل کی۔

(باقی برصفحہ ۴۱۳)

بلکہ بالاخانہ پر صوفی ٹریڈرز کا دفتر تھا۔ یہ فرم مختلف کیمیکل منگوا کر تقسیم کرتی تھی مگر در اصل اس کے لائلپور

(بقیہ حاشیہ ص۴۱۲)

بعدہٗ جب حضرت محدث اعظم پاکستان علیہ الرحمۃ محرم کے اجلاس کے سلسلے میں بمبئی تشریف لائے تو آپ کے ارشاد پر حضرت مولانا معین الدین صاحب حصولِ علمِ دین کے لیے بریلی شریف حاضر ہوئے جہاں آپ کو حضرت فیض درجت شہزادۂ اعلیٰ حضرت قبلہ مفتیِ اعظم ہند دامت برکاتہم العالیہ، حضرت محدث اعظم پاکستان حضرت صدر الشریعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما، حضرت مولانا مفتی اعجاز ولی خاں رح ، حضرت مولانا محمد حامد فقیہہ رح اور حضرت مولانا وقار الدین صاحب مدظلہم العالیہ اور مولانا مفتی محمد مختار احمد صاحب موجودہ مفتی جامعہ قادریہ رضویہ جیسی بزرگ و یکتائے زمانہ ہستیوں سے تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت مفتی اعظم ہند سے میزان وغیرہ پڑھی۔ حضرت صاحب خود اپنے ساتھ کھانا کھلاتے رہے۔

حضرت محدث اعظم پاکستان جب لائل پور تشریف لا کر دورۂ حدیث شریف شروع فرمایا تو مولانا صاحب بھی بمبئی سے آ کر شاملِ دورہ ہو گئے اور حضرت شہید اہلسنت علیہ الرحمۃ کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ آپ نے حضرت شہید اہلسنّت کے ساتھ مل کر جامعہ رضویہ مظہر الاسلام کی تعمیر میں اہم خدمات انجام دیں۔ جامعہ رضویہ کے قیام سے لے کر اوائل ۱۹۶۲ء تک حضرت شہید اہلسنّت علیہ الرحمۃ جامعہ رضویہ کے ناظمِ اعلیٰ اور حضرت مولانا محمد معین الدین صاحب ناظم رہے۔

آپ کو ہر وقت حضرت محدث اعظم پاکستان قدس سرہٗ کی خدمت و صحبت میں رہنے کا شرف حاصل ہے۔ سفر و حضر میں یہاں تک کہ زیارت مدینہ طیبہ اور حج بیت اللہ شریف کے لیے بھی حضرت محدث اعظم علیہ الرحمۃ مولانا صاحب کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ حضرت مولانا محمد معین الدین صاحب کو حضرت مفتیِ اعظم ہند شہزادۂ اعلیٰ حضرت دامت برکاتہم العالیہ اور حضرت محدثِ اعظم پاکستان علیہ الرحمۃ سے سند و دستارِ خلافت بھی حاصل ہے۔ حضرت قبلہ مفتیِ اعظم ہند دامت برکاتہم العالیہ نے اجمیر مقدس میں آستانہ عالیہ پر حضرت مولانا معین الدین صاحب کو دستارِ خلافت عطا فرمائی اور ساتھ ہی "تاج العلم والفضل" کی سند بھی عطا فرمائی۔

حضرت مولانا محمد معین الدین صاحب نے زندگی کے بیس برس حضرت محدثِ اعظم پاکستان علیہ الرحمۃ کی خدمت و صحبت میں گزارے ہیں اور اب بھی انہی کے فیض و کرم سے خدمت تبلیغ دین میں مصروف ہیں۔ آپ حضرت شہید اہلسنت کے رفیقِ صادق ہیں۔ دونوں نے ایک ساتھ زندگی کے بیس برس بھائیوں کی طرح مل کر گزارے اور اپنے دوست کے مشن و مسلک کی ترویج و تکمیل میں مصروف ہیں۔

میں ناظم میرے دوست جناب رشید احمد صاحب[1] نوری تھے۔ وہ ایک تجارتی شعبے کے انچارج تھے مگر باطنی طور پر صوفی وصافی تھے۔ گفتگو میں تجارتی انداز سے ہٹ کر مخلصانہ بلکہ مشفقانہ انداز ہوتا۔ معاملات میں صاف۔ میرے قریب رہ کر میرے دل کے قریب ہو گئے۔ کھانا پینا اکٹھا۔ ان کا گھر دفتر سے دُور تھا لیکن جب کبھی سلسلۂ گفتگو دراز ہوتا تو رات گئے تک وہ گھر نہ جاتے اور آدھی رات کے وقت گھنٹہ گھر کے اردگرد سواری کی تلاش کرتے۔ نوری صاحب نعت خوان، بذلہ سنج اور بڑے خدمت گزار ساتھی کی حیثیت سے میرے ساتھ رہے۔ میں نے انہیں تجارتی کام کے ساتھ ساتھ دینی کتابوں کی تقسیم واشاعت کا مشورہ دیا تو انہوں نے مکتبۂ معین الاسلام کے نام سے ایک کتب خانہ قائم کیا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں سارے ضلع میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ وہ لوگوں کو سستی، اچھی اور معیاری کتابیں مہیا کرتے۔ اور بس نہ چلتا تو ادھار بلکہ مفت بھی کتابیں دے دیتے۔ انہوں نے مکتبہ نبویہ لاہور سے تجارتی مراسم پیدا کر کے لائلپور میں سُنّی لٹریچر کو عام کر دیا۔

---

[1] مولانا رشید احمد صاحب نوری لائلپور کے مکتبہ معین الاسلام کے ناظم اور صوفی ٹریڈنگ کمپنی کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ بڑے خوش باش اور خوش گفتار آدمی ہیں۔ نعت خوش الحانی سے پڑھتے ہیں۔ درود وسلام کے رسیا ہیں۔ آپ ۱۹۳۵ء میں ضلع جہلم کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں سے مکمل کی۔ لائلپور میں جامعہ رضویہ میں داخل ہوئے۔ صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ حضرت شیخ الحدیث اور حضرت مولانا عبد القادر شہید کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ تعلیم ادھوری چھوڑ کر لائل پور کاٹن ملز میں ملازمت اختیار کر لی۔ جلسے کرانے، نعتیں سنانے اور علماء کی مجالس میں بیٹھنے کا ذوق پیدا ہو چکا تھا۔ کراچی پہنچے کچھ عرصہ بعد صوفی اینڈ کمپنی کے ایجنٹ مقرر ہو کر لائلپور آ گئے۔ میرے مشورے پر مکتبہ معین الاسلام کو سُنّی لٹریچر پھیلانے کا مرکز بنایا اور کامیاب رہے۔ دار العلوم قادریہ لائلپور کے خاص معاونین میں شمار ہوتے ہیں۔ ماہنامہ "فیض رضا" کے نائب ایڈیٹر ہیں اور دوستوں کے دل وجان سے خدمت گزار ہیں۔ میرے مخلص دوست ہیں۔

انہی دنوں مجھے چشتی کتب خانہ کے مالک جناب صائم چشتی صاحب[1] نے اپنی خصوصی مجالس سے نوازا۔ چشتی صاحب کا کتب خانہ لائلپور کے کاروباری مرکز میں قائم تھا۔ کتب خانہ تو ان کے

---

[1] **حضرت صائم چشتی** مخلص و محبّی حضرت شیخ محمد ابراہیم صاحب المتخلص بہ صائم چشتی پنجابی کے معروف شاعر ہیں جنہوں نے اپنا موضوعِ سخن نعتِ رسول ہی رکھا اور بڑی عمدہ نعتیں لکھیں۔ آپ موضع گنڈی ونڈ متصل سرائے امانت خاں ضلع امرت سر میں پیدا ہوئے اپنے والد شیخ محمد اسماعیل سے قرآن پاک پڑھا۔ سکول کی تعلیم حاصل کی اور تقسیمِ ملک کے بعد امرت سر سے پاکستان آئے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک موضع رسول پور جٹاں ضلع شیخوپورہ میں مقیم ہوئے۔ مقامی طور پر دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ صرف و نحو کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ شاعری کا ملکہ ابتدائی عمر سے ہی تھا۔ بغیر کسی استاد کے پنجابی میں شعر کہتے۔ ۱۹۵۲ء میں باقاعدگی سے شاعری کا آغاز کیا اور ہیر وارث شاہ کی بحر میں شعر کہنا شروع کیے جو سیدنا غوث الاعظم کی شان میں تھے۔ اس مبارک آغاز نے آپ کو مشہورِ عالم بنا دیا۔ شاعری کا پس منظر آپ کے والد مکرم کا والہانہ عشق تھا جو احسن القصص کو نہایت خوش آوازی سے پڑھتے اور بچوں کو سناتے اور اپنے ہونہار فرزند کو ایک عاشق شاعر کی حیثیت سے دیکھنے کے آرزومند تھے۔ ۱۹۵۴ء میں آپ کے مرشد حضرت پیر محمد علی شاہ چشتی صابری نے آپ کو بیعت میں لیا تو آپ نے شجرہ سلسلۂ چشتیہ اُردو نظم میں لکھا۔ ۱۹۵۶ء میں لائل پور آ گئے اور "پنجابی بزم ادب" کے رکن بن کر زوردار نظمیں کہیں اور دُوسرے شعراء کو شعرگوئی کے مواقع بھی بہم پہنچائے۔ ایک عرصہ تک اسی بزم کے سیکرٹری جنرل رہے۔ ۱۹۶۲ء میں چشتی کتب خانہ جھنگ روڈ لائل پور پر دینی کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا۔ نوائے صائم چار جلد، بہاراں مسکراپیاں، نُوری نُور، خاتونِ جنت، پُھل تے کنڈے، اور پھر گیارھویں شریف آپ کی مشہور تصانیف آئیں تو ہر طرف سے دادِ تحسین حاصل کی۔ آپ نے ۱۹۶۳ء میں جامعہ رضویہ لائل پور سے دورۂ حدیث پڑھا اور دستارِ فضیلت حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء میں حج بیت اللہ کیا بڑے علم دوست، شاعر نواز اور مجلسی انسان ہیں۔ آپ کے شاگردوں، نیاز مندوں اور احباب کا وسیع حلقہ سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ راقم کے خاص احباب میں سے ہیں اور حاشیۂ دل کا عنوان ہیں۔

بھائی فضل کریم کے رحم وکرم پر تھا۔ مگر چشتی صاحب ایک قادر الکلام پنجابی شاعر اور نعت خوانِ رسول ہونے کی وجہ سے مرجع خلائق تھے۔ ان کی مجلس میں علماء، شعراء، ادباء، نعت خوان اور صحافی آتے۔ وہ اپنی وضعداری برقرار رکھتے۔ دوسری علمی مجالس کے برعکس ان کی مجلس میں حُقّے کا دَور چلتا۔ حقّہ نوش حضرات شعراء اور علماء کی گفتگو سے اپنے دامن میں چند چیزیں لے جاتے۔ صائم صاحب دوستوں پر بے پناہ خرچ کرتے جاتے اور اپنی آمدنی کا کوئی خیال نہ کرتے۔ اُن کی مجلس میں وُہ شاعر بھی دادِ سخن پاتے جنہیں سارے لائلپور جیسے بے رُوح شہر میں کوئی پاس نہ بٹھاتا۔ بُوڑھے شاعر، زندگی سے تھکے شاعر، نڈھال اور خستہ حال شاعر، بیمار اور مریل شاعر، بدمزہ اور بے تُکے شاعر، زندگی کی سرحدوں سے چند قدم پر رُک جانے والے شاعر چشتی صاحب کی مجلس میں پہنچ کر جب دادِ سخن پاتے تو مانی و بہزاد کو غرور کی نگاہ سے دیکھنے لگتے صائم صاحب خلوص و محبت کے پیکر ہیں۔ خود تو پنجابی کے نعتیہ ادب کے شاعر ہیں مگر اہلِ علم اور اہلِ ذوق کے لیے وُہ ہمہ تن عقیدت اور احترام ہیں۔ ان کی مجلس میں ان کے شاگرد نعت خوانوں اور قوالوں کی نغمہ ریزیاں اہلِ محفل کے لیے سامانِ طرب و نشاط ہوتی ہیں۔ صائم صاحب میرے حدودِ دل میں داخل ہُوئے تو پھر آج تک نکل نہ سکے۔ آہ! اُن کی محفل کے آفتاب و ماہتاب! حضرتِ صدف، حضرتِ ساقی، استاد جوہر جالندھری، جناب سدیدی، مولانا غلام رسول چشتی، علامہ حامد الوارثی، عزیزازجان خالد اور پیر صوفی فضل کریم صفحۂ یاد میں یادگار بن کر رہیں گے۔

لائل پور کے قیام کے دوران مجھے "رضائے مصطفیٰ" گوجرانوالہ باقاعدہ پہنچتا اور مجھے اس کے مطالعہ کا موقعہ ملتا۔ یہ اخبار اگرچہ عام کاغذ اور عامیانہ انداز میں چھپتا تھا مگر اس میں خالص سُنّی عقائد کی ترجمانی ہوتی۔ ملک کے مایۂ ناز عالمِ دین ابو داؤد محمد صادق صاحب[1] خطیب زینت المساجد

---

[1] مولانا الحاج محمد صادق گوجرانوالہ ممتاز سُنّی عالم دین، راسخ العقیدہ صحافی اور نڈر خطیب میرے ان احباب میں سے ہیں جنہیں میری نگاہیں دامنِ احترام میں بٹھاتی ہیں۔ آپ ایک مستعد باعمل اور نیک سیرت خطیب (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کی نگرانی کرتے اور سطر سطر میں اعتقادی، ترجمانی کا حق ادا کر دیتے تھے۔ آپ نے گوجرانوالہ میں ایک فعال عالمِ دین کی حیثیت سے تبلیغی فرائض سرانجام دیے۔ فسق و فجور کے تمام مقامات کو للکارا اور اعتقادی لغزش کو کبھی معاف نہ کیا۔ انہوں نے سنیت سے وابستگی رکھنے والوں پر دل و جان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مبلغ اور اہلِ قلم ہیں۔ ۱۳۵۰ھ میں کوٹلی لوہاراں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم نقشبندیہ علی پور سیداں میں مولانا محمد عبدالرشید جھنگوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور دینی علوم کا مطالعہ کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جامعہ رضویہ منظرالاسلام بریلی میں داخل ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد جامعہ رضویہ لائلپور میں شیخ الحدیث مولانا سردار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دورۂ حدیث پڑھا۔ ۱۳۶۹ھ میں دستارِ فضیلت حاصل کی۔ ایک سال چھ ماہ تک اسی دارالعلوم میں تدریس میں مشغول رہے۔ پھر گوجرانوالہ کی جامع مسجد زینت المساجد کے خطیب منتخب ہوئے۔ گوجرانوالہ میں آپ نے مسلسل محنت، حق گوئی اور زورِ خطابت سے معاشرتی زندگی میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ آپ کی انتھک کوششوں سے گوجرانوالہ کی اکثر مساجد علماء اہلسنت کی امامت و خطابت سے معمور ہو گئیں۔ ۱۳۷۰ھ میں حج بیت اللہ اور زیارت گنبدِ خضریٰ سے مشرف ہوئے۔ واپسی پر دارالعلوم سراج العلوم کی بنیاد رکھی۔ علوم دینیہ کا اہتمام کیا اور طلباء کو دعوتِ تدریس دینے لگے۔

آپ سلسلۂ قادریہ میں اپنے جلیل القدر استاد شیخ الحدیث لائلپوری سے بیعت ہوئے۔ دستارِ خلافت حاصل کی۔ سنیوں کا خالص اعتقادی رسالہ رضائے مصطفیٰ جاری کیا جس میں بڑے بلند پایہ مضامین لکھے۔ کتابی دنیا میں آپ برہان صادق، پیغام صادق، تاریخی حقائق، نورانی حقائق، مودودی حقائق، دیوبندی حقائق، انوارِ عقیدت، شاہ احمد نورانی اور کرنل قذافی جیسی بلند پایہ تصانیف سے خاصے مشہور ہوئے۔ آپ نے تبلیغی طور پر بہت سے پوسٹر شائع کیے۔

سیاسی اور دینی مہمات میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ تحریک ختم نبوت، تحریک کشمیر، جنگ ۱۹۶۵ء اور دیگر مواقع پر آپ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ آپ کی تبلیغی سرگرمیوں میں آپ کے شاگرد خاص مولانا محمد حفیظ نیازی آپ کے برابر کے شریک کار رہے۔ وہ رضائے مصطفیٰ کے مدیر معاون اور تبلیغی امور کے ناظم ہیں اور بڑی محنت اور باقاعدگی سے دینی خدمت میں مصروف ہیں۔ یہ دونوں جواں سال مخلص علمائے دین راقم کی دینی خدمات کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنے مخلصانہ تعاون سے عملی طور پر نوازتے ہیں۔

نثار کی۔ وُہ دیوبندی، وہابی، مرزائی اور پرویزی عقاید پر پُرزور تنقید کرتے۔ انہی دنوں میرے فاضل دوست مولانا غلام مہر علی[1] دامت برکاتہ، اپنی کتاب "الیواقیت المہریہ" کی تالیف کے

دیوبندی مذہب اور الیواقیت المہریہ فی شرح التورۃ النہریہ کے

[1] حضرت مولانا غلام مہر علی مصنف جلیل ۱۵ شوال ۱۳۴۲ھ میں بمقام محمود پور رالیکا ضلع بہاولنگر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مکرم مولانا جان محمد رحمۃ اللہ علیہ (م) حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے مریدِ خاص تھے۔ مولانا غلام مہر علی صاحب سے پہلے آپ کے دو بیٹے عبدالخالق اور عبدالمالک صغر سنی میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ آپ نے اپنے پیر و مرشد کے اسم گرامی کے دامن میں اپنے نامور تیسرے لڑکے کا نام غلام مہر علی چھپا کر قضا کا رُخ پھیر دیا۔ مولانا غلام مہر علی صاحب پنجاب کے مشہور راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ عبداللہ بھٹی المشہور بہ دُلّا بھٹی جس نے مغلِ اعظم اکبر کے خلاف عمر بھر جنگ لڑی آپ کے اجداد و امجاد میں سے تھے۔ آپ نے پانچ سال کی عمر میں اپنے والد سے قرآن پاک حفظ کیا۔ ۱۰ سال کی عمر میں والد کے ہمرکاب ہو کر سفرِ حجاز کیا اور بچپن میں، ۱۳۵۰ھ میں حج کیا۔ سفرِ حج میں فارسی عربی کتابیں پڑھتے رہے۔ حرم کعبۃ اللہ زیر سایہ گنبدِ خضریٰ کچھ اسباق پڑھے۔ ۱۳۵۹ھ میں مدرسہ صادقیہ منچن آباد بہاولنگر میں داخل ہوئے۔ ان دنوں وہاں مولانا غلام مصطفیٰ صدر مدرس تھے۔ چونکہ آپ مولانا پیر سید غلام مہر علی شاہ گولڑوی کے مرید تھے۔ مدرسہ میں اساتذہ اور تلامذہ اکثر اہل اللہ کے خلاف بدزبانی کرتے تو آپ کو بڑا ناگوار گزرتا۔ آپ نے اس ماحول کو ترک کر دیا اور ۱۳۶۱ھ میں مفتاح العلوم بہاولنگر میں داخلہ لے لیا۔ مولانا فتح محمد رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد اکمل سے فنی کتابیں پڑھیں۔ ۱۹۶۲ء میں لاہور کے مدرسہ فتحیہ اچھرہ میں مولانا مہر محمد مرحوم کے تلامذہ میں شریک ہوئے۔ یہاں شرح قاضی مبارک، حمد اللہ، توضیح و تلویح کے علاوہ ادب عربی کا گہرا مطالعہ کیا۔ دورۂ حدیث کے لیے آپ دارالعلوم حزب الاحناف میں داخل ہوئے اور ۲۳ سال کی عمر میں ۱۳۶۵ھ میں سندِ فضیلت حاصل کی ــــ فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن میں اپنے والد ماجد کے مدرسہ میں مسندِ تدریس پر جلوہ افروز ہوئے اور ساتھ ہی بہاولنگر کے نواح میں دیوبندی اور وہابی علماء سے مناظرانہ مباحث میں مصروف رہتے۔ آپ کو اس ابتدائی دور میں مناظرانہ استدلال اور نظریاتی نزاع پر تقریر کرنے کا بڑا تجربہ ہوا۔ آپ کی شہرت آپ کو پیر محل لائلپور میں لے گئی۔ جامع مسجد میں خطیب مقرر ہوئے لیکن ایک سال بعد وطن واپس آ کر چشتیاں میں مسجد نور

(باقی بر صفحہ آئندہ)

کے سلسلہ میں علمأ سے ملاقات کر رہے تھے ۔ وُہ لاہور میں مجھے بھی ملے اور اپنی کتاب کے موضوعات پر ایک عرصہ تک گفتگو کرتے رہے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق انھیں بہت سے علماء اہلسنت کے حالات فراہم کر کے دیئے۔ دراصل یہ کتاب حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی کتاب الثورۃ الہندیہ کے عربی حواشی کی حیثیت سے تالیف ہو رہی تھی۔ مولانا کا مقصد یہ تھا کہ ہمارے عقیدہ کے اس جانباز عالمِ دین جس نے جنگِ آزادی میں سب کچھ قربان کیا اور جزائر انڈمان میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد جانِ عزیز جانِ آفریں کے سپرد کی تھی، کی یادگار کے ساتھ ساتھ ان علماء اہلسنت کا تذکرہ عربی میں مرتب کر دیا جائے جو عہدِ حاضرہ میں برصغیر میں ان کی یاد کو تازہ رکھے ہُوئے ہیں۔ اس فاضل جلیل نے بڑی آسان عربی میں یہ حالات لکھے اور عرب ممالک میں ہر مکتبِ فکر کے عالمِ دین تک پہنچائے۔ آپ کی اس مخلصانہ کوشش نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ میں آپ کے اس پروگرام سے پہلے ہی تذکرہ علماء اہلسنت ترتیب دینے میں مصروف تھا۔ علماء اہلسنت کے تذکرہ کے سلسلے میں مجھے اخی المکرم الحاج حکیم محمد موسیٰ صاحب نے بڑے مفید مشورے دیئے۔ یُوں تو وُہ ہر علمی اور تحقیقی کام کرنے والے کے ممد و معاون ہوتے ہیں مگر مجھے انھوں نے خصوصیت کے ساتھ اس کام پر آمادہ کیا۔ میں نے لاہور کے مقتدر علماء کرام کا یہ تذکرہ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

میں خطیب مقرر ہُوئے۔ مدرسہ نور المدارس کی بنیاد رکھی۔ ۱۳۰۰ھ میں مسجد نور تعمیر کی۔ ۱۳۰۴ھ میں منچن آباد میں دار العلوم انوار الاسلام قائم کیا۔

آپ کی مشہور تصانیف میں سے رسالہ نور محمدی، صواعق حتا نیہ علی راس الوہابیہ، المواعظ ہریہ، خاتم النبیین، دیو بندی مذہب اور ریوانیت المہریہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے مدارج النبوت کا فارسی ایڈیشن چھپوایا۔ آپ نہ صرف ایک معروف اور ممتاز سُنّی خطیب ہیں۔ وُہ ایک زبردست مناظر ہیں۔ آپ کی تصنیف دیو بندی مذہب، نظریاتی دنیا میں ایک الوندین کر سامنے آئی اور دیو بندی مناظرین اس کی چٹانوں سے سر پھوڑتے رہے۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپے۔ اس پر دیو بندی پریس نے آہ و فغاں کی مگر یہ کتاب اپنے ٹھوس دلائل کی وجہ سے مقبول ہوتی گئی۔

لائلپور میں کتابت کے لیے دے دیا۔ کتابت مکمل ہُوئی تو ایک پریس کو دے دیا مگر پروف آنے پر دل گرفتہ ہوگیا۔ سارے پروف دیکھے مگر لیتھو کی پست طباعت کے سامنے تذکرہ چھپوانے سے رُک گیا۔ ایک اور کاتب آئے، اُنھوں نے ایک طرف اپنی بے روزگاری سے متاثر کیا، دُوسری طرف اپنی قلم کی خوش خرامی کی وُہ تعریفیں کیں کہ مَیں نے مسودہ اُن کے حوالے کر دیا۔ دوبارہ کتابِ کتابت کی منزلیں طے کرنے لگی۔ ایک سال بعد وُہ کتابت کر کے لائے، بِل وصول کر کے ابھی چائے پی رہے تھے کہ میں نے کتابت پر نگاہ ڈالی تو الفاظ ایسے "باغ و بہار" دکھائی دیے کہ دل چاہا کہ کتابت ان کے مُنہ پر دے ماروں۔ لیکن ان کی بے روزگاری اور غربت کی تصویر سامنے آئی اور اپنی بے وقوفی پر ماتم کرنے کو جی چاہا، اُٹھا اور ایک دیا سلائی لے کر کتابت شدہ کتاب ان کے سامنے جلا دی۔ وُہ مجھے ذہنی مریض سمجھ کر چُپ سادھے بیٹھے رہے اور اپنی قلم کے کمالات کی داد و صول ہوتی دیکھتے رہے۔ اس دن سے میں ان کی شکل دیکھنے اور ان کی قلم کے "جواہر آبدار" کی زیارت کو ترس گیا ہُوں۔ ہائے! عؔ

کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آجاتے ہیں

مسودہ پھر میرے سامنے تھا اب جناب محمد شریف گل[۱] متعارف ہُوئے۔ یہ نوجوان میرے

---

[۱] **محمد شریف گل صاحب** مکتبۂ نبویہ کے خصوصی خوشنویس اور قلمی آرٹسٹ ہیں۔ ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو بمقام کڑیال کلاں ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہُوئے۔ والد کا اسم گرامی عبد الرشید بن مولوی بدر الدین بن میاں کرم بخش بن حسن محمد ہے۔ آپ جاٹ خاندان کی گوت شیر گل سے تعلق رکھتے ہیں — آپ کا اسم گرامی آپ کے نانا الحاج مولانا محمد حسین والدِ میاں محمد عالم مختار حق نے تجویز کیا اور قرآن پاک پڑھایا۔ ۱۹۶۳ء میں میٹرک کیا اور خطاطِ پاکستان حاجی محمد اعظم صاحب منور رقم سے مشقِ کتابت کی۔ چند ماہ میں نوکِ قلم نے آبداری قبول کر لی اور کتابت کرنے لگے۔ کچھ عرصہ ماہنامہ چٹان کے ادارۂ کتابت میں رہے۔ پھر روزنامہ مغربی پاکستان اور کوہستان میں کتابت کرنے لگے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اخباری دنیا سے دل اُچاٹ ہوگیا تو کتابی صفحات کو گلہائے رنگا رنگ سے مزین کرنے لگے۔ اب تک تیس سے زائد کتابیں سپردِ قلم کر چکے ہیں۔ زود نویس، خوشنویس اور صحیح نویس ہیں۔ خط میں موزونیت اور بانکپن ہے۔ فنی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور مستقبل کے نامور خطاط بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

فاضل دوست جناب محمد عالم مختار حق کے خواہرزادے ہونے کی حیثیت سے مجھے ملے۔ ایک دو رسالے لکھائے، طرزِ نگارش پسند آگیا۔ اب تذکرہ ان کی قلم کا گھسیٹا ہُوا آپ کے ہاتھوں آگیا ہے اگر وہ دل لگا کر لکھتے اور قلم بنا کر کتابت کرتے تو آپ اُنھیں داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے۔ ان دنوں میری ساری کتابیں، تراجم اور حواشی انہی کی قلم کی زد میں ہیں۔

قلم کے حکمرانوں کی دنیا میں مجھے جن شہنشاہانِ قلم نے نوازا اور گاہک نہیں دوست کی حیثیت سے دیکھا وُہ جناب حافظ محمد یُوسف سدیدی صاحب[1]، سیّد نفیس رقم صاحب اور صوفی خورشید صاحب

---

[1] **حافظ محمد یُوسف صاحب سدیدی** آپ سرزمینِ پاکستان کے مایہ ناز خطاط اور نامور خوش نویس ہیں۔ خطِ نسخ، نستعلیق، خطِ کوفی میں فنکارانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ محنتی، خلیق اور درویش سیرت انسان ہیں۔ آپ کے خط میں جو رعنائی اور پختگی ہے اس نے فنِ خطاطی کے ماہرین سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ آپ ۱۹۲۰ء میں تحصیل چکوال ضلع جہلم کے قصبہ بھون میں پیدا ہُوئے۔ قرآن پاک کے حفظ کے سلسلہ میں ۲۱ پارے اپنے گاؤں ۱۵۰ سے ۲۲ پارے کھیوڑہ ضلع جہلم اور ۲۳ سے ۳۰ تک قاری محمد طفیل مسجد وزیر خاں لاہور کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ فنِ خطاطی میں منشی محمد شریف ابن سلطان القلم محمد قاسم لدھیانوی کے شاگرد ہیں۔ عربی رسم الخط کے مختلف طریقے سیکھے۔ دہلی پہنچ کر منشی محمود عالم کے زیرِ سایہ قلم کے نوک پلک میں رعنائی پیدا کی۔ تقسیم ملک کے طوفانوں میں لاہور آئے۔ اور صوفی عبدالمجید پروین رقم اور منشی تاج الدین زریں رقم سے استفادہ کیا۔ آپ ایک عرصے سے روزنامہ امروز کے شعبۂ کتابت کے انچارج ہیں اور اخبار کی جلی سُرخیوں کے ساتھ ساتھ آپ کا قلم مختلف مقامات پر فنِ کتابت کے گلہائے رنگا رنگ بکھیرتا جاتا ہے۔ آپ کو اس فن سے والہانہ عشق ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کبھی قلم کی قیمت وصول نہیں کی۔ مساجد کے محراب و منبر، یادگارِ پاکستان کے ایوان، مسجد شہداء کے در و دیوار اور ملکی دستاویزات اور علمی کتابوں کے سرورق آپ کے فن کے کمال کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ آپ حُسنِ قلم کے ساتھ ساتھ حُسنِ سیرت کا پیکر ہیں۔ مکتبہ نبویہ کے مربی خود راقم کے مشفق اور محبوب دوست ہیں۔ اہلِ علم کی قدر کرتے ہیں۔ صُوفیہ سے عقیدت اور اہلِ دل کے سامنے دل و جان کی متاع قربان کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ کسب کمال کس انداز میں بھی ہو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ہیں۔ سعدی صاحب کا گوشۂ قلم اس وقت نوازش کرتا ہے جب میں اُن کے پاس بیٹھ کر، ان کے دسترخوان سے چائے پیتا جاؤں اور اپنی ناتراشیدہ زبان سے ان کے کان کھاتا جاؤں ورنہ وُہ لمبی تاریخیں دے کر "چراغِ رُخِ زیبا" سے ڈھونڈنے پر لگا دیتے ہیں۔ ایک دفعہ شیخ محدث دہلوی کی کتاب "مرج البحرین" کے گردپوش پر الفاظ لکھنے کا کہہ کر کراچی چلے گئے۔ ایک ماہ راہیں دکھائیں۔ واپس آئے تو مجھے خشمگیں اور اندوہگیں پایا۔ وہاں ہی زانوئے کتابت بلند کیا اور لکھنے بیٹھ گئے اور مجھے تسلی دینے کو کہتے جاتے کہ کراچی گیا، سمندر کے کنارے مجھے کوئی چیز سر پر چونچ مارتی تھی سمجھ نہیں پاتا تھا کہ کون ہے۔ اب یاد آیا یہ تو آپ کی فریاد تھی۔ ~

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

یہ تیری یاد تھی! اب یاد آیا!!

سرِورق لکھا، خود سکوٹر پر بیٹھے، لوگ دامن پکڑتے رہے مگر نکل گئے۔ بلاک بنوایا، پریس گئے اور چھپنے کے لیے ٹائیٹل کا کاغذ دے کر ساری منزلیں طے کر دیں اور میرے غصّے اور مایوسی کو قلم زد کر کے پھر دفتر میں جا بیٹھے۔ نفیس صاحب صاحبِ قلم ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی بھی ہیں۔ تصوّف کی باتوں پر مجھے گھنٹوں وقت دیتے ہیں مگر چند حروف لکھنے کے لیے اُن کے مُوڈ کی تلاش کرنا پڑتی ہے۔ صوفی خورشید عالم صاحب تو مجھے زحمتِ انتظار بھی نہیں دیتے، التجا کی، اثرِ التجا سے پہلے سرِورق لکھا اور مکتبہ میں پہنچا دیا۔

مولوی شمس الدین مرحوم کا حلقہ ان کی موت نے ختم کر دیا۔ جو احباب آیا کرتے تھے اپنے اپنے علاقوں بلکہ غیر علاقوں میں چلے گئے۔ وُہ لاہور میں ہوتے ہُوئے بھی وادیِ گم گشتہ میں پہنچے گئے۔ ہماری ٹکڑی کے بچے کھچے احباب شیخ محمد بشیر المعروف بہ لیڈر کی دُکان پر آنے لگے۔ شیخ بشیر مولوی شمس الدین کا بدل تو نہیں البتہ بعض باتوں میں گوارا تھا۔ وُہ صبح کے وقت موٹے شیشوں کی عینک سے ملک کی ساری اخباروں کا مطالعہ کرتا۔ مطالعہ کے بعد دنیا بھر کے مشہور سیاستدانوں کے نام طویل ناصحانہ خطوط لکھتا اور انھیں مفید مشورے دیتا۔ اس کا یہ روزانہ کا معمول تھا۔ خدا معلوم وُہ خطوط مکتوب الیہ تک پہنچتے تھے یا نہیں لیکن وُہ لکھنے کے فرائض سے کبھی نہ تھکتا۔ کالجوں میں چھٹی ہوتی تو طلباء اور اساتذہ کتابیں لینے کے لیے دُکان پر پہنچ جاتے۔ وُہ ان کی کھال اتارتا۔

بایں ہمہ وُہ خوش خوش جاتے۔ ہم لوگ دفاتر سے چھٹی کر کے اس کی دکان پر ظہر کی نماز کے بعد جا پہنچتے۔ مخدوم غلام جیلانی صاحب، مرزا غلام قادر صاحب، سیّد اصغر علی شاہ جعفری، بشیر حسین صاحب ناظم اور جناب اقبال صلاح الدین جیسے دُوسرے اہلِ قلم و اہلِ سخن پہنچ جاتے وُہ دوستوں کے لیے بار بار چائے منگواتا اور بلا اجازتِ احباب چائے منگواتا۔ اگر مرزا غلام قادر صاحب قدرے چپ چپ دکھائی دیتے تو انہیں منانے کے لیے جالندھر موتی چُور سے مٹھائی منگاتا مگر مٹھائی بلا اجازت اس نے کبھی نہیں منگائی۔ اس کی یہ ادا مولوی شمس الدین مرحوم سے تھوڑی ملتی تھی مگر بعض ادائیں مرحوم سے بالکل برعکس تھیں۔ مثلاً مولانا مرحوم اہلِ ذوق کو نادر کتاب دے کر راحت محسوس کرتے۔ لیڈر نادر اور اچھی کتاب کے بارے میں کہہ دیتا اس پر ابھی جھگڑا چل رہا ہے۔ مولوی شمس الدین الفاظ کے استعمال میں بڑے محتاط اور درست تلفظ کے مالک تھے۔ مگر لیڈر کے ہاں اُلٹے پلٹے الفاظ اور عجیب و غریب تلفظ سُن کر ہم ایک دُوسرے کا منہ تکنے لگتے۔ جب اسے سمجھاتے تو غصہ منانے یا نادم ہونے کے بجائے ایک زور دار قہقہہ لگا کر لڑکے کو آواز دیتا: "دوستوں کے لیے جلد چائے لاؤ۔" مولوی شمس الدین صاحب اولاد نہ تھے شادی کرنے کی کسی کو ترغیب نہ دیتے مگر لیڈر کثیر اولاد کا مالک ہوتے ہوئے بھی غریب مولویوں، نادار طالب علموں اور عمر رسیدہ شاعروں کو بڑی متانت سے پہلی، دُوسری، تیسری بلکہ چوتھی شادی کا مشورہ دیتا۔ دکاندار اور شیخ ہونے کے باوجود ہاتھ کا کھلا، زبان کا کھرا اور دل کا مخلص دنیا بھر میں ایسا کوئی شخص نہیں ملے گا۔ سیاسی انداز میں نظریۂ پاکستان کے خلاف رائے رکھنے والوں کو کبھی معاف نہ کرتا اور اس سلسلہ میں کوئی سفارش، کوئی مشورہ، کوئی کتاب اور کوئی واقعہ سُننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے ایک مرصّع پنجابی قصیدہ لکھا تو اسے زینتِ دیوارِ دکان بنا لیا۔ شعر باقاعدہ سناتا مگر ہمیشہ شعر غلط پڑھتا۔ اہلِ مجلس خود ہی سمجھ جاتے کہ جذبات کا رُخ کدھر ہے۔

لاہور کی دینی اور تدریسی دنیا میں جہاں مفتی محمد حسین صاحب نعیمی، علامہ ابو البرکات سیّد احمد قادری دامت برکاتہ، مولانا عبدالقیوم ہزاروی اور مولانا محمد مہرالدین صاحبان دن رات کام کر رہے تھے وہاں میرے مخلص احباب میں ... [illegible] ... القراء قاری غلام رسول

اور مولانا محمد عبداللہ قصوری صاحبان کی تدریسی خدمات قابلِ صد افتخار تھیں۔ مولانا سید حسن الدین ہاشمی[1]

---

[1] **سید حسن الدین ہاشمی** آپ موضع بھوئی ضلع کیمبلپور میں پیدا ہُوئے۔ والد کا اسم گرامی مولانا سید فرید الدینؒ (م ۴ ، ۱۹۱ء) تھا۔ ابتدائی تعلیم فاضلِ یگانہ مولانا محی الدین بھیروی سے قصبہ بھیرہ میں حاصل کی۔ پھر صرف و نحو کی کتابیں وار برٹن ضلع شیخوپورہ میں مولانا فرید الدین سے پڑھیں اور علوم دینیہ پر مدرسہ عالیہ انوار العلوم ملتان میں عبور حاصل کیا اور دورۂ حدیث جامعہ غوثیہ گولڑہ شریف میں مکمل کیا۔ ان دنوں گولڑہ شریف میں مولانا محب النبی شیخ الحدیث تھے سندِ فراغت کے بعد آپ دار العلوم حزب الاحناف لاہور میں مدرس مقرر ہوئے۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ آپ مصری شاہ لاہور کی مسجد الشمس میں خطابت کرتے۔ غالباً ۱۹۵۰ء میں آپ میرے حلقۂ احباب میں شامل ہُوئے۔ راقم ان دنوں دہلی دروازہ لاہور کے باہر مسجد مولانا محمد نبی بخش حلوائی میں نمازِ جمعہ سے پہلے تقریر کیا کرتے تھے۔ مولانا ہاشمی جواں سال، محنتی اور بڑے مستعد عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے علمی اور معاشرتی دنیا میں اُبھر رہے تھے، میرے پاس تشریف لاتے، حوصلہ افزائی فرماتے اور اپنے ماہنامہ "ترجمانِ حقیقت" کے اداریہ اور شذرات پر تبادلۂ خیال کرتے۔ آپ یہ رسالہ بڑی جانفشانی سے نکالتے اور بڑے بلند پایہ مضامین لکھتے۔ اسی دوران آپ دار العلوم نعمانیہ میں مسندِ تدریس پر جلوہ فرما ہُوئے۔ صدر ایوب کے دورِ حکومت میں جامعہ عباسیہ بہاولپور کو جامعہ پنجاب میں تبدیل کر دیا گیا تو آپ فقہ کے شعبۂ تخصیص میں مدرس اعلیٰ مقرر ہُوئے۔ انہوں نے اپنی شبانہ روز محنت اور اعلیٰ کارکردگی سے علمی حلقوں میں اپنا مقام بنا نا اور نام پیدا کیا۔ آپ ایک رسالہ دیوبندی دھرم نظریاتی مطالعہ کرنے والوں کے لیے بڑی مفید کتاب ثابت ہوا۔ ایک عرصہ تک جامعہ پنجاب میں گزارنے کے بعد ۱۹۶۲ء میں علماء اکیڈمی لاہور میں علماء اوقاف کی تربیت پر مقرر ہُوئے۔ ۱۹۷۲ء میں بہاولپور تبدیل کر دیے گئے مگر آپ سرکاری مدارس، سرکاری تنخواہ اور اوقافی ماحول سے تنگ آکر مستعفی ہو گئے اور ان دنوں دار العلوم نظامیہ رضویہ لاہور میں مصروفِ تدریس ہیں۔ راقم کو آپ کے دامنِ شفقت میں جگہ ملی ہے۔ آپ اکثر علمی موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور مفید مشوروں سے نوازتے ہیں اور علماء اہلسنت کے مروجہ جمود و ذہنی کے شکوہ طراز ہیں۔

(الیواقیت المہریہ)

محکمہ اوقاف کی علماء اکیڈمی شاہی مسجد لاہور میں زیرِ تربیت علماء کو لیکچر دیتے تھے مگر وہ محکمہ کی ہدایات سے ہٹ کر ان طالب علموں کی تعلیم کو زیادہ اہم خیال کرتے تھے جو محض علم دین کی تحصیل کے لیے مختلف دینی مدارس میں کام کر رہے تھے چنانچہ وہ دارالعلوم نظامیہ رضویہ لاہور میں درسِ نظامی کی تدریس کے لیے آگے بڑھے اور ایک مدرس کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ قاری غلام رسول[1] اپنی

---

[1] **زینت القراء قاری غلام رسول** قاری غلام رسول راقم کے ان خلیب احباب میں سے ہیں جنھوں نے ایک عرصہ تک لاہور کے گلی کوچوں میں تبلیغ اسلام کی مہم کا آغاز کیا۔ انجمن اصلاح المسلمین کے مشہور جلسے قاری صاحب کی دلگداز آواز میں تلاوت قرآن سے شروع ہوتے۔ قاری غلام رسول صاحب لاہور کے ایک قریبی گاؤں سلامت پورہ میں ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قرآن اپنے گاؤں سے حاصل کی۔ آپ کے بچپن کی خوش آوازی نے لوگوں کو بڑا متاثر کیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قاری صاحب نے سب سے پہلے کس قاری کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ لیکن جب آپ ایک خوش آواز قاری کی حیثیت سے ابھرے تو آپ نے ۱۹۵۵ء میں جناب قاری عبدالمالک سے باقاعدہ فنِ تجوید کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے عربی اور فارسی کی کتابیں دارالعلوم حزب الاحناف لاہور سے پڑھیں اور ۱۹۵۳ء کو سندِ تحصیل علوم حاصل کی۔ آپ تعلیم کے ساتھ ساتھ جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو میں شعبہ قرأت کے انچارج تھے اور وہاں طلباء کو قرأت سکھانے لگے۔ اسی دوران آپ ملک کے دینی جلسوں میں شرکت کرتے اور اپنے سحرِ قرأت سے سامعین کو مسحور کر دیتے۔ آپ ان جلسوں کے وقت تلاوت قرآن کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ دلوں پر نور کی بارش ہو رہی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں آپ ریڈیو پاکستان پر تلاوت کرنے لگے اس طرح آپ کی آواز فضاؤں میں پھیلنے لگی ایک طرف آپ کے شاگردوں کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا۔ دوسری طرف ملک بھر میں حسنِ قرأت کی مجالس نے فنِ قرأت کا ذوق پیدا کر دیا۔ قاری صاحب ان مجالس میں شریک ہوتے اور نئے قاریوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ۱۹۶۵ء میں "انجمن فروغ تجوید قرأت" قائم کی۔ قاری اس انجمن کے نائب صدر تھے۔ آپ نے ... دارالعلوم سے ... مسجد ... منتقل کر لیا اور اب تک وہاں پر کام کر رہے ہیں۔

قاری غلام رسول کی خوش آوازی ...

مصروفیتوں کے باوجود فنِ قرأت و تجوید کے لیے دن رات کوشاں رہے اور انہوں نے نورانی مسجد صدر لاہور سے نکل کر مسلم ٹاؤن میں ایک وسیع پلاٹ میں قرأت و تجوید کے ایک شاندار مرکز کی بنیاد رکھی جہاں مسجد کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ ادھر مولانا محمد عبداللہ قصوری[۱] قصور کے جامعہ حنفیہ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کا خطاب دیا۔ آپ ۱۹۶۶ء میں ادارہ اصلاح المسلمین کی طرف سے افغانستان، ایران، اردن، فلسطین اور شام سے ہوتے ہُوئے بیت اللہ شریف پہنچے اور ہر ملک میں محافل قرأت میں قرآن سناتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں جامعہ تجوید القرآن قائم کیا اور سکولوں میں قرأت کو رواج دینے کے لیے بڑی جدّوجُہد کی۔ نومبر ۱۹۶۹ء میں کوالالمپور ملائشیا میں عالمی قرأت کے مقابلہ میں شریک ہُوئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ آپ سرکاری تقاریب کے آغاز پر تلاوتِ قرآن کرتے تو اعیانِ مملکت سے بھی خراجِ تحسین حاصل کرتے۔ عالمِ اسلام کے قاری پاکستان میں آتے تو آپ نے شاہی مسجد میں قرأت کی مجلس کا اہتمام کیا۔ آپ نے ملک کے کئی شہروں میں دارالعلوم کی شاخیں قائم کیں اور فنِ قرأت پر ابتدائی کتابیں لکھیں۔ آپ ایک طرف سرکاری تقاریب کی زینت ہیں اور دُوسری طرف عوامی دینی جلسوں میں اپنی خوش الحانی سے سامعین کے محبوب قاری ہیں۔

[۱] مولانا محمد عبداللہ قصوری قصور شہر میں جامعہ حنفیہ کے بانی، مہتم اور شیخ الحدیث ہیں۔ آپ مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف کے نامور شاگردوں میں سے ہیں۔ امرت سر کے ایک گاؤں سرسنگھ میں ۱۴ر جنوری ۱۹۲۰ء میں پیدا ہُوئے۔ والد کا اسم گرامی الحاج گلاب دین ہے۔ آپ نے پٹی ضلع امرت سر بھارت کے ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا اور حزب الاحناف لاہور میں داخل ہو کر علوم دینیہ پڑھنے لگے۔ آپ ابتدائی فارسی کتابوں سے لے کر انتہائی کتابوں میں حضرت مولانا محمد مہرالدین کے زیرِ تلمذ رہے۔ دورۂ حدیث حضرت استاذ العلماء علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری شیخ الحدیث حزب الاحناف سے مکمل کیا۔ ۱۹۴۳ء میں دستارِ فضیلت اور سندِ فراغت لے کر اپنے گاؤں سرسنگھ گئے اور جامعہ حنفیہ کی بنیاد رکھی۔ تقسیمِ ملک پر قصور آئے۔ ۱۹۴۹ء میں جامعہ حنفیہ کا آغاز کیا اور لگاتار محنت کر کے اسے بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ آپ کی شبانہ روز محنت اور دانشمندانہ جدّوجہد نے قصور کی اس علمی وراثت کو محفوظ کر لیا جو ایک عرصہ سے ختم ہو گئی تھی۔ آپ پاکستان بھر کے علماء کرام کو اپنے دارالعلوم کے جلسہ تقسیم اسناد میں بلاکر

(باقی بر صفحہ ۴۲۷)

انتظامات کو وسعت دینے کے لیے دن رات کام کرنے لگے۔ انہوں نے دارالعلوم کو ایک کھلے پلاٹ میں منتقل کیا۔ تدریسی دنیا میں ان حضرات نے ایک نیا مقام پیدا کیا اور اپنی گونا گوں مشکلات کے باوجود آگے بڑھتے گئے۔ مدرسہ نعمانیہ لاہور ایک قدیم یادگار کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ حزب الاحناف اپنی نصف صدی کی دوڑ کے بعد تھک گیا تھا۔ مدرسہ حمیدیہ مسجد نیلا گنبد میں برائے نام کام کر رہا تھا۔ اچھرہ کا مدرسہ فتحیہ دم توڑ چکا تھا۔ بڑے میاں کے درس کی پارینہ یادگار بن گیا تھا۔ اندریں حالات مندرجہ بالا مدارس نے ان روایات کو زندہ رکھنے میں بڑا نام پیدا کیا۔

لاہور سے ہٹ کر بعض علماءِ اہلسنت تدریسی دنیا میں بہت اہم خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ بصیر پور میں مدرسہ فریدیہ، اوکاڑہ میں اشرف المدارس، لائل پور میں جامعہ قادریہ اور جامعہ رضویہ، دارالعلوم امینیہ، جھکی شریف گجرات میں سید جلال الدین صاحب کا مدرسہ، ملتان کا انوار العلوم، سیالکوٹ میں دارالعلوم حنفیہ، بندیال کا دارالعلوم امدادیہ، بھیرہ میں دارالعلوم محمدیہ کے قابلِ قدر اساتذہ دینی علوم کی اشاعت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے عزم اور جذبہ کے ساتھ وہ علم اٹھائے جا رہے ہیں جسے ہمارے اسلاف کا قافلہ لے کر وادیٔ بطحا سے نکلا تھا۔ ان مدارس کے اساتذہ، مدرسین اور طلباء راقم کے پاس آتے اور اپنی علمی جدوجہد میں باقاعدہ شریک رکھتے۔ یہ مدارس اگرچہ اپنے اسلاف کی یادگار ہیں مگر انہیں جن حالات کا سامنا ہے وہ بہت شدید ہیں۔ حکومت کی طرف سے تحسین و امداد کی بجائے بروقت ناروا پابندیاں، امراء کی طرف سے بے اعتنائی، عوام الناس کی تنگدستی اور طلباء کی نایابی۔ پھر دینی علوم کی تحصیل کے بعد فکرِ معاش کا مایوس کن تصور قدم قدم پر حوصلہ توڑ دیتا ہے مگر بایں ہمہ یہ لوگ قدم آگے بڑھاتے جا رہے ہیں۔ میرے خیال

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

قصور کے عوام کو سُنی نظریات سے واقف کراتے ہیں۔ ہزاروں شاگرد زیورِ تعلیم سے آراستہ کر چکے ہیں۔ علماءِ اہلسنت میں ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ علمی کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ آپ کے کتب خانہ میں ہے جو ذوقِ مطالعہ کی غمازی کرتا ہے۔

میں یہ لوگ عظیم عزم کے مالک ہیں۔

علماء اہلسنت میں بعض نے سیاسیات میں حصّہ لے کر جرأت اور بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انتخابات کے معرکوں، پارلیمنٹ کے ہالوں اور پھر حزب اختلاف کے جلسوں میں ایک سیاسی معیار قائم رکھا۔ قومی اسمبلی میں مولانا شاہ احمد نورانی خلف الرشید شاہ عبدالعلیم میرٹھی، مولانا مصطفیٰ الازہری خلف الرشید صدر الشریعۃ مولانا محمد امجد اعظمی (مؤلف بہار شریعت) اور پھر مولانا عبدالستار خان نیازی، علامہ محمود احمد صاحب رضوی، مولانا غلام علی صاحب اوکاڑوی، مولانا محمد اکبر ساقی اور دوسرے ممتاز علماء کرام نے عوام الناس میں پہنچ کر سیاسی اور دینی بیداری کا ثبوت دیا۔ انہوں نے عام جلسوں میں ایک طرف اہلسنت کے عقائد کی تشہیر کی اور دوسری طرف حکومت پر جرأت سے تنقید کی۔

ایک عرصہ سے سُنیوں کی طرف سے تالیفی اور تصنیفی شعبے میں جمود چلا آرہا تھا مگر چند برسوں سے یہ جمود بھی ٹوٹنے لگا ہے۔ اہل قلم لکھنے کے لیے آگے بڑھے، ناشرین نے دینی لٹریچر کو اچھے انداز سے چھاپنا شروع کیا اور اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں ہر قسم کی کتابیں عوام تک پہنچنے لگیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لاہور میں نوری کتب خانہ اعلیٰحضرت یا دوسرے علماء اہلسنت کی کتابیں شائع کیا کرتا تھا۔ موجودہ دس سالہ دور میں مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی نے بڑی عمدہ کتابوں کے تراجم عوام تک پہنچائے۔ لاہور میں مکتبۂ نبویہ، مکتبہ حامدیہ، المعارف اور مکتبہ رضویہ نے بڑا کام کیا۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلویؒ کی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے میں جو کردار مرکزی مجلس رضا لاہور نے ادا کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اراکین مجلس نے صرف دعائے خیر کے ہدیہ پر خوب صورت اور عمدہ کتابیں پڑھی لکھی دنیا تک پہنچا کر ایک عمدہ مثال قائم کر دی۔ سیالکوٹ کے مکتبہ نعمانیہ، مکتبہ ماہ طیبہ کوٹلی لوہاراں، نعیمی کتب خانہ گجرات، مکتبہ القیاس لاہور، لائلپور میں سُنی دارالاشاعت، چشتی کتب خانہ اور مظہر فیض رضا نے بھی اپنے اپنے انداز میں اہم کتابیں چھپوائیں۔ اس سے انکار نہیں کہ دیوبندی اہل قلم کا اشاعتی دنیا پر ابھی تک تسلط ہے مگر وہ اپنے عقائد کو کھل کر بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ملک کی کثیر آبادی سُنی عقائد کی حامی ہے مگر یہ لوگ اپنی تحریر کی چاشنی سے عوام کو متاثر کر رہے ہیں۔ جہاں وہ کھل کر سامنے آتے ہیں سرِ بازار پٹ جاتے ہیں۔

ان دیوبندی اشاعتی اداروں نے عوامی رجحان کو بھانپ لیا ہے۔ اب وُہ ہمارے ہی اسلاف کی تصانیف کو بادنیٰ ترمیم بازار میں لارہے ہیں۔ اس رجحان سے ہم اُن کتابوں کے مطالعہ سے بہرہ ور ہورہے ہیں جو ہماری کم مائیگی کی نوحہ خوانی کر رہی تھیں۔ کراچی کے بعض دیوبندی مطابع تو اس سلسلہ میں بڑا اہم کام کر رہے ہیں۔

میدانِ صحافت میں سُنّی ماہ نامے بڑے کمزور نظر آرہے ہیں۔ ایک روزنامہ نہیں، ایک ہفت روزہ نہیں جو جاندار ہو۔ ماہ ناموں میں ضیائے حرم نے اپنا مقام پیدا کیا۔ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ خالص دینی حلقوں میں جارہا ہے مگر اس کا انداز زمانۂ حال کے طباعتی حسن و جمال سے کوسوں دور ہے۔ کراچی سے ترجمان اہلسنّت غنیمت ہے۔ رضوان لاہور، عرفات لاہور، فیض رضا لائلپور، الحسن پشاور نکلتے ہیں مگر پڑھے نہیں جاتے۔ ان ماہناموں سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے مگر ابھی تک نوکِ قلم پر روشنائی کی چمک نہیں ہے۔

لاہور میں جس کمی کو ہر شخص بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہے وہ خطیبانِ شہر کی ہے۔ ایک وقت تھا کہ کئی جامع مساجد اپنے خطباء کی وجہ سے معروف تھیں۔ لوگ جمعہ پڑھنے جاتے تو مقرر کے بیان وکلام سے متاثر ہوکر آتے۔ اب اکثر مساجد تو محکمہ اوقاف کے زیرِ اثر ہیں اور اُن کے محراب و منبر کو اوقاف کے بے علم حکام کی ہدایات چاٹ گئی ہیں۔ وہاں نمازِ جمعہ پڑھنے جائیں تو خطبہ سننے کی بجائے ریڈی میڈ جمعہ کی نماز حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اکثر مساجد خطباء کی بے ربط اور غلط تقاریر سے اُجڑ کر رہ گئی ہیں۔ وُہ جوش، وہ ولولے، وُہ خطاب و بیان کی حلاوت، وہ رومی و جامی کے اشعار قلب و جگر کو گرما دیا کرتے ہیں۔ ع

اہلِ دل کے کارواں کن وادیوں میں کھو گئے
